حصہ اوّل

مولینا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب

المرتضیٰ کا مسکت جواب

فروغ کاظمی

جملہ حقوق بہ حق مؤلف وناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: ——— الخلفاء
مولف: ——— فروغ کاظمی
تعداد اشاعت: ——— ایک ہزار
سن اشاعت: ——— دسمبر ۱۹۹۶ء
طباعت: ——— سرفراز پریس، لکھنؤ۳
قیمت: ——— چالیس روپئے
ناشر: ——— ادارہ تہذیب ادب ۲۹۲ میدان ایل ایچ خان جگنی لین۔ لکھنؤ۳

ملنے کا پتہ

عباس بک ایجنسی

درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ۔۳

فون دوکان: 260756 فون رہائش گاہ: 269598

انتساب

اس مظلوم شہزادے کے نام

جو ضرب عمری کا شکار ہوکر

بطن مادر میں شہید ہوگیا

فروغ کاظمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ

امابعد

اس
کتاب
کی
تالیف کا مقصد
کسی مسلمان کی دل آزاری نہیں

بلکہ
میرے مخاطب
صرف ابوالحسن ندوی اور وہابی مسلک کے افراد ہیں

اور
میری یہ کتاب
مولانا ندوی کی کتاب المرتضیٰ کے جواب میں ہے۔

فروغ کاظمی

انڈکس

عنوانات	صفحہ نمبر	عنوانات	صفحہ نمبر
پیش لفظ	۱	پیشہ	۴۳
اہم گفتگو	۹	نفع خوری	۴۴
باب اوّل ۔ ابوبکر بن قحافہ		شراب نوشی	۴۴
شجرہ	۳۰	ابوبکر کا مسلمان ہونا	۴۴
قریش کون ؟	۳۱	صدیق اکبر کون ؟	۵۱
ابوبکر خلیفہ تھے یا خالفہ !	۳۷	ابوبکر، پیغمبر اسلامؐ کی نظر میں	۵۲
پیدائش	۳۷	ابوبکر کا شیطانی ایمان	۵۳
ابوبکر کی وجہ تسمیہ اور نام	۳۸	ابوبکر کی نافرمانی اور خدا کی لعنت	۵۵
حلیہ	۳۹	ابوبکر کی معزولی	۵۸
ابتدائی زندگی	۳۹	غارِ ثور میں ابوبکر کا گریہ	۶۱
والدین	۴۰	غارِ ثور کی نوعیت	۶۷
تعلیم	۴۰	غزوات سے کنارہ کشی اور فرار	۶۷
		جنگ بدر	۶۹
		جنگ احد	۷۱

جنگ خندق	۷۲
جنگ خیبر	۷۵
جنگ حنین	۷۹
صلح حدیبیہ اور ابوبکر کی گالیاں	۸۱
ابوبکر سے رسولؐ اللہ کی بیزاری	۸۳
رسولؐ اللہ کی شہادت	۸۴
سقیفہ بنی ساعدہ کی حیثیت	۹۲
سقیفہ کی کارروائی	۹۴
خلیفہ کی ضرورت اور تقرری	۹۷
دھا چوکڑی	۱۰۳
خالد بن ولید کے مظالم	۱۰۴
فدک پر قبضہ	۱۰۷
فدک کی حقیقت	۱۱۰
ابوبکر سے سیدہ فاطمہؑ کی ناراضگی	۱۱۵
سیدہ کونین حضرت فاطمہ زہراؑ کی رحلت	۱۲۰
حضرت فاطمہ زہراؑ پیغمبرؐ اسلام کی نظر میں	۱۲۳
خلافت کی واپسی	۱۲۵
واقعۂ قرطاس	۱۲۷
انتقال	۱۳۱
مدفن	۱۳۱
حضرت علیؑ کی خاموشی اور اپنے لیے تلوار نہ اٹھانے کا سبب	۱۳۳

باب ثانی

بنی ہاشم	۱۳۸
حضرت عبدالمطلبؑ	۱۴۳
حضرت ابوطالبؑ	۱۵۰
حضرت طالبؑ	۱۶۲
مولودِ کعبہ، حضرت علی علیہ السلام	۱۶۴

باب ثالث ۔ عمر بن الخطاب

پیدائش	۱۷۸
نام، کنیت اور القاب	۱۷۹
حلیہ	۱۸۰
والدین اور نسب	۱۸۲
ابتدائی حالات	۱۸۵
تعلیم، رنگین مزاجی، پہلوانی اور شراب نوشی	۱۸۸
پیشہ	۱۸۹
حضرت عمر کا ڈرامائی اسلام	۱۹۰
عمری نوشتہ	۱۹۲
دوسرا خط	۱۹۴
بت پرستی	۱۹۸
حضرت عمر اور ام کلثوم	۱۹۶
کتابیات	۲۱۱

پیش لفظ

(ایک فاضل مقالہ نگار کے قلم سے)

زورِ حق بھی کیا چیز ہے جو باطل کے قدم جمنے نہیں دیتا ۔ یہ قدرتِ حق دیکھیے کہ حکومتِ شام کے ہزاروں اور لاکھوں درہم و دینار حدیثوں کے بنانے پر صرف ہو گئے ۔ لیکن وہ درہم و دینار اس بات کو کسی طرح چھپا نہ سکے کہ یہ حدیثیں حکومتِ شام کے کہنے سے بنائی گئی ہیں ۔ اس پردہ کو چاک کرنے کے لیے فقرائے ملتِ اسلامیہ کو ایک پیسہ بھی صرف کرنے کی ضرورت نہ ہوئی بلکہ وہ خود قلمِ تحقیق کے سامنے جامۂ کتان کی طرح تار تار ہو گیا ۔ ورنہ ابو علی مدائنی جیسے شخص سے لکھوا دینے والی شے وہ انعام و اکرام نہ تھا بلکہ وہ زورِ حق تھا جسے بغیر ظاہر کیے ہوئے دل صبر نہ کر سکا ۔ ورنہ احکام و اقوالِ خدا و رسولؐ کے بدل دینے میں ذرہ برابر بھی نہ حاکمِ شام کو کوئی باک تھا نہ اس کے ماننے والوں کو اس کی کوئی پروا تھی ۔ اور زمانہ کتنا متدینین اہلِ اسلام سے پاک و صاف ہو گیا تھا کہ تعمیلِ حاکمِ شام مال و زر کی لالچ میں فوراً کی جاتی تھی چاہے قرآن محو ہو جائے یا حدیثِ رسولؐ ۔ حکومت نے دماغوں پر اتنا تسلط قائم کر لیا تھا کہ لوگوں کو بدھ اور جمعہ میں امتیاز نہ رہا تھا ۔ اونٹ اور اونٹنی میں فرق نہ کر سکتے تھے ۔ یہ بھی پتہ نہ تھا کہ علیؑ کون ہیں، فاطمہ کون ہیں، رسول کون ہیں اور ان کا آپس میں ایک دوسرے سے رشتہ

کیا ہے؟ علامہ مسعودی اپنی کتاب مروج الذہب میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے حضرت ابوبکر و عمر و معاویہ و علیؑ کے بارے میں بحث کرتے تھے کہ وہیں ایک بوڑھا شامی بھی آپہنچا جس کی ڈاڑھی بڑی تھی اور ان لوگوں سے کہا کب تک تم لوگ علیؑ اور معاویہ کے بارے میں بحث کرتے رہو گے۔ ایک شخص نے اس سے کہا اچھا تم ہی بتاؤ تم ان لوگوں کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ اس بوڑھے نے پوچھا کس کے متعلق سوال کرتے ہو۔ اس شخص نے کہا علیؑ ہی کے بارے میں بتاؤ کہ تم کیا کہتے ہو۔ اس بوڑھے شامی نے کہا وہی علیؑ جو فاطمہؑ کے باپ تھے؟ اس شخص نے پوچھا فاطمہؑ کون تھیں۔ اس شامی نے کہا تھیں کون حضرت رسول خدا کی بیوی اور عائشہ کی بیٹی تھیں اور عائشہ معاویہ کی بہن تھیں۔ تب اس نے پوچھا کہ پھر علیؑ کا کیا ہوا۔ اس شامی نے کہا وہ تو حضرت رسولِ خداؐ کے سامنے غزوۂ حنین میں شہید ہو گئے (مروج الذہب ج ۲ ص ۱۰۸ بر حاشیہ کامل)

حکومت شام دماغوں پر اتنی چھا چکی تھی کہ لوگوں کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ خانہ کعبہ کسی عمارت کا نام ہے یا کسی انسان کا (مروج الذہب)، وضع احادیث کا ایک کارخانہ تھا جس میں ضرورت کے مطابق حدیثیں ڈھالی جاتی تھیں۔ اگر کسی کو کبوتر بازی کا شوق ہوا تو حدیث رسولؐ موجود اور اگر پیاز کی خرید و فروخت میں کمی پیدا ہو گئی اور ذخیرہ سڑنے گلنے لگا تو حدیث رسول وضع کر لی گئی۔ باپ کی مستعملہ کنیز پر اگر بیٹے نے تصرف کرنا چاہا تو مفتیانِ شرعِ متین نے مال و زر کے ڈھیر دیکھ کے فتویٰ دے دیا کہ ہر دعوے کے لیے دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے کنیز سے کہو کہ اس موقع کے دو گواہ پیش کرے تو دعویٰ قابل قبول ہے ورنہ تم کو تصرف کا حق حاصل ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وہ گواہ پیش کر سکی نہ تصرف سے محفوظ رہ سکی۔ دین کو اس طرح سے برباد اور شریعت کو اس طرح سے پامال کیا جا رہا تھا۔

واجب الاحترام صحابی وہ سمجھا جاتا تھا جو آل محمدؐ سے عداوت شدیدہ رکھتا ہو جو آل محمدؐ سے جتنا قریب تھا وہ دنیا کی نظروں میں اتنا ہی ذلیل و کم وقعت والا تھا۔

ابو الصلت ہروی جو حضرت امام رضا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ممتاز ترین صحابیوں میں سے تھے ان کے متعلق امام ذہبی نے اپنی کتاب میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ رجل صالح الا انہ شیعی۔ یہ تھے تو مرد صالح و نیکوکار ضرور مگر ایک عیب یہ تھا کہ یہ شیعہ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی اچھائیاں تھیں، جتنی خوبیاں تھیں، جتنے محامد و محاسن تھے، جتنے فضائل و مناقب تھے وہ سب ایک شیعہ ہونے کی وجہ سے ختم ہو گئے۔

محمد بن ابوبکر جو ام المومنین عائشہ کے سگے بھائی تھے جب ان کی بہن ام المومنین (تمام مومنین کی ماں) ہو سکتی ہیں تو ماں کا بھائی ماموں ہی تو ہوتا ہے اس رشتہ سے محمد بن ابوبکر کو خال المومنین (تمام مومنین کا ماموں) کہنا چاہیے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس لقب کے لیے معاویہ ابن ابوسفیان کا انتخاب ہوا۔ اس لیے کہ محمد بن ابوبکر کے دل میں امیر المومنینؑ کی محبت جاگزیں تھی اور معاویہ کے دل میں عداوت۔ لہٰذا صاحب عداوت کو صاحب محبت پر ترجیح دی گئی۔

عمر بن سعد کو دنیا جانتی ہے کہ کیسا دشمنِ اہل بیت اور قاتل سردارِ جوانانِ جنت گزرا ہے مگر اس کے لیے ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب تقریب التہذیب میں لکھتا ہے کہ عمر بن سعد بن ابی وقاص المدنی نزیل الکوفۃ صدوق ولکن مقتر الناس لکونہ امیرا علی الجیش الذین قتلوا الحسین بن علی۔ عمر بن سعد بن ابی وقاص مدینہ کا رہنے والا وارد حال کوفہ بہت زیادہ سچا ہے لیکن لوگ اس کو اس سبب سے دشمن رکھتے ہیں کہ یہ اس لشکر کا

سردار تھا جس نے حسینؑ ابن علیؑ کو قتل کیا ہے۔ اس عبارت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دنیا عمر سعد کو دشمن رکھتی ہے لیکن ابن حجر اس کو دوست رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک قتل حسینؑ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اس جگہ سے یہ راز بھی سمجھتے چلیے کہ تمام صحاح ستہ میں صحیح بخاری سب سے زیادہ مستند اور معتبر کیوں سمجھی جاتی ہے۔ اس کا راز یہی ہے کہ یہ کتاب دشمنانِ آل محمدؐ کو کام میں لاکر لکھی گئی ہے۔ اس کے راوی زیادہ تر وہی ہیں جو اہل بیتؑ اطہار سے عداوت شدیدہ رکھتے ہیں۔ مثلاً مروان بن حکم۔ ابن حجر نے مروان کے لیے لکھا ہے کہ لا یثبت لہ صحبتہ۔ اس کا صحابی ہونا ثابت نہیں ہے۔ پیغمبرؐ نے مروان اور اس کے باپ حکم کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا تھا جس کو مسعودی نے مروج الذہب میں ان الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ مروان ھو طرید رسول اللہ الذی غربہ عن المدینہ ونفاہ عن جوارہ۔ یعنی مروان رسول اللہؐ کا مطرود ہے جس کو آنحضرت نے مدینہ سے باہر نکال دیا تھا اور اس کو اپنے پڑوس سے دور فرما دیا تھا۔ مروان آنحضرتؐ کے نزدیک قابل لعنت تھا۔ چنانچہ خود ام المومنین نے ایک مخاطبہ میں مروان سے کہا ہے کہ اما انت یا مروان فاشہد ان رسول اللہ لعن اباک وانت فی صلبہ۔ لیکن تو اے مروان! تو میں شہادت دیتی ہوں کہ پیغمبرؐ نے تیرے باپ پر اس وقت لعنت کی جب تو اس کے صلب میں موجود تھا۔ حضرت امیر المومنین اس کو ایک یہودی نما مسلمان سمجھتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی اپنی کتاب فتاوائے عزیزیہ صفحہ ۱۹۲ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مروان را لعنت کردن از لوازم سنت ومحبت اہل بیت است از جملہ فرائض ایمان است۔ مروان پر لعنت کرنا سنت اور محبت اہل بیت

لوازمات میں سے ہے جو منجملہ فرائض ایمان ہے۔

ایسے راوی سے امام بخاری نے روایت لی ہے۔ دیکھیے بخاری جلد اول، کتاب الہبہ باب ۱۶۳۰۔ حدیث نمبر ۲۴۲۲۔ باب مناقب زبیر بن عوام حدیث نمبر ۹۱۱ جلد دوم۔

دوسرا راوی عمران بن حطان ہے۔ یہ وہ راہ دین کا شناختہ راہ زن ہے جس نے اس ضربت کی تعریف کی ہے جو ابن ملجم مرادی ملعون نے حضرت امیر المومنینؑ کے سر اقدس پر لگائی تھی۔ چنانچہ عمران بن حطان کہتا ہے

یا ضربۃ من تقی ما اراد بہا	الا لیبلغ من ذی العرش رضوانا
انی لاذکرہ یوما فاحسبہ	اوفی البریۃ عند اللہ میزانا

(اصابہ ابن حجر مطبوعہ کلکتہ جلد ۳ ص ۳۵۴ وحیواۃ الحیوان دمیری تحت لغت انسان)

یہ ضربت ایک متقی و پرہیز گار کے ہاتھ کی لگائی ہوئی ضربت تھی جو اس لیے لگائی گئی تھی کہ صاحب عرش اس سے راضی وخوشنود ہو۔ جب کبھی میں اس ضربت کو یاد کرتا ہوں تو یہ گمان کرتا ہوں کہ میزان عمل میں اس سے بڑھ کر کوئی وزنی عمل نہ ہوگا

اب ہر مسلمان ذرا سوچے کہ کیا عمران بن حطان صف رواۃ میں شامل ہونے کے قابل ہے کیا اس لائق ہے کہ اس کی روایتوں پر اعتبار کیا جائے۔ مگر امام بخاری نے اس سے روایت لی ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری جلد ۲ حدیث نمبر ۷۸۱۔

اسی طرح سے ایک راوی حریز بن عثمان ہے جو حضرت امیر المومنین سے اتنی عداوت رکھتا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کے بارے میں یہ حدیث جو ارشاد فرمائی ہے کہ علی بمنزلۃ ھارون موسیٰ (علیؑ کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی) تو حدیث تو صحیح ہے لیکن سننے والوں کو دھوکا

ہوا ہے۔ پیغمبر نے یہ فرمایا تھا قارون من موسیٰ علی کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو قارون کو موسیٰ سے تھی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۲۹)

ایک راوی اشعث بن قیس ہیں۔ یہ بھی حضرت امیر المومنینؑ کے قتل کی سازش میں شریک تھے (تذکرہ خواص الامہ) ان کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی اہل بیت کی دشمنی میں شہرۂ آفاق تھے۔ لڑکا محمد بن اشعث جو ابن زیاد کے یہاں سے جناب مسلم کے قتل کے لیے فوج لے کر آیا تھا اور لڑکی جعدہ بنت اشعث جس نے حضرت امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کیا۔

غرض کہ جو بھی اٹھا اس نے دامے درمے قدمے سخنے اہل بیتؑ اطہار کی دشمنی میں پورا زور صرف کر دیا۔

"امیر شام کی شومی قسمت خوں آشامیوں کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ بنی اُمیہ کی اُمّت اس دولت داُبہت سمیت اسی روِیہ پر گذر گئی بنی عباس اس دن سے بے پرواہ ہو کے جس کے لیے خدائی اعلان تھا "یوماً عبوساً قمطریرا" اپنے اساسِ دولت کو وقارِ اہل بیتؑ مٹا کے مضبوط کرتے رہے۔ مسلم نے اپنی اسلام نوازیاں غلط انداز سے صحیح کیں۔ بخاری نے اپنی کتاب کو وزارت قرآن سپرد کر کے دل کا بخار اچھی طرح نکالا۔ ابن ماجہ کے تموج نے سفینۂ فضل اہل بیتؑ کو متلاطم کر دیا۔ ابو داؤد نے اپنی کوششوں سے دولت و سلطنت کا دل اپنے لیے موم کر لیا۔ مشکوٰۃ نے الٰہی چراغ کے مقابل میں اپنے چراغ پیش کیے۔ ابن حجر نے "تطہیر الجنان" میں اپنی سنگ دلی کو اچھی طرح سراہا۔"

غرض کہ جو آیا وہ اقوال خدا اور رسول سے جہاد کرتا ہوا آیا لیکن ہر دور میں وہ حق گو اور حق پرست بھی دنیا میں موجود رہے جنھوں نے باطل کے قدم ایک ساعت

کے لیے جمنے نہیں دیے۔ دست و پا قطع کر دیے گئے۔ زبانیں کاٹ دی گئیں، سولی پر چڑھا دیے گئے، قید خانوں میں قید کر دیے گئے لیکن سوائے کلمۂ حق کے دوسری بات زبان سے نہ نکلی۔ زمانہ ماضی سے یہی ڈھرا چلا آ رہا تھا۔ ابطال باطل لکھی گئی تو اس کا جواب احقاق الحق کی شکل میں سامنے آیا۔ عزیز مصر تعصب نے دہلی کے گندے نالے سے ایک بدبودار تحفہ شیعوں کو بھیجا تو یوسف کنعان دہلی نے بھی اس کا جواب نزہہ اثنا عشریہ کے نام سے دیا۔ شوکت عمریہ شائع ہوئی تو اس کا جواب ضربت حیدریہ کے نام سے دیا گیا۔ قیقاب لکھی گئی تو اس کا جواب کنتاپ سے دیا گیا۔ سیف قاطع وجود میں آئی تو برق لامع نے چوندھیا دیا۔ موجودہ دور میں انھیں خرافات کا ایک مجموعہ المرتضیٰ کے نام سے شائع ہوا جس میں حقائق کو چھپانے اور معارف پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ وہی راستہ اختیار کیا گیا ہے جو اسلاف کا تھا۔ انھیں نشانات پر چلنے کی کوشش کی گئی ہے جو اسلاف قائم کر گئے تھے۔ یقین تھا کہ یہ حرف آخر ہے اور ہماری بات کا جواب دینے والا کون ہے؟ مگر مشہور ہے ہر فرعونے را موسیٰ۔ ابھی زمانہ کا دامن ایسے افراد سے خالی نہیں ہے کہ باطل حملہ آور ہوتا رہے اور وہ خاموش بیٹھے رہیں۔ حقائق و معارف پامال ہوتے رہیں اور وہ دیکھتے رہیں۔ حق پر آنچ آئے اور ان کا احساس و شعور بیدار نہ ہو۔ اس خدمت کے لیے خالق نے فروغ کاظمی کا انتخاب کیا جو محض شاعر ہی نہیں بحر تحقیق و تدقیق کے غواص بھی ہیں۔ میدان مناظرہ کے مجاہد اعظم بھی دریائے معرفت کے شناور بھی۔ جو ہمیشہ زبان سے احقاق حق اور قلم سے ابطال باطل کرتے رہے۔ کمال شاعری جن کے ذہن رسا کی ایک فکر نارسا کا نام ہے۔ اگر نظم کی لڑیاں ان کے تار نفس کے حرکات کا دم بھرتی ہیں تو نثر کے موتی ان کے صدف ذہن کے تبسم کے منتظر رہتے ہیں۔ ان کی عارفانہ طبیعت اس کو برداشت نہ کر سکی

کہ باطل حملہ آور ہو اور وہ خاموش رہیں ۔ لہٰذا فروغ کاظمی اپنے میثمی کردار اور بوذری گفتار کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور رات و دن کی مسلسل محنت شاقہ کے بعد زیر نظر مجموعہ مرتب کرکے پیش کر دیا۔ اور باطل کے چہرہ پر وہ طمانچہ رسید کیا ہے کہ قیامت تک وہ منھ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

فقط

گدائے باب اہل بیت

ایک مقالہ نگار

۲۵ رماہ رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ

اہم گفتگو

اسلام میں جاگیرداری کی بدعت جاری کرنے والے حضرت عثمان تھے اور اُن کے بعد اس بدعت کی خبیث رسم کو ترقی اور وسعت دینے والے امیر شام معاویہ تھے اور اسی بدعت نے ہر ایک دور، ہر عہد اور ہر زمانے میں صورت بدل بدل کر اسلام کو تباہ اور مسلمانوں کو برباد کیا۔ کبھی اس نے شیرازۂ اسلامی کو منتشر کیا تو کبھی جذبۂ اسلامی کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور یہی عمل پیہم (جو بجائے خود ایک ظلم عظیم ہے) بنی اُمیہ اور بنی عباس کے عہد میں جاری رہا۔ البتہ بدلتے ہوئے دور اور حالات میں تغیرات کے تقاضوں نے مختلف نام اختیار کیے مگر ملوکیت وہی رہی۔ کوئی اسلام کے اولین دور کے سازشی مسلم حکمراں کی صورت میں سامنے آیا، کوئی مسلم ڈکٹیٹر کے روپ میں ابھرا، کہیں امارت کے نام سے خانہ ساز خلافت چلائی گئی اور کہیں شاہی کے نام سے پرانی استبدادیت کو جاری رکھا گیا۔ اسی سازشی ملوکیت، امارت، ڈکٹیٹر شپ، شاہی اور شہنشاہی کے ساتھ درباریت اور جاگیرداریت نے موقع محل اور وقت و مقام کے لحاظ سے مختلف صورتیں بدل بدل کر اپنے وجود کو باقی رکھا اور اسی کے ناجائز ٹکڑوں پر پلنے والے خوشامدی، درباری، جاگیردار، عہدہ دار، ایمان فروش مورّخ، قاضی، ملّا، مفتی، راوی اور ضمیر فروش امرا اور علما رہے تھے، اور آج بھی موجود ہیں۔ اور یہی لوگ اسلام کو، مسلمانوں کو بلکہ پوری ملت مسلمہ کو تباہ و برباد کرنے میں ہمیشہ

پیش پیش رہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاسق درباریوں اور جاگیرداروں اور فاجر امرار وعلمار کی جانب سے ہمیشہ خالص اسلامی تحریکوں کی مخالفت کی جاتی رہی اور آج بھی کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی خباثت کی بدلی ہوئی ترقی یافتہ شکل فیصل ایوارڈ ہے جو ایک لاکھ سعودی ریال پر مشتمل ہے اور جسے حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کے ساتھ حق کو باطل کا لباس پہنانا پڑتا ہے اور مشقت سے اسلام کی خوبصورت تصویر پر دہابیت کی مکروہ تصویر بنانا پڑتی ہے اور اس کام کو بڑی جانفشانی کے ساتھ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے انجام دیا ہے اور ایسے کامیاب انداز میں انجام دیا کہ فیصل ایوارڈ حاصل کرلیا۔ اسی ایوارڈ نے ندوی صاحب کو نہ صرف دولت وشہرت کا مالک بنایا بلکہ ان کے نام ونمود کے تسلسل کو بھی باقی رکھا۔

ندوی صاحب سعودی اخراجات سے جو جہل قسم کی کتابیں یا رسائل شائع فرما رہے ہیں، ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا اسلام محض ایک دکھاوا اور خلوص عقیدت سے عاری ہے۔ اگر ندوی صاحب کے دل ودماغ میں حقیقی اسلام کی کوئی تصویر ہوتی یا اسلام کے لیے خلوص اور مسلمانوں کے لیے ذرا سا بھی درد ہوتا تو آپ ملتِ مسلمہ کو مزید منتشر کرنے کی تحریری کوشش کبھی نہ فرماتے بلکہ مسلمانوں میں اتحاد وہم آہنگی کا جذبہ پیدا کرنے کی سعی فرماتے۔

مذکورہ عبارت حجۃ الاسلام، مولانا السید غلام حسین صاحب قبلہ مجتہد حیدرآبادی کے تاثرات اور خیالات سے ماخوذ ہے جو ایک طویل گفتگو کی شکل میں عالی جناب شوکت حسین صاحب قبلہ کی مایہ ناز تالیف اعلان حق میں اشاعت پذیر ہو چکی ہے اور چونکہ میں بہ ذات خود اپنے قلم سے مولانا ندوی صاحب کی پراسرار شخصیت کا تعارف نہیں کرانا چاہتا تھا اس لیے مناسب تھا کہ اسی گفتگو کے اقتباس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کروں۔

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی میرے ہم وطن اور نظریاتی اختلافات کے باوجود میرے بھائی ہیں (یہ اور بات ہے کہ مولانا ندوی صاحب کا دیرینہ تعلق ندوہ سے ہے اور دارالندوہ وہ جگہ ہے جہاں کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں مولانا ندوی کی کتاب المرتضیٰ ص ۵۰ ۵۴) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مولانا کا قلم، قرطاس کی وادیوں میں بے نکیل اونٹ کی طرح بلبلاتا پھرے اور میں تماشائیوں کی صف میں کھڑا ہو کر اس بے راہ روی کا تماشہ دیکھوں۔

میرا شیوہ حق پرستی اور دنیا حق فروش
میں کہاں لے جاؤں اپنے میثمی کردار کو (مؤلف)

مولانا ندوی صاحب کے رشحات قلم کا دل آزار نتیجہ اور حالیہ تالیف "المرتضیٰ" میرے ایک مخلص دوست اور کرم فرما جناب سید انتخاب حسین صاحب کاظمی نے مجھے مرحمت فرمائی، جس کی تحریروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا ندوی نے سیرت علوی کو سپر بنا کر، اسلام کی ان نزاعی شخصیتوں کا دفاع کیا ہے جو چودہ سو برس سے اختلافی ہیں اور جن کے غیر اسلامی طرزِ عمل نے اسلام کو پارہ پارہ کرکے مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا، یا یوں کہا جائے کہ فاضل مولف نے محض اپنے مخصوص نظریات کی وضاحت کے لیے سیرت علوی کو بہانہ بنا کر نہ یہ کہ صرف خلفائے ثلاثہ کی شان میں مدح کے گیت گائے ہیں بلکہ خانوادۂ رسالت پر وہابیت کا کیچڑ اچھالنے میں اپنی ذہنیت، کوتاہ بینی اور تاریخی بد دیانتی کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ جس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۵۔ بنی ہاشم ایک زمانہ تک اپنی قوم وہم وطن کے عقائد جاہلیت اور غیر اللہ کی عبادت میں ان کے شریک ہو گئے تھے۔ (المرتضیٰ ص ۳۱-۳۲)

٥۔ ابوطالب نے اسلام قبول نہیں کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا بڑا ملال تھا۔ (المرتضیٰ ص ۳۹)

٥۔ ابوطالب کے بڑے بیٹے طالب کی غزوۂ بدر کے بعد حالت شرک میں موت واقع ہوئی (المرتضیٰ ۴۰)

٥۔ عقیل ابن ابوطالب فتح مکہ کے بعد ایمان لائے (المرتضیٰ ۔ ۴۰ - ۴۱)

٥۔ شیعوں کی بڑی جماعت کو یقین ہے کہ حضرت علیؑ کی ولادت اندرونِ کعبہ ہوئی، لیکن محدثین نے اس کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ ان کا خیال ہے کہ کعبہ میں جو صاحب پیدا ہوئے وہ حکیم بن حزام تھے (المرتضیٰ ص ۴۸ - ۴۹)

٥۔ اگر ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔ (المرتضیٰ ص ۔ ۱۱۱)

٥۔ تبلیغ سورۂ برارت کے ذیل میں مولانا ابوالحسن صاحب ندوی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر الحج بنا کر تین سو حاجیوں کے ساتھ مکہ روانہ فرمایا تاکہ آپ اسلامی طریقے سے انھیں حج کرائیں اور حضرت علیؑ کو سورۂ برارت کی ابتدائی آیتوں کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ اس کی تبلیغ فرمائیں۔ راہ میں دونوں سے ملاقات ہوئی تو ابوبکر نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ تم امیر کی حیثیت سے چل رہے ہو یا مامور کی حیثیت سے، حضرت علیؑ نے جواب دیا کہ میں مامور کی حیثیت سے چل رہا ہوں۔ (المرتضیٰ ۔ ۸۶ - ۸۷)

٥۔ غدیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا دوست اور حامی میں ہوں اس کے دوست اور حامی علیؑ ہیں (المرتضیٰ ص ۸۰ - ۸۸)

٥۔ اپنی علالت کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو نماز پڑھانے کا حکم دیا، چنانچہ آپ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھائی، اور

رسول نے بیٹھ کر نماز پڑھی، حضرت علیؑ بھی موجود تھے۔ (المرتضیٰ ص ۹۰ - ۹۱)

٥۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد، اپنے جانشین کے بارہ میں یہ نہیں بتایا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ اور سربراہ ہوگا۔ (المرتضیٰ ص ۱۲۱)

٥۔ واقعہ قلم و قرطاس کے ذیل میں مولانا ندوی کا یہ کہنا ہے کہ کاغذ طلب کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین دن تک حیات رہے لیکن دوبارہ قلم و قرطاس طلب نہیں کیا، اور خلافت کے بارہ میں کوئی تصریح نہیں فرمائی، اس روز متعدد وصیتیں بھی کیں مگر ان میں خلافت کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ ان وصیتوں میں یہ تھا کہ نماز اور روزہ کا خیال رکھا جائے اور غلاموں اور باندیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا جائے (المرتضیٰ ص ۱۲۳)

مولانا ابوالحسن ندوی نے غزوۂ بدر، احد، خندق اور خیبر کے اجمالی تذکرے میں خلفاء کی شمولیت کا کوئی ذکر نہیں کیا، شاید اس لیے کہ ان معرکوں سے خلفاء کا فرار ثابت ہے، غزوۂ حنین کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے، اس لیے کہ آپ کے ممدوحین کا پول کھلتا۔ غزوۂ تبوک کی واپسی پر واقعہ عقبہ کو اس لیے نہیں چھیڑا کہ منافقوں کے چہرے بے نقاب ہوتے، میرے نزدیک مولانا کا یہ طرز عمل بد دیانتی پر مبنی ہے۔

٥۔ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی "نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کی شرائط و مطالبات" کے ذیل میں فرماتے ہیں "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے جو مشکل صورت حال سامنے آگئی تھی اور جس پیچیدہ مسئلہ سے یہ نوخیز امت دوچار تھی، اور جس سے مفر بھی نہیں تھا کہ ایک نہ ایک دن اس حادثہ کو پیش آنا ہی تھا کہ یہی سنت الٰہی ہے جس کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے؛

"جو لوگ پہلے گذر چکے ہیں ان کے بارے میں بھی خدا کی یہی عادت رہی ہے اور تم خدا کی عادت میں تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔" (سورہ احزاب۔ ۶۲)

اس صورت حال پر قابو پانے کا ایک ہی راستہ تھا، اور وہ یہ کہ ایسا خلیفہ منتخب کر لیا جائے جس میں ایسی خصوصیات ہوں جن کے ذریعہ (اللہ تعالی کی توفیق ارزانی کی بدولت) وہ دین کو تحریف سے بچائے رکھے اور امت کو جادۂ مستقیم سے منحرف نہ ہونے دے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو چھوڑا ہے، وہ خصوصیات یہ ہیں،

(۱) اس کی یہ خصوصیت ہو کہ اسلام لانے کے بعد سے زندگی بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکمل اعتماد کا اس کو شرف حاصل رہا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس کی شہادت دی ہو اور دین کے متعدد اہم ارکان اور اہم ترین ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے لیے اس کو اپنا قائم مقام بنایا ہو۔ اور ایسے خطرات سے پُر مواقع پر اس کو اپنے ساتھ لیا ہو، جس کے لیے اسی کو انتخاب کیا جاتا ہے جس پر پورا اعتماد اور مکمل بھروسہ ہو۔

(۲) اس کی خصوصیت یہ ہو کہ بلا خیز آندھیوں کے وقت جبکہ دین کی روح اور اس کی اصلیت کا چراغ جھلملا رہا ہو اور اس کے بجھ جانے کا خطرہ ہو، ایسے سخت طوفان کے عالم میں جبکہ بڑے بڑے دل گردہ والے، ایمان و یقین کے پیکر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طویل صحبت و رفاقت کا شرف رکھنے والے بھی سہم رہے ہوں، یہ شخص پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہا ہو اس نے اس موقع پر (اثبات و استقامت میں) انبیاء سابقین کے کردار کا مظاہرہ کیا ہو، جس نے نگاہوں سے پردے اٹھا دیے

ہوں اور صحیح عقیدہ اور دین کی اصلیت پر غبار نہ آنے دیا ہو۔

(۳) اس کی خصوصیت یہ ہو کہ اسلام کا صحیح ادراک اور اس کی حقیقت اور روح اس کے رگ و پے میں سرایت کی ہوئی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ، جنگ کی حالت میں، صلح کی صورت میں، خوف و دہشت کی فضا میں، امن و سلامتی کی ساعتوں میں، اتحاد و یگانگت کی حالت میں، تنگی و ترشی میں اور فارغ البالی اور اطمینان کی زندگی میں، ہر ہر موقع اور ہر ساعت میں اس کے پیش نظر ہو۔

(۴) اس کی یہ خصوصیت ہو کہ دین کی حقیقت و اصلیت اور اس کو قائم و دائم رکھنے کی فکر اور اس کی غیرت اس کے اندر اس سے بدرجہا زیادہ ہو جس قدر کسی کو اپنے گھرانہ، ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کی عزت و حرمت کے بارہ میں غیرت ہوتی ہے اور اس راہ میں محبوب سے محبوب شے اور عزیز سے عزیز ہستی کی پاسداری، کوئی تاویل و توجیہ، کسی طرح کا خوف یا طمع حائل نہ ہو سکتا ہو۔

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا اور مرضی کو عمل میں لانے اور ان کی تکمیل کا اس کے اندر بے پایاں جذبہ ہو اور آپ کے راستہ سے سر مو انحراف بھی اس کو گوارا نہ ہو اور اس سلسلہ میں کسی ملامت کا ڈر نہ ہو۔

(۶) اس کی خصوصیت یہ ہو کہ وہ دنیاوی جاہ و ثروت کا طالب نہ ہو اور نہ اس کو اپنے عیش و آرام کی فکر ہو، دولت دنیا اور لذت عیش کے معاملہ سے اس درجہ بے نیاز و یکسو ہو کہ سوائے اس کے قائد و ہادی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس کی کوئی دوسری مثال نہ ملتی ہو، اپنے یا اپنے خاندان

کے لیے کسی حکومت کے قیام اور اس کی توسیع و ترقی کا خواب بھی کبھی اس نے نہ دیکھا ہو جیسا کہ قریب ترین ممالک (روم و فارس) کے حکمراں خاندانوں کا قدیم وتیرہ رہا ہے کہ ان کی ساری مساعی خاندانی سلطنتوں اور بادشاہتوں کی تاسیس و توسیع کے لیے وقف رہی ہیں۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ان شرائط پر ہر طرح سے پورے اترے اور وہ ان تمام خصوصیات کے جامع تھے۔ اپنی خلافت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں اور آپ کی وفات کے بعد اپنے عہد خلافت میں آخری دم تک۔ اس طرح ثابت قدم رہے کہ کسی انکار کرنے والے یا شک کرنے والے کے لیے انکار یا شک کی گنجائش نہیں ہے اور آپ کی یہ خصوصیات بدیہی صورت میں اور تواتر کے ساتھ ثابت ہیں۔" (المرتضیٰ ص ۹۸ تا ۱۰۱)

حضرت ابوبکر کی شان میں عربی انداز کا یہ نثری قصیدہ، جو اردو کا روپ اختیار کر کے مولانا ندوی کے قلم کی زبان پر جاری ہو کر صفحۂ قرطاس پر آیا، نکات پر منحصر ہے۔ اور اس کی متذکرہ بالا عبارت کا اجمالی مفہوم یہ ہے کہ:۔

(۱) حضرت ابوبکر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اپنی زندگی کی آخری سانس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تابع اور فرمانبردار رہے اور آنحضرتؐ کو آپ کی ذات پر مکمل اعتماد اور بھروسہ تھا۔

(۲) یہ کہ آنحضرت صلعم نے اہم ارکان و اہم ترین ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے لیے آپ کو اپنا قائم مقام بنایا اور ایسے خطرناک مواقع پر آپ کو اپنے ساتھ رکھا، جس کے لیے اس شخص کا انتخاب کیا جاتا ہے جس پر مکمل اطمینان اور بھروسہ ہو

(۳) یہ کہ حضرت ابوبکر بعد وفات پیغمبرؐ اس وقت جبکہ دین کی روح اور اس کی

اصلیت کا چراغ جھلملا رہا تھا اور اس کے بجھ جانے کا خطرہ لاحق تھا، اور اس وقت جبکہ بڑے بڑے دل گردہ والے، ایمان و یقین کے پیکر اور پیغمبر اسلام کی طویل صحبت و رفاقت کا شرف رکھنے والے سہم رہے تھے، پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہے اور آپ نے ثبات و استقامت کی منزل میں انبیاے ماسبق کا کردار کیا۔

(۴) حضرت ابوبکر کے رگ و پے میں، اسلام کے صحیح ادراک اور اس کی حقیقت کی روح تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ جنگ کی حالت میں، صلح کی صورت میں، خوف و دہشت کی فضا میں، امن و سلامتی کی ساعتوں میں، اتحاد و یگانگت کی حالت میں آپ کے پیش نظر تھا۔

(۵) یہ کہ حضرت ابوبکر میں دین کی حقیقت و اصلیت اور اس کو قائم و دائم رکھنے کی فکری صلاحیت بدرجہا زیادہ تھی۔

(۶) یہ کہ حضرت ابوبکر میں آنحضرت صلعم کی منشا اور مرضی کو عمل میں لانے اور ان کی تکمیل کا بے پایاں جذبہ موجود تھا اور آپ کو جادۂ رسالت سے سرمو انحراف گوارا نہ تھا

(۷) بعد وفات پیغمبر قائد و ہادی کی حیثیت سے حضرت ابوبکر کے علاوہ دوسری مثال نہیں ملتی۔

پھر تحریر فرماتے ہیں:۔

۵۔۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کس طرح مکمل اعتماد تھا، اس کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ آپ نے انتہائی خطرات سے پُر سفر میں ان کو ساتھ لیا۔ یہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا سفر تھا۔" (المرتضیٰ ۱۰۱)

"اس کارنامہ (رفاقت سفر) کو قرآن کریم نے ذکر کر کے دوام عطا کر دیا۔"

"(اس وقت) دو ہی شخص تھے جن میں (ایک ابو بکر تھے) دوسرے (خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔" (سورہ توبہ۔ ۴۰) (المرتضیٰ ص ۱۰۲)

"یہ وہ مدح ہے جس میں حضرت ابو بکر کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔"

(المرتضیٰ ص ۱۰۲)

٥۔ حضرت ابو بکر کی بیعت کوئی اتفاقی بات نہ تھی، جس کو کہیں کہ بات بن گئی اور نہ کوئی سازش تھی، جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ کبھی کبھی اس طرح کی سازشیں کامیاب ہو جاتی ہیں، درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا جو غالب اور حکمت والا ہے طے کردہ معاملہ تھا۔ (المرتضیٰ ص ۱۴۰)

٥۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس وقت منصب خلافت پر فائز ہوئے جس وقت صحابہ رسول بلکہ پوری امت میں ان سے افضل اور ان سے زیادہ مہمات خلافت کا بار اٹھانے والا کوئی دوسرا نہیں رہ گیا تھا۔ (ص ۱۴۶)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ علیؑ سے قبل جو خلفا ہوئے وہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے (معاذ اللہ) افضل تھے۔

٥۔ تمام اور محدثین کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:۔ "ہم پیغمبروں کا گروہ (کسی مال کا کسی کو) وارث نہیں بناتا جو چھوڑ دیا وہ صدقہ ہوتا ہے۔" (ص ۱۴۷)

٥۔ باغ فدک کے معاملے میں حضرت فاطمہؑ کو حضرت ابو بکر سے شکوہ رہا، لیکن جب حضرت فاطمہؑ کی علالت نے شدت اختیار کی تو حضرت ابو بکر،

حضرت فاطمہؑ کی عیادت کے لیے گئے، اجازت طلب کی، حضرت علیؑ نے ان سے کہا کہ دروازہ پر ابو بکر کھڑے ہیں، اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں، اگر تم چاہو تو ان کو اجازت دے دو، حضرت فاطمہؑ نے فرمایا کہ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں؟ کہا ہاں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ حضرت ابو بکر اندر آئے، معذرت کی، گفتگو کی اور وہ (حضرت فاطمہؓ) ان سے خوش ہو گئیں۔

٥۔ مشہور ہے کہ حضرت علیؑ نے ضروری سمجھا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے احساسات و جذبات کا کسی درجہ لحاظ کریں۔ اس لیے حضرت ابو بکر کی بیعت نہیں کی پھر جب فاطمہ رضی اللہ عنہا چھ ماہ بعد انتقال کر گئیں تو حضرت علی نے بر سر عام بیعت کی (ص ۱۵۱)

٥۔ حضرت علی زندگی بھر حضرت ابو بکر کے اُن کی خلافت کے زمانہ میں ان کے معاون ان کے بہترین مشیر اور سچے خیر خواہ تھے (ص ۱۵۳ و ۱۵۴)

٥۔ حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت عمر کو خلافت کے لیے اس لیے نامزد کیا تھا کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ عمر فاروق میں قوت فیصلہ، مستقل مزاجی، اصابت رائے اور عقل و رائے کی پختگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

(ص ۱۶۳-۱۶۴)

٥۔ حضرت علیؑ نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کو حضرت عمر کی زوجیت میں دے دیا تھا۔ (ص ۱۷۶)

٥۔ جب حضرت عمر کی وفات ہو چکی تو حضرت علیؑ آئے اور حضرت عمر کے چہرے کو کھولا پھر کہا:۔ اے ابو حفص آپ پر اللہ کی رحمتیں ہوں، اللہ کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے علاوہ

کوئی ایسا نہیں ہے جس کے نامۂ اعمال کے ساتھ میں اللہ کے سامنے جانا پسند کروں۔ (ص ۱۹۶)

۰۔ حضرت علیؑ، حضرت عمر کی وفات پر رو رہے تھے، ان سے پوچھا گیا کہ کیوں رو رہے ہیں تو فرمایا کہ عمر کی موت پر رو رہا ہوں۔ عمر کی موت اسلام میں ایک ایسا شگاف ہے، جو قیامت تک پُر نہیں کیا جاسکے گا (المرتضیٰ ص ۱۹۶)

۰۔ جب عثمان کی بیعت ہونے لگی تو حضرت علیؑ نے بھی بیعت کی۔ پہلے کی یا آخر میں اس میں اختلاف ہے۔ (ص ۲۰۲)

۰۔ جب رقیہ کا انتقال ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دوسری صاحبزادی ام کلثوم کا عقد بھی حضرت عثمان سے کر دیا اسی لیے ان کا لقب ذوالنورین تھا۔ (ص ۲۰۳) وغیرہ وغیرہ

عقائدِ ملتِ جعفریہ کے خلاف یہ تمام باتیں جنھیں مولانا ندوی نے تحریر فرما کر مباحثات و مناظرات کا در باز کیا ہے، ایسی ہیں جسے شیعہ قوم برداشت کرنے سے قاصر ہے۔

اس لیے

ضرورت اس امر کی ہے کہ مولانا ندوی کو نئے انداز و نئے ڈھنگ سے جواب دیا جائے اور جواب کے ساتھ مولانا ندوی صاحب کی خدمت میں ان کے ممدوحینِ (خلفاء) کی سیرت اور کردار کا (پیدائش سے وفات تک کے حالات پر مبنی) وہ تاریخی آئینہ پیش کیا جائے جس کی ضرورت ہے تاکہ موصوف کو وہ سب کچھ نظر آجائے جو تاریخ کی کتابوں میں ہونے کے باوجود ان کی نظروں سے دانستہ یا نادانستہ طور پر اوجھل ہے۔

اس اہم موضوع پر خامہ فرسائی سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ خلفاء کو اہمیت و افضلیت عطا کرنے میں مورخین و محدثین کا طریقۂ کار کیا تھا اور کن حالات کے تحت خلفاء کے حق میں فضیلتوں، حدیثوں اور روایتوں کا بھی سرمایہ تاریخ کی کتابوں میں جمع ہوا۔ جو اسلام اور اہل اسلام کے لیے مصیبت بن گیا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں حدیثوں کے بیان کرنے کا جو طریقہ رائج تھا وہ زبانی تھا۔ باقاعدہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ عہد معاویہ میں شروع ہوا جب امیر شام نے عبید بن شریہ کو جو زبانی حدیثوں کا راوی تھا، صنعاء سے بلا کر کاتبوں اور محرروں کے ذریعہ اس کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو قلم بند کرایا۔ جس کے نتیجہ میں کئی کتابیں عالمِ وجود میں آئیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام "کتاب الملوک واخبار الماضیین" ہے جو معاویہ کے حکم سے لکھی گئی کتابوں میں غالباً سب سے پہلی کتاب ہے۔ عبید کے بعد عوانہ بن الحکم (المتوفی ۱۴۷ھ) کا نام قابل ذکر ہے جو اخبار و انساب کا ماہر تھا۔ اس نے عام کتابوں کے علاوہ خاص بنی امیہ اور معاویہ کے حالات پر ایک کتاب لکھی جو پہلوی زبان میں تھی اور جس کا ترجمہ عربی زبان میں ۱۱۷ھ میں ہشام بن عبدالملک کے دور میں ہوا۔

۱۴۳ھ میں جب تفسیر، فقہ اور حدیث کی تدوین شروع ہوئی تو دیگر علوم کے ساتھ تاریخ و رجال میں بھی مستقل کتابیں لکھی گئیں اور محمد بن اسحاق (المتوفی ۱۵۱ھ) نے سیرت نبوی پر ایک کتاب منصور عباسی کی تحریک پر لکھی جو غالباً فن تاریخ کی پہلی کتاب ہے۔

اس کے بعد تاریخ بتدریج ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی اور بڑے بڑے نامور مورخ پیدا ہوتے رہے، ان مورخین میں جن لوگوں نے خاص طور پر صحابہ کے حالات قلم بند کیے ان میں نصر بن مزاحم کوفی، مصنف کتاب الجمل، سیف بن

عمر الاسدی مصنف کتاب فتوح الکبیر، معمر بن راشد کوفی مصنف کتاب المغازیؒ عبداللہ بن سعد زہری مصنف کتاب فتوحات خالد بن ولید، ابوالبختری وہب بن وہب مصنف کتاب صفت النبی وفضائل انصار، ابوالحسن علی بن محمد عبداللہ مدائنی، احمد بن حارث خزار (مدائنی کا شاگرد) عبدالرحمٰن بن عبیدہ مصنف مناقب قریش، عمر بن الشبۃ مصنف کتاب امرار الکوفہ وامرار البصرہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اگرچہ ان مصنفین کی کتابیں اب ناپید ہوچکی ہیں لیکن دیگر کتابیں جو اس زمانے یا اس سے قریب تر زمانے میں لکھی گئیں ان میں بہت کچھ سرمایہ ان کتابوں کا محفوظ ہے۔ مثلاً عبداللہ بن مسلم قتیبہ کی کتاب المعارف۔ احمد بن داؤد ابوحنیفہ دینوری (المتوفی ۲۷۹ھ) کی کتاب اخبار الطوال۔ محمد بن سعد واقدی (المتوفی ۲۳۰ھ) کی کتاب طبقات ابن سعد (جو بارہ جلدوں میں ہے) محمد بن ابی یعقوب بن واضح کی کتاب تاریخ یعقوبی۔ احمد بن یحیٰ بلاذری کی کتاب فتوح البلدان اور انساب الاشراف۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (المتوفی ۳۱۰ھ) کی کتاب تاریخ طبری (جو تیرہ جلدوں میں ہے) علی بن الحسین المسعودی (المتوفی ۳۴۶ھ) کی کتاب مروج الذہب اور کتاب الاشراف التنبیہ وغیرہ۔ یہ تصانیف جس دور کی ہیں وہ متقدمین کا دور کہلاتا ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے متوسطین کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ابن اثیر، سمعانی، ذہبیؒ ابوالفدا، نویری اور سیوطی وغیرہ نے نام پیدا کیا۔ مگر ان لوگوں میں خاص کمی یہ تھی کہ تاریخ میں اضافہ کے بجائے انھوں نے جو طریقہ کار اختیار کیا وہ یہ تھا کہ متقدمین میں سے کسی کی تصنیف سامنے رکھ لی اور اس میں تغیرات و اختصار پیدا کر کے اس کی ہیئت بدل دی لیکن اس طریقۂ کار کے باوجود ان

کتابوں کو عوامی حلقہ میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی اور تاریخ ابن اثیر نے وہ شہرت و مقبولیت حاصل کی کہ اکثر قدما رکی تصنیفیں ناپید ہو گئیں۔ غرضکہ ابن اثیر کے بعد جو مورخین ابھرے انھوں نے بھی اپنی کتابوں کا ماخذ ابن اثیر کی کتاب کو قرار دیا۔ لیکن اس فہرست میں ابن خلدون کا نام شامل نہیں ہے کیونکہ اس کا انداز سب سے الگ ہے۔

بہرحال مختصر یہ کہ اموی اور عباسی عہد میں احادیث اور فقہ کی اشاعت بکثرت ہوئی اور خلفائے ثلاثہ کی شان میں جھوٹی حدیثوں اور غلط روایتوں کی بنیاد پر خوب خوب کتابیں لکھی گئیں اور چونکہ بنی امیہ اور بنی عباس کے حکمرانوں نے طاقت اور دولت کا استعمال کر کے خاص توجہ کے ساتھ کتابیں تصنیف کرائیں اس لیے ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں خلفائے ثلاثہ، بنی امیہ اور بنی عباس کے لیے ان کی فضیلت میں کیا کچھ نہ لکھا ہوگا۔ جب کہ یہ طے شدہ بات ہے کہ معاویہ کی حکومت کی بنیاد حضرت عثمان کی خلافت پر تھی۔ حضرت عثمان کی خلافت حضرت عمر کی مرہون منت تھی، حضرت عمر کی خلافت حضرت ابوبکر کی نوازشوں کا نتیجہ تھی اور خود حضرت ابوبکر کی خلافت سقیفہ بنی ساعدہ میں دھاندلی اور بے ایمانی کا ماحصل تھی۔ چنانچہ حق فروش اور بے ضمیر محدثین اور مورخین نے دنیاوی منفعت کے لیے غلط، لغو، اور مہمل حدیثوں سے کتابوں کے دامن کو بھر دیا اور ہزاروں کی تعداد میں جعلی اور فرضی حدیثیں قلم کے ذریعہ استحکام پاگئیں۔

معاویہ کے دور استبداد میں یہ ناممکن تھا کہ خلفار کی شان کے خلاف کوئی ایک حرف بھی اپنی زبان پر لاتا، اگر وہ ایسا کرتا بھی تو اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جاتی اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جاتے، اس کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں چلا دی جاتیں۔ یہی وہ خاص وجہ تھی کہ خلفار کے لیے تاریخ کا دامن جعلی حدیثوں اور غلط

روایتوں سے چھلک پڑا۔

چنانچہ امام بخاری نے جب اپنے دور میں صحیح حدیثوں کو جمع کرنا چاہا تو کئی لاکھ حدیثوں میں سے اپنی جامع میں کل ۷۳۹۲ حدیثوں کو جگہ دے سکے اور اگر ان میں سے مکررات کو علاحدہ کر دیا جائے تو مجموعی طور پر ۲۷۶۱ حدیثیں باقی رہ جاتی ہیں۔ فرضی اور بے بنیاد حدیثوں کے اس طوفان نے اسلام اور اس کے مقصد کو جو نقصان عظیم پہنچایا اس کی تلافی پھر ممکن نہ ہو سکی۔ کیونکہ ان فرضی حدیثوں میں سے بہت سی مقبول ہو کر رواج پا گئیں جن کی وجہ سے ہزاروں اقوال بے سبب پیغمبر کی طرف منسوب ہو گئے اور امام ابو حنیفہ کے دور میں حدیثوں کا جو دفتر تیار ہوا وہ لغویات، مہملات اور اغلاط سے پر تھا۔

محدثین کا کہنا ہے کہ امام مالک نے جب مؤطا لکھی تو اس وقت اس میں احادیث کی تعداد دس ہزار تھی لیکن تحقیق کے بعد یہ تعداد صرف چھ سات سو رہ گئی۔

امام شافعی کا کہنا ہے کہ ارباب معرفت کے نزدیک صحیح حدیثیں بہت ہی کم تعداد میں ہیں، کیونکہ حضرت ابو بکر نے جو حدیثیں رسول اللہ سے روایت کی ہیں ان کی کل تعداد سترہ ہے۔ عمر بن خطاب کی روایتوں سے پچاس سے زیادہ حدیثوں کا ثبوت نہیں ملتا اور یہی حال عثمان کا بھی ہے۔

اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بھی بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو حاکم کے نزدیک بالکل درست ہیں لیکن ائمہ احادیث کے نزدیک غلط اور مہمل ہیں۔ اور یہی نوعیت ان حدیثوں کی بھی ہے جنھیں ابو نعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اور تقریباً یہی صورت خطیب بغدادی، ابوالفضل، ابو موسیٰ، ابن عساکر اور حافظ عبدالغنی کی پیش کردہ حدیثوں کی بھی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے بھی فرمایا ہے کہ ابو نعیم، خطیب بغدادی، ابوالفضل،

ابو موسیٰ مداینی اور حافظ عبدالغنی وغیرہ جو حدیثوں کے امام تھے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ خلفاء اور صحابہ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے۔

(سیرۃ النبی ص ۳۹)

معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان چوں کہ اہل سنت کے دینی پیشوا اور مذہبی مقتدا تھے اس لیے اس مسلک کے راوی ان کے فضائل میں بے دھڑک غلط اور فرضی روایتیں اور حدیثیں بیان کرتے گئے اور علماء انھیں آنکھ بند کر کے اپنی کتابوں میں جمع کرتے گئے۔

غلط حدیثیں وضع کرنے میں ابو ہریرہ سب پر بھاری تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس حدیثیں ڈھالنے کی آٹومیٹک مشین تھی۔ چنانچہ صرف تقی ابن مخلد کی مسند میں ان کی بیان کی ہوئی حدیثوں کی تعداد پانچ ہزار تین سو بتائی گئی اور بخاری کا کہنا ہے کہ ابو ہریرہ سے آٹھ سو علماء نے حدیثیں روایت کی ہیں چنانچہ جو حدیثیں نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی وغیرہ کے یہاں پائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر مبالغہ آرائی پر منحصر ہیں اور خلفاء کے فضائل میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

جلیل القدر سنی عالم محمد بن عقیل کا کہنا ہے کہ امام حسنؑ سے صلح کے بعد معاویہ نے اپنے ہر گورنر، ہر حاکم اور ہر والی کو یہ فرمان جاری کر دیا تھا کہ جو شخص حضرت علیؑ کے فضائل اور ان کی خوبیاں بیان کرے گا، حکومت اس سے بری الذمہ رہے گی۔ چنانچہ اس فرمان کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں اور دیہاتوں کے واعظ اور خطیب منبروں سے حضرت علیؑ پر تبرا کرنے لگے۔ اس نئی مصیبت اور افتاد میں سب سے زیادہ کوفہ کے لوگ مبتلا ہوئے، کیونکہ وہاں شیعوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مستزاد یہ کہ معاویہ نے ان لوگوں پر زیاد ابن سمیہ کو گورنر کی حیثیت سے مسلط کر دیا۔ یہ آل رسول

کا جانی دشمن، بد ترین مخالف اور کوفہ کے شیعوں سے بخوبی آگاہ اور واقف تھا چنانچہ اس نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ اس نے ہر شیعہ کو گرفتار کیا اور اسے قتل کیا۔ قتل ہونے سے جو بچ گئے ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیے گئے یا اُن کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں چلا دی گئیں اور ہزاروں افراد کو درختوں پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ لاکھوں بے گھر اور آوارہ وطن کر دیے گئے۔ ایسے اندوہ ناک اور خونچکاں ماحول میں بھلا کس کی مجال تھی جو خلفار کی شان کے خلاف زبان کھولنے کی جسارت کرتا۔

معاویہ نے اپنے گورنروں اور والیوں کے نام یہ فرمان بھی جاری کیا کہ حضرت علیؑ کے کسی بھی شیعہ کی بیان کی ہوئی کسی بھی روایت یا حدیث کے بارے میں کسی گواہی کو قبول نہ کیا جائے اس کے برعکس جو لوگ حضرت عثمان کے فضائل میں حدیثیں بیان کریں انھیں حکومت کی جانب سے خصوصی مراعات اور عزت دی جائے اور ان کی فہرست مرتب کر کے ہمارے پاس ارسال کی جائے تاکہ انھیں نوازا جا سکے۔ الغرض یہ شاہی فرمان جہاں جہاں پہنچا اسے خصوصی اہتمام کے ساتھ مشتہر کیا گیا اور حضرت عثمان کی شان میں حدیثیں جمع کرنے کے لیے جگہ جگہ کاتب مقرر کیے گئے۔

اس فرمان کا اثر یہ ہوا کہ دولت و ثروت کے بھوکے راوی زمین سے پیدا ہونا شروع ہو گئے اور ہر کاذب انسان راوی بن گیا۔ چنانچہ لوگ حضرت عثمان کی شان میں بے سر و پیر کی حدیثیں بیان کرتے اور کاتبوں سے انھیں لکھوا کر معاویہ کے پاس بھیج دیا جاتا اور وہاں سے انعامات و جاگیروں کے پروانے جاری ہو جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت ہی کم وقفہ میں عثمان پر حدیثوں کا ایسا زبردست انبار اور ڈھیر لگ گیا کہ خود معاویہ بھی پریشان ہو گیا اور اسے

یہ فرمان جاری کرنا پڑا کہ حضرت عثمان پر حدیثیں زیادہ ہو چکی ہیں لہذا اس سلسلے کو روک کر راویوں کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی شان میں حدیثیں بیان کریں اور اس بات کا خاص لحاظ رکھیں کہ جیسی حدیثیں حضرت علیؑ کے لیے رسول اللہ صلعم سے مروی ہیں بالکل ویسی ہی حدیثیں شیخین کے لیے بیان کی جائیں کیونکہ یہ تدبیر میرے لیے باعث مسرت ہے۔

اس فرمان کے بعد حضرت عثمان کی شان میں حدیث سازی کا سلسلہ بند ہوا اور حضرات ابوبکر و عمر کے لیے راویوں کی زبان پر احادیث و روایات کی فصل اُگنے لگی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے جعلی اور فرضی حدیثوں اور روایتوں کے کھلیان لگنا شروع ہو گئے۔ اور ایسی ایسی خود ساختہ اور خود رَو حدیثیں عالم وجود میں آ گئیں جن کی حیثیت چانڈو خانے کی گپ سے زیادہ قطعی نہیں ہے۔

یقیناً یہ وہ سیلاب تھا جس میں بڑے بڑے علمار، حفّاظ اور مذہبی علوم کے علمبردار بہہ گئے۔ مستزاد یہ کہ یہی حدیثیں مدرسوں میں بھی رائج کر دی گئیں اور انھیں کی روشنی میں طلبار کو درس دیا جانے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو سچ تھا وہ جھوٹ بن گیا اور جو جھوٹ تھا اسے سچ مان لیا گیا۔ مختصر یہ کہ معاویہ کی اس کوشش نے خلفائے ثلاثہ کو نہ صرف فضیلتوں کے آسمان پہ پہنچا دیا بلکہ کہیں کہیں پر انھیں رسول اللہ سے بھی افضل بنا دیا۔

دور حاضر میں یہی طریقۂ کار سعودی حکومت کا ہے جس کے ٹکڑوں پر پلنے والے حق فروش و ضمیر فروش علمار معاویہ کی "حدیث مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹیڈ" کی بنی ہوئی جعلی اور فرضی حدیثوں کے ذریعہ آل محمدؐ کے تقدس کو پامال کرنے کی جدو جہد میں مصروف ہیں اور ان کا بس نہیں چلتا کہ کب اور کس وقت فضائلِ آلِ محمدؐ کو کتابوں سے خارج کر کے وہ جگہ خلفائے ثلاثہ کی فضیلتوں سے بھر دیں جو درحقیقت

کچھ بھی نہیں ہیں۔

یقیناً یہ ایک ایسا خطرناک منصوبہ ہے جس کی تکمیل کے بعد اصل اسلام کی جگہ صرف عبدالوہاب کا خود ساختہ اسلام رہ جائے گا اور ہماری آنے والی نسلیں آل محمدؐ اور اسلام محمدؐ کے بارے میں وہ سب کچھ بھول جائیں گی جو انھیں یاد رکھنا چاہیے۔ اور یہی وہ احساس ہے جس کے تحت مجھے "المرتضیٰ" کے جواب میں قلم اٹھانا پڑا ورنہ یہ حقیقت ہے کہ میں ایک شاعر ہوں اور صرف شاعر، دینی تالیفات کا میدان میرا نہیں ہے۔

چنانچہ اسی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اپنی اس کتاب میں وہی کچھ پیش کیا ہے جو اس سے قبل کی کتابوں میں موجود ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس تالیف میں میرا اپنا ذاتی قلمی سرمایہ کچھ نہیں ہے میری محنت صرف اتنی ہی ہے کہ میں نے مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے تاریخی جواہر پاروں کو سمیٹ کر مولانا ابوالحسن ندوی کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین کی گرانقدر رائے پر منحصر ہے۔

میں نے اپنی اس تالیف میں عربی اور فارسی کی اصل عبارتوں کے بجائے صرف ترجمہ اس لیے پیش کیا ہے کہ ہمارے وہ نوجوان جو عربی اور فارسی نہیں جانتے اس کتاب سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

آخر کلام میں یہ وضاحت بھی کر دوں کہ میں اپنی اس کتاب میں کسی فرقہ کے کسی مسلمان سے مخاطب نہیں ہوں۔ بلکہ میرے مخاطب صرف مولانا ابوالحسن صاحب ندوی اور وہابی مسلک سے تعلق رکھنے والے حضرات ہیں اور میری یہ کتاب صرف "المرتضیٰ" میں پیش کیے گئے اختلافی مسائل

کے جواب میں ہے اور بس۔۔۔

والسلام

فروغ کاظمی

۲۶ر جنوری ۱۹۹۰ء

قطعہ

کئی ایسے منافق بھی اسلام میں ہیں جنھیں اپنی بزم رسالت میں آکر
نبی نے بلایا، بلا کر بٹھایا، بٹھا کر اٹھایا، اٹھا کر نکالا
مگر ان کی جھوٹی فضیلت میں ندوی نے جھوٹی حدیثوں کا لے کر سہارا
جو چاہا وہ "المرتضیٰ" میں بھی لکھا، نہ سوچا، نہ سمجھا، نہ دیکھا، نہ بھالا

فروغ کاظمی

باب اوّل

ابو بکر بن ابو قحافہ

شجرہ

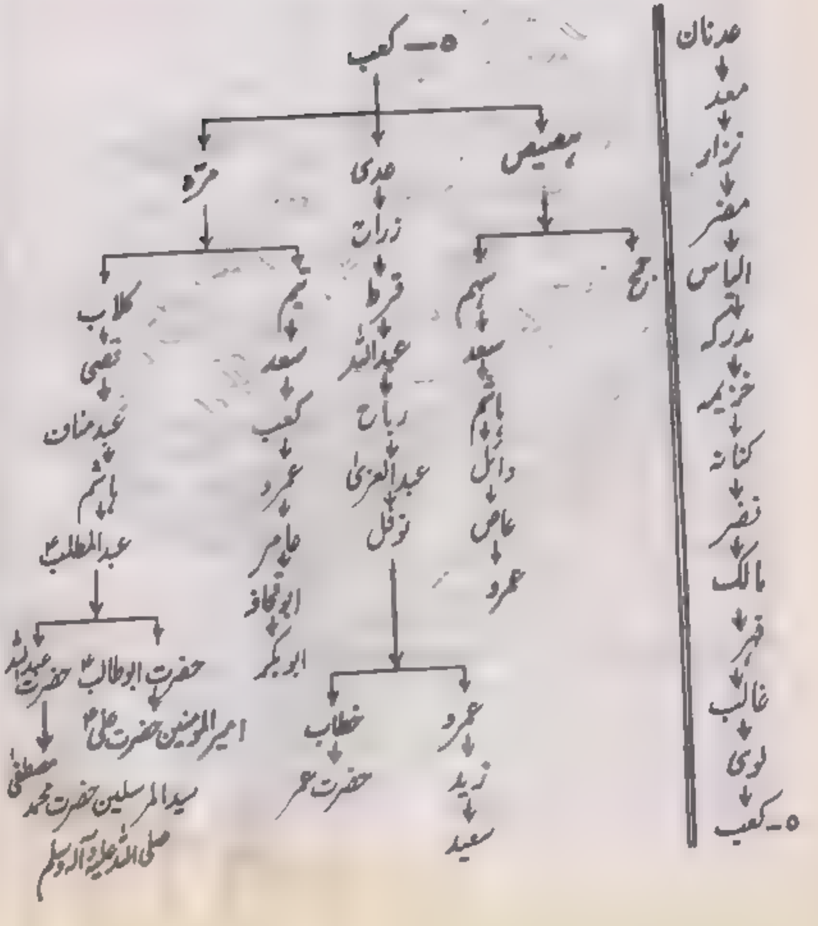

قریش کون؟

حضرات شیخین یعنی حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کو خاندان یا قبیلۂ قریش میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے۔ لہذا پہلے یہ تحقیق ضروری ہے کہ درحقیقت ان کا تعلق خاندان قریش سے تھا بھی یا نہیں۔

علم انساب کے ماہرین اور علم تاریخ کے محققین کے درمیان قریش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان میں ایک گروہ کا خیال ہے صرف قصی ابن کلاب کی نسل اور اولاد ہی قریش کہلائے جانے کی مستحق ہے جبکہ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جناب قصی کے بزرگ فہر کی پوری نسل قریش ہے۔

اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ہم جناب قصی کی نسل کو قریش تسلیم کرتے ہیں تو ان کے بھائیوں اور بزرگوں کو قریش سے خارج کرنا ہوگا۔ اور اگر قریش فہر کی نسل قرار پائے گی تو اس سلسلے کے جملہ افراد قریش تسلیم کیے جائیں گے یا ایسے یوں واضح کر دوں کہ زید نے اپنی ذاتی کمائی سے کوئی جائداد اپنے نام خریدی۔ تو اس جائداد کے مالک اور وارث زید یا ان کی اولادیں ہوں گی۔ بصورت دیگر اگر کوئی جائداد زید کے آبار و اجداد کی ہے اور اس کی نوعیت موروثی ہے تو اس سلسلے کے تمام افراد اس جائداد کے حقدار، وارث یا مالک ہوں گے ورنہ نہیں۔ اسی طرح اگر جناب قصی، قریش قرار پاتے ہیں تو صرف قصی کی اولادیں قریش قرار

پائیں گی۔ قصی کے باپ دادا یا خاندان کے دیگر افراد قریش نہیں ہو سکتے۔

محققین کے گروہ اوّل میں علامہ عبد ربہ کا کہنا ہے کہ قصی ابن کلاب نے چونکہ اہل عرب کو ایک مرکز پر جمع کیا اس لیے وہ قریش کہلائے۔ تقرّش کے معنی ایک مرکز پر جمع کرنا ہے اور قصی کو جمع کرنے والا کہتے ہیں (عقد الفرید ج ۲ ص ۲)

ابن اثیر جزری کا قول ہے کہ جب عرب کو قصی نے جمع کیا تو انھیں لوگ قریش کہنے لگے کیونکہ تقرش کے معنی اچھی طرح جمع ہونا ہے اور دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ جب قصی ابن کلاب حرم کے سردار ہوئے اور انھوں نے بہتر د نمایاں کارکردگی انجام دی تو لوگ ان کو قرشی کہنے لگے اور پہلی مرتبہ قصی کا یہ نام رکھا گیا۔ یہ لفظ اجتماع سے نکلا ہے یعنی قصی میں اچھی صفتیں جمع تھیں، اس لیے انھیں قریش کہا گیا۔ (تاریخ کامل ج ۲ ص ۳۸)

طبری کا کہنا ہے کہ جب قصی حرم (مکہ معظمہ) میں آکر مقیم ہوئے اور اس پر غالب آئے تو وہاں بہت اچھے کام کیے اس لیے لوگ انھیں قرشی کہنے لگے لہٰذا وہی پہلے شخص ہیں جنھیں یہ نام دیا گیا۔ (تاریخ طبری طبع مصر ج ۲ ص ۱۸۸)

علامہ شبلی نے اس واقعہ کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب اول ان ہی کو ملا۔ چنانچہ علامہ عبد ربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چوں کہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں کیونکہ تقرش کے معنی جمع کرنے کے ہیں اسی بنا پر اُن کو مجمّع بھی کہتے ہیں۔ قصی ابن کلاب کا تذکرہ تفصیل سے طبقات ابن سعد جزو اول مطبوعہ لندن ۱۳۲۲ھ میں ص ۳۶ تا ۴۲ موجود ہے۔ قریش کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اور قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا اس لیے وہ قریش کہلائے بعض کہتے ہیں کہ ایک مچھلی کا نام ہے جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے۔ چونکہ قصی بہت بڑے سردار تھے اس لیے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی گئی۔" (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۱۹)

طبری نے خاندان بنی امیہ کے مشہور حکمراں عبد الملک بن مروان کے لیے لکھا ہے کہ اس نے محمد بن جبیر سے پوچھا کہ قریش کا یہ نام کب سے پڑا۔ اس نے کہا کہ جب سے لوگ الگ الگ رہنے کے بعد حرم میں اکٹھا ہو گئے کیونکہ تقرش کے معنی تجمّع ہیں۔ اس جواب پر خلیفہ عبد الملک بن مروان نے کہا کہ میں نے تو آج تک یہ نہیں سنا بلکہ یہ سنتا آرہا ہوں کہ قصی ہی کو قریش کہتے ہیں اور ان سے پہلے کسی کا نام قریش ہوا ہی نہیں۔ (طبری ج ۲ ص ۱۸۸-۱۸۹)

عبد الملک کے انکار کی یہ روایت فتح الباری فی شرح بخاری ج ۱۴ ص ۳۰۲ اور در منثور ج ۶ ص ۳۹۸ میں بھی بیان ہوئی ہے اس کے علاوہ مفسرین نے بھی لکھا ہے جس سے یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ قریش کے بارے میں عبد الملک بن مروان کا قول قصی ابن کلاب کے لیے درست ہے۔

ایسی صورت میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر دونوں ہی دائرۂ قریش سے خارج ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ بہ اعتبار شجرہ یہ دونوں حضرات قصی ابن کلاب کی اولادوں یا نسل میں نہیں آتے۔ لہٰذا اس اخراج کی بنا پر حضرات شیخین قریش کی فضیلت اور شرف سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ کیونکہ تمام عرب میں قریش ہی کو سب سے زیادہ عزت اور توقیر حاصل تھی اور وہی عربوں کے سردار تسلیم کیے جاتے تھے۔ باقی تمام قبیلے قریش کے ماتحت اور فرماں بردار تھے۔

قریش کے بارے میں رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ لوگوں کی خوبی اور بھلائی صرف قریش ہیں۔ بغیر قریش کے لوگ زندہ نہیں رہ سکتے، قریش کو وہ فضیلتیں ملی ہیں جو کسی کو بھی میسر نہیں ہوئیں۔ قریش اللہ کے خاص اور پسندیدہ بندے ہیں۔ اگر کوئی قبیلہ قریش کی مخالفت کرے گا تو وہ شیطان کا گروہ ہوگا اور جو شخص قریش کی ذلت و خواری چاہے گا اللہ اس کو ذلیل و خوار کرے گا۔

(خلاصہ کنز العمال ج ۶ ص ۱۹۸ تا ۲۰۰)

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کا تعلق قریش سے نہیں ہے، ان کی خلافتوں کا محل خود بخود ڈھیر ہو جاتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے سواد اعظم کا یہ دعوی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ خلیفہ قریش سے ہی ہوگا اور خلافت صرف قریش میں ہی محدود رہے گی، ظاہر کرتا ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرات شیخین کا یہ کہنا کہ وہ قریش ہیں غلط بیانی پر منحصر تھا اور ان کا یہ اقدام خلافت ان تمام ارشادات پیغمبر کی نفی میں تھا جو زبان پیغمبر پر جاری ہوئے۔ مثلاً،

o — میری خلافت اور حکومت کے حقدار صرف قریش ہیں، جب تک کہ وہ اللہ کی نافرمانی نہ کریں۔

اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافتِ رسول کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ اول قریشی ہونا دوسرے معصوم ہونا۔ یعنی کسی بھی حالت میں اللہ کی نافرمانی نہ کرنا۔

o — اس امت (اسلام) کی حکومت اور امارت صرف قریش ہی میں رہے گی اور جو شخص قریش سے دشمنی رکھے گا اللہ اس کو منہ کے بل جہنم میں جھونک دے گا۔

o — میرے بعد دین و دنیا کے حاکم بارہ ہوں گے اور وہ سب قریش ہی ہوں گے

o — دین اس وقت تک غالب رہے گا جب تک اس میں امامت قائم رہے گی اور اماموں کی تعداد بارہ ہوگی، جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔ اس کے بعد فتنہ و فساد پھیلے گا اور قیامت آئے گی۔

(کنز العمال ج ۶ ص ۱۹۸ تا ۲۰۲ و ج ۷ ص ۱۳۸ تا ۱۴۰، کتاب الفتن ص ۹۳۸، صحیح مسلم مطبوعہ دہلی ج ۲ ص ۱۱۹، جامع ترمذی ص ۲۶۹، مشکوٰۃ شریف ج ۲ ص ۹۳، سنن ابی داؤد ص ۵۸۸، صحیح بخاری پ ۱۴، پ ۲۹ باب مناقب، تفسیر در منثور، تفسیر معالم التنزیل اور جامع الاصول ج ۴)

قریش کی ابتدا چوں کہ قصی ابن کلاب کی ذات خاص سے وابستہ ہے اس لیے جناب قصی سے قبل ان کے خاندان میں جتنے بھی لوگ شامل ہیں انھیں قریش نہیں قرار دیا جا سکتا البتہ جناب قصی یا ان کی نسل میں عبد مناف، عبد المطلب، حضرت عبد اللہ، حضرت ابو طالبؑ، حضرت رسول خداؐ، حضرت علیؑ یا ان کی اولاد ہیں جو درحقیقت قریش ہیں ان سے انکار بھی ناممکن ہے۔ لہٰذا حشر میں جو حال شیخین کی غاصبانہ خلافت کا ہوگا وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

اس کے برعکس کچھ مورخین کا خیال یہ بھی ہے کہ قریش صرف قصی ابن کلاب کی اولادوں میں منحصر نہیں ہیں بلکہ قصی کے بزرگ فہر ابن مالک کی پوری نسل قریش ہے۔

عقل سلیم اور دلائل کی روشنی میں ان مورخین کا یہ خیال قابل قبول اس لیے نہیں ہو سکتا کہ قصی ابن کلاب کا قریش ہونا ثابت ہے پھر بھی ہم اگر اس بے دلیل بات کو تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیں تو حضرات شیخین یعنی حضرت ابو بکر اور حضرت عمر خاندان رسالت سے کوسوں دور ہیں۔ اور حضرت ابو بکر کا شجرہ آٹھویں پشت میں اور حضرت عمر کا شجرہ نویں پشت میں کعب ابن لوی سے ملتا ہے جو رسول خداؐ کے بھی بزرگ تھے۔ اس کے برعکس حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔ اس حیثیت سے خلافت پر حضرت علیؑ کا حق زیادہ تھا نہ کہ حضرات شیخین کا۔

ابوبکر خلیفہ تھے یا خالفہ؟

نہایہ ابن اثیر میں ہے کہ ایک روز ایک عرب نے حضرت ابوبکر سے دریافت کیا کہ کیا آپ خلیفہ ہیں؟ جواب میں آپ نے فرمایا کہ میں خلیفہ نہیں خالفہ ہوں۔

○۔ صاحب نہایہ خالفہ کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ خالفہ وہ ہوتا ہے جس میں کوئی خیر و خوبی نہ ہو۔

○۔ قاموس میں خالفہ کے معنی سفیہ کے ہیں۔

(اصحاب ثلاثہ ج ۱ ص ۵۵ بحوالہ نہایہ ابن اثیر)

○۔ لغات کشوری میں سفیہ کے معنی میں "نادان، کم عقل اور بے وقوف" تحریر ہے۔

لہذا کسی وہابی کا یہ کہنا کہ حضرت ابوبکر فہم و فراست کے حامل تھے، محض خوش فہمی، خوش اعتقادی اور ابوبکر نوازی کی دلیل ہے۔

پیدائش

تاریخ کی کسی کتاب میں میری نظر سے آج تک ایسی کوئی روایت نہیں گزری جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت ابوبکر کی تاریخ پیدائش کیا ہے۔ بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ آپ، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوا دو برس یا تین برس چھوٹے تھے اور آپ ۵۷۲ء میں متولد ہوئے۔ لیکن بخاری (باب الہجرت)

کی ایک روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ کو روانہ ہوئے تو آگے اونٹ پر حضرت ابو بکر سوار تھے کیونکہ یہ بوڑھے تھے اور انھیں لوگ پہچانتے تھے۔

بہر حال حضرت ابو بکر چھوٹے تھے یا بڑے، اس سے آپ کی فضیلت میں کوئی اضافہ ممکن نہیں ہے۔ یہاں تو سوال تاریخ پیدائش کا ہے۔ کہ ملت مسلمہ خلیفہ اول کی تاریخ پیدائش سے بیگانہ کیوں ہے؟ اس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکر کی شخصیت ایسی تھی ہی نہیں کہ اس دور کے راوی یا اسلام کے ابتدائی دور کے محققین و مورخین آپ کی تاریخ ولادت کی طرف متوجہ ہوتے اور اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو میں مولانا ابو الحسن صاحب ندوی سے گذارش کروں گا کہ وہ ثبوت کے ساتھ اپنے اس دینی پیشوا اور مذہبی مقتدا کی تاریخ پیدائش کی وضاحت فرمادیں۔

ابو بکر کی وجہ تسمیہ اور نام

مصر کے مشہور مصنف محمد حسین ہیکل کی عربی کتاب "حضرت ابو بکر" کے مترجم محمد احمد پانی پتی ابو بکر کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"بکر عربی میں جوان اونٹ کو کہتے ہیں۔ چونکہ ابو بکر کو اونٹوں کی پرورش و پرداخت کا بے حد شوق تھا اور آپ اونٹوں کے علاج و معالجہ میں بھی مہارت رکھتے تھے اس لیے آپ کو لوگوں نے ابو بکر (اونٹ کا باپ) کہنا شروع کر دیا اور آپ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔"

(حضرت ابو بکر ص ۲۵)

حضرت ابو بکر کا نام ان کے زمانۂ کفر میں عبد الکعبہ تھا۔ اسلام قبول کرنے

کے بعد عبد اللہ ہوا لیکن آپ کی کنیت نے آپ کے کسی نام کو ابھرنے نہ دیا اور آج ساری دنیا آپ کو ابو بکر کے ہی نام سے جانتی ہے۔

حلیہ

عبد الرحمٰن بن حافظ عمر الدین نے اپنی کتاب "ابو بکر کی سوانح عمری" میں حضرت ابو بکر کا حلیہ یوں تحریر فرمایا ہے:

"حضرت ابو بکر کا رنگ سفید زردی مائل تھا۔ بدن چھریرا اور پیشانی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ رخسار اس قدر پچکے تھے کہ چہرے کی سب رگیں ابھری رہتی تھیں داڑھی ہر وقت مہندی اور خضاب سے رنگین رہتی تھی اور سب سے خاص بات یہ تھی کہ ہاتھ کی انگلیوں پر بال بالکل نہیں تھے۔"

(سوانح عمری حضرت ابو بکر مولفہ عبد الرحمٰن ص ۴۴)

باعتبار علم قیافہ آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہونا بغض اور کینہ پروری کی علامت ہے اور ہاتھ کی انگلیوں پر بال نہ ہونا بزدلی اور نامردی کی دلیل ہے۔

ابتدائی زندگی

حضرت ابو بکر کے بچپن یا جوانی کے بہت کم واقعات تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں اور جو واقعات ہیں بھی ان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ کی زندگی کے ابتدائی خدو خال کیا تھے؟ جس وقت آپ مسلمان ہوئے اس وقت آپ کے باپ ابو قحافہ زندہ تھے لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کے باپ پر آپ کے اسلام لانے کا کیا اثر ہوا اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں اپنے باپ ابو قحافہ سے

MUWLANA NASIR DEVJANI
MAHUVA, GUJARAT, INDIA
PHONE : 0091 2844 28711
MAIL devjani@netcourier.com

کیا اثر قبول کیا۔

والدین

حضرت ابو بکر کے والد کا نام عثمان بن عامر اور ان کی کنیت ابو قحافہ تھی۔ والدہ کا نام سلمٰی تھا جو صخر بن عمرو کی صاحبزادی اور ابو قحافہ کی چچا زاد بہن تھیں۔ حضرت ابو بکر کے والد قحافہ نے ۹۷ برس کی عمر پائی۔ فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں مسلمان ہوئے اور ۱۴ھ ہجری میں موت سے ہمکنار ہوگئے۔ اس طرح آپ کل چار سال کچھ ماہ مسلمان رہے اور اپنی زندگی کے ۹۲ برس آپ نے کفر اور بت پرستی میں گذارے۔

تعلیم

حضرت ابو بکر چونکہ زمانۂ جاہلیت کی پیداوار تھے اور کفر و بت پرستی کی چھاؤں میں آپ نے آنکھیں کھولی تھیں اس لیے جہل آپ کے ظاہر و باطن میں فطرتاً دخیل تھا۔ تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ملت مسلمہ کے خلیفہ ہونے کے باوجود تمام مسائل شرعیہ سے ناواقف و نابلد تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں

(۱) ایک دادی نے اپنے مرحوم پوتے کی جائداد سے اپنا حق طلب فرمایا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ تیرا حق نہ قرآن میں ہے نہ کسی حدیث میں کسی مسلمان فقیہ سے دریافت کرلوں تو جواب دوں۔

(مشکوٰۃ شریف، مؤطا ص ۲۸۷)

(۲) دادی کی موجودگی میں آپ نے متوفی کی جائداد کا چھٹاں حصہ نانی کو دلوایا۔ (تحفۃ العباد ص ۴۵۵)

(۳) فجاۃ السلمی یا ایاس السلمی کو زندہ آگ میں جلوایا۔ (یہ حکم خلاف شرع تھا)

(۴) چور کا بایاں ہاتھ کٹوایا۔ (یہ حکم بھی خلاف شرع تھا)

(۵) آپ مسئلہ کلالہ و میراث جدہ سے ناواقف تھے۔ (کنز العمال)

(۶) آپ کے پاس ایک یہودی آیا اور اس نے آپ سے تین سوالات کیے۔ (۱) کون سی چیز اللہ کے لیے نہیں ہے (۲) کون سی چیز اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔ (۳) کون سی چیز اللہ نہیں جانتا۔

یہودی کے یہ سوالات سن کر آپ بغلیں جھانکنے لگے۔ آخر کار وہ یہودی جواب نہ پاکر آپ کی علمی صلاحیتوں کو کوستا ہوا باب شہر علم کی چوکھٹ پر آیا۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے مسکراہٹ سے اس یہودی کا استقبال کیا اور فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تو کس ارادے سے آیا ہے پھر آپ نے اس کے سوالوں کے جوابات مرحمت فرمائے اور فرمایا کہ اللہ لاشریک ہے یعنی کسی شے کی شرکت کا تصور اللہ کے لیے نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کے نزدیک فقر و جور نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ اپنے نفس کے لیے بیٹا، بیٹی نہیں جانتا۔ جوابات سن کر وہ یہودی مسلمان ہوا اور کہا کہ بے شک آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی و جانشین ہیں۔

اسی قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو حضرت ابو بکر کے استعداد علمی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ لیکن سخت حیرت اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایسے خلیفہ کا تقابل اس مقدس اور عظیم ترین شخصیت سے کیا جاتا ہے، جس کے بارے میں پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد ہے کہ میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کے دروازہ ہیں۔

(کوکب دری ص ۱۵۰، ینابیع المودۃ باب ۱۴ ص ۱۰۷، ارجح المطالب ص ۱۳۱، صحیح ترمذی، مستدرک حاکم،

اور صواعق محرقہ وغیرہ)

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی علمی حیثیت کی تشریح ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ امام شبلنجی تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کے علم و فہم وغیرہ کے لیے بہت سی جلدیں درکار ہیں۔ محمد ابن طلحہ شافعی کا کہنا ہے کہ امام المفسرین جناب ابن عباس سے مروی ہے کہ علم و حکمت کے دس درجوں میں سے نو حضرت علی کو ملے ہیں اور دسویں میں تمام دنیا کے علماء شامل ہیں اور اس دسویں درجہ میں بھی علیؑ کو اوّلیت اور افضلیت حاصل ہے۔

مولائے کائنات کی بے پناہ علمی صلاحیتوں اور عظیم المرتبت شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے بیروت کے عیسائی ادیب فوائد الاحترام البستانی اپنی کتاب "حضرت علی ابن ابی طالب، نہج البلاغہ و درس منتخبات" میں تحریر فرماتے ہیں،

"حضرت علیؑ کی شخصیت ایک خاص کشش والی شخصیت ہے جس کے گرد روایت، حدیث اور مورخین کے قلم گردش کرتے رہتے ہیں اور ناقدین و مفکرین کی عقلیں اس شخصیت کو سمجھنے میں کوشاں رہی ہیں اور زہاد و ارباب سلوک کے اذہان ان کی سیرت اور طرز زندگی کی طرف متوجہ رہے ہیں اور ان کے علم کے سائے میں ارباب ادب کی ایک بڑی جماعت چلتی رہتی ہے۔ مختلف اور جداگانہ نظریات اور کثیر التعداد مناظرات جو بہ امتداد زمانہ سنی اور شیعہ فرقوں میں رہا کیے ہیں وہ اس عظیم الشان انسان کی بلندی اور رفعت میں اضافہ ہی کرتے رہے ہیں اور اس کے کمالات عقلیہ کی نمائش ان مناظرات کے پردوں سے جو کبھی گہرے اور اکثر اوقات ہلکے رہے ہیں زیادہ ہی ہوتی رہی ہے۔"

(ماخوذ از بلاغ المبین ج ۲ ص ۱۵۰۰ تا ۱۵۰۱)

قول پیغمبر ہے کہ میری امت میں سب سے زیادہ عالم و دانا میرے بعد علیؑ ابن ابی طالب ہیں۔ (کوکب دری ص ۱۸۱)

حضرت علی علیہ السلام نے خود بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے علم کے ہزار باب تعلیم فرمائے ہیں اور میں نے ہر باب سے ہزار باب پیدا کر لیے ہیں۔ ایک منزل پر یہ بھی فرمایا ہے کہ رسول اللہؐ نے مجھے اس طرح علم بھرایا ہے جس طرح کبوتر اپنے بچہ کو دانہ بھراتا ہے۔ ایک مقام پر یہ بھی فرمایا کہ میری زندگی میں جو چاہو مجھ سے پوچھ لو قبل اس کے کہ تمھارے درمیان میں نہ رہوں اور ایک مقام پر یہ فرمایا کہ آسمان کے بارے میں مجھ سے جو سوال بھی کرنا چاہو کرو کیونکہ مجھے زمین کے راستوں سے زیادہ آسمان کے راستوں کا علم ہے۔ ایک موقع پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ خدا کی قسم مجھے علم ہے کہ قرآن کی کون سی آیت کہاں نازل ہوئی اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خشکی میں کون سی آیت نازل ہوئی اور تری میں کون سی آیت نازل ہوئی۔

اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے اس تالیف کے دامن میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس علمی سلسلے کو آگے بڑھایا جا سکے بس یہی کہنا کافی ہے کہ جو علم رسول کا حامل ہو اس سے جاہلوں کا کیا تقابل!

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

پیشہ

سن و شعور کو پہنچ کر حضرت ابو بکر نے اپنے باپ کا پیشہ اختیار کیا اور کپڑے کی تجارت شروع کی جس میں آپ نے اپنی نفع خوری کی بدولت بڑا مال کمایا اور غیر معمولی ترقی کی یہاں تک کہ آپ کا شمار عرب کے بڑے تاجروں میں ہونے لگا۔

نفع خوری

نفع خوری کے معاملات میں حضرت ابو بکر کا پیٹ کبھی بھرتا ہی نہیں تھا۔ گراں فروشی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے رسول اللہ صلعم کو بھی معاف نہیں کیا اور دو سو درہم کا خریدا ہوا ایک مریل اونٹ رسول اللہ صلعم کے ہاتھ نو سو درہم کا فروخت کر کے سات سو درہم کا منافع حاصل کر لیا۔ (نور ایمان ص ۵۵ بحوالہ مدارج النبوۃ)

اس واقعہ سے حضرت ابو بکر کی تاجرانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ ایسی صورت میں "المرتضیٰ" کے فاضل مولف مولانا ابو الحسن صاحب ندوی کا یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حضرت ابو بکر نے اپنا سب کچھ نثار کر دیا تھا کیوں کر قرین قیاس اور قابل قبول ہو سکتا ہے۔

شراب نوشی

حرام ہونے کے باوجود شراب حضرت ابو بکر کے مشرب میں حلال تھی۔ چنانچہ اصحاب ثلاثہ ج ۱ ص ۷ میں بحوالہ فتح الباری تحریر ہے کہ اسلام اختیار کرنے کے بعد بھی آپ شراب نوشی فرماتے رہے اور آپ نے اپنے اس محبوب مشغلے کو ترک نہیں کیا

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ابو بکر کا مسلمان ہونا

حضرت ابو بکر کے اسلام اختیار کرنے کا مسئلہ بھی بنیادی طور پر اختلافی ہے بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ حضرت ابو بکر پہلے شخص ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے مبعوث بہ رسالت ہوتے ہی اسلام لائے۔ بعض نے خوش اعتقادی کی حدود سے گذر کر آپ کو سابق الاسلام بھی کہہ دیا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اسلام قبول کرنے والوں میں آپ کا نمبر چوتھا ہے اور بعض علماء کا یہ کہنا ہے کہ حضرت ابو بکر نے اسلام اس وقت قبول فرمایا جب پچاس سے زیادہ افراد مسلمان ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس ذیل میں حضرت ابو بکر کے شیدائی مولوی عبد الشکور پاٹا نالوی کا کہنا ہے کہ پیغمبر کے مبعوث بہ رسالت ہوتے ہی ابو بکر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ پھر موصوف نے اپنی کتاب خلفائے راشدین کے حاشیہ پر یہ وضاحت بھی فرمادی کہ عورتوں میں حضرت خدیجہؓ، لڑکوں میں حضرت علیؑ، غلاموں میں زید بن حارثہ اور آزادوں میں حضرت ابو بکر سب سے پہلے اسلام لائے (خلفائے راشدین ص ۲۰)

مولوی عبد الشکور کا نظریہ اوّل اُن کی اپنی ذہنی کثافت کا آئینہ ہے اور حاشیہ پر کی گئی وضاحت مولانا شبلی نعمانی کے خیال کی تائید میں ہے جیسے نعمانی صاحب نے یوں تحریر فرمایا ہے کہ سب سے پہلے خدیجہؓ زوجہ رسولؐ، دوسرے حضرت علیؑ تیسرے زید بن حارثہ، جو آنحضرتؐ کے آزاد کردہ غلام تھے، اور چوتھے شخص ابو بکر تھے جو اسلام لائے (سیرۃ النبی)

اس طرح مولانا شبلی نعمانی نے اسلام اختیار کرنے والوں کی فہرست میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بعد حضرت علیؑ کو پہلے نمبر پر اور حضرت ابو بکر کو تیسرے نمبر پر تسلیم کیا ہے۔ جب کہ عبد الشکور کی وہابیت نے عورتوں، لڑکوں، غلاموں اور آزادوں میں اصل واقعہ کو محصور کر کے حقیقت پر ابہام کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ طبری کی تحقیق مولوی عبد الشکور اور مولانا شبلی دونوں کے نظریہ تحقیق کو باطل قرار دیتی ہے۔ اس ذیل میں طبری کا کہنا ہے کہ:

"محمد بن سعید سے مروی ہے کہ میں نے اپنے باپ سے پوچھا

کہ کیا آپ لوگوں میں حضرت ابو بکر سب سے پہلے مسلمان ہوئے تھے انھوں نے کہا یہ بات غلط ہے۔ ابو بکر سے پہلے پچاس سے زیادہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۱۵)

ان اختلافات کے مابین صحیح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ابو بکر کے قبول اسلام کا حقیقی نمبر کیا تھا۔ البتہ حضرت ابو بکر کے مسلمان ہونے کی اصل وجہ کیا تھی؟ اس کے ذیل میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر کے مسلمان ہونے کا سہرا کاہنوں اور نجومیوں کے سر ہے۔ کیونکہ آپ نے نجومیوں سے سن رکھا تھا کہ اسلام عنقریب ترقی کر کے ساری دنیا میں پھیلے گا اس لیے آپ نے اسلام اختیار کر لیا۔ (خلاصۂ عبارت ازالۃ الخفاء مطبوعہ بریلی ص ۵۷۔۵۸)

معلوم ہوا کہ اسلام کے محاسن اور اس کی احادیث کے تحت ابو بکر نے اسلام نہیں قبول کیا بلکہ اپنے ذاتی مفاد، حصول مقصد اور مستقبل کی بقا کو مدنظر رکھتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

اس کے برعکس حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسلام و ایمان کے بارے میں مورخین و محدثین کا جو نظریہ ہے اس کی بھی ایک جھلک پیش کر دینا ضروری ہے تاکہ گفتگو مکمل ہو جائے۔

ابن سعد فرماتے ہیں کہ واقدی کا کہنا ہے کہ ہم سب کا اجماع اور اتفاق اس امر پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث بہ رسالت ہوتے ہی حضرت علیؑ پہلے شخص ہیں جو ایمان لائے۔

(خلاصۂ عبارت تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱ تا ۲۱۴)

ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت علیؑ ایمان لائے اور آنحضرت کے ساتھ آپ نے نماز پڑھی اس کے بعد زید بن حارثہ بن شرجیل

بن کعب بن عبد العزیٰ بن امرؤ القیس بن عامر بن نعمان کلبی جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام تھے اسلام لائے۔ (خلاصہ عبارت سیرۃ النبی ابو محمد بن عبد الملک بن ہشام ج ۱ ص ۲۶۴ تا ۲۶۶)

استیعاب اور اسد الغابہ میں ہے کہ حضرت علیؑ سب سے پہلے اسلام لائے۔ ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ حضرت علیؑ دس برس کے سن میں اسلام لائے، عن المجاہد میں بھی دس برس کی عمر میں اسلام لانا تحریر ہے۔ محمد بن عبد الرحمٰن زرارہ کا کہنا ہے کہ حضرت علیؑ نو سال کی عمر میں ایمان لائے جبکہ صحیح ترمذی میں آپ کی عمر آٹھ سال بتائی گئی ہے۔ غرض کہ اسی قسم کی تمام روایتیں تاریخ ابو الفداء ص ۱۱۵، ۱۱۶ جیب السیر ج ۱ جزو ۳ ص ۱۵، تاریخ کامل، فردوس الاخبار، سیرۃ العلویہ حصہ اول ص ۱۳ اور کوکب دری وغیرہ میں موجود ہیں جن سے حضرت علیؑ کے ایمان و اسلام کی تابندگی ظاہر ہوتی ہے۔

ان تمام روایتوں کو نظر انداز کر کے اگر مولائے کائنات کی حیات طاہرہ کا جائزہ لیا جائے تو آپ کی عمر کا کوئی بھی لمحہ ایسا نہیں ملتا جو (معاذ اللہ) کفر کے سائے میں گزرا ہو یا کسی مورخ کے قلم میں یہ جسارت پیدا ہوئی ہو کہ وہ آپ پر کفر کا بہتان رکھتا۔ لہٰذا ایسی صورت میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسلام اور ایمان پر کسی تبصرے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام چونکہ سابق الاسلام اور سابق الایمان تھے اس لیے آپ کے سامنے اسلام قبول فرمانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ البتہ اگر کوئی مسئلہ تھا تو وہ سابقہ اسلام کے ظاہر کرنے کا تھا اور جسے آپ نے اپنی ولادت کے بعد رسول اللہ صلعم کے سامنے خانۂ کعبہ میں ظاہر فرما دیا تھا جیسا کہ خلافت الٰہیہ حصہ اول ص ۳۶ میں ہے کہ:

"جب حضرت علی خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے تو یہ مژدہ سن کر

رسول خداؐ تشریف لائے اور اس نومولود بچے کو اپنی گود میں لیا، آغوش رسالت کی گرمی محسوس ہوئی تو آپ نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے چہرۂ رسول کی زیارت کی اور فرمایا اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ بعض کتابوں میں دگر صحیفہ ہائے آسمانی کی تلاوت کرنا بھی مرقوم ہے۔"

السلام علیک یا رسول اللہ کہنا خود اس بات کی ناقابل تردید دلیل ہے کہ عالم وجود میں آتے ہی امیرالمومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ نے، محمدؐ بن عبداللہ کو اللہ کا رسول تسلیم کیا اور قرآن کی تلاوت کر کے اپنے ایمان کو ظاہر کر دیا۔ اور چونکہ اسلام کی اساس اور بنیاد ایمان پر ہے اس لیے آپ کا اسلام خود بخود ظہور میں آ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث بہ رسالت ہونے کے بعد حضرت علیؑ کے لیے اسلام اختیار کرنے یا قبول کرنے کا کوئی مسئلہ قطعی نہیں تھا اور چونکہ رسول اللہؐ اور حضرت علیؑ کی خلقت ایک ہی نور سے ہوئی تھی، جیسا کہ پیغمبرؐ نے خود فرمایا کہ میرا نور اور علیؑ کا نور ایک ہے یا یہ کہ میں علیؑ سے ہوں اور علیؑ مجھ سے ہے۔
(کوکب دری ص ۱۵۳۔۱۵۴) اس لیے اسلام کو دنیا والوں پر ظاہر کرنے کی جو صورت پیغمبر کے لیے تھی بالکل وہی صورت علیؑ کے لیے بھی تھی۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلعم نے اللہ کے حکم سے اسلام کا اعلان کر کے الوہیت کے بارے میں کفار کے سامنے اپنے نظریۂ وحدانیت کو پیش کیا تو علیؑ نے بھی اس کی تائید فرما کر اپنے سابقہ اسلام کو ظاہر کر دیا۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسی عمل کو مورخین نے اسلام اختیار یا قبول فرمانے سے تعبیر کر دیا۔

تاریخ کامل ج ۲ ص ۲۰ میں ہے کہ حضرت علیؑ نے ظہور اسلام سے سات برس قبل رسولؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔

تاریخ الامم والملوک میں عبادہ ابن عبداللہ سے مروی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ میں بندۂ خدا ہوں اور رسولؐ کا بھائی ہوں اور میں ہی صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہوں۔ میں نے ظہور اسلام سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔

(تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱)

رسول اللہؐ نے فرمایا:

"علیؑ میرے بعد ہر مومن کا حاکم اور ولی ہے۔ میں خلائق کو ڈرانے والا ہوں اور علیؑ ہدایت کرنے والے ہیں۔ علیؑ کا دوست مومن ہے اور دشمن منافق۔ علیؑ قسیم بہشت اور دوزخ ہیں۔ علیؑ کی دوستی انسان کے گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جیسے آگ ایندھن کو۔ علیؑ کی دوستی ایسی نیکی ہے کہ اس نیکی کے ہوتے ہوئے کوئی بدی ضرر نہیں پہنچاتی اور علیؑ کی دشمنی ایسا گناہ ہے کہ اس گناہ کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی فائدہ نہیں پہنچاتی۔ علیؑ کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔ جو علیؑ کو ایذا پہنچائے گا خداوند عالم اس کو قیامت میں یہودی اور نصرانی اٹھائے گا۔ علیؑ کی محبت کے بغیر کوئی صراط مستقیم سے گذر نہیں سکتا۔"

(کوکب دری ص ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۷، ۱۶۸)

مسعودی نے بھی حضرت علیؑ کو سابق الاسلام تسلیم کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں،

"جناب علیؑ ابن ابی طالبؑ اور ان کے اسلام کے بارے میں لوگوں نے جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک کثیر تعداد علماء اور محققین کی رائے یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے کبھی شرک اور کفر نہیں کیا اس وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب اسلام لائے۔ کیونکہ وہ ہر ایک فعل میں حضرت رسول خدا صلعم کی متابعت کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں

سن بلوغ کو پہنچے۔ اسی لیے خدا نے انھیں عصمت عطا کی اور انھیں تمام برائیوں سے پاک وصاف رکھا کیونکہ یہ نفسِ رسول تھے۔ اور یہ دونوں یعنی حضرت رسول خداؐ اور حضرت علیؑ اطاعت وعبادت پر مجبور نہیں کیے گئے بلکہ دونوں نے اپنے اختیار سے بلا جبر اللہ کی اطاعت وعبادت کو اختیار کیا۔ علماء کی ایک جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ سب سے پہلے علیؑ اسلام وایمان لائے۔" (مروج الذہب مطبوعہ ۱۲۸۳ھ ج ۱ ص ۳۰۷)

مسعودی کے اس بیان سے حسب ذیل صراحت ہوتی ہے:

(۱) یہ کہ حضرت علیؑ اور ان کے اسلام کے بارے میں لوگوں نے جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش کی تاکہ آپ کے سابق الاسلام یا سابق الایمان ہونے کو مشکوک بنایا جا سکے۔

(۲) حضرت علی علیہ السلام نے از ابتدا تا انتہا کبھی شرک اور کفر اختیار نہیں کیا

(۳) حضرت علیؑ کا ہر فعل اور ہر عمل، پیغمبر اسلام کے ہر فعل اور ہر عمل سے مکمل طور پر متابعت اور مطابقت رکھتا تھا۔

(۴) یہ کہ جس طرح رسولؐ کا اسلام ازلی تھا اسی طرح حضرت علیؑ کا بھی اسلام ازلی تھا اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے کب اسلام اختیار کیا۔

(۵) اللہ نے حضرت علیؑ کو عصمت عطا کی اور تمام کثافتوں اور برائیوں سے پاک رکھا۔

(۶) علیؑ نفسِ رسول تھے۔

(۷) اللہ نے علیؑ اور محمد کو اپنی اطاعت وعبادت پر مجبور نہیں کیا بلکہ ان لوگوں نے اپنی مرضی اور اختیار سے عبادت الٰہی کو قبول کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اسلام اختیار کرنے کا

جو جھگڑا پیدا کیا گیا اور اس کے جواز میں جو روایتیں مورخین کے قلم سے بیان ہوئیں وہ محض ابوبکر وغیرہ کو علیؑ کا ہمسر بنانے کی کوشش میں تھیں اور عقلی دلائل کی روشنی میں ان کی اہمیت کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس حضرت ابوبکر اور دیگر دو خلفا چونکہ کافر، مشرک، خاطی اور غیر معصوم تھے اس لیے مسلمان کہلائے جانے کے لیے ان کا اسلام اختیار کرنا ضروری تھا۔ لیکن وثوق کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ اسلام اختیار کرنے والوں کی فہرست میں حضرت ابوبکر کا نمبر چوتھا ہے یا پچاس کے بعد...

صدیق اکبر کون؟

تفسیر درمنشور مطبوعہ مصر ج ۶ ص ۱۵۴ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ صدیقین میں صرف تین افراد شامل ہیں جن میں اوّل علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں جنھوں نے میری رسالت کی گواہی دی۔ دوسرے حبیب نجار ہیں جو مومن آل یٰسین ہیں اور انھوں نے حضرت عیسٰی کی گواہی دی۔ تیسرے حزقیل مومن آل فرعون ہیں جنھوں نے حضرت موسٰی کی گواہی دی۔

ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول خداؐ صلعم فرمایا کرتے تھے کہ تمام امتوں میں سبقت کرنے والے صرف تین ہیں جو ایک لمحہ کے لیے بھی کافر نہیں ہوئے۔ اوّل علیؑ ابن ابی طالبؑ، دوسرے صاحب یٰسین، تیسرے مومن آل فرعون ہیں۔ اور یہی صدیقین میں ہیں اور علیؑ ان سے افضل ہیں۔ (کوکب دری ص ۱۵۴)

حضرت سلمان فارسی سے روایت ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ صدیق صرف تین ہیں۔ اول علیؑ ابن ابی طالبؑ، دوسرے حبیب نجار جنھوں نے کہا تھا کہ اے میری قوم والو! رسولوں کی تابعداری کرو، تیسرے حزقیل جنھوں نے یہ کہا تھا کہ تم اس آدمی کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب

اللہ ہے۔ حضرت علیؑ حزقیل اور حبیب نجار سے افضل ہیں (ینابیع المودۃ ص ۱۹۲؛
ریاض النضرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ
کا نام صدیق رکھا تھا۔

عبادہ ابن عبداللہ کی روایت کے مطابق، حضرت علی علیہ السلام کا خود یہ
قول ہے کہ میں بندۂ خدا ہوں، رسول اللہ کا بھائی ہوں اور میں ہی صدیق اکبر و فاروق
اعظم ہوں۔ میں نے ظہور اسلام سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔ میرے سوا
اگر کوئی دوسرا شخص اپنے کو صدیق یا فاروق کہتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔
(تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱ اور تاریخ کامل)

تاریخ کی اکثر کتابوں سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکر
کو صدیق اور حضرت عمر کو فاروق کا لقب "معاویہ حدیث مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ"
نے دیا ہے جو اصولاً غلط ہے۔

ابو بکر پیغمبرؐ اسلام کی نظر میں

حضرت ابو بکر سے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم لوگوں میں شرک چیونٹی کی چال
سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔ پیغمبرؐ کا یہ ارشاد سن کر ابو بکر نے کہا کہ حضور! مشرک تو
وہ ہے جو غیر اللہ کی پرستش (پوجا) کرے۔ ابو بکر کی اس گفتگو پر پیغمبر نے غضبناک ہو کر
فرمایا کہ اے ابو بکر! صفائی نہ پیش کرو۔ بخدا تم لوگوں میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی
زیادہ پوشیدہ ہے۔ (در منثور ج ۴ ص ۴۸، کنز العمال ج ۱ ص ۱۷، ۲، ازالۃ الخلفاء ج ۲ ص
۱۹۹، اور تفسیر کبیر بر حاشیہ فتح البیان طبع مصر ج ۵ ص ۲۲۹)

مذکورہ بالا روایت سے دو باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اول یہ کہ ابو بکر،
پیغمبر اسلام کی نظر میں مشرک تھے دوسرے یہ کہ پیغمبر نے حضرت ابو بکر سے

مخاطب ہو کر "تم لوگوں" کا لفظ استعمال کیا ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت
ابو بکر تنہا مشرک نہیں تھے بلکہ آپ کے ساتھ کچھ لوگ اور شامل تھے۔ ممکن ہے کہ یہ
اشارہ حضرت عمر کی طرف رہا ہو۔ (واللہ اعلم)

بہر کیف حضرت ابو بکر اور ان کے ہمراہیوں کو وہ شخص مشرک قرار دے
رہا ہے جس نے قرآن کریم کا یہ حکم سنایا تھا کہ مشرک پر جنت حرام ہے۔

قول رسول پاک ہے اللہ کی قسم — دنیا کے مشرکین پہ جنت حرام ہے (مولف)

ابو بکر کا شیطانی ایمان

امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ "ایمانِ ابو بکر و ایمان ابلیس واحد است" یعنی ابو بکر
کا ایمان اور شیطان کا ایمان ایک ہے (نور ایمان ص ۵۴ بحوالہ تاریخ بغداد مولفہ ابن جزلہ)

امام ابو حنیفہ کے اس قول کی تائید خود حضرت ابو بکر کے اس بیان سے ہوتی
ہے کہ جب اجماع سقیفہ کے دوسرے دن آپ نے مسجد نبوی کے منبر سے مسلمانوں
کو خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ اے مسلمانو! اگر میں سیدھی راہ اختیار کروں تو تم مجھے
خلیفہ مان کر میری اطاعت کرنا اور اگر میں ٹیڑھے راستے پر چلوں تو تم مجھے ہٹا دینا،
کیوں کہ میرے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے جو مجھے ہر وقت بہکایا کرتا ہے اور مجھ پر
سوار رہتا ہے۔ (اصحاب ثلاثہ ج ۱ ص ۴۰ بحوالہ تاریخ طبری، ریاض النضرہ، صواعق
محرقہ اور نور ایمان ص ۴۵ وغیرہ

اکثر مفکرین کا یہ خیال ہے کہ حضرت ابو بکر کا یہ اشارہ حضرت عمر کی طرف تھا
کیونکہ وہی آپ پر سوار رہتے تھے اور ہر وقت بہکایا کرتے تھے۔ لیکن میرے نزدیک
اس موقع پر شیطان حقیقی کی طرف ابو بکر کا یہ اشارہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ بہر
حال حقیقت کچھ بھی، افسوس تو اس بات پر ہے کہ ندوی صاحب جیسے لوگ

حضرت ابوبکر کے اس شیطانی ایمان کا مقابلہ "کل ایمان" کے ایمان سے جب کرتے ہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ:

وہ آئینہ ہے اہل کدورت کی زندگی
جس میں کوئی بھی عکس ابھر کر نہ آسکا (مؤلف)

میرے ذخیرۂ ادب میں وہ الفاظ نہیں ہیں کہ جن کے ذریعہ میں "کل ایمان" کے ایمان کا حال بیان کر سکوں تاہم یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تاریخی اسناد کے تحت کچھ گفتگو ہو جائے تاکہ بات ناتمام نہ رہے۔ اس ذیل میں مولوی عبید اللہ امرتسری کا کہنا ہے کہ علی ہدایت کا جھنڈا اور ایمان کا مینار ہیں۔ علی تمام مومنوں سے ایمان کی منزل میں افضل اور مقدم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ خندق کے موقع پر حضرت علی کو کل ایمان کی سند عطا کی۔ علی سید المومنین، امام المتقین، امیر المومنین، صالح المومنین اور مولیٰ المومنین ہیں۔ اور علیؑ کے چہرے پر نظر کرنا عبادت ہے۔ (ارجح المطالب ص ۲۱ تا ۱۵)

علامہ شیخ سلیمان قندوزی فرماتے ہیں کہ جب حُبِّ علیؑ ایمان ہے تو علی کے ایمان کا کیا عالم رہا ہوگا (ینابیع المودۃ ص ۸۰)

سید محمد صالح سنی الحنفی کا کہنا ہے کہ حضرت عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر آسمان اور زمین پر بسنے والوں کا ایمان ترازو کے ایک پلڑے میں اور حضرت علیؑ کا ایمان دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو علیؑ کے ایمان کا وزن زمین اور آسمان پر بسنے والوں کے ایمان کے وزن سے بڑھ جائے گا۔ (کوکب دری ص ۱۸۷)

اس ارشاد پیغمبر کی روشنی میں یہ کہنا قطعی غلط نہ ہوگا کہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا ایمان تمام انبیاء و ملائکہ اور آسمان و زمین پر بسنے والوں کے ایمان سے زیادہ

وزنی تھا۔

حضرت علی کے ایمانِ کاملہ پر بے شمار حدیثیں، روایتیں اور قرآنی آیتیں دلالت کرتی ہیں جنھیں پیش کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب کے اوراق درکار ہیں۔

آخر میں ایک وضاحت اور کر دوں کہ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کی بدقسمتی سے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام "قسیم النّار والجنۃ" بھی ہیں۔

گم کردہ راہ ہو گئے منزل شناس لوگ
بدلے گئے اصول سفر جب بھی راہ میں (مؤلف)

ابوبکر کی نافرمانی اور خدا کی لعنت

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی اپنی کتاب المرتضیٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسند اور ناپسند کو اچھی طرح سمجھنا اور انتہائی باریک بینی کے ساتھ ان کا جائزہ لینا اور اس بات کی کوشش کرنا کہ آپ کی وفات کے بعد، آپ کی خواہشوں کے عین مطابق تمام امور انجام پائیں۔ اس کا نمونہ حضرت ابوبکر کے اس اصرار میں ملتا ہے کہ جب انھوں نے حضرت اسامہ کی قیادت میں فوج بھیجی"۔ (المرتضیٰ ۱۱۰، ۱۱۱)

پھر فرماتے ہیں:

"حضرت ابوہریرہ نے اس واقعہ کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ابوالاعرج حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں اگر ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی۔ اس بات کو انھوں نے دوبارہ سہ بارہ دہرایا پھر جیش اسامہ کے بھیجے جانے کا واقعہ بیان کیا، اور اس سلسلہ میں فرمایا

حضرت ابوبکر نے جیش اسامہ کو روانہ کر دیا اور کہا کہ جس جیش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روانہ کر دیا تھا اسے واپس نہیں ہونے دوں گا وہ جھنڈا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باندھا ہے اس کو میں نہیں کھولوں گا۔" (المرتضیٰ ص ۱۱۱، ۱۱۲)

مولانا ندوی نے اپنے بیان یا ابوہریرہ کی روایت مہملہ کے ثبوت میں کسی مستند کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیا جس سے مولانا موصوف کی بد دیانتی کا پتہ چلتا ہے۔ اور آپ نے جیش اسامہ کے واقعہ کو جس انداز سے پیش کرنے کی ناکام کوشش فرمائی ہے وہ بجائے خود حقائق کو مسخ کرنے کی بیّن دلیل ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ وضاحت بھی کہ "اگر حضرت ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی" رسول اسلام کی تیئیس سالہ تبلیغی محنتوں پر پانی پھیرنے کے مترادف ہے۔ لیکن چونکہ مولانا ندوی کا باطل عقیدہ وہابی مسلک سے وابستہ ہے اس لیے ان کے نزدیک بے شک ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو اللہ کی یہ عبادت نہ ہوتی جس کا طریقہ وہابی مسلک میں رائج ہے بلکہ اللہ کی عبادت اس طور وطریقہ کی پابند ہوتی کہ جو طریقہ پیغمبر نے بنایا تھا یا جسے آل پیغمبرؑ نے اپنایا تھا۔

اپنی تالیف المرتضیٰ میں ابوہریرہ سے مسلسل اور بے تکلف روایتیں نقل کر کے مولانا نے خود ہی اپنے مولفانہ وقار کو مجروح کر لیا ہے جبکہ یہ حقیقت آپ کو معلوم ہوگی کہ ۷ھ میں مقام صہبا کی واپسی پر غزوۂ وادی القریٰ واقع ہوا تھا اور یہودیوں سے جنگ ہوئی تھی، ابوہریرہ جو یہودی تھے اسی سال مسلمان ہوئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کل تین سال عہد رسالت میں زندگی بسر کی۔ شرح مسلم نووی ص ۷۷، صحیح مسلم ج ۲ ص ۵۰۹، الفاروق ج ۲ ص ۱۰۵ اور میزان الکبریٰ ج ص ۱۱ وغیرہ میں یہ صراحت موجود ہے کہ حضرت عائشہ، عبداللہ بن عمر اور حضرت علیؑ وغیرہ ان کے بیان پر

یقین نہیں کرتے تھے اور انھیں جھوٹا تصور کرتے تھے۔

جیش اسامہ کا اصل واقعہ کیا ہے؟ اسے مورخین نے یوں بیان کیا ہے:

آخری حج کے بعد، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی علالت کے دوران یہ خبر موصول ہوئی کہ حکومت روم مدینہ پر حملہ کر کے اسے تاراج اور برباد کرنا چاہتی ہے، چنانچہ اس خیال کے پیش نظر کہ کہیں مدینہ پر حملہ نہ ہو جائے آپؐ نے اُسامہ بن زید کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کرنے کا فیصلہ کیا اور تمام مسلمانوں کو اس امر کی سخت تاکید فرمادی کہ علی کے علاوہ، کوئی بھی مسلمان خواہ وہ انصار ہو یا مہاجر مدینہ میں نہ رہے اور جو میرے اس حکم کو نہ مانے گا اس پر اللہ کی لعنت ہوگی۔ (ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ جزاوّل ص ۵۳) اس کے بعد آنحضرتؐ نے اسامہ کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے روانہ کیا۔ انھوں نے مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر جُرف نامی مقام پر کیمپ لگا کر اکابرین صحابہ کا انتظار کیا لیکن وہ لوگ نہیں آئے۔ (طبری ج ۳ ص ۱۸۵، تاریخ ابوالفدا ج ۱ ص ۱۵۲ مطبوعہ مصر، تہذیب التہذیب علامہ حجر عسقلانی مطبوعہ دارالمعارف حیدرآباد دکن جزاول ص ۲۰۸ وغیرہ)

مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۴۸۸، تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۲۰ اور طبری ج ۳ ص ۱۸۸ میں ہے کہ نہ جانے والوں میں حضرت ابوبکر کے علاوہ حضرت عمر بھی تھے۔

مدارج النبوہ، تاریخ کامل اور تاریخ طبری کا شمار، معتبر اور مستند کتابوں میں ہے اور ان کتابوں کے مورخین اہل سنت ہیں۔ لہذا اس بات سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ حضرات شیخین یعنی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے رسول اللہ صلعم کی دی ہوئی اللہ کی دائمی لعنت کو قبول کر لیا لیکن جیش اُسامہ کے ہمراہ نہیں گئے۔

چنانچہ حکم پیغمبرؐ کی اس نافرمانی پر خلاق کائنات نے فرمایا:

"جس شخص نے اللہ اور رسول کے حکم کی نافرمانی کی اور اپنی حدوں

سے گزر گیا، خدا اس کو جہنم میں داخل کرے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، اور اس میں رسوائی کا عذاب ہے۔" (النساء - ۱۴)

مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۱۹۴ میں یہ بھی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ آخر صفر میں جب شدید درد سر میں مبتلا تھے تو رات کے وقت دعا کی خاطر آپ گھر سے نکل گئے۔ حضرت عائشہ نے یہ سمجھا کہ میری باری میں کسی اور بیوی کے پاس چلے گئے ہیں، چنانچہ آپ تلاش میں نکلیں تو حضور کو بقیع میں محو دعا پایا۔ آنحضرتؐ نے جب عائشہ کو دیکھا تو فرمایا کہ اے عائشہ کاش تم پہلے مرجاتیں تو میں تمہارا کفن دفن اچھی طرح کر دیتا۔ اس پر حضرت عائشہ نے کہا کہ آپ تو چاہتے ہیں کہ میں مرجاؤں تاکہ آپ دوسری شادی کر لیں۔

ابوبکر کی معزولی

اس ذیل میں تاریخی پس منظر سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کی وہ خودساختہ روایت پیش کر دوں جو آپ کی کتاب المرتضیٰ کے ص ۸۶۔ ۸۷ پر موجود ہے تاکہ ناظرین کو صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ مولانا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت اور انکسار طبیعت" کے عنوان میں تحریر فرماتے ہیں،

"۹ھ میں حج فرض ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس سال امیر الحج بنا کر بھیجا کہ وہ مسلمانوں کو اسلامی طریقہ پر حج کرائیں۔ اس وقت تک مشرکین اپنے طریقوں پر حج کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جن کا حج کا ارادہ تھا، ان کی تعداد تین سو تھی اور وہ سب اہل مدینہ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سورۂ براءت نازل ہوئی آپ نے حضرت علی کو بلایا اور ان کو حکم دیا کہ سورۂ براءت کی ابتدائی آیتیں لے کر جاؤ اور قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ کو) لوگوں کو سنا دینا اور بتا دینا کہ جنت میں کوئی کافر نہیں جائے گا اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا، خانۂ کعبہ کا طواف کوئی ننگے جسم نہیں کرے گا اور آنحضرتؐ نے اگر کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا ہے تو وہ زندگی بھر پابند رہیں گے۔" حضرت علیؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی عضباء پر نکلے، راستہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ تم امیر کی حیثیت سے چل رہے ہو یا مامور کی حیثیت سے، حضرت علیؑ نے کہا مامور کی حیثیت سے، دونوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ حضرت ابوبکر کی رہنمائی میں لوگوں نے مناسک حج ادا کیے۔ جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علیؑ نے لوگوں میں ان باتوں کا اعلان کر دیا، جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہدایت دی تھی۔" (المرتضیٰ ص ۸۶ - ۸۷)

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے اپنے مذکورہ بیان کے تحت ابن ہشام ق ۲ ص ۵۴۳ تا ۵۴۶ کا حوالہ دیا ہے جو پوری عبارت کے اس آخری جملے کی تائید میں ہے کہ جب قربانی کا دن آیا تو حضرت علیؑ نے لوگوں (کفار) میں ان باتوں کا اعلان کیا جس کی ہدایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی تھی۔"

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت ابوبکر کو امیر الحج بنانا، راستے میں حضرت علیؑ سے ابوبکر کا یہ دریافت فرمانا کہ تم امیر کی حیثیت سے چل رہے ہو یا مامور کی حیثیت سے، حضرت علیؑ کا جواب دینا، حضرت ابوبکر کی رہنمائی میں لوگوں کا مناسک حج ادا کرنا وغیرہ، یہ ساری باتیں بے دلیل، بے حقیقت اور خود ساختہ ہیں۔

جو محض حضرت علیؑ پر ابو بکر کو افضل ظاہر کرنے کی غرض سے بیان کی گئی ہیں اور ان باتوں کے ضمن میں کسی مستند کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔

اس حقیقت کو مستند و معتبر کتابوں کی روشنی میں؛ میں تحریر کرتا ہوں۔ اگر ممکن ہو سکے تو مولانا ندوی صاحب انکار فرمائیں تاکہ آپ کی علمی صلاحیتیں کچھ اور اجاگر ہو کر اہل علم کے سامنے آجائیں۔ واقعہ یہ ہے :-

سورۂ برأت کی ابتدائی دس آیتوں نے کفار و مشرکین پر خانہ کعبہ میں داخلہ کی سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ چنانچہ ۳؍ ذی الحجہ ۹ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو بکر کو اس کام پر مامور فرمایا کہ وہ مکہ معظمہ جاکر دورانِ حج ان آیاتِ قرآنی کی تبلیغ فرمائیں۔ ابو بکر اپنی اس عارضی فضیلت پر ناز فرماتے ہوئے تین سو حاجیوں کے قافلے کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ بدقسمتی سے آپ ابھی راستے ہی میں تھے کہ واپس بلا لیے گئے اور یہ سعادت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سپرد کر دی گئی۔ حضرت ابو بکر جب کبیدہ خاطر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اپنی معزولی پر اشکبار ہوئے اور آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ کیا میرے بارے میں کوئی خاص بات واقع ہوئی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کوئی خاص بات نہیں، اس امر میں خدا کا حکم ہے کہ میں خود جاؤں یا میری آل میں سے کوئی جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا کہنا ہے کہ شیخین میں دونوں تھے مگر معزول کیے گئے۔ ملاحظہ ہو قرۃ العین ۲۲۴، صحیح بخاری پ۲ ص ۲۳۸، ریاض النضرہ ص ۱۷۴، تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۴، تاریخ خمیس ج ۲ ص ۱۵۷ تا ۱۶۰، روض الانف ج ۲ ص ۳۲۸، درمنثور ج ۳ ص ۲۱۰، کنز العمال ج ۱ ص ۱۲۶ اور خصائص نسائی ص ۲۱ وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے سورہ برارت دے کر روانہ کیا تھا کہ میں اہلِ مکہ میں جاکر یہ اعلان کر دوں کہ اس سال کے بعد کوئی بھی کافر و مشرک

حج نہ کرے اور نہ ہی کوئی خانۂ کعبہ کا برہنہ طواف کرے، اور جنت میں صرف مومن ہی جائے گا اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی شخص کا کوئی معاہدہ ہے تو وہ وقت مقررہ تک ہی رہے گا آئندہ کوئی توسیع نہ ہوگی اور خدا اور اس کا رسولؐ مشرکین سے بری الذمہ ہیں۔ ابھی میں نے صرف تین دن کی مسافت طے کی تھی کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کو ایک تیز رفتار ناقہ کے ذریعہ میری طرف روانہ کیا اور انھیں تاکید فرمادی کہ وہ مجھ سے سورۂ برارت لے کر اس کی تبلیغ خود کریں چنانچہ علیؑ نے وہی کیا جو حکمِ پیغمبرؐ تھا اور میں مایوسی کی حالت میں مدینہ واپس آگیا۔ جب پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا تو ناکامی اور نامرادی کے احساس نے مجھ پر گریہ طاری کر دیا اور میں بلک بلک کر رونے لگا، جب دل کچھ ٹھہرا تو میں نے پوچھا کہ کیا میرے متعلق کوئی خاص بات رونما ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہوا وہ اچھا ہوا، مجھے اللہ نے حکم دیا تھا کہ سورۂ برارت کی تبلیغ میں خود کروں یا وہ شخص اس کام کو انجام دے جو میری آل میں شامل ہو۔ (خلاصہ عبارت مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲ بحوالہ نفس رسولؐ ص ۲۴۸)

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی نظروں میں حضرت ابو بکر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی نمائندگی یا نیابت کے اہل قطعی نہیں تھے۔

سچ بولنے کے بعد عجب حادثہ ہوا   کاٹی گئی زبان مری بات بات پر (مؤلف)

غارِ ثور میں ابو بکر کا گریہ اور پیغمبرِ اسلام کی ہجرت

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت اور غارِ ثور کے بارے میں مولانا ابوالحسن صاحب ندوی فرماتے ہیں کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر کس طرح مکمل اعتماد تھا، اس کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ آپ نے

انتہائی خطرات سے پُر سفر میں ان کو ساتھ لیا، یہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا سفر تھا جب کہ دشمن گھات میں تھے۔ ایسے سفر میں کوئی صاحب عقل انسان ایسے شخص کو اپنا راز دار و دمساز نہیں بنا سکتا جس پر اُس کو مکمل بھروسہ نہ ہو جب کہ معلوم ہو کہ قدم قدم پر خطرہ تھا، تلاش کرنے اور تعاقب کرنے والوں کا جال بچھا ہوا تھا، اس وقت سفر میں اسی کو ساتھ لیا جاتا ہے جو اپنی جان اور زندگی سے زیادہ اپنے محبوب و آقا رفیق کو عزیز رکھتا ہو۔" (المرتضیٰ ص ۱۰۱)

پھر فرماتے ہیں:

"اس کارنامہ (رفاقت سفر) کو قرآن کریم نے ذکر کر کے دوام عطا کر دیا۔

"(اس وقت) دو ہی شخص تھے، جن میں (ایک ابو بکر تھے) دوسرے (خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے۔ اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دے رہے تھے کہ غم نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔" (سورۂ توبہ - ۴۰)

یہ وہ مدح ہے جس میں ابو بکر کا کوئی سہیم و شریک نہیں۔" (المرتضیٰ ص ۱۰۲)

یہ ضروری نہیں ہے کہ محض اعتماد ہی کی بنیاد پر کوئی کسی کو اپنا شریک سفر بنائے۔ اکثر مجبوری اور مصلحت کے تحت انسان کو وہ کرنا پڑتا ہے جو وہ نہیں چاہتا پھر ایسے حالات میں جب کہ قدم قدم پر جان کا خطرہ لاحق ہو، اس شخص کو ساتھ لیا جاتا ہے جو ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے مضبوط، طاقتور، باہمت، جوانمرد، شجاع اور بہادر ہو اور دشمنوں سے مقابلہ کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

یقیناً پیغمبر اسلام چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے اور آپ کے

پاس علی ابن ابی طالبؑ ایسا شجاع و بہادر موجود تھا، جو آپ کے دشمنوں پر تنہا بھاری آپ کا بہترین رفیق سفر، مددگار اور ساتھی تھا، چاہتے تو آپ امیرالمومنین کو اپنے ساتھ لے لیتے لیکن علیؑ کو اپنے بستر پر سُلا کر، آپ کا اپنے گھر سے تنہا نکلنا اور سفر ہجرت اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو کسی مددگار، ساتھی یا رفیق سفر کی ضرورت نہیں تھی بلکہ آپ کو اپنے معبود پر مکمل اعتماد اور بھروسہ تھا اور وہی آپ کی حفاظت کر رہا تھا جو تمام کائنات پر غالب اور حاوی ہے۔

حضرت ابو بکر کو، جو غزوات اسلامی اور جہاد فی سبیل اللہ کے کسی محاذ پر نہ ٹھہرے، رسول اللہ صلعم کے اعتماد کا مرکز اور ان کے تحفظ کی ضمانت قرار دینا مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کا وہ کارنامہ ہے جس کو نہ عقل تسلیم کر سکتی ہے اور نہ صداقت کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔

ہجرت یا غار ثور سے متعلق جو واقعات مورخین نے تحریر کیے ہیں۔ ان سے ہٹ کر ندوی صاحب نے اپنا قیاسی خاکہ الگ مرتب کیا ہے جبکہ اس سلسلے کے واقعات یوں ہیں کہ:-

کفار مکہ نے دارالندوہ میں جمع ہو کر ابو سفیان کی تجویز کے مطابق قتل رسولؐ کا منصوبہ تیار کیا تھا اس پر عملدرآمد کی غرض سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تو آپ نے امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے فرمایا کہ کفار مکہ نے آج کی شب مجھے قتل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور میرے لیے اللہ کا یہ حکم ہے کہ میں تمہیں اپنے بستر پر سلا کر ہجرت اختیار کروں۔ علیؑ نے دریافت کیا کہ کیا میرے سونے سے آپ کی جان بچ جائے گی پیغمبرؐ نے فرمایا کہ اللہ کا یہی حکم ہے۔ علیؑ نے کہا کہ مجھے آپ کی سلامتی مطلوب ہے، میری جان جائے یا رہے آپ حکم الٰہی کے مطابق عمل کریں۔ میں آپ کی

رو اوڑھ کر آپ کے بستر پر سونے کے لیے تیار ہوں، رسول اللہ صلعم نے علیؑ کو گلے سے لگایا۔ اہل مکہ کی تمام امانتیں آپ کے سپرد کیں اور آپ کو اپنی جگہ اپنے بستر پر سلا کر ایک مٹھی خاک اٹھائی اور کفار مکہ کی آنکھوں میں جھونکتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر ہجرت اختیار کیا اور دوسری طرف حضرت علیؑ تمام خطرات سے بے نیاز سر سے پاؤں تک پیغمبری چادر تان کر بستر رسول پر سو گئے۔ جب خلاق کائنات نے یہ منظر دیکھا تو ملائکہ سے فرمایا:

"تم میں کچھ میرے بندے ایسے بھی ہیں جو میری خوشنودی کی خاطر اپنی جان تک بیچ دیتے ہیں اور اللہ ایسے بندوں پر بڑا ہی مہربان اور شفقت کرنے والا ہے۔" (البقرہ۔ ۲۰۶)

احیاء العلوم میں امام غزالی تحریر فرماتے ہیں کہ شب ہجرت خدا نے جبرئیل اور میکائیل سے فرمایا کہ میں نے تم دونوں میں بھائی چارہ قائم کیا اور ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ کی۔ اب بتاؤ، تم میں کون ایسا ہے جو اپنی عمر اپنے بھائی کو دے دے۔ مگر دونوں فرشتوں نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ رہے۔ تب خدا نے فرمایا کہ میں نے علیؑ اور محمدؐ میں اس رشتے کو قائم کیا ہے اور دیکھو علیؑ نے آج کی شب اپنی زندگی محمدؐ کو دے دی ہے اور دشمنوں کے نرغے میں بے خوف و خطر ان کے بستر پر محو خواب ہیں۔ تم دونوں ابھی زمین پر جاؤ اور علی کی حفاظت کرو۔ خدا کے اس حکم سے دونوں فرشتے زمین پر آئے۔ جبرئیل حضرت علی علیہ السلام کے سرہانے اور میکائیل پائنتی بیٹھے اور علیؑ سے فرمایا کہ اے نفس پیغمبرؐ! خداوند عالم آپ کے اس عمل پر فخر و مباہات کرتا ہے۔" یہ وہ مدح ہے جس میں علیؑ کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔"

الغرض حضرت علی علیہ السلام بستر رسولؐ پر شانِ بے نیازی کے ساتھ جبرئیل و

میکائیل کی نگرانی میں محو خواب تھے اور اللہ کا حبیب اپنے معبود کی حفاظت میں اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

حدود مکہ سے باہر نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ محسوس کیا جیسے کوئی ناقہ سوار آپ کا تعاقب کر رہا ہے۔ پیغمبرؐ تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ تیز رفتاری کے سبب آپ کا پائے اقدس، پہاڑی علاقہ کی ناہموار زمین پر پڑتے ہوئے ایک پتھر سے اس طرح ٹکرایا کہ ساری انگلیاں لہولہان ہو گئیں۔ لیکن ناقہ سوار کا برابر تعاقب برابر جاری رہا، آخر کار پیغمبرؐ نے آتے ہوئے ناقہ سوار کو بغور دیکھا تو یہ اندازہ ہوا کہ شاید ابوبکر ہیں۔ آپ ٹھہر گئے۔ پیغمبری اندازہ غلط نہیں تھا، تعاقب کرنے والے حضرت ابوبکر ہی تھے (صحیح بخاری ج ۱ حصہ ۳ ص ۶۹) پیغمبرؐ اسلام نے اس اندیشے کے تحت کہ کہیں دشمنوں کو خبر نہ ہو جائے ابوبکر کو اپنے ساتھ لے لیا کیونکہ آپ ابوبکر کی منافقت اور ریشہ دوانیوں سے بخوبی واقف تھے اور اس وقت ابوبکر کو چھوڑ دینا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ غرض کہ مختصر سا سفر طے کر کے آنحضرت ابوبکر کو لیے ہوئے غار ثور تک پہنچے اور بحکم الٰہی اس میں داخل ہو گئے۔ صحیح بخاری کے اسی صفحہ میں یہ بھی ہے کہ جس ناقہ پر ابوبکر سوار تھے اس کو پیغمبرؐ اسلام نے بہ قیمت خرید لیا۔ مدارج النبوۃ میں ہے کہ دو سو درہم کی خریدی ہوئی اونٹنی ابوبکر نے وقت اور موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھا کر پیغمبرؐ کے ہاتھ نو سو درہم کی بیچی اور پیغمبرؐ اسی پر سوار ہو کر غار ثور تک پہنچے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار میں داخل ہو گئے تو بحکم خدا مکڑی نے غار کے دہانے پر جالا تان دیا، کبوتروں نے انڈے دے دیے اور ببول کا ایک درخت بھی پیدا ہو گیا تاکہ دشمنوں کو پیغمبرؐ کی موجودگی پر شک نہ ہو سکے۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ عافیت غار میں قیام فرما ہو چکے

تھے اور ادھر کفار مکہ ساری رات رسولؐ کے گھر کا محاصرہ کیے، کبھی پنجوں پر کھڑے ہو کر اور کبھی اچک اچک کر آنحضرتؐ کے بستر کی نگرانی کرتے رہے۔ اسی عالم میں رات گذر گئی اور جب صبح ہوئی تو سب کے سب دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے اور چادر ہٹائی تو اوسان خطا ہو گئے۔ دشمنوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ بستر رسولؐ پر علیؑ ہیں۔ گھبرا کر رسول اللہؐ کے بارے میں پوچھا تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ کیا تم نے محمد کو میرے سپرد کیا تھا۔ طبری میں ہے کہ علیؑ تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور سب گھر سے باہر نکل بھاگے۔

اپنی اس ناکامی کے بعد کفار نے آپس میں مشورہ کر کے یہ اعلان کیا کہ جو شخص محمدؐ کو زندہ پکڑ کر یا ان کا سر کاٹ کر لائے گا اسے سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے۔ یہ اعلان سن کر بہت سے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکلے لیکن ناکام رہے۔ البتہ سراقہ ابن مالک نام کا ایک شخص کھوج لگاتا ہوا کسی طرح غار تک جا پہنچا۔ اس کی آہٹ پر ابو بکر نے اپنے کان کھڑے کیے اور جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ دشمن قریب تر ہے تو اس کو متوجہ کرنے کے لیے آپ نے بہ آواز بلند پھوٹ پھوٹ رونا شروع کر دیا۔ یقیناً ابو بکر کا یہ حبیب گریہ پیغمبرؐ اسلام کو قتل کرا دینے کے لیے کافی تھا، اگر خدا کا تحفظ نہ حاصل ہوتا، پیغمبرؐ نے ابو بکر سے فرمایا کہ روتا کیوں ہے اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ ہے حضرت ابو بکر کا وہ کارنامہ جسے مولانا ندوی نے بہت عظیم فضیلت سے تعبیر کیا ہے۔

یکم ربیع الاول ۱۴؁ بعثت کو پنجشنبہ کی شب میں کفار مکہ نے آنحضرتؐ کے گھر کا محاصرہ کیا، ۲ ربیع الاول یوم جمعہ کو آغاز سحر سے کچھ پہلے آنحضرت غار ثور میں داخل ہوئے اور ۴ ربیع الاول یکشنبہ تک وہاں قیام فرما رہے اور حضرت

علی علیہ السلام رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آب و غذا پہنچاتے رہے۔

چوتھے روز مولائے کائنات جب کفار کی طرف سے مطمئن ہوئے تو عبداللہ بن ارقیط اور عامر بن فہیرہ کے ہمراہ سواری لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں غار سے نکال کر عبداللہ بن ارقیط اور عامر بن فہیرہ کے ہمراہ مع ابو بکر کے مدینہ روانہ کر دیا اور بعد میں آپ بھی اہل مکہ کی امانتیں واپس کر کے عورتوں اور بچوں کے ہمراہ مدینہ روانہ ہو گئے اور اس طرح خاندان نبوی کی ہجرت مکمل طور پر عمل میں آ گئی۔

بانی اسلام کے بارے میں کفار قریش
جو نہ پوری ہو سکی وہ آرزو کرتے ہیں (ڈاکٹر محضور نواب)

غار ثور کی نوعیت

مکہ سے داہنی طرف تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلہ پر جبل ثور نامی پہاڑ کی چوٹی پر گیند نما ایک گول پتھر تھا جس میں قدرتی طور پر اندر خول تھا اور اس پتھر میں ڈیڑھ بالشت لمبا اور ڈیڑھ ہی بالشت چوڑا سوراخ تھا جو در تھا۔ خول کے اندر صرف اتنی گنجائش تھی کہ ایک پستہ قد آدمی کھڑا ہو سکے، شب ہجرت پتھر کے اسی خول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ اعجاز نبوت داخل ہوئے تھے اس پہاڑ کی چوٹی سطح زمین سے ایک میل بلند ہے جہاں سے سمندر دکھائی دیتا ہے۔ (تلخیص سیرۃ النبی ص ۱۶۹)

غزوات سے کنارہ کشی اور فرار

مخالفین اور مشرکین اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو

دفاعی لڑائیاں لڑیں ان کی تعداد باسٹھ ہے۔ جن لڑائیوں میں سرورِ کائنات نے اپنے باوفا اصحاب میں سے کسی کو فوج کا سردار بنا کر بھیجا انھیں سریہ کہا جاتا ہے۔ سریوں کی کل تعداد چھتیس ہے، جن میں موتہ بہت مشہور جنگ ہے اور اس جنگ میں حضرت جعفر طیار کی شہادت واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ جن جنگوں میں سرکارِ دو عالمؐ بہ نفس نفیس شریک ہوئے انھیں غزوہ کہتے ہیں۔ غزوات کی مجموعی تعداد چھبیس ہے۔ جن میں بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین کی جنگیں شہرۂ آفاق ہیں۔ ان تمام جنگوں میں خلفائے ثلاثہ کی شرکت اور ان کا میدان چھوڑ کے بھاگنا تاریخ کی ہر مستند اور معتبر کتاب سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی میدانِ جنگ سے راہ فرار اختیار کرنے والوں کو قرآن میں جہنمی قرار دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے کہ:-

"جب تم کفار سے میدان جنگ میں لڑو تو ان کی طرف پیٹھ نہ پھیرو اور جو شخص بھی دورانِ جنگ کفار کی طرف پیٹھ پھیرے گا وہ یقیناً خدا کے قہر و غضب میں آئے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور یقیناً وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔" (انفال۔ ۱۶)

سورہ توبہ میں ارشاد فرمایا کہ:-

"کیوں قتال نہیں کرتے تم اس قوم سے جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور رسولؐ کے نکالنے کا ارادہ کر لیا اور انھیں لوگوں نے تمھارے ساتھ ابتدا کی، آیا تم ان لوگوں سے ڈرتے ہو، پس اگر تم مومن ہو تو اللہ زیادہ مستحق ہے کہ تم اُس سے ڈرو۔" (سورہ توبہ۔ ۱۳، ۱۴)

مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ میدان سے بھاگنا نفاق کی علامت ہے۔ مولوی عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں تحریر فرمایا ہے کہ میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرنا کفر ہے۔

غالباً یہی سبب ہے کہ مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے اپنی کتاب المرتضیٰ میں بدر، احد، خندق اور خیبر کے واقعات بیان کرتے وقت خلفائے ثلاثہ میں سے کسی کا نام تک نہیں لیا۔ حالانکہ مولانا کا یہ فعلِ غلط دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔ لیکن ع

نمک حلال کی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں

بہرحال مجبوریاں کچھ بھی، مولانا ندوی کی تاریخی بددیانتی کا تقاضہ یہی ہے کہ بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین کے واقعات کو اجمالی تفصیل کے ساتھ دوبارہ تحریر کیا جائے تاکہ جو کمی رہ گئی ہے وہ پوری ہو جائے۔

جنگ بدر

کفر اور اسلام کے درمیان جنگِ بدر پہلی جنگ ہے جو ماہ رمضان سنہ ۲ھ میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کا لشکر کل تین سو تیرہ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ صرف دو عدد گھوڑے تھے۔ ایک پر حضرت مقداد سوار تھے، دوسرا مرثد کی سواری میں تھا، باقی لوگ پیدل تھے۔ کل چھ مجاہدین کے پاس زرہیں تھیں باقی سب لوگ بغیر زرہ کے تھے۔ دوسری طرف لشکر کفار میں زرہ پوش اور ہتھیار بند سو سوار تھے۔ لشکر اسلام کی علم برداری حضرت علیؑ کے سپرد تھی۔

جنگ کا حال مورخین نے یوں بیان کیا ہے کہ کفار مکہ کا ایک قافلہ ابوسفیان اور عمرو عاص کی قیادت میں سامان تجارت لے کر شام سے مکہ کی طرف جا رہا تھا۔ یہ خبر آنحضرتؐ کو دی گئی اور جہاد کا حکم ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں کا مختصر سا لشکر آنحضرتؐ کی سربراہی میں ان کافروں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ ابوسفیان کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ گھبرایا اور اس نے مکہ سے کفار کو اپنی مدد کے لیے

طلب کیا۔ جب مکہ والوں میں یہ خبر عام ہوئی تو وہاں ایک کہرام مچ گیا۔ ابوجہل نے یہ منادی کرادی کہ ابوسفیان اور اس کے ہمراہی سب خطرے میں ہیں اور تم میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس کا مال اس قافلے میں نہ ہو۔ اس منادی کے ہوتے ہی کفار مکہ بڑے ساز و سامان کے ساتھ ایک لشکر لے کر ابوسفیان کی مدد کو روانہ ہوئے۔ ابوسفیان اپنی چالاکی سے عام راستہ سے ہٹ کر، کسی دوسرے راستے سے مکہ کی طرف نکل گیا اور مکہ سے آئے ہوئے لشکر کی مسلمانوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں ہی اپنی بزدلی کی وجہ سے اس جنگ کے مخالف تھے اور مسلمان بھی اپنی قلت پر گھبرا رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصحاب سے مشورہ کیا۔ سعد بن معاذ اور مقداد وغیرہ نے عزم وہمت کا مظاہرہ کیا، اور کہا کہ ہماری جانیں اللہ اور اس کے رسول کے لیے وقف ہیں ہم جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو اپنے ثبات قدم سے کھیلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ غرض کہ جنگ کی ٹھہری۔ کفار کا لشکر ایک ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا لیکن اللہ نے مسلمانوں کی مدد کی اور دشمنوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ کفار کے ستّر آدمی قتل ہوئے اور ستّر ہی قید ہوئے۔ قیدیوں میں نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط قتل کر دیے گئے۔ باقی قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ اس جنگ میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے تنہا چھتیس کافروں کو موت کے گھاٹ اتارا اور ابوجہل، اس کا بھائی عاص اور عتبہ، شیبہ، ولید بن عتبہ و نیز اسلام کے بہت سے دشمن مارے گئے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ اس جنگ میں موجود تھے مگر نہ جانے کہاں روپوش تھے کہ انھوں نے جنگ ہی نہیں کی، اس جنگ کے بعد کفار کا ہر ایک گھر ماتم کدہ بن گیا اور مقتولین کے انتقام کا جذبہ مکہ کے ہر پیر و جوان میں پیدا ہو گیا جس کے نتیجہ میں احد کا معرکہ ہوا۔

جنگ احد

یہ جنگ ۱۵ر شوال ۳ھ کو ہوئی۔ اس کی روداد یہ ہے کہ جنگ بدر کی شکست سے کفار مکہ کے دلوں میں غم و غصہ اور انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے اور ابوسفیان نے مقتولین بدر کے ورثا کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنی عورتوں کو رونے نہ دیں ورنہ آنسو نکلنے سے غم و غصہ کم ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ جنگ بدر کا بدلہ لینے کی غرض سے ابوسفیان تین ہزار سواروں، دو ہزار پیادوں اور مقتولین بدر کی عورتوں کے ہمراہ مکہ سے نکلا اور مدینہ سے چار میل کے فاصلے پر کوہ احد کے دامن میں خیمہ زن ہو گیا۔

یہ خبر پیغمبرؐ کو موصول ہوئی تو آپ بھی ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ مقابلہ کو نکلے اور میدان میں پہنچ کر آپ نے عبداللہ ابن جبیر کو پچاس تیر اندازوں پر مشتمل ایک دستے کا افسر معین کیا اور اس بات کی سخت تاکید فرما دی کہ لشکر اسلام کو خواہ فتح حاصل ہو یا شکست لیکن تیر اندازوں کا یہ دستہ اپنی جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹے گا۔ اس ہدایت کے بعد آنحضرتؐ نے اسلامی لشکر کو کفار کے مقابلہ میں صف آرا کیا اور رفتہ رفتہ معرکۂ کارزار گرم ہونے لگا۔ مسلمانوں کے سخت حملوں نے دشمنوں کے حوصلے پست کر دیے اور اسلامی فوج عنقریب کامیابی سے ہمکنار ہونے ہی والی تھی کہ عبداللہ ابن جبیر کا دستہ مالِ غنیمت کی لالچ میں پیغمبرؐ کے تاکیدی حکم کے باوجود اپنی جگہ چھوڑ کر ہٹ گیا اور جس کا انجام ہوا کہ حاصل ہوتی ہوئی فتح اور کامرانی شکست میں تبدیل ہو گئی اور میدان میں بھگدڑ مچ گئی۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ تو اس طرح سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے کہ انھوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ کیا گذر رہی

ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے ساتھ حضرت عثمان بھی بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ در منشور ج ۲ ص ۸۰ اور کنز العمال ج ۱ ص ۲۳۸ میں ہے کہ ابوبکر بھاگ کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تھے۔ اور خود حضرت ابوبکر کا کہنا ہے کہ میں پہاڑ کی چوٹی پر اس طرح اچک رہا تھا جیسے پہاڑی بکری اچکتی ہے۔

اس جنگ میں ستر مسلمانوں کے ساتھ حضرت حمزہؑ بھی شہید ہوئے اور معاویہ کی ماں ہندہ نے آپ کا کلیجا نکال کر چبایا۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے جسم اقدس پر سولہ زخم آئے اور آپ کا ایک ہاتھ بھی ٹوٹا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی زخمی ہوئی اور آپ کے دو دانت شہید ہو گئے۔ اسی جنگ میں امیر المومنین کو لافتیٰ الا علی کی سند کے ساتھ ذوالفقار عطا ہوئی اور ایک روایت کے مطابق ناد علی کا نزول بھی اسی جنگ میں ہوا۔ (طبری ج ۲ ص ۶۰ ہم، تاریخ کامل ج ۲ ص ۳۶)

جنگ خندق

یہ جنگ ماہ ذیقعدہ ۵ھ میں ہوئی۔ اس جنگ کو غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ مدینہ سے جلاوطن کیے ہوئے یہودی جو خیبر کے آس پاس سکونت پذیر ہو گئے تھے، رات دن اسی فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں سے کیونکر بدلہ لیا جائے چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ مکہ گئے اور ابوسفیان سے مل کر، قبیلۂ بنی غطفان اور دیگر قبائل کے ساتھ رشتۂ اخوت قائم کیا جس کے نتیجہ میں یہودیوں اور مختلف قبائل کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ تمام قبیلوں کے بہادر اور سورما مل کر مدینہ پر ایک ساتھ حملہ کر کے اسے برباد و تاراج کر دیں کہ جس سے اسلام کی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

اس معاہدہ کے تحت، ابوسفیان مکہ سے چار ہزار کا لشکر لے کر نکلا،

اور یہودیوں نے دیگر قبائل کے ساتھ چھ ہزار کے لشکر سے پیش قدمی کی۔ غرض کہ دس ہزار کا یہ جم غفیر مدینہ پر حملہ کی نیت سے آگے بڑھا۔ پیغمبرؐ اسلام بھی مدینہ سے نکلے اور کوہِ سلع کو پشت پر لے کر جناب سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے پندرہ فٹ چوڑی اور پندرہ فٹ گہری ایک خندق کھدوائی۔ خندق کی کھدائی میں آنحضرتؐ خود بھی کمال جاں فشانی اور محنت کے ساتھ لگے رہے۔

اس جنگ میں منافقین کی ریشہ دوانیاں بھی جاری تھیں اور اندرونی خلفشار بھی تھا۔ جلال الدین سیوطی کا کہنا ہے کہ تحفظ کے پیش نظر آنحضرتؐ نے دشمنوں کی نقل و حرکت کی خبر گیری کے لیے ابوبکر اور عمر کو مامور کرنا چاہا مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا تو آپؐ نے حذیفہ کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ (درمنشور ج ۵ ص ۱۸۵)

خندق کی تیاری کے تیسرے ہی دن کفار کا لشکر آدھمکا اور دشمنوں کی کثرت دیکھ کر مسلمانوں میں تشویش کے آثار نمایاں ہوئے۔ آنحضرت نے ثابت قدمی کی ہدایت فرمائی اور ان کے حوصلوں کو بلند کیا۔ جلال و ہیبت پیغمبری سے دشمنوں میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ یکبارگی حملہ کی ہمت و جسارت کرتے۔ اس کے علاوہ بھی دشمنوں کو اس امر کا بخوبی علم تھا کہ لشکر اسلام میں علیؑ ایسا تلوار کا دھنی، شجاع اور بہادر موجود ہے۔ اس لیے اکا دکا خندق پار کر کے مسلمانوں پر حملہ کی کوشش کرتا رہا اور یہ سلسلہ ستائیسؔ دن تک برابر جاری رہا۔ آخرکار عمرو بن عبدِ وُد جو طاقت اور بہادری میں تنہا ایک ہزار جوانوں کے برابر سمجھا جاتا تھا ایک دن خندق پھاند کر خود ہی مقابلے میں آگیا اور اس نے ھل من مبارز کی صدا بلند کی۔ عمرو بن عبد ود کی آواز سن کر حضرت ابوبکر اور عمر کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ خوف و دہشت کے مارے تھرتھرانے لگے۔ حضرت عمر نے کہا کہ اس دیو پیکر سے کون لڑ سکتا ہے جو ایک ہزار قزاقوں سے تنہا مقابلہ کرتا ہے۔ خدا کی قسم

میں ایک سفر میں ایک بار اس کے ساتھ تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے قافلے پر رات کے وقت حملہ کر دیا۔ عمرو ابن عبدود اس وقت سو رہا تھا، اسے جگایا گیا، جلدی میں اسے ڈھال نہ مل سکی تو ڈھال کی جگہ اس نے اونٹ کا ایک بچہ اٹھا لیا اور قزاقوں پر حملہ کر کے انھیں بھگا دیا۔

حضرت عمر کے اس بزدلانہ بیان نے مسلمانوں کو اور بھی خوف و دہشت میں مبتلا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرتؐ نے لشکرِ اسلام کو مخاطب کر کے مقابلہ کی ہمت دلائی لیکن ایک بہادر نوجوان کے علاوہ کوئی نہ سنکا۔ تاریخ خمیس، روضۃ الاحباب اور روضۃ الصفا میں ہے کہ تین بار آنحضرت نے اپنے صحابہ (ابوبکر اور عمر وغیرہ) سے مقابلہ کے لیے کہا، لیکن یہ لوگ چپ رہے اور ان میں سے کوئی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بزدلوں کے سروں پر طائر بیٹھے ہوں۔ صرف ایک علیؑ ابن ابی طالبؑ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر بار بار لبیک کہہ رہے تھے۔

جب صحابہ میں کوئی تیار نہ ہوا تو پیغمبر اسلامؐ نے علیؑ کو اجازت دی اور انھیں اپنی زرہ پہنا کر اپنا عمامہ ان کے سر پر رکھا۔ اپنی تلوار مرحمت کی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر فرمایا کہ پالنے والے، جنگ بدر میں عبیدہ اور جنگ احد میں حمزہ کو تیری بارگاہ میں نذر کر چکا ہوں اور اب میرے پاس صرف علیؑ رہ گئے ہیں، مالک! تو ان کی حفاظت فرما، اور جب علی مرتضیٰؑ آپؐ کی دعاؤں کے سائے میں عمرو ابن عبدود سے جنگ کے لیے چلے تو آپ نے فرمایا کہ دیکھو آج کُلِّ ایمان کُلِّ کفر کے مقابلہ میں جا رہا ہے۔ (حیواۃ الحیوان ج ۱ ص ۲۳۸ و سیرۃ محمدیہ ج ۲ ص ۱۰۲)

حضرت علی علیہ السلام عمرو ابن عبدود کے مقابل ہوئے اور جنگ شروع ہوئی، عالم یہ تھا کہ گرد و غبار کے پردے میں صرف دو تلواریں تھیں جو چمکتی ہوئی

دکھائی دیتی تھیں، اس کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ حضرت علیؑ نے جب نعرہ تکبیر بلند کی تو مسلمانوں کو اطمینان ہوا کہ عمرو پر علیؑ غالب آگئے۔ پیغمبر اسلام نے عمرو ابن عبدود کے قتل کی خبر سنی تو فرمایا کہ آج کے دن علیؑ کی ایک ضربت عبادت ثقلین سے بہتر ہے۔

عمرو بن عبدود کے قتل ہوتے ہی اس کے تمام ساتھی خندق پھاند کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر کیا تھا، حضرت علیؑ نے کفار کے لشکر میں گھس کر دشمنوں کو تلوار کی باڑھ پر لے لیا اور یہ جنگ اللہ کی مدد اور علیؑ کی قوت سے سر ہوئی۔ اس جنگ میں حضرات شیخین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اپنے جسم پر ایک خراش تک نہ آنے دی۔ (تاریخ احمدی ص ۵۰ و سیرۃ محمدیہ ج ۲ ص ۱۰۲)

بعض کتابوں میں ہے کہ عمرو ابن عبدود کے سینے پر چڑھ کر حضرت علیؑ اس کا سر کاٹنا چاہتے تھے کہ اس نے لعاب دہن سے چہرۂ اقدس پر بے ادبی کی۔ حضرت کو غصہ آگیا لیکن آپ یہ سوچ کر فوراً سینے سے اتر آئے کہ کارِ خدا میں جذبۂ نفس شامل ہو رہا تھا۔ چنانچہ جب غصہ فرو ہوا تو آپ نے سر کاٹا اور زرہ اتارے بغیر رسالت مآب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے علیؑ کو سینے سے لگایا۔

بروایت سلیمان قندوزی جبرئیل امین نے آسمان سے انار لاکر تحفہ عنایت کیا۔ انار کے ساتھ ایک سبز رنگ کا رومال بھی تھا جس پر "علیٌّ ولیُّ اللہ" لکھا تھا۔

جنگ خیبر

یہ جنگ ۷ھ میں ہوئی۔ خیبر مدینہ منورہ سے تقریباً پچاس میل کی دوری پر واقع ہے۔ اس جنگ کا واقعہ یہ ہے کہ وہاں کے سرکش یہودیوں نے باہم متحد ہو کر قبیلۂ بنی اسد اور بنی غطفان کی مدد سے مدینہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا

چنانچہ یہودیوں کے اس منصوبہ کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوا تو آپ چودہ سو پیادوں اور دو سو سواروں کا ایک لشکر لے کر ان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۴ ربیع/صفر ۷ھ کو خیبر میں پہنچ کر اس کا محاصرہ کیا۔ خیبر میں یہودیوں کی جو سب سے بڑی پناہ گاہ تھی وہ قلعۂ قموص کے نام سے مشہور ہے۔

تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس جنگ میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر پر بھی مردانگی سوار ہوئی اور یہ لوگ بھی میدان کارزار میں گئے، لیکن مرحب و عنتر وغیرہ نے انھیں دوڑایا تو بہادری اور مردانگی کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ حضرت عمر دو بار مقابلہ کے لیے نکلے۔ لیکن جب کھدیڑے گئے تو آپ نے بھاگ کر سیدھے اپنے خیمہ میں دم لیا۔ مستدرک حاکم، تاریخ طبری ج ۳ ص ۹۳ تاریخ احمدی ص ۵۹ اور شواہد النبوۃ ص ۸۵ وغیرہ میں مرقوم ہے کہ حضرت عمر نے اپنی اس کھسیاہٹ کے تحت لشکر اسلام کو بزدل قرار دیا اور لشکر اسلام نے انھیں بزدل ٹھہرایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دوران درد شقیقہ میں مبتلا تھے اور اپنی اس ناسازیٔ طبع کی بنا پر اپنے خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ میدان جنگ مسخروں اور بھگوڑوں کی آماجگاہ بنتا جا رہا ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں کل اپنے ہاتھوں سے علم اس کو دوں گا جو کرار اور غیر فرار ہوگا اور وہ خدا اور رسول کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا اور رسول اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔ وہ دشمنوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والا ہوگا اور میدان جنگ سے اس وقت تک نہ پلٹے گا جب تک قلعۂ قموص فتح نہ ہو جائے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اعلان سے بزدلوں اور بھگوڑوں کے دلوں میں اس خواہش نے سر اٹھایا کہ شاید رسولؐ کی نگاہ انتخاب ان کی

جانب ملتفت ہو جائے اور پیغمبرؐ سے ملنے والی یہ سعادت ان کے ہی حصہ میں آجائے اس لیے ان لوگوں نے بے خوابی کے عالم میں کسی طرح رات کاٹی اور جب صبح ہوئی تو سرداری کا حوصلہ دل میں لیے رسولؐ کے خیمہ کا طواف کرنے لگے کہ علم مل جائے۔ لیکن اس وقت ان کا یہ سنہرا خواب چکنا چور ہو گیا جب زبانِ رسالت مآبؐ پر حضرت علیؑ کا نام آیا۔ فوراً بڑھ کر ایک نے کہا کہ حضور! علیؑ تو آشوب چشم میں مبتلا ہیں وہ جنگ کیوں کر کر سکتے ہیں؟ ابھی یہ جملہ ناتمام ہی تھا کہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام خدمت رسولؐ میں آتے دکھائی دیے۔ پیغمبرؐ نے امیر المومنین کو بڑھ کر گلے لگایا اور آپ کا سر اپنے زانو پر رکھ کر آپ کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا جس سے آپ کا آشوب چشم جاتا رہا اور بخار بھی اتر گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے علم حضرت علیؑ کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ جا کر قلعۂ قموص کو فتح کرو۔ امیر المومنین نے دریافت فرمایا کہ کب تک جنگ کروں، رسول نے فرمایا کہ جب تک قلعہ فتح نہ ہو جائے۔

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اپنی سابقہ شان شجاعت کے ساتھ میدان میں آئے اور علم کو ایک پتھر پر گاڑ دیا۔ یہ منظر ایک یہودی دیکھ رہا تھا اس نے بڑھ کر امیر المومنین سے آپ کا نام دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں علی ابن ابی طالب ہوں۔ یہ سننا تھا کہ وہ یہودی اپنی جان لے کر بھاگا اور قلعہ میں پہنچ کر یہودیوں سے بولا کہ خدا کی قسم آج ہم سب مارے جائیں گے کیونکہ اس قلعہ کے فاتح کے جو اوصاف توریت میں بیان ہوئے ہیں وہ سب علیؑ میں موجود ہیں۔

الغرض جنگ چھڑی اور معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ حارث، عنتر، ربیع اور

مرحب جیسے نامی وگرامی پہلوان ذوالفقار حیدری کی زد میں آئے اور موت کے گھاٹ اتر گئے۔ بالآخر یہودیوں میں بھگدڑ مچی اور بھاگتے بھاگتے ایک یہودی نے امیرالمومنینؑ کے ہاتھ پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ڈھال آپ کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ شیر ذوالجلال کو جلال آیا اور آپ نے قلعہ کے آہنی دروازہ پر اپنا بایاں ہاتھ رکھ کر زور دیا تو انگلیاں باب خیبر میں اس طرح در آئیں کہ جس طرح موم میں لوہا در آتا ہے۔ وہ دروازہ جسے چالیس پہلوان مل کر جنبش نہ دے سکتے تھے، ایک جھٹکے میں ہاتھوں پر اس طرح آگیا کہ جیسے کوئی شاخ سے پھول توڑ لے۔

درِ خیبر کو آپ نے ڈھال کی جگہ استعمال کرکے دشمنوں سے جنگ کی اور پھر اسی کا پل بنا کر اسلام کی فوج کو قلعہ کے اندر داخل کیا جس کے نتیجہ میں یہودیوں کو شکست ہوئی اور لشکر اسلام ظفریاب ہوا۔ حضرت علی علیہ السلام قلعہ قموص فتح کرنے کے بعد کامیابی وکامرانی کا تاج پہنے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں واپس پلٹے۔

روضۃ الصفا میں باب خیبر کا وزن تین ہزار من بتایا گیا ہے۔ چونکہ اس در کا اکھاڑنا قوت انسانی سے باہر تھا اس لیے امیر المومنینؑ نے یہ وضاحت بھی فرما دی تھی کہ میں نے باب خیبر کو قوت ربانی سے اکھاڑا ہے۔

طبری ج ۳ ص ۹۳ میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ سرداری کا جیسا حوصلہ مجھے خیبر میں ہوا، ایسا کبھی نہیں ہوا......

نوٹ:۔ تاریخ کی کتابوں میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ کسی جنگ کے موقع پر رسول خداؐ نے حضرات شیخین کے سپرد علم کیا ہو۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ میدانِ کارزار میں علم اس کو دیا جاتا ہے جو فن حرب میں مہارت اور میدان جنگ کا تجربہ رکھتا ہو۔ بھلا شیخین کو فن حرب سے کیا تعلق؟ جبکہ حضرت ابوبکر ایک معمولی بزاز

کے بیٹے اور حضرت عمر ایک غریب ومزدور پیشہ لکڑہارے کے فرزند تھے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علالت سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ دیہرسل کی غرض سے خیبر میں بزعم خود علم لے بھاگے ہوں اور مرحب وغیرہ نے کھدیڑ کر انھیں خیمہ تک پہنچا دیا ہو۔ (واللہ اعلم)

جنگ حنین

یہ جنگ ۶؍ شوال ۸ھ میں لڑی گئی۔ حنین ایک وادی کا نام ہے جو مکہ سے طائف کی سمت تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس جنگ کا تاریخ میں ایک اہم مقام ہے لیکن مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے اس جنگ کا تذکرہ اپنی کتاب میں نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ اس جنگ کے حالات بیان کرنے سے وہ راز ہائے سربستہ منکشف ہوتے ہیں جنھیں مولانا ندوی نے پردے میں چھپانا چاہا ہے اور ان لوگوں کا فرار ثابت ہوتا ہے جو سیف اللہ کہے جاتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس جنگی تسلسل کے آخر میں اس جنگ کی بھی اجمالی تفصیل پیش کی جائے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔ اس جنگ کا واقعہ یہ ہے کہ:۔

فتح مکہ کے بعد، قبیلہ بنی خثعم، بنی سعد، بنی ہوازن اور بنی ثقیف وغیرہ نے ایک اجماع میں یہ فیصلہ کیا کہ سب مل کر مسلمانوں پر حملہ کریں۔ اس تجویز کے بعد سب قبیلوں نے متفقہ طور پر اپنا سردار مالک بن عوف کو مقرر کیا اور لشکر کی علمبرداری ابوجرول کے سپرد کی گئی اور یہ لوگ پانچ ہزار کا ایک لشکر لے کر حنین اور طائف کے درمیان اوطاس کے مقام پر جمع ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہ ہزار کے لشکر کے ہمراہ جس میں دو ہزار نومسلم بھی شامل تھے مقابلہ کے لیے نکلے۔ حسب معمول حضرت علیؑ اسلامی لشکر

کے علمبردار تھے۔ جب لشکر میدان میں پہنچا تو حضرات شیخین کو اپنی کثرت اور دشمنوں کی قلت پر ایسا گھمنڈ ہوا کہ فرمانے لگے، آج ہم تعداد میں اس قدر ہیں کہ دشمنوں کو پیس کر رکھ دیں گے۔

شیخین کا یہ غرور اور گھمنڈ شاید اللہ کو بھی ناگوار گذرا اور ابھی یہ دونوں برادران اپنی کثرت پر ناز فرما ہی رہے تھے کہ پہاڑوں میں چھپے ہوئے دشمنوں نے تیروں اور پتھروں سے اچانک حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ بزدلوں کو جان کے لالے پڑ گئے اور ان کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ جنگ کی بساط الٹتے ہی یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمنوں میں چھوڑ کر اس طرح بھاگے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ رسول اللہ آوازیں دیتے رہے کہ اے بیعت رضوان والو! کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ لیکن پیغمبر اسلام کی یہ آواز صدائے بازگشت کی طرح گونجتی رہی اور بھاگنے والے بھاگتے رہے۔

حبیب السیر اور روضۃ الاحباب میں ہے کہ بھاگنے والوں میں سب سے پہلے خالد بن ولید (سیف اللہ) بھاگے، ان کے پیچھے نو مسلم تھے۔ ان کے پیچھے ابو بکر، ان کے پیچھے عمر اور عثمان وغیرہ، ان کے پیچھے انصار و مہاجر بھاگے۔ غرضکہ بزدلوں کی یہ میل ٹرین بزدلی کی پٹری پر تیزی سے بھاگ رہی تھی اور خالد بن ولید جنھیں سیف اللہ کہا جاتا ہے انجن کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ الغرض رسول اسلام کے تحفظ میں علی ابن ابی طالبؑ، عباس، زید بن حارث اور ابن مسعود کے علاوہ کوئی نہ ٹھہرا۔ (سیرت حلبیہ ج ۲ ص ۱۰۹)

حالات کی نزاکت کے پیش نظر رسول اللہ نے بہ ذات خود جنگ کا ارادہ کیا لیکن عباس نے بڑھ کر لجام فرس تھام لی اور بھاگتے ہوئے لوگوں کو پکار پکار کر انھیں شرم و غیرت دلائی۔ عباس کی آواز پر تقریباً سو آدمیوں کا ایک دستہ

پلٹ کر آیا اور دشمن بھی پہاڑوں سے نکل کر مقابل ہو گئے۔ گھمسان کی جنگ ہوئی ابو جرول جو کفار کے لشکر کا علمبردار تھا، حضرت علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کا قتل ہونا تھا کہ مسلمانوں کے حوصلے یک بارگی بڑھ گئے اور آخر کار اللہ نے حضرت علیؑ کے توسل سے اس جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی عطا کی۔

یہ ہیں حضرات ابو بکر اور عمر وغیرہ کے قابل فخر جنگی کارنامے جو تاریخی حیثیت سے مستند اور مسلم ہیں۔ مولانا ابو الحسن صاحب ندوی یا ان کے مسلک کے حضرات اپنے ان مذہبی پیشواؤں اور دینی مقتداؤں کے ان کارناموں پر جس قدر بھی ناز فرمائیں بجا ہے

صلح حدیبیہ اور ابو بکر کی گالیاں

مولانا ابو الحسن ندوی نے اپنی کتاب میں صلح حدیبیہ کے حالات کی تفصیل بیان کرتے وقت حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی موجودگی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور نہ ان کی اس گفتگو کو بیان کیا ہے جو تاریخ ساز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اختصار کے ساتھ ان واقعات کو پیش کر دوں جنھیں مولانا نے قصداً نظر انداز کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

ماہ ذیقعدہ سنہ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کے لیے روانہ ہوئے اور راستے میں ایک کنویں کے پاس قیام فرمایا جس کا نام حدیبیہ تھا۔ وہاں آپ نے اپنے تمام اصحاب سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ اسی بیعت کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے اور بیعت کرنے والوں کو اصحاب سمرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

چونکہ رسول اللہ کے لیے مکہ کا ماحول سازگار نہیں تھا اس لیے قریش کے خصوصی ایلچی عروہ نے آپ کو یہ مشورہ دیا کہ اس سال آپ حج سے باز آئیں۔ اول تو مکہ کا ماحول درست نہیں ہے۔ دوسرے میں آپ کے گرد ایسے غلط اور

اوباش لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جو وقت پڑنے پر آپ کو چھوڑ کے بھاگ جائیں گے

عروہ چونکہ شیخین کی بزدلی سے باخبر تھا اس لیے اس کا یہ مشورہ کسی حد تک درست بھی تھا لیکن حضرت ابوبکر کو اس کی یہ بات پسند نہ آئی اور وہ آپے سے باہر ہو گئے اور آپ نے گالیوں کی بوچھار شروع کر دی۔ فرمایا کہ جا اور جا کر اپنے معبود (لات وہبل) کی شرمگاہ چوس اور اس کے بظر آلات کا مزہ لے۔ کیا ہم ایسے ہیں کہ رسول کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔
(تجرید بخاری، حدیث ۱۰۹۷، شرح زرقانی ص ۲۱۹ اور روضۃ الاحباب ص ۲۱۵ وغیرہ)

حضرت ابوبکر کے اس طرز عمل سے واضح ہے کہ آپ گالیوں کے ایسے مجتہد تھے کہ آپ کو پیغمبر کی موجودگی کا بھی کوئی ادب، احترام یا لحاظ نہیں تھا۔

تاریخ ابن اثیر میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار مکہ سے مصالحانہ گفتگو کی غرض سے ابوبکر اور عمر کو مکہ روانہ کرنا چاہا لیکن ان لوگوں نے جانے سے انکار کیا تو آپ نے عثمان کو بھیجا۔ حضرت عثمان چونکہ ابوسفیان کے بھتیجے تھے اس لیے کفار سے انھیں کوئی خطرہ نہیں تھا لہٰذا وہ گئے اور گفتگو کے بعد مصالحت کا معاہدہ ضابطۂ تحریر میں آیا لیکن اس کی صورت یہ نہیں تھی جیسے مولانا ندوی نے ظاہر کیا ہے۔

تاریخ خمیس ج ۱ ص ۱۵ اور در منثور ج ۶ ص ۷۷ میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمر نے فرمایا کہ محمدؐ کی نبوت میں جیسا شک آج مجھے ہوا، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔

حضرت عمر کے اس قول ہی سے ظاہر ہے کہ وہ محمدؐ کی نبوت کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھا کیے لیکن حدیبیہ میں موصوف کا یہ شک شاید ان کی یقین کی منزلوں میں داخل ہو چکا تھا۔ جب کہ قرآن کا یہ حکم ہے کہ رسول اللہ صلعم کی

کی رسالت پر شک کرنے والا کافر اور رسول اللہؐ کو صدمہ پہنچانے والا جہنمی ہے۔

ابن خلدون کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کے اس طرز عمل سے رسول اللہؐ بے حد ملول اور کبیدہ خاطر ہوئے۔ (تاریخ ابن خلدون ۳۰۶)

ابوبکر سے رسول اللہؐ کی بیزاری

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ وقت آخر آنحضرت نے مجھ سے فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ، میں نے اپنے باپ ابوبکر کو بلایا جب وہ آئے تو آپ نے ان کی طرف سے اپنا منھ پھیر لیا اور ان سے کوئی کلام نہیں کیا۔ پھر فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ، دوسری بار میں نے عمر بن خطاب کو بلایا آپ نے ان سے بھی کوئی کلام نہ کیا اور جب تیسری بار پھر فرمایا تو میں نے علیؑ ابن ابی طالب کو بلایا جب وہ آئے تو آپ نے انھیں اپنی چادر میں لے لیا اور وقت آخر تک انھیں اپنے سینے سے لگائے رہے۔ (ماحض النغیہ ص ۱۸۰)

روضۃ الاحباب ج ۱ ص ۵ تاریخ بغداد ص ۱۲۹۰ اور مدارج النبوہ ج ۲ ص ۵۱۱ میں مرقوم ہے کہ آنحضرتؐ نے سیدہ اور حسنینؑ کو بھی طلب فرمایا تھا اور انھیں یہ وصیت فرمائی تھی کہ میرے بعد تمھیں سخت مصائب وآلام کا سامنا ہوگا مگر تم صبر کرنا اور جب اہل دنیا، دنیا پرستی کریں تو تم دین اختیار کیے رہنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت

المرتضیٰ کے فاضل مولف مولانا ندوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افسوس ناک شہادت کو وفات سے تعبیر کیا ہے جبکہ الوافی ج ۱ ص ۶۶ بحوالۂ تہذیب الاحکام، سر العالمین طبع مطبع بمبئی ۱۳۱۴ھ ص ۷، صحیح بخاری مطبوعہ مصر

ج ۲ باب اللدود، کتاب الطب اور مشکوٰۃ شریف باب ۳ ص ۵۸ وغیرہ میں موجود ہے کہ مدینہ میں دوران علالت پیغمبر اسلام کو بستر علالت پر ہی زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

زہر دینے والا کون تھا؟ اس کی صراحت مذکورہ کتابوں میں نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر نہیں کی گئی یا نہیں رہ گئی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ دوران علالت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بستر مرض حضرت عائشہ کے قبضہ میں تھا، جیسا کہ انگریز مورخ اور ادیب مسٹر گبن کا کہنا ہے کہ، "رسول کا بستر عائشہ جیسی چالاک عورت کے محاصرے میں تھا جو ابو بکر کی بیٹی اور علیؑ کی سخت دشمن تھیں۔" (تاریخ عروج وزوال سلطنت روم ص ۹۲۸)

حضرت عائشہ کا رویہ یقیناً امیر المومنین سے ہمیشہ معاندانہ رہا اور اکثر ان کے دل کی کدورت ان کے چہرے سے ظاہر ہوجاتی اور ان کے طرز عمل سے نفرت و بیزاری جھلک اٹھتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر کسی واقعہ کے سلسلے میں حضرت علیؑ کا نام آجاتا تو ان کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے۔ اس نفرت و عناد کا ایک خاص سبب جناب فاطمہ زہرا کا وجود بھی تھا جن کی ہمہ گیر عظمت و توقیر ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور سوتاپے کی جلن یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ پیغمبر اسلام، سوت کی دختر کو اس طرح چاہیں کہ اسے دیکھتے ہی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جائیں اور اپنی مسند پر جگہ دیں اور سیدۃ النساء العالمین کہہ کر دنیا کی تمام عورتوں پر اس کی فوقیت ظاہر کریں اور اس کی اولاد کو اس حد تک عزیز رکھیں کہ انھیں اپنا فرزند کہہ کر پکاریں۔ یہ تمام چیزیں حضرت عائشہ پر شاق گذرنے والی تھیں اور فطری طور پر ان کے جذبات اس موقع پر یہی ہونگے کہ اگر خود ان کے بطن سے کوئی اولاد ہوتی تو وہ پیغمبر کے بیٹے کہلاتے اور بجائے

حسنینؑ کے وہ آپ کی محبت کا مرکز بنتے مگر ان کی گود اولاد سے ہمیشہ ہی خالی رہی اور ماں بننے کی آرزو کو اپنے بھانجے کے نام پر اپنی کنیت ام عبداللہ رکھ کر پورا کر لیا۔ غرض یہ سب چیزیں ایسی تھیں جنھوں نے عائشہ کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا جس کے تقاضے سے مجبور ہو کر آپ جناب سیدہ کے خلاف پیغمبر سے شکوہ وشکایت بھی کرتی رہتی تھیں۔ مگر آنحضرت کی توجہات ان کی طرف سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس رنجش وکشیدگی کا تذکرہ حضرت ابو بکر کے کانوں میں بھی برابر پہنچتا رہتا تھا جس سے وہ دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتے رہتے تھے۔ مگر ان کے کیے بھی کچھ نہ ہو پاتا تھا سوا اس کے کہ ان کی زبانی ہمدردیاں اپنی بیٹی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام کو دنیا سے رخصت کیا گیا اور حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی۔ اب موقع تھا کہ وہ جس طرح چاہتے انتقام لیتے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتے اور جو تشدد چاہتے فاطمہ زہراؑ کے لیے روا رکھتے۔ چنانچہ پہلا قدم یہ اٹھایا کہ جناب سیدہ کو محروم الارث قرار دینے کے لیے آپ نے پیغمبروں کے ورثہ کی نفی کر دی کہ نہ وہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ ان کا کوئی وارث ہوتا ہے بلکہ ان کا ترکہ حکومت کی ملکیت ہوتا ہے۔ ابو بکر کے اس طرز عمل سے جناب فاطمۃ الزہراؑ اس قدر متاثر ہوئیں کہ آپ نے ترک کلام کر دیا اور انھیں تاثرات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ حضرت عائشہ نے اس موقع پر بھی اپنی روش نہ بدلی اور یہ تک گوارا نہ کیا کہ ان کے انتقال پر افسوس کا اظہار کرتیں۔ چنانچہ ابن ابی الحدید کا کہنا ہے کہ "جب حضرت فاطمہ زہراؑ نے رحلت فرمائی تو تمام ازواج پیغمبر بنی ہاشم کے یہاں تعزیت کے لیے پہنچ گئیں سوا عائشہ کے کہ وہ نہ آئیں اور یہ ظاہر کیا کہ وہ مریض ہیں اور ان کی طرف سے حضرت علی کے کانوں میں ایسے الفاظ پہنچے جن سے ان کی مسرت وشادمانی کا پتہ چلتا ہے"

(شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۱۵۹)

جب جناب سیدہ سے اس حد تک دشمنی تھی تو جن سے آپ کا دامن وابستہ تھا وہ حضرت عائشہ کی دشمنی اور عناد سے کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا جبکہ ایسے واقعات بھی رونما ہوتے رہے ہوں جو اس مخالفت کو ہوا دیتے اور جذبۂ نفرت کو ابھارتے رہے ہوں۔ جیسے واقعۂ افک کے سلسلے میں حضرت علی کا پیغمبرؐ سے یہ کہنا کہ "یہ تو آپ کی جوتی کا تسمہ ہے۔" اسے چھوڑیے اور طلاق دے کر الگ کیجیے۔

جب حضرت عائشہ نے یہ سنا ہوگا تو یقیناً بے قراری کے بستر پر کروٹیں بدلنے لگی ہوں گی اور حضرت علی کے خلاف جذبۂ شدت نفرت کے ساتھ آپ کے دل میں ابھرتا ہوگا۔ پھر ایسے واقعات بھی پیش آتے رہے کہ ان کے باپ حضرت ابوبکر کے مقابلہ میں حضرت علی کو امتیاز دیا گیا اور ان کے مدارج کو بلند و نمایاں کر کے دکھایا گیا، جیسے کہ تبلیغ سورۂ برارت کے سلسلے میں پیغمبر کا انھیں معزول کر کے واپس بلا لینا اور یہ خدمت علیؑ کے سپرد کرنا۔ مسجد نبوی میں کھلنے والے تمام دروازے جن میں حضرت ابوبکر کا بھی دروازہ تھا، چنوا دینا اور صرف حضرت علیؑ کے گھر کا دروازہ کھلا رہنے دینا وغیرہ، یہ وہ باتیں تھیں جن کے سبب سے حضرت علیؑ کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عائشہ کا اہل بیت سے جذبۂ نفرت بام عروج پر تھا۔

اس کے علاوہ بھی حضرت عائشہ اپنے باپ کے مقابلے میں حضرت علی کا تفوق گوارا نہ کر سکتی تھیں اور جب بھی کوئی امتیازی صورت پیدا ہوتی تو اسے ٹالنے کی کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھتی تھیں۔ چنانچہ جب پیغمبرؐ نے آخر وقت حضرت اُسامہ کے ہمراہ لشکر روانہ کیا اور حضرت ابوبکر اور عمر کو بھی ان کے زیرِ امارت جانے کا حکم دیا تو ازواج پیغمبرؐ کے ذریعہ انھیں یہ پیغام ملتا ہے کہ پیغمبرؐ کی حالت نازک ہے، لشکر کو آگے بڑھنے کے بجائے پلٹ آنا چاہیے۔ کیونکہ حضرت عائشہ

اور حضرت ابوبکر کی نظروں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ مدینہ کو مہاجرین و انصار سے خالی کرنے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کے بعد علی سے کوئی مزاحمت نہ کر سکے اور کسی شورش انگیزی کے بغیر آپ منصب خلافت پر فائز ہو سکیں۔ چنانچہ جیش اسامہ اس پیغام پر پلٹ آیا۔ جب پیغمبرؐ نے یہ دیکھا تو اُسامہ کو پھر لشکر سے جانے کی تاکید فرمائی اور یہ تک فرمایا کہ جو شخص لشکر اسامہ سے تخلف کرے گا اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ لشکر روانہ ہوا مگر پھر انھیں واپس بلا لیا جاتا ہے یہاں تک کہ پیغمبرؐ پر نزع کا عالم طاری ہونے لگا لیکن لشکر کو روانہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ اس کارروائی کے بعد بلالؓ کے ذریعہ حضرت ابوبکر کو یہ کہلوایا جاتا ہے کہ وہ نماز میں امامت کے فرائض انجام دیں تاکہ ان کی خلافت کا راستہ ہموار ہو جائے۔ چنانچہ اسی کے پیش نظر انھیں خلیفۃ الرسول علی الصلوٰۃ کہہ کر خلیفہ علی الاطلاق مان لیا گیا اور پھر ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ کسی طرح خلافت امیر المومنین تک نہ پہنچ سکے لیکن دورِ عثمانیہ کے بعد حالات نے اس طرح کروٹ لی کہ لوگ حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت عائشہ اس موقع پر مکہ میں تشریف فرما تھیں۔ انھیں جب امیر المومنین کی بیعت کا علم ہوا تو ان کی آنکھوں سے شرارے برسنے لگے۔ غیظ و غضب نے نسوانی مزاج میں برہمی پیدا کر دی اور دیرینہ نفرت نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ جس خون کے بہانے کا فتویٰ دے چکی تھیں اسی کے قصاص کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور کھلم کھلا اعلان جنگ کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں ایسا کشت و خون ہوا کہ بصرہ کی سرزمین سرخ ہو گئی اور افتراق انگیزی کا دورہ ہمیشہ کے لیے کھل گیا۔

مولانا ندوی نے اپنی کتاب 'المرتضیٰ' میں ابوبکر کے نماز پڑھانے کا واقعہ بڑی اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں حضرت ابوبکر کو انتہائی

فضیلت کا حامل قرار دیا ہے۔ اوّل تو نماز پڑھانے کا یہ حکم رسول اللہ صلعم کا نہیں بلکہ آپ کی بیٹی حضرت عائشہ کا تھا جس کے ذریعہ وہ اپنے باپ کی خلافت کا راستہ ہموار کر رہی تھیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ علمائے اہل سنت کے نزدیک اسلام میں امامت نماز کی کچھ اہمیت اور فضیلت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ "ہر مسلمان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے خواہ وہ نیک ہو یا فاسق و فاجر ہو یا گناہ کبیرہ ہی کیوں نہ کرتا ہو" (دیکھیے مشکوٰۃ المصابیح باب الامامت)

جب فاضل مولف کے علماء کے نزدیک ایک فاسق، فاجر اور گناہ کبیرہ کے مرتکب انسان کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے تو پھر حضرت ابو بکر کو فضیلت دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور نہ حضرت ابو بکر کا یہ سازشی عمل اس قابل ہے کہ اس کو موضوع بحث قرار دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کے باب میں جو وضاحت پیش کی گئی وہ اہم اور ضروری تھی۔ اب ہم پھر رہوار قلم کو موضوع شہادت کی طرف موڑتے ہیں تاکہ گفتگو ناتمام نہ رہے۔

۲۸ صفر ۱۱ھ کا دن عالم اسلام میں قیامت کی طرح نمودار ہوا جب اللہ کے آخری رسولؐ نے زہر سے لبریز جام شہادت نوش فرما کر اپنے معبود کو لبیک کہا ملک الموت نے آپ کے خلعت ظاہرہ کو اتار کر حلۂ بہشت پہنایا۔ بزم انبیاء اور صف ملائکہ سے انا للہ وانا الیہ راجعون کا شور بلند ہوا۔ دین اسلام نے فرش غم بچھایا اور شریعت مصروف ماتم ہو گئی۔

ایک طرف اہل بیت اطہار میں کہرام تھا تو دوسری طرف کچھ سفاک چہروں پر مسکراہٹیں تھیں۔ اس غم و اندوہ کے ماحول اور کرب و اضطراب کے عالم میں فطرت انسانی کا تقاضا تو یہ تھا کہ رسول کی عقیدت و محبت کا دم بھرنے والے اور

بزم ادب آموز میں بیٹھنے والے آل رسولؐ کے غم زدہ دلوں کے زخموں پر تسلی کا مرہم رکھتے اور انھیں ہر طرح کا دلاسہ دیتے۔ لیکن افسوس کہ یہ سب کچھ نہ ہو سکا بلکہ حصول اقتدار کا ایک سوچا سمجھا ہوا دیرینہ منصوبہ انسانیت کی راہ میں حائل ہو گیا اور جس نے صحابیت کے تمام فرائض پر پانی پھیر کر صحابہ کو کسی قابل نہ رکھا۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی سب سے پہلے شخص حضرت عمر تھے جو برہنہ تلوار لیے ہوئے مصلحت کے اسٹیج پر کسی فلمی اداکار کی طرح نمودار ہوئے اور اپنی گرجدار و بے ہنگم آواز میں بولے کہ خبردار اگر رسول کے بارے میں کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو خدا کی قسم میں اس کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالوں گا اور اس کی گردن اڑا دوں گا۔ اس ہنگامہ آرائی اور اداکاری کا مقصد در اصل اپنے منصوبہ کے تحت رسولؐ کی خبر شہادت کو روکنا اور مسلمانوں میں دہشت پھیلانا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سسرے حضرت ابو بکر نہ جانے کس مصلحت کے پیش نظر مدینہ سے ملحق ایک گاؤں سُنح میں اپنے خسر خارجہ بن زید انصاریؓ کے یہاں قیام پذیر تھے اور اپنی نئی نویلی دولہن سے داد خواہی میں مصروف تھے جبکہ اصولاً آپ کو دوران علالت اپنے داماد کے پاس موجود رہنا چاہیے تھا۔

چنانچہ اپنی اداکاری کے دوران حضرت عمر نے سالم بن عبید کو آپ کے پاس دوڑایا کہ رسول اللہؐ دنیا سے رخصت ہو چکے اب آپ فوراً آئیے ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

حضرت ابو بکر گویا منتظر تھے۔ فوراً آئے اور آتے ہی آپ نے حضرت عمر کے کان میں نہ جانے کون سا منتر پھونک دیا کہ آن واحد میں آپ کا سارا بھوت اتر گیا اور اداکاری ہوا ہو گئی۔

اس کے بعد یہ دونوں صاحبان ابو عبیدہ کے ہمراہ رسول اللہؐ کی میت کو

بے غسل و کفن چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ روانہ ہوگئے جہاں پیغمبر اسلام کی خلافت و نیابت کا تاج حضرت ابو بکر کو پہنانا مقصود تھا۔ چنانچہ علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ:

"آنحضرت کے انتقال کے فوراً بعد خلافت کی نزاع پیدا ہوگئی اور اس بات کا بھی انتظار نہ کیا گیا کہ پہلے رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین سے فراغت حاصل کر لی جائے۔ کس کے قیاس میں آسکتا ہے کہ رسول اللہؐ انتقال فرمائیں اور جن لوگوں کو ان کے عشق و محبت کا دعویٰ ہو وہ ان کو بے گور و کفن چھوڑ کر چلے جائیں اور اس بندوبست میں مصروف ہوں کہ مسند حکومت اوروں کے قبضہ میں نہ آجائے۔ تعجب پر تعجب یہ ہے کہ یہ فعل ان لوگوں (حضرت ابوبکر اور حضرت عمر) سے سرزد ہو، جو آسمان کے مہر و ماہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر وغیرہ تجہیز و تکفین چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے۔ یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے سقیفہ میں پہنچ کر خلافت کے باب میں انصار سے معرکہ آرائی کی اور اس طرح ان کو مشغول میں مصروف رہے گویا ان پر کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے اپنی خلافت کو نہ صرف انصار بلکہ بنو ہاشم اور حضرت علیؑ سے بزور شمشیر منوانا چاہا" (الفاروق مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۹۰۸ حصہ اول ص۴۵-۴۶).

شمس العلماء حافظ نذیر احمد صاحب اپنی کتاب امہات الامۃ میں رقم طراز ہیں:

"جن بھکّڑوں، محتاجوں اور فاقہ مست لوگوں نے فاطمہؑ کے باپ کی بدولت عروج پایا اور خاک مذلت سے اوج عزت پر پہنچے، ان کو شایان شان نہ تھا کہ فاطمہ کے باپ کی رعایت اور پرورش کے حقوق کو یکسر بھلا دیتے"

ڈاکٹر محمد ابو بکر خاں صاحب ملیح آبادی "اسلام اور بنی امیہ" کے عنوان سے محرم ۱۳۸۵ھ میں شائع شدہ اپنے ایک مقالے میں فرماتے ہیں کہ:

"سادہ لوح مسلمان اور چالاک منافقین مرے نہیں تھے بلکہ منافقت کی نقاب چہروں پر ڈالے مسلمانوں میں مل گئے تھے اور اس دن کا انتظار کر رہے تھے کہ پیغمبرؐ کی آنکھیں بند ہوں اور وہ سلطنت اسلامی پر قبضہ کر کے خوب گلچھرّے اڑائیں۔ منافقین کے نقطۂ نظر سے وفات رسولؐ کا وقت ہی اس کے لیے نہایت مناسب و مسعود تھا کہ وہ بھولے بھالے مسلمانوں کی مدد سے اپنی دیرینہ آرزوئیں بروئے کار لائیں اور ۲۳ سال تک جس بات کو دل کی گہرائیوں اور منافقت کے پردوں میں چھپائے ہوئے تھے اسے ظاہر کر کے رہیں۔ رسولؐ کے انتقال کے بعد ہی جب کہ ابھی حضور اکرمؐ کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی، جنازہ کو چھوڑ کر صحابہ کا یہ اقتدار پسند گروہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو گیا اور بالآخر حضرت ابو بکر خلیفہ بن گئے۔"

مولانا خواجہ حسن نظامی ماہنامہ "منادی" جلد ۳۴ شمارہ ۱۱ میں الکشن اور سقیفہ کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

"یہ ڈبونے والی آگ اور جلانے والا پانی ہے، اس میں سر نہیں، دل نہیں، دماغ نہیں۔ اس کی ناک میں سو سوراخ اس کے چہرے پر ہزار ہزار آنکھیں ہیں۔ اس کی غذا جھوٹ ہے، مکر ہے، فریب ہے۔ اس کی شکل بلّی سے زیادہ مسکین، مگر پنجہ شیر سے زیادہ خاردار ہے۔ اگر سقیفہ کے دن وہ گھر سے باہر نہ نکلا تو کیا ڈر ہے وہ الکشن کی حکمتوں سے تہی دست تو نہ تھا۔ وہ کون؟ میرا باپ، میرا دادا اور رسولِ خداؐ کے بعد سب سے بڑا آدمی علی مرتضیٰ علیہ السلام۔"

تاریخ احمدی ص ۱۰۸ میں بحوالہ کنز العمال عروہ سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ کے دفن کے وقت حضرت ابو بکر اور حضرت عمر موجود نہ تھے بلکہ سقیفہ میں تھے۔ قبل اس کے

کہ یہ دونوں صاحبان وہاں سے واپس آئیں، رسول اللہؐ دفن ہو چکے تھے۔

تاریخ ابن خلدون میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ میرے باپ ابو بکر اور عمر بن خطاب رسول اللہؐ کی میت کو چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے تھے۔ لیکن علیؑ ابن ابی طالبؑ، عباس اور عباس کے دونوں پسران، فضل اور قثم اور اسامہ بن زید رسول اللہؐ کی تجہیز و تکفین میں مشغول رہے۔ علیؑ نے آنحضرت کو غسل دیا، عباس اور ان کے دونوں پسران آنحضرتؐ کے جسم اطہر کو پلٹتے جاتے تھے اور اسامہ پانی ڈال رہے تھے۔ (تاریخ ابن خلدون ص ۹۳ مطبوعہ ۱۲۸۴ھ)

الغرض جب حضرت ابو بکر خلیفہ بن کر اور حضرت عمر خلیفہ بنا کر سقیفہ بنی ساعدہ سے واپس ہوئے تو دین و دنیا کے تاجدار سپرد خاک ہو چکے تھے۔

اقتدار کی خاطر شیخین نے وہ حالات پیدا کر دیے تھے کہ سرور کائنات اور دین و دنیا کے تاجدار کی میت میں آل اطہار کے علاوہ صرف پانچ آدمی شریک ہو سکے جبکہ مسلمانوں کے مجمع سے مدینہ کی گلیوں کو چھلک جانا چاہیے تھا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کی حیثیت

سقیفہ بنی ساعدہ مدینہ منورہ سے تین میل کی دوری پر ایک چھتے کا نام ہے، جہاں چور، بدمعاش اور لٹیرے جمع ہو کر لوٹ مار کا منصوبہ تیار کرتے تھے اور لوٹے ہوئے مال کا بٹوارہ کیا کرتے تھے۔ اجماع کے بعد اس مقام کی تاریخی حیثیت اس لیے اور مستحکم ہو گئی کہ یہاں حضرت علیؑ کے حقوق خلافت پر ڈاکہ ڈال کر لٹیروں نے اسے لوٹ لیا۔

سقیفہ کی کارروائی

سقیفہ کی کارروائی اسلام میں تخریب کاری کی وہ منزل ہے جہاں تمام

ارشادات پیغمبریؐ، احکام الٰہی اور اسلامی اصولوں کو فراموش کر کے، جھوٹ، فریب اور مکر کی بنیاد پر ایک غیر اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا اور اسی غیر اصولی کارروائی کے ذریعہ حضرت ابو بکر ملت مسلمہ کے خود ساختہ خلیفہ بن بیٹھے۔

شیخ محمد مہدی علیہ الرحمہ کی کتاب "جہاد حسین" کے مترجم شیخ محسن علی نجفی تحریر فرماتے ہیں:

"اگر ہم سقیفہ میں اپنائی گئی گفتگو میں منطق کا جائزہ لیں تو قبائلی تعصبات نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں چنانچہ ابو بکر کے قلم سے "اوس" اور "خزرج" کے درمیان عداوت کا احیا ہو گیا۔ انھوں نے دونوں قبیلوں کے مقتولین کا ذکر کیا اور ان زخموں کا ذکر کیا جو ابھی تک مندمل نہ ہوئے تھے۔ دوسری طرف سے حباب ابن منذر نے بھی اسی جاہلانہ جذبے بات کی اور انصار کو مشتعل کرنے اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔

مہاجرین کی سوچ بھی اس سے مختلف نہ تھی، ان کا کہنا تھا کہ محمد صلعم کے اقتدار میں ہمارا مدمقابل کون ہو سکتا ہے جبکہ ہم ان کے قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالات اسی ڈگر پر چل نکلے جس کے خطوط حضرت ابو بکر نے قائم کیے تھے۔ چنانچہ انصار قبائلی تعصب سے متاثر ہو کر بٹ گئے اور خلافت کے لیے ان کے امیدوار سعد ابن عبادہ خزرجی اس وقت گوشہ نشین ہو گئے جب قبیلۂ "اوس" نے ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔"

پیغمبرؐ کی تجہیز و تکفین کے بعد جب امیر المومنینؑ نے سقیفہ کی کارروائی کا حال سنا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ انصار کیا کہتے تھے؟ تو لوگوں نے کہا کہ وہ کہتے تھے کہ ایک ہم میں سے امیر ہو اور ایک تم میں سے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم نے

ایمان لائے۔ یہی پیغمبرؐ کے دوست اور ان کے کنبہ والے ہیں اور یہی سب سے زیادہ خلافت کے حق دار ہیں۔ جو ان سے ٹکرائے گا وہ ظالم ہوگا۔

(طبری ج ۲ ص ۴۵۷)

جب ابوبکر اپنا بیان ختم کر چکے تو حباب ابن منذر کھڑے ہوئے اور انھوں نے انصار سے مخاطب ہو کر کہا۔ اے گروہ انصار! تم اپنی باگ ڈور دوسروں کے ہاتھ میں نہ دو، دنیا تمھارے سائے میں بس رہی ہے۔ تم عزت و ثروت والے اور قبیلے و جتھے والے ہو۔ اگر مہاجرین کو تم پر بعض چیزوں میں فضیلت حاصل ہے تو تمھیں بھی بعض چیزوں پر فوقیت حاصل ہے۔ تم نے انھیں اپنے گھروں میں پناہ دی۔ تم ہی اسلام کے بازوئے شمشیر زن ہو۔ تمھاری ہی وجہ سے اسلام اپنے پیروں پر کھڑا ہوا ہے۔ تمھارے شہروں میں آزادی سے نمازیں قائم ہوئیں۔ تم تفرقہ اور انتشار سے اپنے کو بچاؤ اور اپنے حق پر یکجہتی سے جمے رہو۔ اگر مہاجرین تمھارا حق تسلیم نہ کریں تو پھر ان سے کہو کہ ایک امیر تم میں سے ہوگا اور ایک امیر ہم میں سے ہوگا۔

حباب یہ کہہ کر بیٹھے ہی تھے کہ حضرت عمر کھڑے ہو گئے اور بولے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی وقت میں دو حکمراں ہوں۔ خدا کی قسم عرب اس بات پر کبھی راضی نہ ہوں گے کہ تمھیں اپنا امیر بنائیں جب کہ نبیؐ تم میں سے نہیں تھے، البتہ عربوں کو اس امر میں پس و پیش نہ ہوگا کہ وہ خلافت کو اس کے حوالے کر دیں کہ جس کے گھرانے میں نبوت ہو اور صاحب امر بھی انھیں میں سے ہو اور انکار کرنے والے کے سامنے اس سے ہمارے حق میں کھلم کھلا دلیل اور واضح برہان لائی جا سکتی ہے۔ جو ہم سے محمدؐ کی سلطنت و امارت میں ٹکرائے گا وہ باطل کی طرف جھکنے والا ہوگا۔ (طبری ج ۲ ص ۴۵۷)

ASSOCIATION KHOJA
SHIA ITHNA ASHERI
JAMATE
MAYOTTE

یہ دلیل کیوں نہ پیش کی رسول اللہ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ انصار میں جو اچھا ہو اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور جو برا ہو اسے درگزر کیا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ اس میں ان کے لیے خلافت کا کیا ثبوت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر حکومت و امارت ان کے لیے ہوتی تو ان کے مقابلہ میں دوسروں کو وصیت کیوں کی جاتی پھر حضرت نے پوچھا کہ قریش نے کیا کہا۔ لوگوں نے کہا کہ انھوں نے شجرہ رسولؐ سے ایک ہونے کی بنا پر اپنے استحقاق پر استدلال کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ شجرہ ایک ہونے پر تو استدلال کیا لیکن اس کے پھلوں کو ضائع و برباد کر دیا۔

(جہاد حسین ص ۱۱۱۔ ۱۳ بحوالہ نہج البلاغہ ص ۲۰۹۔ ۲۱۰)

امیرالمومنین علیہ السلام کی اس حکیمانہ گفتگو کی تشریح میں مفسر نہج البلاغہ علامہ مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ فرماتے ہیں:

سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انصار کے مقابلہ میں مہاجرین کی سب سے بڑی دلیل اور وجہ کامرانی یہی چیز تھی کہ قریش چونکہ پیغمبرؐ کے ہم قوم و ہم قبیلہ ہیں لہٰذا ان کے ہوتے ہوئے کوئی غیر خلافت کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر انصار کا جم غفیر صرف تین مہاجرین کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا اور وہ نسلی امتیاز کی بنا پر بازی جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ مورخ طبری واقعات سقیفہ کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں سعد ابن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت کا اجماع کیا تو حضرت ابوبکر حضرت عمر اور ابو عبیدہ بن جراح بھی سن گن پا کر وہاں پہنچ گئے۔ اس موقع پر حضرت عمر نے پہلے ہی سے کچھ سوچ لیا تھا جسے کہنے کے لیے وہ کھڑے ہوئے مگر ابوبکر نے انھیں روک دیا اور خود کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ:

یہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے زمین پر اللہ کی پرستش کی اور

حضرت عمر کے اس بیان کے بعد حباب پھر کھڑے ہوئے اور انصار کو مخاطب کرکے کہا کہ دیکھو اپنی بات پر ڈٹے رہو اور اس کی اور اس کے ساتھی کی باتوں میں نہ آؤ۔ یہ شخص تمھارے حقوق کو دبانا چاہتا ہے۔ اگر مہاجرین نہیں مانتے تو انھیں اپنے شہروں سے نکال دو اور خلافت کو سنبھال لو۔ بھلا تم سے زیادہ اس کا حق دار کون ہو سکتا ہے۔

جب حباب خاموش ہوئے تو حضرت عمر نے انھیں سخت وسست کہا اُدھر سے بھی تلخ کلامی ہوئی اور رنگ بگڑنے لگا۔ ابو عبیدہ نے جب یہ دیکھا کہ معاملہ نازک ہے تو انصار کو ٹھنڈا کرنے اور اپنے ڈھرے پر لانے کے لیے بولے۔ اے گروہ انصار! تم وہی ہو جنھوں نے ہمیں سہارا دیا، ہماری امداد کی، اور اب اپنی روش کو نہ بدلو اور اپنے طور وطریقوں کو نہ چھوڑو۔ مگر انصار ان کی خوشامد میں نہیں آئے کیونکہ وہ سعد کے علاوہ اور کسی کی بیعت پر تیار نہ تھے اور وہ بیعت کے لیے بڑھا ہی چاہتے تھے کہ سعد ہی کے قبیلے کا ایک شخص بشیر خزرجی اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

بے شک ہم نے جہاد میں قدم بڑھایا اور دین کو سہارا دیا مگر اس سے ہماری غرض صرف اللہ کی رضامندی اور اس کے رسول کی اطاعت تھی ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ ہم تفوق جتلائیں اور خلافت کے معاملہ میں جھگڑا کریں چونکہ محمدؐ قریش سے تھے لہٰذا ان کی وراثت اور نیابت کا حق بھی انھیں کی قوم کو پہنچتا ہے۔

بشیر کا یہ کہنا تھا کہ انصار میں پھوٹ پڑ گئی اور بشیر کا مقصد بھی یہی تھا، کیونکہ وہ اپنے قبیلہ کے کسی شخص کو اس طرح بڑھتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا۔

مہاجرین نے اس افتراق سے پورا فائدہ اٹھایا اور حضرت عمر اور ابو عبیدہ

نے حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کا مکمل تہیہ کر لیا۔ ابھی وہ ان کی طرف بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ بشیر نے سب سے پہلے اپنا ہاتھ ابو بکر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر اور ابو عبیدہ نے بیعت کی اور سعد ابن عبادہ کو پیروں تلے کچل کر رکھ دیا۔

امیر المومنین علیہ السلام اس موقع پر پیغمبرؐ کے غسل وکفن میں مصروف تھے۔ بعد میں جب سقیفہ کی کارگذاری سنی تو یہ لطیف جملہ ارشاد فرمایا کہ شجرہ ایک ہونے کی دلیل تو لائے ہیں لیکن اس کے پھلوں کو ضائع کر دیا جو پیغمبرؐ کے اہل بیت ہیں۔

خلیفہ کی ضرورت اور تقرری

خلاق کائنات نے جب خلیفہ کی ضرورت کو محسوس کیا تو ملائکہ سے فرمایا کہ میں روئے زمین پر اپنا خلیفہ بھیجنے والا ہوں۔ چنانچہ اسی ارادۂ قدرت کے تحت حضرت آدم کی تخلیق عمل میں آئی، اور پھر آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاء تک یہ سلسلہ جاری رہا اور ہر نبی اپنے بعد اپنا نائب وجانشین مقرر کرتا رہا۔ غرض کہ حضرت آدم نے اپنے بیٹے شیث کو اپنا ولی عہد اور جانشیں بنایا۔ حضرت شیث نے انوش کو اور انوش نے اپنے فرزند قینان کو اپنا وصی بنایا۔ قینان نے مہائیل کو جانشیں مقرر کیا، مہائیل نے یزدیار کو اور یزدیار نے اپنے فرزند خنوخ (حضرت ادریس) کو اپنی جانشینی کا شرف بخشا۔ حضرت ادریس کے بعد اُن کے بیٹے متوشلخ ان کے جانشین ہوئے اور متوشلخ نے لمک کو اپنا خلیفہ بنایا۔ پھر حضرت نوحؑ نے اپنے فرزند سام کو اپنا جانشیں مقرر کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحٰق کو شام میں اپنا نائب اور وزیر مقرر فرمایا اور جب حضرت اسمٰعیل کا زمانۂ وفات

قریب آیا تو انھوں نے بھی اپنے بھائی اسحاقؑ ہی کو اپنی ذمہ داری سونپی۔ حضرت اسماعیلؑ نے ایک دوسرے مقام پر قیدار کو بھی اپنا وصی بنایا تھا۔ حضرت اسحاقؑ نے اپنے فرزند یعقوبؑ کو اپنا ولی عہد مقرر فرمایا۔ حضرت موسیٰؑ نے ہارونؑ کو اپنا ولی بنایا تھا لیکن ہارونؑ کا انتقال چونکہ حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا اس لیے ہارون کے بعد یوشع بن نون حضرت موسیٰؑ کے وصی مقرر ہوئے۔ یوشع بن نون نے کالب کو اور کالب نے اپنے فرزند یوساقوس کو اپنا وصی مقرر کیا۔ جناب داؤدؑ نے اپنے فرزند سلیمانؑ کو اپنا وصی مقرر کیا اور حضرت عیسیٰؑ نے اپنا وصی شمعون کو مقرر کیا۔ (روضۃ الصفا ج۱ ص ۱۸۴، تاریخ طبری ج ۱ ص ۷۶، ۸۲، ۸۳، ۱۷۲، ۱۶۷، ۲۸۵، تاریخ کامل ج۱ ص ۲۶، ۷، ۴، ۸، ۷، ۸۴ وغیرہ)

انبیاء و مرسلین میں نیابت، وصایت، ولایت اور خلافت کا یہ سلسلہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ خدا نے ہر نبی کو اپنے بعد اپنی امت کے لیے جانشین اور قائم مقام مقرر کرنے کا اختیار دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیونکر ممکن تھا کہ جو تاجدار انبیاء اور فخر مرسلین ہو وہ اپنی امت کو مفسدین اور منافقین کے رحم و کرم پر لاوارث چھوڑ جائے۔ لیکن "المرتضیٰ" کے فاضل مولف مولانا ندوی کا اپنی کوتاہ نظری کی بنا پر یہ کہنا تعجب خیز ہے کہ "اسلام نے خلیفہ کے منتخب کرنے کی ذمہ داری، مسلمانوں اور اہل شوریٰ اور اہل علم و اخلاص کے سپرد کر دی۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد اپنے جانشین کے بارے میں نہیں بتایا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ اور سربراہ ہو گا۔ اگر ایسا کرنا دینی فرائض میں داخل ہوتا اور اس کو صراحت کے ساتھ بتا دینا ضروری ہوتا تو آپ اس حکم کی تنفید ضرور فرماتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

"اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا) اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔" (سورۃ المائدہ۔ ۶۷)

(المرتضیٰ ص ۱۲۱۔ ۱۲۲)

حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا ندوی کے اس بیان پر "ماؤ دگھٹنا پھوٹے آنکھ" والی کہاوت مکمل طور پر حاوی ہے۔ اس لیے کہ مولانا نے اپنی غلط اور مہمل بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے قرآن مجید کی جس آیت کا سہارا لیا ہے اس کا نزول پیغمبر اسلامؐ پر آخری حج کی واپسی کے دوران ہوا اور پیغمبر نے اس حکم الٰہی پر عمل پیرا ہو کر میدانِ غدیر میں پالان شتر کے منبر سے علیؑ کی ولایت اور جانشینی کا اعلان کر کے اللہ کے اس پیغام کو مسلمانوں تک پہنچا دیا جس کے لیے حکم تھا۔ مکمل وضاحت باب ثانی میں پنج پنج کے۔ عنوان سے پیش کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ جہاں تک پیغمبرؐ کا اپنے بعد اپنا جانشین مقرر یا نہ مقرر کرنے کا سوال ہے اس موضوع پر مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ نے بڑی مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"پیغمبر اسلامؐ کے بعد ایک ایسی ہستی کا وجود ناگزیر تھا جو امت کا شیرازہ نہ بکھرنے دے اور شریعت ان لوگوں کے دست برد سے بچائے رکھے جو اسے توڑ مروڑ کر اپنی خواہشوں کے مطابق ڈھال لینا چاہتے ہوں۔ اگر اس کی ضرورت سے انکار کر دیا جائے تو پھر پیغمبرؐ کے بعد ان کی نیابت و جانشینی کے مسئلے کو اتنی اہمیت دینے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ ان کی تجہیز و تکفین پر سقیفہ بنی ساعدہ کے اجماع کو مقدم سمجھ لیا جائے اور اگر اس کی ضرورت ثابت ہے تو کیا پیغمبرؐ کو بھی اس کی ضرورت اور اہمیت کا احساس تھا اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے کہ انھیں اس کی ضرورت یا عدم ضرورت کا احساس

ہوتا تو پیغمبرؐ کے ذہن کو ارتداد کی فتنہ انگیزیوں اور بدعتوں کی کارفرمائیوں کی خبر دینے کے باوجود ان کی روک تھام اور فکر کی تدبیر سے خالی سمجھ لینا عقل اور بصیرت سے محرومی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ احساس تو تھا مگر مصلحت کی بنا پر اسے غیر طے شدہ چھوڑ جانے پر مجبور تھے تو اس صورت میں اس مصلحت کو زیرِ نقاب رہنے کے بجائے کھل کر سامنے آنا چاہیے ورنہ بے وجہ خاموشی فرائض نبوت میں کوتاہی سمجھی جائے گی۔ اور اگر کوئی مانع تھا تو اس مانع کو پیش کرنا چاہیے، ورنہ اسے تسلیم کیجیے کہ جس طرح آپ نے ذہن کا کوئی گوشہ ادھورا نہیں چھوڑا اسی طرح اسے بھی ناتمام نہیں رہنے دیا اور ایک ایسا لائحہ عمل تجویز فرمایا کہ جس کے بروئے کار لانے سے دین دوسروں کے دست برد اور استیلا سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ طریقۂ کار کیا تھا؟ اگر اجماع امت کو پیش کیا جائے تو اس کے وقوع پذیر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ اجماع میں ایک ایک فرد کا اتفاق رائے ضروری ہے اور اگر انسانی طبائع کے اختلاف کو دیکھتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ وہ ایک نقطہ پر متحد ہو جائیں اور نہ ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ جہاں ایسے موارد پر اختلاف کی کوئی آواز نہ اٹھی ہو، تو پھر کیونکر ایک ایسی بنیادی ضرورت کو ایک ناممکن الوقوع امر سے وابستہ کیا جا سکتا ہے کہ جس پر اسلام کے مستقبل کا انحصار ہو اور مسلمانوں کے فلاح و بہبود کا دارومدار ہو۔ لہٰذا نہ عقل اس معیار کو تسلیم کرنے کو تیار ہے نہ نقل ہی اس سے ہمنوا ہے۔ چنانچہ قاضی عضدالدین نے مواقف میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"تمھیں جاننا چاہیے کہ خلافت کا انعقاد اجماع پر منحصر ہے، کیونکہ اس پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل قائم نہیں ہو سکی۔"

مدعیان نے جب یہ دیکھا کہ راویوں کا متفق ہونا مشکل ہے تو اقلیت کے اختلاف کو نظر انداز کر کے اکثریت کے اتفاق کو اجماع کے قائم مقام ٹھہرایا۔ لیکن اس صورت میں بھی اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ حق و ناحق اور جائز و ناجائز وسائل کا زور اکثریت کا رخ ادھر موڑ دیتا ہے جہاں نہ شخصی فضیلت ہوتی ہے نہ ذاتی قابلیت جس کے نتیجہ میں اہل افراد دبکے پڑے رہ جاتے ہیں اور نااہل ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ تو جہاں صلاحیتیں پھڑپھڑا کر رہ جائیں اور ذاتی غرضیں روک بن کر کھڑی ہو جائیں وہاں کسی صحیح شخص کے انتخاب کی توقع کیوں کر کی جا سکتی ہے اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تمام رائے دہندگان ایسے افراد ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی رائے آزاد اور بے لاگ ہے، نہ ان میں کوئی صاحب غرض ہے نہ کسی کی رو رعایت رکھتا ہے تو بھی کہاں یہ ضروری ہے کہ اکثریت کا ہر فیصلہ صحیح ہو اور وہ بھٹک کر غلط راستے پر آ ہی نہ سکے جبکہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اکثریت نے تجربہ کے بعد خود اپنے فیصلوں کو غلط بھی ٹھہرایا ہے۔

ان حالات میں اگر خلیفہ و جانشین کا انتخاب غلط ہو تو اس غلطی کے مہلک نتائج کا ذمہ دار کون ہوگا اور اسلام کی ہیئت اجتماعی کی تباہی و بربادی کا مظلمہ کس کی گردن پر جائے گا اور پھر انتخاب کی ہنگامہ آرائیوں اور شورش انگیزیوں پر جو خوں ریزی اور فساد برپا ہوگا وہ کس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا جبکہ بزم ادب آموز میں بھی بیٹھنے والوں کو دیکھا جا چکا ہے کہ وہ باہم آویزیوں سے نہ بچ سکے تو کسی اور کا دامن کیا بچ سکتا ہے۔

اگر ان مفاسد سے بچنے کے لیے اسے اہل حل و عقد پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی صواب دید سے کسی ایک کو منتخب کر لیں تو یہاں بھی وہی انتشار و کشمکش کی صورت پیش آئے گی کیونکہ انسانی طبائع کا یہاں بھی ہم آہنگ ہونا ضروری

نہیں ہے اور نہ انھیں ذاتی اغراض کی سطح سے بلند قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ یہاں تصادم اور ٹکراؤ کے اسباب اور زیادہ قوی ہیں کیونکہ اکثر سب نہیں تو اکثر خود اس منصب کے لیے امیدوار ہوں گے اور اپنی کامیابی کے لیے اپنے حریف کو زک پہنچانے میں کوئی تدبیر نہ اٹھا رکھیں گے اور جس طرح بن پڑے گا اس کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ باہم آویزی اور فتنہ انگیزی پیدا ہو گی اور جس اختلاف سے بچنے کے لیے یہ صورت پیدا کی گئی ہے اس سے بچاؤ نہ ہو سکے گا اور امت کسی صحیح فرد تک پہنچنے کے بجائے دوسروں کے ذاتی مفاد کا آلۂ کار بن کر رہ جائے گی۔ پھر یہ اہل حل و عقد کا معیار کیا ہو گا! وہی جو ہر زمانے میں رہا ہے کہ جس نے چند ہوا خواہ جمع کر لیے اور کسی اجتماع میں چند مخصوص و پرجوش لفظیں دہرا کر ہڑ بونگ مچوا دیا وہ ابھر کر اہل حل و عقد کی صف میں آ گیا۔ یا صلاحیتوں کو بھی پرکھا جائے گا۔ اگر صلاحیتوں کو پرکھنے اور جانچنے کا طریقہ یہی رائے عامہ ہے تو پھر وہی کش مکش اور الجھنیں یہاں بھی پیدا ہو جائیں گی۔ جس کے لیے یہ راہ نکالی گئی ہے اور اگر کوئی معیار ہے تو اس پر ان کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے بجائے اس کی صلاحیت کو کیوں نہ پرکھ لیا جائے جسے اس منصب کا اہل سمجھا جا رہا ہے۔ یہ ہے سقیفہ بنی ساعدہ کی کارروائی اور شوریٰ کی گرم بازاری کہ ایک ہی شخص کے کارناموں کا نام اجماع اور ایک ہی فرد کی کارفرمائی کا نام شوریٰ رکھ دیا گیا۔

حضرت ابو بکر نے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا کہ اجماع ایک ہی آدھ کی رائے کا نام ہوا کرتا ہے جسے بھولے بھالے عوام کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔ اس لیے انھوں نے اجماع اور شوریٰ کا رنگ چڑھائے بغیر علانیہ حضرت عمر کو نامزد کر کے اجماع کی پابندی، کثرت رائے کے معیار اور شوریٰ کے طریقۂ

انتخاب کو نظر انداز کر دیا۔

حضرت عائشہ کے نزدیک بھی خلافت کو امت یا چند مخصوص افراد کی رائے پر چھوڑنا فتنہ و فساد کو دعوت دینا تھا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عمر کو بستر مرگ پر پیغام بھجوایا کہ امت محمدیہ کو بغیر کسی پاسبان کے نہ چھوڑ لیے اور اسے بے مہار رہنے نہ دیجیے کیونکہ اس صورت میں فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے۔

جب اہل حل و عقد کا طریقہ بھی کامیاب نہ ہوا تو اسے بھی ختم کر دیا گیا اور یہ کہ "ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند" معیار بن کر رہ گیا۔ یعنی جو دوسروں کو اپنے اقتدار اور تسلط کے بندھن میں جکڑ لے وہی خلیفۂ برحق و جانشینِ رسولؐ ہے۔

یہ تھے وہ خود ساختہ اصول جن کے سامنے پیغمبرؐ کے تمام ارشادات جو انھوں نے دعوت ذوالعشیرہ، شب ہجرت، غزوۂ تبوک، تبلیغ سورہ برأت اور غدیر خم کے موقع پر فرمائے تھے، یکسر فراموش کر دیے گئے۔

حیرت ہے کہ جب تینوں خلافتیں ایک ہی فرد کی رائے سے طے پاتی ہیں تو پھر کس دلیل کی بنا پر پیغمبرؐ سے یہ حق سلب کیا جاتا ہے کہ وہ کسی کا تعین خود فرما دیتے اور تمام خلفشار سے امت کو محفوظ کر جاتے۔ چنانچہ پیغمبرؐ نے وقت آخر فرمایا کہ مجھے قلم دوات اور کاغذ دے دو تاکہ یہ نوشتہ چھوڑ دوں کہ میرے بعد کون خلافت کا حق دار ہو گا لیکن آنحضرتؐ کی اس خواہش نوشتہ کو حضرت عمر نے ٹھکرا دیا اور سقیفہ میں دوسرے تمام مسلمانوں سے ہٹ کر خلافت پر اجماع کیا اور پیغمبرؐ کی اس وصیت کو جو علی کے بارے میں تھی بھول گئے ..."

دھاچوکڑی

سقیفائی خلیفہ کی حیثیت سے جب حضرت ابو بکر تخت خلافت پر

غاصبانہ قابض ہوئے اور اقتدار ہاتھ آیا تو آپ نے اپنے مافیا گروہ کے ذریعہ مدینہ کو مرکز آلام بنادیا اور ان لوگوں پر مظالم، تشدد اور غنڈہ گردی کا بازار گرم ہونے لگا جو آپ کی خلافت سے متفق نہیں تھے یا جن لوگوں نے آپ کی بیعت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس فہرست میں بنی ہاشم کے علاوہ سلمانؓ فارسی، ابوذرؓ غفاری، عمارؓ یاسر، مقدادؓ، خالد بن سعید، زبیر، عقبہ بن ابولہب، براء بن عازب، ابی ابن کعب، مالک بن نویرہ اور ابوسفیان وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان افراد نے ابوبکر کی ناجائز خلافت پر کھل کر احتجاج بھی کیا اور ان کے احتجاج کی آواز بازگشت صرف مدینہ کی گلیوں ہی تک محدود نہ رہی بلکہ اس کے اثرات بیرون مدینہ یمامہ، منامہ، عمان، یمن، بحرین اور حضرموت وغیرہ پر بھی مرتب ہوئے اور شورش و بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ بگڑتے ہوئے حالات پر قابو پانے کا جو راستہ اختیار کیا گیا وہ مظالم اور تشدد کا تھا۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ خالد بن ولید ایسے ظالم و جابر شخص کو پندرہ ہزار کے لشکر کی سرداری دے کر یمامہ اور حضرموت وغیرہ کے مسلمانوں پر مسلط کر دیا۔ الغرض ایک طرف خالد بن ولید مدینہ سے باہر یمامہ اور حضرموت کے مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے تھے اور دوسری طرف اندرون مدینہ ابوبکر کی حمایت میں حضرت عمر اپنی جماعت کو لیے بربریت کا ننگا ناچ ناچ رہے تھے۔ جس کے سبب سے آل رسولؐ پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ اہل بیت اطہارؑ سے حضرت عمر کی دشمنی اور عداوت اس فعل سے ظاہر ہے کہ آپ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے ابوبکر کے لیے بیعت طلبی کی گستاخی اور جسارت کر بیٹھے اور صرف یہی نہیں بلکہ چند غنڈوں کے ہمراہ آگ اور لکڑیاں لے کر رسولؐ کی غمزدہ اور سوگوار

بیٹی فاطمہ زہراؑ کی چوکھٹ پر پہنچ گئے اور یہ مطالبہ کیا کہ علیؑ کو گھر سے باہر نکالو ورنہ ہم اس گھر میں آگ لگا دیں گے اور سب کو زندہ جلا کر خاک کر دیں گے۔

بنت رسولؐ جب اس ہنگامے سے باخبر ہوئیں تو آپ دروازے کے قریب تشریف لائیں اور حضرت عمر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ کیا ہم سوگواروں کو گھر میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دو گے۔ عمر نے کہا کہ خدا کی قسم اگر حضرت علیؑ ابوبکر کی بیعت نہ کریں گے تو ہم اس گھر کو پھونک دیں گے۔ جناب فاطمہ زہراؑ نے فرمایا کہ اس گھر میں ابوالحسنؑ کے علاوہ رسول اللہؐ کے دونوں نواسے حسنؑ اور حسینؑ بھی ہیں۔ عمر نے کہا، ہوا کریں ...، حضرت عمر کے اس جواب پر معصومہؑ کونین بے اختیار رونے لگیں اور آپ نے فرمایا کہ اے پدر بزرگوار! آپ کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی ہم پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے جا رہے ہیں اور آپ کی امت کے لوگ ہم سے کس طرح پھر گئے ہیں۔ لیکن حضرت عمر پر معصومہؑ کی اس آہ و زاری اور فریاد و فغاں کا مطلق اثر نہ ہوا، اور آپ نے وہی کیا جو آپ کا مقصد تھا۔ فاطمہؑ کے گھر میں آگ لگا دی گئی اور شعلے بلند ہونے لگے۔ لیکن اس پر بھی حضرت عمر کے دل کو تسلی نہ ہوئی اور آپ کی آتش غضب ایسی بھڑکی کہ آپ نے جلتے ہوئے دروازے کو لات مار کر معصومہؑ پر گرا دیا جس کی ضرب سے آپ کا پہلوئے مبارک شکستہ ہو گیا اور آپ کے شکم میں جناب محسنؑ شہید ہو گئے۔ اس بے مثال کارنامے کے بعد حضرت عمر دندناتے اپنے غنڈوں کے ہمراہ خانۂ زہراؑ میں داخل ہوئے اور آپ نے دھاچوکڑی مچا دی۔ سارے گھر کو تہس نہس کر ڈالا اور امیرالمومنین حضرت علیؑ ابن طالبؑ جیسے شجاع و بہادر کے گلے میں بزدلی کی رسی باندھ کر گھر سے باہر لائے اور اسی حالت میں مولائے

کائنات کو لیے ہوئے دربار ابو بکری میں حاضر ہوئے اور کہا کہ بیعت کرو ورنہ خدا کی قسم سر کاٹ لوں گا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ تم لوگ کس حق کی بنیاد پر مجھ سے بیعت کے طالب ہو۔ خدا کی قسم مجھ سے یہ کبھی نہ ہوگا۔ تمھیں چاہیے کہ میری بیعت کرو کیونکہ رسول کا وارث اور جانشیں میں ہوں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دنیا سے رخصت بھی ہو گئے لیکن حضرت علی نے کبھی ان کی بیعت نہیں کی۔ (الامامت والسیاست ج۱ ص ۱۲)

تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۱۶ میں ہے کہ جب حضرت علیؑ کو عمر گرفتار کر کے دربار خلافت کی طرف لے چلے تو حضرت فاطمہ زہراؑ نے فرمایا کہ ابوالحسن کو چھوڑ دو، ورنہ بد دعا کے لیے میں اپنے سر کے بال کھول دوں گی۔

طبری کا کہنا ہے کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کے اس کہنے پر مسجد نبوی کی دیوار قد آدم بلند ہو گئی تھی۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد شیخین سے وقت آخر تک کلام نہیں کیا اور ناراض و غضبناک اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

خالد بن ولید کے مظالم

حضرت ابو بکر نے خالد بن ولید کو حصول بیعت کے لیے اس حکم کے ساتھ روانہ کیا کہ جب تم یمامہ اور حضرموت کے مسلمانوں پر غالب آنا اور انھیں قتل کرنا تو ان کی لاشوں کو جلا کر خاک کر دینا۔ قیدیوں اور زخمیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دینا اور قتل عام میں کوئی کوتاہی نہ کرنا اور لوگوں کو عبرتناک سزائیں دینا۔

(تاریخ ابوالفدا ج ۱ ص ۱۰۶)

چنانچہ خالد نے ابو بکر کے اس حکم کے تحت دس ہزار مسلمانوں کو قتل کیا ان مقتولین کی لاشوں کو ایک گڑھے میں جمع کر کے نذر آتش کر دیا (تاریخ خمیس ج۲)

مقتولین میں نشر حافظ قرآن بھی تھے اور وہ لوگ بھی تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے صدقات کے عامل تھے۔ حامیہ بن سبیع کو زندہ آگ میں جلا کر مار ڈالا گیا۔ مالک بن نویرہ کو خالد بن ولید نے قتل کر کے اس کا چولھا بنایا اور اس میں کھانا پکوا کر کھایا۔ جب اس پر انسانی خون کی آمیزش کا نشہ سوار ہوا تو اس نے اسی رات کو مالک کی سوگوار اور غم گسار بیوہ سے اپنا منھ کالا کیا۔ (تاریخ الاعیان ص ۲۷۹)

مالک بن نویرہ کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب مالک کے سامنے حضرت ابو بکر نے اپنی بیعت کا سوال پیش کیا تو انھوں نے نہایت سختی اور حقارت سے جھڑک دیا اور کہا کہ آپ اپنی حیثیت پر قائم رہیے اور اپنے گھر بیٹھیے اور اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کیجیے۔ آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ اس تخت خلافت پر قابض ہوئے ہیں جس کے لیے اللہ اور رسول نے کسی اور کو نامزد کر کے حاکم بنایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم میں حضرت علیؑ کی ولایت اور خلافت کا اعلان کر کے کسی حجت اور دلیل کو باقی نہیں رکھا۔ (تحفۃ العباد ص ۴۰۵)

تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۳۱ میں ہے کہ جب خالد کے ہمراہی اس کی بربریت کو دیکھ کر چیخ اٹھے تو اس نے اپنے ساتھیوں کو ابو بکر کا تحریری حکم نامہ دکھایا۔

فدک پر قبضہ

انتہائی سخت گیر مظالم اور کرب و اضطراب کے عالم میں معصومۂ کونین حضرت فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کو یہ اطلاع ملی کہ ابو بکر نے ایک فرضی حدیث کو رسول اللہ سے منسوب کر کے آپ کی جائداد فدک پر قبضہ کر کے آپ کو ترکۂ

پدری سے محروم کر دیا ہے اس اندوہ ناک خبر سے آپ بے حد رنجیدہ اور ملول ہوئیں، کیونکہ یہ جائداد آپ کو اپنے شفیق باپ سے ہبہ کے ذریعہ حاصل ہوئی تھی اور آپ رسالت مآب صلعم کی زندگی ہی سے اس پر قابض اور متصرف تھیں۔

حضرت ابوبکر کے اس غاصبانہ طرز عمل کے خلاف حضرت فاطمہ زہراؑ نے اپنے حق کا دعویٰ کیا اور امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ اور حسنینؑ کے ہمراہ ام ایمن کو بھی بطور گواہان پیش کیا۔ لیکن وہاں انصاف کا کیا سوال ؟ اس لیے کہ عدالت کی کرسی پر جو شخص منصف کی حیثیت سے بیٹھا تھا وہی مجرم بھی تھا چنانچہ آپ کے گواہان کو مسترد کرتے ہوئے آپ کا دعویٰ خارج کر دیا گیا۔ (صواعق محرقہ ص ۲۳۔ الفاروق ج ۲ ص ۲۲۸)

فدک پر غاصبانہ قبضہ پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کے مولانا شاہد زعیم فاطمی اپنے ایک طویل مقالہ مطبوعہ سرفراز ۲ر اگست ۱۹۷۷ء میں "علی ابن ابی طالب اور ان کے سیاسی حریف" کے عنوان سے فرماتے ہیں کہ:

"ایک فرضی اور سراسر جعلی حدیث کا سہارا لے کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یکلوتی صاحبزادی سیدہ فاطمہ زہراؑ کو حضورؐ کے ورثہ سے جس طرح محروم کیا گیا وہ بذات خود ایک المیہ ہے۔ سیدہ فاطمہ اپنا جائز حق مانگ رہی تھیں اور انھیں ان کے حق سے محروم کرنے کے لیے پیغمبرؐ کا ایک قول گڑھ لیا گیا۔ وضع حدیث کا صریحاً یہ پہلا ارتکاب تھا جو اسلام کے خلیفۂ اول نے کیا اور انھوں نے اہل بیت نبوت کو ورثۂ نبوت سے محروم رکھنے کے لیے ایک ایسی حدیث وضع کی جو بیسیوں آیات قرآنی اور نصوص قطعیہ کے سراسر خلاف تھی، جس شخص نے بھی اس ظلم اور صریح زیادتی کے خلاف آواز اٹھائی

اسے ختم کرنے اور بزور شمشیر چپ کرانے کی کوشش کی گئی۔ قرآن مقدس اپنے مفہوم کی وضاحت کے لیے نہ کسی ابوبکر کا محتاج ہے، نہ کسی عمر کا، قرآن کی وہ کون سی آیت ہے جس کی رو سے وراثت کے حق کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذوالقربیٰ اور اہل بیت نبوت کے لیے منسوخ کیا گیا ہے۔"

مشہور سنی عالم ڈپٹی نذیر احمد خاں نے اپنی کتاب رویائے صادقہ میں فرمایا ہے کہ:

"جو شخص رسولؐ کی وفات سے سب سے زیادہ متاذی ہوا وہ فاطمہؑ تھیں۔ آپ کی والدہ پہلے ہی انتقال فرما چکی تھیں اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبرؐ صاحب ہی تھے اور باپ بھی کیسے ؟ دین و دنیا کے بادشاہ، ایسے باپ کا سایہ سر سے اٹھنا، اس پر علیؑ کا خلافت سے محروم ہونا، ترکہ پدری فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمہ ہار جانا، انھیں رنجوں میں گھٹ گھٹ کر انتقال فرما گئیں۔"

پھر تحریر فرماتے ہیں:

"سخت افسوس ہے کہ اہل بیت نبوی کو پیغمبرؐ صاحب کی وفات کے بعد ایسے ناملائم حالات پیش آئے کہ ان کا وہ ادب و لحاظ جو ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہوا اور اس میں ضعف آگیا اور شدہ شدہ منجر ہوا اس ناقابل برداشت واقعہ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، ایسی نالائق حرکت مسلمانوں سے سرزد ہوئی کہ سچ پوچھو تو منھ دکھانے کے قابل نہ رہے۔" (رویائے صادقہ ص ۱۵۲)

بعض روایتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابوبکر نے فدک کے واگذاشت کا پروانہ لکھ کر سیدہ فاطمہ زہرا کو دے دیا تھا اور وہ اسے لے کر جانا ہی چاہتی تھیں کہ اتنے میں حضرت عمر آگئے اور انھوں نے معصومہ سے پوچھا کہ یہ کاغذ کیسا ہے،

فرمایا کہ فدک کے واگذاشت کی سند ہے جو ابو بکر نے مجھے دی ہے۔ یہ سن کر آپ غصہ سے پاگل ہو اٹھے اور اسے فاطمہ زہرا کے ہاتھ سے چھین کر پارہ پارہ کر دیا ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اسے پیروں سے مسل ڈالا اور اس پر تھوکا۔

(سیرت حلبیہ ص ۱۸۵)

فدک کی حقیقت

فدک مدینہ منورہ سے تقریباً پچاسی میل کی دوری پر خیبر کے نواح میں ایک سرسبز و شاداب مقام کا نام تھا۔ جس کا طویل رقبہ زرخیز زمینوں اور باغات پر مشتمل تھا، یہ علاقہ یہودیوں کی ملکیت تھا جو ۷ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہوا۔ سبب یہ تھا کہ یہودیوں کو جنگ خیبر کے بعد پیغمبر اسلامؐ کی طاقت اور قوت کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا اور وہ لوگ اپنے مستقبل سے خائف تھے چنانچہ یہ دیکھ کر کہ آنحضرتؐ نے خیبر فتح ہونے کے بعد کچھ یہودیوں کو امان اور پناہ دے کر انھیں چھوڑ دیا ہے، ان لوگوں نے بھی مصالحت اور پناہ چاہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں صلح کا پیغام بھیج کر یہ خواہش ظاہر کی کہ فدک کا علاقہ ان سے لے کر انھیں امان و پناہ دے دی جائے۔ رسول اللہؐ نے ان کی اس درخواست اور خواہش کو منظور فرمایا جس کے نتیجہ میں فدک کا علاقہ حاصل ہوا، جو آپ کی تنہا ملکیت قرار پایا کیونکہ دیگر مسلمانوں کا صرف انھیں اموال میں حصہ ہوتا ہے جو جہاد کے موقع پر بطور مال غنیمت حاصل ہوا ہو، اور جو مال بغیر فوج کشی یا بغیر جنگ و جدال کے حاصل ہو وہ مال فَے کہلاتا ہے اور وہ سربراہ کا خصوصی حق ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ فدک کا علاقہ بغیر جنگ و جدل اور فوج کشی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل

ہوا تھا اس لیے وہ آپ کی خصوصی ملکیت تھا۔ دیگر مسلمانوں کا نہ اس میں کوئی حق تھا نہ حصہ۔ چنانچہ طبری نے تحریر فرمایا ہے کہ "فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص تھا کیوں کہ مسلمانوں نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ"۔

(تاریخ طبری ج ۲ ص ۳۰۲)

تقریباً یہی عبارت بلاذری کی کتاب فتوح البلدان کے ص ۲۷ پر بھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ فدک کا علاقہ آنحضرتؐ کو بغیر جنگ کے حاصل ہوا تھا اور مورخین کا اجماع و اتفاق اس امر پر بھی ہے کہ جب فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبضہ اور ملکیت میں آیا تو جبرئیل امینؑ اللہ کا حکم لے کر حاضر ہوئے اور فرمایا کہ اللہ کا حکم ہے کہ اپنے قرابت داروں کو ان کا حق دے دو۔ آپ نے فرمایا میرے قرابت داروں سے مراد کون لوگ ہیں اور ان کا حق اللہ کے نزدیک کیا ہے؟ جبرئیل نے کہا کہ خدا کا حکم ہے کہ فدک کو فاطمہؑ کو دے دیجیے۔ چنانچہ آپ نے فوراً فاطمہ زہراؑ کو طلب فرمایا اور تحریری ہبہ نامہ کے ذریعہ فدک کی ملکیت مع قبضہ فاطمہ کے حق میں منتقل کر دی۔

درمنثور مطبوعہ مصر ج ۴ ص ۱۷۶، ۱۷۷ سطر ۱۵ تا ۱۹ درج ہے کہ آنحضرتؐ نے اللہ کے حکم سے فدک فاطمہ زہراؑ کو دے دیا تھا۔ شرح مواقف ص ۷۳۵ پر بھی تقریباً یہی عبارت تحریر ہے۔ مدارج النبوۃ ج ۴ ص ۲۲۱ پر بھی ہے کہ فدک کو رسول اللہؐ نے بذریعہ تحریری ہبہ نامہ فاطمہؑ کے حق میں منتقل کر دیا تھا۔ کنز العمال ج ۲ ص ۱۰۸ میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ جب آیۂ ذوالقربیٰ نازل ہوئی تو پیغمبرؐ نے فرمایا اے فاطمہؑ فدک تمھارا حصہ ہے۔

لیکن جب حضرت ابو بکر نے تخت خلافت پر قبضہ کیا اور اقتدار کے نشے میں آپ کا شیطانی ایمان ڈگمگایا تو آپ نے تمام اسلامی اصولوں کو فراموش کر کے فاطمہ زہراؑ کو بے دخل کر دیا اور فدک پر قابض ہو گئے۔ ابن حجر عسقلانی نے بھی لکھا ہے کہ

ابوبکر نے فاطمہ زہراؑ کے ہاتھ سے فدک چھین لیا اور شہزادی نے جب اپنے حق کا دعویٰ کیا اور فرمایا کہ رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں فدک کو مجھے ہبہ کیا تھا تو حضرت ابوبکر نے معصومہؑ کے اس بیان کو ان کی غلط بیانی پر محمول کرتے ہوئے دعویٰ خارج کر دیا۔ امام بلاذری فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؑ نے ابوبکر سے فرمایا کہ رسول اللہ نے فدک مجھے دیا ہے، جس پر ابوبکر نے آپ سے گواہان کا مطالبہ کیا اور آپ نے گواہی میں، حضرت علیؑ، ام ایمن اور حسنینؑ کو پیش کیا۔ لیکن ابوبکر نے ان گواہان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

(فتوح البلدان ص ۳۸)

گواہان کے مطالبہ کے ذیل میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دنیا میں کوئی قانون ایسا ہے جس کے تحت بار ثبوت اس شخص کے ذمہ ہو جو بذات خود کسی جائداد پر قابض و دخیل ہو اور قبضہ کے جواز میں تحریری ثبوت بھی رکھتا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ابوبکر کس حق اور کس قانون کی بنیاد پر شہزادی سے گواہان اور ثبوت کا مطالبہ کر رہے تھے جبکہ معصومہؑ کا قبضہ بھی تھا اور تحریری ہبہ نامہ بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ قبضہ خود ایک محکم دلیل رکھتا ہے۔

ابوبکر کس حیثیت سے فدک پر قابض ہو گئے؟ دراصل یہ ذمہ داری تو ابوبکر پر عائد ہوتی تھی کہ وہ اپنے حق تصرف کے جواز میں کوئی ثبوت فراہم کرتے لیکن وہ کوئی معقول دلیل نہ لا سکے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ابوبکر کے ہی دور میں ان کے سامنے اسی نوعیت کے دیگر مقدمات پیش ہوئے اور انھوں نے بغیر کسی گواہی کے مدعی کے حق میں فیصلہ کیا۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ:۔

"جابر ابن عبداللہ سے مروی ہے کہ میں نے ابوبکر کی عدالت میں اس امر کا دعویٰ کیا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر بحرین کا مال آیا تو میں تمھیں اتنا اور اتنا دوں گا مگر پیغمبرؐ کی وفات تک وہ مال نہیں آیا اور جب

ابوبکر کے زمانے میں آیا تو میں ان کے پاس گیا اور اس مال کا مطالبہ اپنے دعویٰ کے مطابق کیا۔ چنانچہ ابوبکر نے میرا دعویٰ تسلیم کرتے ہوئے وہ مال مجھے مرحمت فرمایا۔"

(صحیح بخاری ج ۲ جز ۲۷ ص ۱۹۰)

یہ دعویٰ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ابوبکر کی عدالت میں کسی ایک عادل شخص کا زبانی دعویٰ بھی قابل قبول تھا خواہ وہ اس شخص کے ذاتی مفاد ہی کے لیے کیوں نہ ہو، کیونکہ ابوبکر نے اس مقدمہ میں جابر ابن عبداللہ سے ان کے دعویٰ کی صحت پر کوئی گواہ طلب نہیں کیا۔ اگر محض حسن ظن کی بنا پر بغیر کسی شہادت کے جابر کو مال کا دیا جانا جائز تھا تو ابوبکر کے دل میں رسولؐ کی بیٹی کے لیے یہ خوش اعتمادی کیوں نہیں تھی کہ وہ حصول فدک کے لیے (معاذ اللہ) رسول پر افترا کا الزام نہیں رکھ سکتیں۔ اور اگر فاطمہ زہراؑ کی طرح گواہان طلب کرنے کا اصول ہمہ گیر اور عام تھا تو اس موقع پر بھی اس کا لحاظ ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ دور پیغمبرؐ میں بھی بعض مواقع پر اس اسلامی اور شرعی اصول کی پابندی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ جب ایک اعرابی نے ایک اونٹ پر آنحضرتؐ سے تنازعہ کیا تو خزیمہ بن ثابت نے آپ کے حق میں گواہی دی اور اس ایک گواہی کو دو گواہوں کے برابر تسلیم کیا گیا کیونکہ جس کے حق میں یہ گواہی تھی اس کی صداقت اور دیانت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ لہٰذا جب پیغمبر کی صداقت کے پیش نظر ایک گواہی شرعی اعتبار سے کافی سمجھی گئی تو کیا جناب سیدہ کی اخلاقی عظمت اور راست گفتاری کے تحت حضرت علیؑ اور ام ایمن کی گواہی کو کافی نہیں سمجھا جا سکتا تھا؟

قاضی نور اللہ شوستری شہید ثالث نے احقاق الحق (باب المطاعن) میں تحریر فرمایا ہے کہ معترض کا یہ الزام کہ ام ایمن کی شہادت سے نصاب شہادت نامکمل رہتا ہے، اس بنا پر غلط ہے کہ بعض احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک گواہ اور حلف سے بھی حکم فیصلہ لگانا جائز ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حکم قرآن منسوخ قرار

پائے کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے حکم فیصلہ صادر ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اگر اس شہادت کے علاوہ کوئی اور معقول دلیل قابل قبول ہے تو اس کی بنا پر فیصلہ ممکن نہیں ہے۔ اس جواب سے یہ امر واضح ہے کہ مدعی اپنے دعویٰ کے اثبات میں اس کا محتاج نہیں ہے کہ دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی ہی گواہی پیش کرے بلکہ اگر ایک گواہ کے ساتھ حلف بھی اٹھالے تو اس کو دعویٰ میں حق بجانب اور سچا سمجھنا چاہیے اور اس کے حق میں فیصلہ کر دینا چاہیے۔

علامہ متقی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ابوبکر، عمر اور عثمان وغیرہ ایک گواہی اور مدعی کی قسم پر فیصلہ کر دیا کرتے تھے۔

(کنز العمال ج۴ ص۶)

جب ایک گواہ اور مدعی کی قسم پر فیصلہ ہوتا تھا تو حضرت ابوبکر کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی تسلی کے لیے اپنی گستاخانہ جسارت کو بروئے کار لاکر زیادہ سے زیادہ ایک شہادت کے ہمراہ معصومہؑ سے حلف کا تقاضہ کر لیتے مگر یہاں تو مقصد ہی تھا کہ آپ کی صداقت پر ضرب لگا کر اسے مجروح کر دیا جائے تاکہ آئندہ کسی معاملہ میں آپ سے تصدیق کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہو۔

جب اس طرح معصومہؑ عالم کا دعویٰ مسترد کر دیا گیا تو آپ نے میراث کی بنیاد پر اپنے حق کا مطالبہ کیا جیسا کہ عبدالکریم شہرستانی تحریر فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک دفعہ وراثت کی رو سے اپنے حق کا دعویٰ کیا اور ایک دفعہ ملکیت کی بنیاد پر مگر آپ کو اس مشہور روایت کی بنا پر محروم کر دیا گیا کہ پیغمبرؐ نے فرمایا تھا ہم گروہ انبیاء کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے بلکہ جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

(کتاب الملل والنحل ص۹)

اس قول پیغمبرؐ کا علم ابوبکر کے علاوہ دیگر صحابہ میں سے کسی کو بھی نہیں تھا اور نہ کسی نے زبان پیغمبرؐ سے اس حدیث کو سنا۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد آپ کی میراث میں اختلاف پیدا ہوا اور کسی کے پاس اس کی کوئی اطلاع نہ تھی کہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سنا ہے کہ ہم گروہ انبیاء کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے بلکہ جو چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

عقل اس بات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ اللہ کا برگزیدہ رسول اپنے حقیقی ورثاء کو یہ تک نہ بتائے کہ وہ وارث ہوں گے یا نہیں۔ اور جس شخص کو رسول اللہ کی وراثت سے دور کا بھی کوئی لگاؤ یا تعلق نہ ہو اس کو یہ اطلاع بہم پہنچا دے کہ ہم وارث نہیں چھوڑتے۔ پھر یہ حدیث اس وقت بے نقاب ہو کر منظر عام پر آتی ہے کہ جب فدک کا مقدمہ دائر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ حدیث اس وقت کہاں تھی جب حضرت ابوبکر نے جناب فاطمہ زہراؑ کا حق وراثت تسلیم کرتے ہوئے فدک کے واگذاشت کا پروانہ لکھ کر دیا تھا جسے حضرت عمر نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

معلوم ہوا کہ فدک کے معاملات میں حضرات شیخین کی ملی بھگت تھی اور محض بے ایمانی اور دھاندلی کی بنا پر رسول کی قدسی صفات بیٹی کو اس حق سے محروم کر دیا گیا۔

ابوبکر سے سیدہ فاطمہ زہراؑ کی ناراضگی

اس ضمن میں مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد چھ ماہ تک حضرت فاطمہؑ حیات رہیں اور ان کو ابوبکر سے شکوہ رہا اور اپنے انتقال تک ان سے کوئی رسم وراہ نہیں رکھی۔ بہرحال رشتہ داریوں اور جماعتوں میں ایسا بھی ہوتا

ہے اور بشریت کا تقاضہ بھی ہوتا ہے کہ انسان جس پر یقین رکھتا ہے اور جس کو سچ سمجھتا ہے، اس کے لیے اس کے اندر ایک حسّاسیت بڑھ جاتی ہے اور جذباتیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ایک اختلاف ایک حد تک رہا اور حدودِ شرع سے متجاوز نہیں ہوا۔ ان کی مخالفت میں بھی شرافت، سیر چشمی، بلند ہمتی اور صبر کا جوہر قائم رہا۔ کیونکہ یہ اخلاق اُن کی سرشت میں داخل تھے۔ حضرت عامر سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی علالت نے شدت کی شکل اختیار کی تو حضرت ابوبکر حضرت فاطمہ کی عیادت کے لیے گئے۔ اجازت طلب کی حضرت علیؑ نے ان سے کہا کہ دروازہ پر ابوبکر کھڑے ہیں، اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ان کو اجازت دے دوں، حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں؟ کہا ہاں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ حضرت ابوبکر اندر آئے، معذرت کی، گفتگو کی، اور وہ (حضرت فاطمہؑ) ان سے خوش ہو گئیں۔"

(المرتضیٰ ص ۱۴۲-۱۴۳)

ندوی صاحب کا یہ فرمانا کہ وفات پیغمبر اسلامؐ کے بعد حضرت سیدہ فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا چھ ماہ تک حیات رہیں، نہ جانے تاریخ کی کس کتاب سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ اپنی اس بات کے اثبات میں ندوی صاحب نے کسی کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ دنیائے اسلام کے قدیم مورخ ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا صرف ۷۵ دن دنیا میں رہیں۔

(الامامت والسیاست ج۱ ص ۱۴)

علامہ بہائی نے ۹۵ دن تحریر فرمایا ہے (جامع عباسی ص ۷۵)، اور انوار الحسینیہ

ج ۳ ص ۳۹ میں ہے کہ آپ کی تاریخ وفات ۳ جمادی الثانیہ ۱۱ھ ہے۔

۲۔ حضرت ابوبکر سے حضرت سیدہ فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا کو شکوہ رہا اور آپ نے وقت انتقال تک ان سے کوئی راہ و رسم نہیں رکھی۔ ہمیں تسلیم ہے۔

۳۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رشتہ کی حیثیت سے ابوبکر حضرت فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کی سوتیلی ماں عائشہ کے باپ تھے۔ اس نسبت سے آپ، معصومۂ عالمیہ کے سوتیلے نانا ہوئے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا "نانا جان" کی غیرت کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ اقتدار اور دنیا پرستی کی خاطر نانائیت کے فرائض کو بھول کر اپنی نواسی کی زندگی کو گہوارۂ آلام بنا دیں۔ اس کے شوہر سے بیعت کا تقاضہ کریں اور انکار بیعت کی صورت میں اپنے رفیق و ہمدم حضرت عمر کے ذریعہ اس کے گھر میں آگ لگوا دیں، ترکۂ پدری سے اسے محروم کر کے اس کی جائداد (فدک) پر قبضہ کر کے اسے ہڑپ کر جائیں اور اپنے مظالم کی بنا پر اسے یہ کہنے پر مجبور کر دیں کہ "مجھ پر وہ مصیبتیں ڈالی گئی ہیں کہ اگر روز ہائے روشن پر ڈالی جاتیں تو وہ سیاہ راتیں بن جاتے۔"

مولانا ندوی مجھے جواب دیں کہ کیا بشریت کا تقاضہ یہی تھا؟ کیا یقین کی منزل اسی کا نام ہے۔ کیا وہ سچ یہی ہے اور کیا ان مظالم بر اندام حالات کے بعد عقل سلیم اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہ نے ابوبکر اور عمر کو معاف کر دیا ہوگا اور ان سے خوش ہو گئی ہوں گی؟

اصل واقعہ انتہائی اختصار کے ساتھ یوں ہے کہ جب حضرت ابوبکر سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ مقرر ہوئے تو اس کے بعد مسلمانوں سے جبریہ بیعت کی مہم شروع کی گئی، اور اسی ذیل میں ابوبکر کے مونس و ہمدم عمر اپنے غنڈوں کے ہمراہ جناب سیدہ کے گھر پہنچے، حضرت علی کو آواز دی اور کہا کہ اگر باہر نہیں نکلو گے تو میں

اس گھر میں آگ لگا دوں گا۔ گھر جلانے کے لیے آپ لکڑیاں بھی لے گئے تھے۔ سیدہ کونین دروازے تک پہنچیں اور پس پردہ رہ کر آپ نے عمر سے فرمایا کہ اے ابن خطاب یہ کیا ظلم ہے کہ تم لوگ ہم سوگواروں کو گھر میں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ کیا تمہیں رسول اللہؐ نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ ہمارا گھر جلا دو۔ حضرت عمر نے کہا خدا کی قسم اگر تم لوگ بیعت نہیں کرو گے میں تمہارا گھر جلا دوں گا۔ حضرت فاطمہ یہ سن کر رونے لگیں اور فرمایا کہ اے پدر بزرگوار، اے رسول خدا، دیکھیے آپ کے بعد ہم پر کیا کیا مظالم ہو رہے ہیں۔ آخر کار حضرت عمر نے فاطمہؑ کے گھر میں آگ لگا دی اور آپ پر جلتا ہوا دروازہ گرا دیا جس کے نتیجہ میں جناب محسنؑ شکم مادر ہی میں شہید ہو گئے۔

حضرت علیؑ کے گلے میں رسی باندھ کر انھیں دربار خلافت میں لے جایا گیا اور وہاں سے بیعت کے لیے کہا گیا۔ حضرت نے قطعی طور پر ابوبکر کی بیعت سے انکار فرما دیا۔ اس پر حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اگر آپ بیعت نہیں کرنا چاہتے تو میں آپ کو مجبور نہیں کرتا۔ اس کے بعد حضرت علیؑ گھر واپس آ گئے۔ اس واقعہ کے بعد حضرت ابوبکر نے حضرت عمر سے فرمایا کہ ہم نے فاطمہؑ کو ناراض کیا ہے، چلو ان کو راضی کر لیں۔ یہ دونوں حضرات فاطمہ زہراؑ کے بیت الشرف پر آئے اور اپنے افعال و اعمال پر معذرت چاہی۔ معصومہؑ نے فرمایا کہ میں تمھیں رسولؐ کی ایک حدیث سناتی ہوں کیا تم اس کی تصدیق کرو گے؟ حضرت ابوبکر اور عمر دونوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ میں تم کو قسم دے کر پوچھتی ہوں کہ کیا تم نے رسولؐ اللہ سے یہ حدیث نہیں سنی کہ: "فاطمہ میری رضا ہے اور غضب فاطمہ میرا غضب ہے۔ جس نے میری بیٹی فاطمہ کو دوست رکھا اس نے مجھ کو دوست رکھا اور جس نے اس کو خوش رکھا اس نے مجھ کو خوش رکھا اور جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھ کو ناراض اور غضب ناک کیا۔

اس حدیث کو سن کر حضرت ابوبکر اور عمر دونوں نے اس کی تصدیق کی تب آپ نے فرمایا کہ: "میں خدا اور اس کے ملائکہ کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ تم دونوں نے مجھے ناراض اور غضب ناک کیا ہے، اور جب میں رسولؐ خدا سے ملوں گی تو تم دونوں کی شکایت کروں گی۔"

حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اے فاطمہؑ میں آپ کے اور رسول خدا کے عتاب سے اور غضب سے پناہ مانگتا ہوں لیکن حضرت فاطمہ زہراؑ فرماتی جاتی تھیں اور یہاں تک فرمایا کہ خدا کی قسم میں ہر اُس نماز میں کہ جو میں پڑھوں گی تمھارے حق میں بد دعا کرتی رہوں گی۔ (الامامت والسیاست ابن قتیبہ مطبوعہ استنبول ص۱۴)

مذکورہ کتاب جو ہندوستان میں شائع ہوئی ہے اس کے جزء اول ص۱۲ تا ۱۴ پر بھی مذکورہ بالا عبارتیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ ابو الفدا ج۱ ص۱۵۶، کتاب سقیفہ ابوبکر جوہری، تاریخ طبری، کنز العمال، تاریخ اعثم کوفی، روضۃ الصفا، روضۃ الاحباب اور ارجح المطالب اردو ص ۳۱۲ وغیرہ میں بھی یہ صراحت موجود ہے۔

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد خاں دہلوی فرماتے ہیں کہ فاطمہؑ نے ابوبکر وغیرہ سے بات چیت کرنا چھوڑ دیا تھا اور آخری وقت یہ وصیت کی تھی کہ مجھے رات کے وقت دفن کرنا اور یہ لوگ میرے جنازے پر نہ آنے پائیں (امہات الأمۃ ص ۹۹) علامہ عبدالبر لکھتے ہیں کہ فاطمہ کی یہ وصیت تھی کہ حضرت عائشہ بھی شریک جنازہ نہ ہونے پائیں (استیعاب ج۲ ص ۲۲۷)

جناب سیدہ کی حضرات شیخین کی ناراضگی کے بارے میں مولانا علی میاں ندوی اگر مطمئن نہ ہوئے ہوں تو مزید ملاحظہ فرمائیں۔ ترجمہ صواعق محرقہ ص۲۱، اشعۃ اللمعات ج۳ ص ۴۰۸، الزہرا، عمر ابو نصر (اردو ترجمہ) ص ۸۹، جمع الفوائد

ج ۲ ص ۱۸ مطبوعہ میرٹھ، ترجمہ صحیح مسلم ج۵ ص ۲۵، روضۃ الاحباب ج۱ ص ۴۳۴
ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۵۰ وغیرہ۔

سیدۂ کونین حضرت فاطمہ زہرؑا کی رحلت

مولانا ندوی نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ "جب حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی علالت نے شدت کی شکل اختیار کی تو حضرت ابوبکر حضرت فاطمہ کی عیادت کے لیے گئے"۔ (المرتضیٰ ص ۱۴۳)

حضرت ابن عباس صحابی رسول کا بیان ہے کہ جب فاطمہ زہرا کی رحلت کا وقت قریب آیا تو نہ معصومہ کو بخار آیا، نہ درد سر عارض ہوا، بلکہ آپ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو ساتھ لیا اور قبر رسول پر گئیں اور قبر و منبر کے درمیان دو رکعت نماز پڑھی پھر دونوں کو اپنے سینے سے لگا کر فرمایا کہ اے بچو! تم دونوں تھوڑی دیر اپنے باپ کے پاس بیٹھو۔ امیر المومنین اس وقت مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ پھر وہاں سے گھر آئیں اور آنحضرت کی چادر اٹھائی، غسل کر کے رسول اللہ کا بچا ہوا کفن یا لباس پہنا۔ بعد ازاں آپ نے اسماء (زوجہ حضرت جعفر طیار) کو آواز دی اور فرمایا اسماء، تم مجھ سے الگ نہ ہونا، میں ایک ساعت کے لیے اس حجرہ میں جاتی ہوں اور جب تھوڑا وقفہ گزر جائے اور میں باہر نہ نکلوں تو مجھ کو تین آوازیں دینا۔ اگر میں جواب نہ دوں تو تم اندر چلی آنا اور سمجھ لینا کہ میں رسولؐ خدا سے ملحق ہو چکی ہوں۔

اس کے بعد آپ حجرہ میں تشریف لے گئیں اور آنحضرت کی جگہ کھڑی ہو کر آپ نے دو رکعت نماز پڑھی پھر لیٹ گئیں اور اپنا منھ چادر سے ڈھانپ لیا بعض علماء کا کہنا ہے کہ سیدہ نے حالت سجدہ میں ہی وفات پائی۔ الغرض جب

ایک ساعت کا وقفہ گزر گیا تو اسماء نے آپ کو آواز دی، مگر جواب نہ ملا، تب اسماء اس حجرہ میں داخل ہوئیں اور دیکھا کہ معصومہ رحلت فرما چکی ہیں۔ اسماء نے اپنا گریبان پھاڑ لیا اور روتی پیٹتی گھر سے نکل کر صحن مسجد میں آئیں جہاں حسنینؑ ماں کا انتظار کر رہے تھے۔ بچوں نے اسماء کو روتا دیکھ کر گھبرا کر پوچھا کہ اے اسماء، ہماری اماں کہاں ہیں۔ عرض کی کہ حجرہ میں ہیں۔ دونوں شاہزادے حجرہ میں پہنچے دیکھا کہ مادر گرامی دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔ شاہزادے روتے ہوئے حضرت علیؑ کے پاس آئے اور انھیں خبر دی۔ آپ صدمہ سے بے حال ہو گئے اور گھر میں تشریف لائے۔ اسماء سرہانے بیٹھی مصروف گریہ تھیں۔ آپ نے چہرۂ انور کو کھول کر دیکھا۔ سرہانے ایک تحریر دستیاب ہوئی جس میں شہادتین کے بعد وصیت پر عمل کا حوالہ تھا اور یہ تاکید تھی کہ مجھے اپنے ہاتھوں سے غسل دے کر کفن پہنانا اور رات کے وقت سپرد خاک کرنا اور میرے دشمنوں (ابوبکر اور عمر) کو میری میت پر نہ آنے دینا۔ آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں تمھیں خدا کے سپرد کرتی ہوں اور اپنی ان تمام اولادوں (سادات) کو سلام کرتی ہوں جو قیامت تک پیدا ہوتی رہیں گی۔

جب رات ہوئی تو حضرت علیؑ نے غسل دیا، کفن پہنایا، نماز پڑھی اور جنت البقیع میں دفن کیا۔ (زاد العقبیٰ ترجمہ مودۃ القربیٰ علی ہمدانی شافعی ص ۱۲۵ تا ۱۲۹)

انوار الحسینیہ ج ۳ ص ۳۹ میں ہے کہ آپ منبر اور قبر رسول کے درمیان دفن ہوئیں۔ کتب مقاتل میں ہے کہ غسل کے وقت حضرت علی علیہ السلام نے پشت و بازوئے فاطمہؑ پر دُرّۂ عمری کے نشانات دیکھے تھے اور چیخ مار کر رو دیے تھے۔

صحیح بخاری اور مسلم وغیرہ میں ہے کہ حضرت علیؑ نے ابوبکر وغیرہ کو شرکت کی اجازت نہیں دی اور نماز جنازہ خود پڑھی۔ علامہ عینی شارح بخاری لکھتے ہیں کہ

یہ سب کچھ حضرت علیؑ نے فاطمہ زہراؑ کی وصیت کے مطابق کیا تھا۔

الغرض غسل وکفن کے بعد آپ اپنی اولاد اور اپنے اعزا کے ساتھ جنازہ لے کر روانہ ہوئے۔ کتاب الفتن میں ہے راستہ دیکھنے کے لیے ایک شمع ساتھ تھی اور حضرت زینبؑ جو کافی کم سن تھیں سیاہ لباس میں لپٹی ہوئی اس سائے میں چل رہی تھیں جو تابوت کے نیچے شمع کی وجہ سے زمین پر پڑ رہا تھا، مودۃ القربیٰ ص ۲۹ میں ہے کہ حضرت علیؑ جب جنت البقیع میں پہنچے تو ایک سمت سے آواز آئی اور کھدی کھدائی قبر نمایاں ہوگئی۔ حضرت علیؑ نے اسی قبر میں جناب فاطمہؑ کی لاش مطہر دفن کی اور زمین اس طرح برابر کردی کہ نشان قبر نہ معلوم ہو سکے۔ کتاب منتہی الآمال شیخ عباس قمی ص ۱۳۹ میں ہے کہ جب جناب سیدہ کی لاش قبر میں اتاری گئی تو رسول خدا کے ہاتھوں کے مانند دو ہاتھ نمودار ہوئے اور انھوں نے جسم مطہر سیدہ کو سنبھال لیا۔ دلائل الامۃ میں ہے کہ چونکہ قبر فاطمہؑ کے ساتھ بے ادبی کا اندیشہ تھا اس لیے چالیس قبریں بنا دی گئی تھیں۔ مناقب ابن شہر آشوب میں ہے کہ چالیس قبریں اس لیے بنائی گئی تھیں کہ صحیح قبر معلوم نہ ہو سکے اور فاطمہؑ کو ستانے والا قبر پر بھی نماز نہ پڑھ سکے ورنہ سیدہ کو اذیت ہوگی۔ اس کے باوجود لوگوں (ابوبکر وغیرہ) نے قبر کھود کر نماز جنازہ پڑھنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں حضرت علیؑ ننگی تلوار لے کر زرد لباس پہنے ہوئے قبر پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت آپ کے منھ سے کف جاری تھا، یہ دیکھ کر لوگوں کی ہمتیں پست پڑ گئیں اور وہ آگے نہ بڑھ سکے۔

علامہ حافظ محمد بن علی شہر آشوب المتوفی ۵۸۸ھ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا کے جنازے میں امیر المومنین حضرت علیؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ، سلمان فارسی، ابوذر، مقداد، عمار اور بریدہ شریک

تھے اور انھیں لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ ایک روایت میں عباس، فضل، حذیفہ اور ابن مسعود کا اضافہ ہے۔ طبری میں ابن زبیر کا بھی تذکرہ ہے۔

(عمدۃ المطالب ترجمۂ مناقب ج ۲ ص ۶۵ مطبوعہ ملتان)

حضرت فاطمہ زہراؑ کے جائے دفن میں اختلاف ہے۔ کوئی جنت البقیع کوئی قبر اور منبر رسولؐ کے مابین اور کوئی گھر اور قبر پیغمبرؐ کے درمیان بتاتا ہے۔ مشہور یہی کہ آپ جنت البقیع میں دفن ہیں۔ لیکن احمد بن محمد بن ابی نصر نے امام رضا علیہ السلام سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؑ اپنے ہی گھر میں مدفون ہوئیں اور جب بنی امیہ نے مسجد کی توسیع کی تو آپ کی قبر روضۂ رسولؐ کے اندر آگئی۔ (ترجمہ مناقب ابن شہر آشوب ج ۲ ص ۶۹)

انوار الحسینیہ ج ۱ ص ۵۴ مطبوعہ بمبئی ۱۳۴۶ھ میں ہے کہ ابن سعود نے جذبۂ وہابیت سے متاثر ہو کر قبر معصومۂ عالم کو منہدم کرا دیا۔ شیخ العراقین محمد رضا کا کہنا ہے کہ ابن سعود نے مکہ میں نو اور مدینہ میں انیس مقامات مقدسہ کو منہدم کرایا تھا جن میں خانۂ سیدہ اور بیت الحزن بھی شامل ہے۔

(اقتباسات چودہ ستارے)

حضرت فاطمہ زہراؑ پیغمبر اسلام کی نظر میں

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں معصومۂ کونین حضرت فاطمہ زہراؑ کی منزلت یہ تھی کہ آپ انھیں "ام ابیہ" یعنی اپنے باپ کی ماں کہہ کر مخاطب فرماتے تھے اور جب معصومہ تشریف لاتی تھیں تو آپ سرو قد تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ فاطمہ زہراؑ کی فضیلت میں رسول اللہؐ کی اس قدر حدیثیں موجود ہیں کہ ایک کتاب الگ سے مرتب ہو سکتی

ہے۔ لیکن یہاں مقصد صرف ان حدیثوں کو پیش کرنا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ فاطمہ زہراؑ کو ایذا پہنچانے والا اللہ اور رسول کی نگاہ میں کیا مقام رکھتا ہے۔

۱۔ ارشاد پیغمبرؐ ہے کہ اللہ، فاطمہؑ کے غضب سے غضب میں آتا ہے اور اس کے خوش ہونے سے خوش ہوتا ہے۔ (مستدرک حاکم و جامع ترمذی)

۲۔ فرمایا رسولؐ خدا نے کہ فاطمہؑ میرا جزو ہے جس نے اس کو غضب ناک کیا اس نے مجھ کو غضب ناک کیا اور جس نے اس کو ایذا پہنچائی اس نے مجھے ایذا پہنچائی۔

۳۔ فرمایا پیغمبرؐ نے کہ فاطمہؑ میرا دل اور میری روح ہے جس نے اسے ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی اور کافر ہوا۔

۴۔ فرمایا رسولؐ خدا نے کہ فاطمہؑ میرا نور، میرا جزو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور فاطمہؑ کو ایذا پہنچانے والا کافر ہے۔ (صحیح بخاری باب ۱۲ ص ۲۹۰ صحیح مسلم ج ۴ ص ۲۹۰، جامع ترمذی ص ۷۰۵، کنز العمال ص ۹۷، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۵۴)

مذکورہ اقوال پیغمبرؐ سے واضح ہے کہ سیدہ فاطمہ زہراؑ کو ناراض کرنے والا اور آپ کو ایذا پہنچانے والا کافر ہے اور قرآن بھی کہتا ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسولؐ کو ایذا پہنچاتے ہیں وہ کافر ہیں اور ان کے لیے دنیا و آخرت دونوں جگہ اللہ کی لعنت ہے۔

اس اعتبار سے فاطمہ زہراؑ کی ایذا رسانی کے بعد، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی شخصیت کا تعین مولانا ندوی خود فرمالیں

خلافت کی واپسی

حضرت ابوبکر کو جب مرض الموت نے اپنے شکنجے میں جکڑا اور انھیں یہ یقین ہوگیا کہ اب بچنا محال ہے تو آپ کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ آپ خلافت کو اسی شخص کے حوالے کر جائیں جس کی یہ مرہون منت ہے۔ چنانچہ اپنی علالت کے دوران آپ نے حضرت عمر کے لیے راستہ ہموار کرنا شروع کر دیا۔ جب مسلمانوں کو آپ کی اس نیت کا پتہ چلا تو انصار و مہاجرین پر مشتمل ایک وفد طلحہ و زبیر کی قیادت میں آپ سے ملا اور احتجاج کرتے ہوئے آپ سے درخواست گذار ہوا کہ حضرت عمر انتہائی غلیظ طبیعت کے انسان ہیں اور جب آپ کی موجودگی میں ان کے مظالم کی تلوار کا لوہا ہم مسلمانوں کے لیے ہمیشہ گرم رہتا تھا تو خلیفہ ہو جانے کے بعد وہ نہ جانے کیا کریں گے۔ اور ہم یہ اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں کہ آپ ہم پر حضرت عمر کو خلیفہ بنا کر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا وقت آخر ہے اور آپ اللہ کے گھر جا رہے ہیں آخر وہاں کیا جواب دیں گے۔ لہذا آپ اپنے اس ارادے سے باز آئیں۔ (تاریخ الامم والملوک ج ۴ ص ۵۴ الفاروق ص ۲۷، تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۶۹ وغیرہ) لیکن حضرت ابوبکر چونکہ حضرت عمر کی خلافت کے بارے میں اپنے دل میں ٹھان چکے تھے اور مکمل فیصلہ کر چکے تھے لہذا انھوں نے طلحہ و زبیر وغیرہ کی باتوں پر توجہ دینے کے بجائے انھیں سختی سے جھڑک دیا اور فرمایا کہ یہ لباس خلافت مجھے تم لوگوں نے نہیں پہنایا بلکہ اسے میرے محسن عمر بن خطاب نے مرحمت فرمایا ہے اور میں اس کو انھیں ضرور واپس کروں گا۔ (خلاصۂ عبارت ابوبکر، مترجم محمد احمد پانی پتی ص ۵۰۴)

الغرض حضرت ابوبکر کی حالت جب بگڑنے لگی تو آپ نے حضرت عثمان کو

بلایا اور کہا کہ قلم دوات اور کاغذ لاؤ اور جو کچھ میں لکھوانا چاہتا ہوں اسے لکھو۔ عثمان کاغذ و قلم لے آئے اور کہا کہ کیا لکھوں۔ فرمایا کہ لکھو، حکم نامہ منجانب ابوبکر بن قحافہ بنام امت مسلمہ، امابعد . . . .، ابوبکر اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ بے ہوش ہو گئے۔ حضرت عثمان ابوبکر کا مقصد سمجھ گئے تھے لہٰذا انھوں نے یہ تحریر فرمادیا کہ میں نے تم پر عمر بن خطاب کو خلیفہ مقرر کیا اور خیر میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس کے بعد جب حضرت ابوبکر ہوش میں آئے تو انھوں نے عثمان سے کہا کہ پڑھو کیا لکھا ہے جو لکھا تھا اسے عثمان نے پڑھ کر سنادیا جس پر خوش ہو کر ابوبکر نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور کہا کہ شاید تمھیں بھی اس امر کا خوف پیدا ہوا کہ اگر میں بے ہوشی کی حالت میں مر گیا تو مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ عثمان نے کہا کہ ہاں۔ اس پر ابوبکر نے فرمایا کہ اللہ تمھیں جزائے خیر دے (تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۴۳، تاریخ الامم والملوک ج ۴ ص ۲۵، تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۶۸)

حضرت ابوبکر نے اس وصیت نامہ کو اپنے غلام کے ذریعہ عام مسلمانوں میں مشتہر کرایا۔ مشتہری کے وقت حضرت عمر، حضرت ابوبکر کے غلام کے ساتھ ساتھ رہے۔ طبری کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جسے ہلا ہلا کر یہ کہتے جاتے تھے کہ اے مسلمانو! خلیفۂ رسول نے جو کچھ اس وصیت نامہ میں لکھا ہے اسے تمھیں ماننا ہوگا۔ (خلاصۂ تاریخ طبری ج ۴ ص ۵۲) اتمام نعمت میں ہے کہ ڈنڈے کے زور پر یہ بیعت، بیعت بالجبر تھی اسے بالرغبت نہیں کہا جاسکتا۔

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ خدا کا رسول جب وصیت کے لیے قلم دوات اور کاغذ طلب کرے تو اس کے اس عمل کو ہذیان سے تعبیر کر دیا جائے اور بستر مرگ پر جب حضرت ابوبکر وصیت لکھوائیں تو اس کو ڈنڈے کے زور سے مسلمانوں پر نافذ کیا جائے۔

مولانا ابوالحسن ندوی کا کہنا ہے کہ: "حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت عمر کو اس لیے نامزد کیا تھا کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ عمر فاروق میں قوت فیصلہ، مستقل مزاجی، اصابت رائے اور عقل و رائے کی پختگی بدرجۂ اتم موجود تھی۔"

(المرتضیٰ ص ۱۶۳، ۱۶۴)

بے شک حضرت عمر میں قوت فیصلہ ایسی ہی تھی کہ جس نے ایک منزل میں رسول اللہ ص کا قصہ ہی پاک کر دینا چاہا اور ایک منزل میں اس نے آپ کو رسول ص کی رسالت پر شک کرنے پر مجبور کر دیا اور مستقل مزاجی کا یہ حال تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کی منزل میں آپ کبھی مستقل مزاج نہ رہ سکے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ محمد و آل محمد ص کی دشمنی اور لات و ہبل کی پرستش میں ہمیشہ مستقل مزاج رہے، جس کا اعتراف ہمیں بھی ہے۔ اصابت رائے اور عقل و رائے کی پختگی کے بارے میں صرف اتنا ہی تبصرہ کافی ہے کہ اس نے جب خام سیاست کا لباس زیب تن کیا تو انسانیت برہنہ ہو گئی۔

واقعۂ قرطاس

واقعۂ قرطاس کے ذیل میں مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"صحیح بخاری میں حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری وقت آیا اس وقت گھر میں کچھ لوگ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا آؤ تمھارے لیے ایک تحریر لکھ دوں کہ اس کے بعد تم گمراہ نہ ہونے پاؤ۔ کچھ لوگوں نے

کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف زیادہ ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے، ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔ اس معاملے میں گھر والے ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے اور آپس میں جھگڑنے لگے۔ ان میں کوئی کہتا تھا کہ (کاغذ قلم) آپ کے قریب کردو تاکہ تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دیں جس کے بعد تم راہ سے نہ بھٹک سکو۔ کچھ لوگ اس کے خلاف کہہ رہے تھے مگر جب زیادہ گفتگو بڑھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "چلے جاؤ۔"

(الجامع الصحیح للبخاری کتاب المغازی باب مرض النبی ووفاتہ)

پھر مزید تحریر فرماتے ہیں:۔

"کاغذ طلب کرنے کے بعد تین روز تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں رہے لیکن دوبارہ قلم و قرطاس طلب نہیں فرمایا اور خلافت کے سلسلہ میں کوئی تصریح نہیں فرمائی۔ اس روز متعدد وصیتیں بھی کیں مگر ان میں خلافت کا ذکر نہیں فرمایا۔ آپ نے جو وصیتیں کیں ان میں یہ تھا کہ نماز اور ان لوگوں کا خیال جو تمہارے زیر نگیں (غلام اور باندیاں) ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز، زکوٰۃ اور غلام اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی۔"

(المرتضٰی ص ۱۲۲، ۱۲۳)

مولانا ابوالحسن ندوی نے اپنی مذکورہ گفتگو کی دلیل میں صحیح بخاری اور رواہ البیہقی واحمد کا نام تو لیا ہے مگر جلد نمبر اور صفحہ نمبر کی وضاحت نہیں کی جس سے آپ کی بددیانتی ظاہر ہوتی ہے اور گفتگو کی صداقت پر شک ہوتا ہے اور

نہ ایسی کوئی روایت صحیح بخاری وغیرہ میں میری نظر سے گزری ہے۔ اس لیے مولانا ندوی کی اس گفتگو پر تبصرہ کے بجائے ضرورت اس امر کی ہے کہ واقعۂ قرطاس کو از سر نو تاریخی حوالوں کی روشنی میں پیش کیا جائے تاکہ حقیقت واضح ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع کی واپسی پر اپنی جانشینی کا اعلان حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے حق میں مرضی الٰہی کے مطابق کر چکے تھے۔ آخری لمحات میں آپ نے یہ ضروری سمجھا کہ اسے دستاویزی شکل دے دوں۔ چنانچہ آپ نے اصحاب سے فرمایا کہ مجھے کاغذ، قلم اور دوات مہیا کردو تاکہ میں تمہارے لیے ایسا نوشتہ تحریر کردوں جو تمھیں گمراہی سے بچائے رکھے۔ یہ سن کر اصحاب میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ لوگوں کے رجحانات قلم و دوات دے دینے کی طرف دیکھ کر حضرت عمر نے کہا کہ یہ مرد ہذیان بک رہا ہے، ہمارے لیے کتاب خدا کافی ہے۔ (صحیح بخاری پ۳ ص ۸۴۲)

علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ حضرت عمر نے آنحضرت کے اس ارشاد کو ہذیان سے تعبیر کیا تھا (الفاروق ص ۶۱)

مولوی نذیر احمد خاں دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ "جن کے دل میں تمنائے خلافت چٹکیاں لے رہی تھی انھوں نے تو دھینگا مشتی سے منصوبہ ہی چٹکیوں میں اڑا دیا اور مزاحمت کی یہ تاویل کی کہ ہماری ہدایت کے لیے قرآن بس کرتا ہے اور چونکہ اس وقت پیغمبر صاحب کے حواس برجا نہیں ہیں۔ کاغذ و قلم و دوات کا لانا کچھ ضروری نہیں، خدا جانے کیا لکھوا دیں۔" (امہات الامۃ ص ۹۲) اس واقعہ سے آنحضرتؐ کو سخت صدمہ ہوا اور آپ نے فرمایا "تو ہوا عنی" میرے پاس سے چلے جاؤ۔ نبی کے روبرو شور و غل انسانی ادب نہیں ہے۔

امام ابوالحامد محمد الغزالی لکھتے ہیں کہ غدیر خم میں حضرت رسول کریمؐ کے

"من کنت مولاہ فہٰذا علی مولاہ" فرمانے کے بعد اور موقع پر مبارک باد دینے کے بعد جب لوگوں پر خلافت کی ہوا و ہوس غالب آگئی تو انھوں نے غدیر خم کی تمام باتیں بھلا دیں پھر جب رسول خدا کے انتقال کا وقت آیا تو انھوں نے وفات سے قبل فرمایا کہ مجھے قلم دوات اور کاغذ دے دو تاکہ میں دستاویزی طور پر خلافت کے اشکال کو دور کر دوں اور تمھیں تحریر کے ذریعہ بتا دوں کہ میرے بعد خلافت کا حق دار کون ہے؟ یہ سن کر حضرت عمر نے کہا کہ اس مرد کو چھوڑ دو یہ ہذیان بک رہا ہے (سر العالمین ص ۹ مطبوعہ بمبئی) یہ عبارت مختلف الفاظ میں صحیح بخاری طبع کراچی ج ۱ ص ۲۴، ۱۳۴، ۱۳۵ و ج ۲ پ ۱۲ ص ۶۹۶ و ج ۳ پ ۲۳ ص ۸۴۲، ۸۴۳ و صحیح مسلم جلد ۵ ص ۷۶، و فتح الباری شرح بخاری عسقلانی ج ۱ ص ۱۲۹ برحاشیہ و جزو ۸ ص ۱۰۱ نسیم الریاض شرح شفا قاضی عیاض طبع مصر جز ۴ ص ۲۷۸ شرح شفا مُلّا علی قاری برحاشیہ نسیم الریاض، مدارج النبوۃ طبع کان پور ص ۵۴۲، حبیب السیر ۱۲ ص ۹۷، و مکتوبات شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ج ۲ ص ۶۱-۶۲ وغیرہ میں بھی ہے۔

انھیں کتابوں کی روشنی میں خواجہ حسن نظامی دہلوی لکھتے ہیں: اسی بیماری کے زمانہ میں ایک دن بہت سے لوگ حضرت صلعم کے پاس جمع تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ لاؤ کاغذ میں تم کو کچھ لکھ دوں تاکہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو جاؤ۔ یہ سن کر (حضرت عمر) بولے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بخار کا غلبہ ہے اس لیے ایسا فرماتے ہیں۔ وصیت نامہ کی کچھ ضرورت نہیں ہم کو خدا کی کتاب کافی ہے۔ (محرم نامہ ص ۱۰ مطبوعہ دہلی)

علامہ طریحی لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، ابو عبیدہ، عبد الرحمٰن اور سالم ان پانچ آدمیوں نے خانہ کعبہ میں قسم کھائی تھی کہ پیغمبر کے بعد ہم خلافت

کو خاندانِ بنی ہاشم میں نہ جانے دیں گے۔ (مجموع البحرین)

یہ واقعہ حدیث قرطاس کی شکل میں مذکورہ کتابوں میں موجود ہے لیکن ندوی صاحب کی چشم وہابیت میں ایسی بصیرت کہاں کہ وہ اسے دیکھ سکے۔

انتقال

حضرت ابوبکر نے دو سال تین ماہ گیارہ دن تخت خلافت پر قابض رہ کر ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳ھ مطابق ۲۲ اگست ۶۳۴ء پیر کے دن انتقال کیا۔ آپ کے دور خلافت میں خاص بات یہ تھی کہ توسیع حکومت اور حصول اقتدار کے نام پر اسلام کا سہارا لے کر تقریباً دو لاکھ اٹھارہ ہزار بے گناہ انسانوں کا خون بہایا گیا کشت و خون کی اس ہولی میں زیادہ تر خالد بن ولید کا ہاتھ رہا۔

حضرت ابوبکر نے اپنی حیات میں پانچ عورتوں سے عقد جائز کیا۔ آپ کی کل چھ اولادیں تھیں۔ لڑکوں میں عبد الرحمٰن، عبد اللہ اور محمد تھے اور لڑکیوں میں حضرت عائشہ، اسماء اور ام کلثوم تھیں۔ حضرت عائشہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقد میں تھیں، اسماء کے شوہر زبیر بن عوام تھے اور ام کلثوم سے حضرت عمر نے عقد فرمایا تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

حضرت ابوبکر کے والد قحافہ نے ۹۷ سال کی عمر پائی تھی۔ ۹ھ میں فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے اور ۱۴ھ میں انتقال فرما گئے۔ اس طرح آپ نے کل پانچ سال مسلمان رہ کر ۹۲ سال کفر کی زندگی گذاری۔

مدفن

یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت ابوبکر اور عمر دونوں ہی رسول اللہ

کے اردگرد حجرۂ عائشہ میں دفن ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس حجرہ میں یہ لوگ دفن ہیں کیا وہ واقعی عائشہ کی ملکیت تھا؟ اس کے جواب میں صاحب کتاب اصحاب ثلاثہ نے ج ۱ ص ۱۵۱ تا ۱۵۳ امام ابوحنیفہ اور فضال کوفی کا ایک دلچسپ مکالمہ نقل کیا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

فضال کوفی: اے ابوحنیفہ میرا ایک بھائی ہے جو حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کو شیخین (حضرت ابوبکر و عمر) سے افضل سمجھتا ہے۔

ابوحنیفہ: شیخین کی افضلیت تو پہلوئے رسولؐ میں دفن ہونے سے ہی ظاہر ہے۔

فضال کوفی: یہ بات میں نے اپنے بھائی سے کہی تھی، مگر وہ کہتا ہے کہ اگر وہ حجرہ آنحضرتؐ کی ملکیت تھا تو دونوں نے اس میں دفن ہو کر ظلم کیا اس لیے کہ انھیں رسول اللہ کے حجرہ میں دفن ہونے کا کوئی حق نہیں تھا اور اگر وہ حجرہ شیخین ہی کا تھا اور انھوں نے رسولؐ کو ہبہ کر دیا تھا تو ہبہ کے بعد بغیر اجازت رسولؐ اس پر تصرف ناجائز تھا اور رسول اللہؐ سے اجازت کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ آپ کا انتقال شیخین سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔

ابوحنیفہ: وہ حجرہ شیخین کی تدفین کے وقت نہ شیخین کا تھا نہ رسول اللہ کا، بلکہ شیخین اپنی اپنی بیٹیوں عائشہ اور حفصہ کے حصہ میں دفن ہیں۔

فضال کوفی: یہ بات بھی میں نے اپنے بھائی سے کہی تھی مگر اس نے جواب دیا کہ تم تو جانتے ہو کہ آنحضرتؐ کی نو بیویاں تھیں لہٰذا شریعت محمدی کی رو سے اس حجرہ کے آٹھویں حصہ کی وارث حفصہ اور نویں حصہ کی وارث عائشہ قرار پاتی ہیں، اور ان دونوں کی زمین کا رقبہ دو بالشت سے بھی کم ہوتا ہے، لہٰذا اتنی تنگ جگہ میں دو طویل القامت آدمی کیونکر دفن ہو گئے اور عائشہ و حفصہ کے علاوہ دیگر سات بیویوں سے اجازت کیوں نہیں لی گئی؟ اس کے علاوہ

رسولؐ کے ترکہ کی وارث عائشہ اور حفصہ کیوں کر ہو سکتی ہیں جب کہ رسول کی بیٹی فاطمہؑ کو میراث پدری سے محروم رکھا گیا۔

اس مختصر مکالمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حجرہ کے اصل وارث پیغمبر اسلامؐ تھے اور آپ کے بعد آپ کی صاحبزادی حضرت سیدہ فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا اس حجرہ کی وارث ہوئیں۔ حجرے کے اندر حضرات شیخین کا دفن کیا جانا اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جب معصومہؑ سے اجازت حاصل کر لی گئی ہو، اور معصومہؑ سے حصول اجازت کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ آپ کا انتقال شیخین سے پہلے ہو چکا تھا۔ اور اگر اس پہلو پر غور کیا جائے کہ معصومہؑ کی حیات میں ہی ان سے اجازت حاصل کر لی گئی تھی تو اس کا امکان اس لیے نہیں ہے کہ سیدہ فاطمہ صلواۃ اللہ علیہا شیخین سے ناراض اس دنیا سے رخصت ہوئیں جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

معلوم ہوا کہ شیخین یعنی ابوبکر اور عمر کا مدفن بھی غاصبانہ ہے۔

حضرت علیؑ کی خاموشی اور اپنے حق کیلئے تلوار نہ اٹھانے کا سبب

بعض نافہم یہ سوال کر بیٹھتے ہیں کہ رسول اللہ کے بعد حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام خاموش کیوں رہے اور آپ نے اپنے حق کی خاطر غاصبوں سے جنگ کیوں نہیں کی؟۔

یقیناً حالات اسی منزل میں تھے اور اس جان لیوا ماحول اور سخت گیر مصائب کے عالم میں امیر المومنین کی جگہ عام ذہن و فکر کا کوئی دوسرا انسان ہوتا تو خونریزی لازمی تھی۔ لیکن اس سخت ترین منزل میں حضرت علیؑ کی حکیمانہ خاموشی نے دور اندیشی اور مصلحت بینی سے کام لے کر نہ صرف رسولؐ کی محنتوں اور مشقتوں کو رائگاں

ہونے سے بچا لیا بلکہ اسلام کی کشتی کو فنا کے گرداب اور طوفان سے نکال کر اُسے دائمی اور ابدی زندگی دے دی۔

اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ حضرت علیؑ کی دلیری ہمت اور شجاعت کا یہ عالم تھا کہ فوجوں کے ریلے آپ کے ثبات قدم کو جنبش نہ دے سکتے تھے۔ ہر معرکہ کی فتح یابی اور کامرانی کا سہرا آپ ہی کے سر رہا کرتا تھا اور بہادر سے بہادر نبرد آزما بھی آپ کی تلوار سے بچ کر جانے میں کامیاب نہ ہوتا تھا۔ آپ نے جس سے بھی مقابلہ کیا اسے پچھاڑے بغیر نہ چھوڑا۔

شجاعوں کی منچلی طبیعتیں سوچ بچار کی عادی نہیں ہوا کرتیں اور نہ مصلحت بینی و مآل اندیشی سے انھیں کوئی لگاؤ ہوتا ہے۔ مگر آپ میں شجاعت کے ساتھ سوجھ بوجھ کا مادہ بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ چنانچہ امام شافعی کا قول ہے کہ میں اس ہستی کے بارے میں کیا کہوں جس میں تین صفتیں ایسی تین صفتوں کے ساتھ جمع تھیں جو آج تک کسی بھی انسان میں جمع نہیں ہوئیں (۱) فقر کے ساتھ سخاوت (۲) شجاعت کے ساتھ تدبر (۳) علم اور رائے کے ساتھ عملی کارگذاریاں۔

اسی اصابت فکر و صحت رائے کا نتیجہ تھا کہ پیغمبرؐ کی وفات کے بعد ابوسفیان نے آپ کو اپنے حق کے لیے تلوار اٹھانے کا مشورہ دیا اور فوجوں کی فراہمی کا وعدہ کیا تو آپ نے اس کے مشورہ کو ٹھکرا دیا حالانکہ ایسے موقعوں پر بہادروں کو ابھارنے کے لیے ذرا سا بھی سہارا کافی ہوتا ہے، مگر آپ کی طبع دور اندیش نے فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ اگر اس وقت معرکۂ کارزار گرم ہو گیا تو سارا مدینہ خون میں ڈوب جائے گا اور اسلام کی آواز تلواروں کی جھنکار میں دب کر رہ جائے گی اور پھر کامیابی حاصل ہوئی تو یہی کہنے میں آئے گا کہ تلوار کے زور سے اس منصب کو حاصل کیا ورنہ کوئی استحقاق نہ تھا۔ لہٰذا آپ نے تلوار روک کر ایک طرف تو اسلام کی حفاظت

کا سامان فراہم کیا اور دوسری طرف اپنے حق کو خوں ریزیوں سے داغدار نہ ہونے دیا۔

جہاں رگ وپے میں شجاعت کا خون دوڑ رہا ہو اور سینے میں غیظ وغضب کی چنگاریاں بھڑک رہی ہوں وہاں ولولۂ انتقام کو دبا کر عفو وبخشش کا طرز عمل اختیار کرنا اور طاقت کے ہوتے ہوئے درگذر سے کام لینا بڑی کٹھن اور امتحانی منزل ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ دیکھو رسول اللہؐ دنیا سے اٹھ چکے ہیں۔ مجھ سے خلافت کے بارے میں کوئی نزاع نہ کرے، لیکن ان لوگوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ خدا کی قسم اگر دین میں تفرقہ پڑنے اور کفر کے پلٹ آنے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ان کی ساری کارروائیاں آن واحد میں پلٹ دیتا۔ (استیعاب ج ۱ ص ۱۸۳ مطبوعہ حیدرآباد)

فتح الباری فی شرح بخاری ج ۴ ص ۲۰۴ سے واضح ہے کہ حضرت علیؑ نے اسی طرح چشم پوشی اختیار کی جس طرح کفر کے پلٹ آنے کے خوف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقین کے ساتھ کرتے تھے۔ چنانچہ تفسیر کبیر ج ۴ ص ۶۸۶، سیرت محمدیہ ص ۳۵۶، سیرت حلبیہ ص ۳۶۰ اور تاریخ خمیس ج ۲ ص ۱۳۹ وغیرہ میں ہے کہ آنحضرتؐ، عائشہ سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر تیری قوم نو مسلم نہ ہوتی تو میں اس کے ساتھ وہ سلوک کرتا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ چونکہ حضرت رسول خداؐ اور حضرت علیؑ لازم وملزوم تھے۔ لہٰذا جن وجوہ کی بنا پر رسول اللہ نے ان منافقوں سے جنگ نہیں کی، انھیں وجوہ کی بنا پر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے تلوار نہیں اٹھائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت ابوسفیان مدینہ میں موجود نہیں تھا۔ کہیں سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں اس المناک واقعہ کی خبر ملی۔ اس نے پوچھا کہ مسلمانوں کی قیادت و امارت کسے ملی؟ بتایا گیا کہ لوگوں نے

ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرلی ہے۔ یہ سن کر عرب کا مانا ہوا فتنہ پرداز سوچ میں پڑگیا اور آخر کار ایک تجویز لے کر عباس ابن عبدالمطلب کی خدمت میں آیا اور کہا کہ دیکھو ان لوگوں نے دھاندلی مچا کر خلافت ایک تیمی کے حوالے کر دی ہے اور بنی ہاشم کو ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا ہے۔ یہ خلیفہ اپنے بعد بنی عدی کے ایک درشت مزاج کو ہمارے سروں پر مسلط کر جائے گا۔ چلو، علیؑ ابن ابی طالبؑ سے کہیں کہ وہ گھر کا گوشہ چھوڑیں اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ چنانچہ وہ عباس کو لے کر علیؑ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ آپ ہاتھ بڑھائیں، میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ اگر کوئی مخالفت پر آمادہ ہوا تو میں مدینہ کی گلیوں کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے لیے یہ انتہائی نازک مرحلہ تھا۔ کیونکہ وہ اپنی جگہ پیغمبرؐ کے صحیح وارث و جانشین تھے اور ابوسفیان جیسا جتھے قبیلے والا آپ کے سامنے کھڑا تھا جو ہر طرح آپ کی مدد پر آمادہ تھا صرف ایک ہی اشارہ کافی تھا کہ جنگ کے شعلے بھڑکنے لگتے۔ مگر امیرالمومنین کے تدبر نے مسلمانوں کو فتنہ و فساد اور کشت و خون سے بچا لیا اور آپ کی دوررس نظروں نے فوراً بھانپ لیا کہ یہ قبائلی تعصب اور نسلی امتیاز کو ابھار کر خوں ریزی کرانا چاہتا ہے تاکہ اسلام میں ایک ایسا زلزلہ آئے اور خون کا ایسا دھاکہ ہو جو اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دے۔ لہذا آپ نے اس کی تجویز کو نہایت سختی سے ٹھکرا کر اسے جھڑک دیا۔

اس موقع پر امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خاموشی، مصلحت بینی اور دوراندیشی اصابت فکر کی آئینہ دار تھی۔ کیوں ان حالات میں اگر مدینہ مرکز جنگ بن جاتا تو اس کی آگ سارے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی اور مہاجرینؓ و انصار میں جس رنجش کی ابتدا ہو چکی تھی وہ بڑھ کر اپنی انتہا کو پہنچ جاتی۔ منافقین کی

ریشہ دوانیاں اپنا کام کرتیں اور اسلام کی کشتی ایسے گرداب میں پڑ جاتی کہ پھر اس کا سنبھلنا مشکل ہو جاتا۔

(اقتباسات نہج البلاغہ)

MOWLANA NASIR DEVJANI
MAHUVA GUJARAT INDIA
PHONE 0091 2844 28711

بنی ہاشم

مذکورہ عنوان کے تحت مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں :۔

"قریش کی شاخ اپنے انسانی شعور اور اعتدال پسندی میں امتیاز رکھتی تھی۔ دینی اور دماغی طور پر بھی اس کو کسی قدر فوقیت حاصل تھی۔ بیت اللہ (خانۂ کعبہ) کا اللہ تعالیٰ کے یہاں جو مقام و مرتبہ تھا اس پر پختہ ایمان رکھتی تھی۔ گناہ کو سمجھنے کا شعور ختم نہیں ہوا تھا۔ ہٹ دھرمی اور ضد اس کا شعار نہیں تھا۔ ہمت بلند تھی۔ کمزوروں اور ضعیفوں پر رحم و شفقت کا برتاؤ کرتی تھی۔ سخاوت و شجاعت اس کا مزاج تھا۔ غرض اخلاق و شرافت، سیر چشمی، حمیت اور جوش عمل کی وہ خصوصیات جس کے لیے عربی میں ایک جامع لفظ "فروسیت" کا ہے، بنی ہاشم میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ان کے اخلاق و سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء و اجداد کے شایان شان تھے اور اسلام نے جن اخلاق عالیہ کی دعوت دی ہے ان سے ان کے اخلاق مناسبت رکھتے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک زمانہ تک وہ اپنی قوم و ہم وطن قبائل کے عقائد جاہلیت اور غیر اللہ کی عبادت میں شریک ہوگئے تھے۔"

(المرتضیٰ ص ۳۱-۳۲)

خط کشیدہ عبارت میں مولانا ندوی نے اپنے جس موقف اور مقصد کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس کا کوئی وجود تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا اور نہ بنی ہاشم پر اس الزام تراشی کے جواز میں کسی مورخ کے قلم میں جنبش ہوسکی۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی اسناد سے مایوسی کے بعد مولانا موصوف نے خود اپنی ہی کتاب کا حوالہ پیش کر کے اپنے دل کی تسلی کرلی۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مولانا کا یہ عمل اور طریقۂ کار عام مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا کرنے اور انھیں دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ بہرحال ... یہ ایک کلیہ، ایک حقیقت، دنیاوی مشاہدہ اور اصول فطرت ہے کہ انسان کے طور و طریقوں، طرز حیات و معاشرت، اخلاق و تہذیب، خصائل و شمائل عادات و اطوار اور سیرت و کردار کا سرمایہ وراثتاً اس کی اولاد و اولاد اور نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ لہذا بنی ہاشم کی فضیلت اور ایمانی منزلت کو زیر بحث لانے سے قبل خود جناب ہاشم کی ایمانی منزلت اور فضیلت کو بھی دیکھنا ضروری ہے تاکہ مکمل وضاحت ہوسکے۔

عالم اسلام میں شاید ہی کوئی بدنصیب ایسا ہوگا کہ جس کو جناب ہاشم سے تعارف نہ حاصل ہو۔ جناب ہاشم کے والد عبد مناف کے چھ بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے ہاشم اور عبد الشمس تھے۔ کیونکہ یہ جڑواں پیدا ہوئے تھے اور صورت حال یہ تھی کہ جناب ہاشم کے پاؤں کا پنجہ عبدالشمس کی پیشانی سے چپکا ہوا تھا جس کو تلوار سے کاٹ کر فصل قائم کیا گیا تھا۔ یہ ابتدا ہے اس انتہا کی جس کے لیے حق و باطل کی مثال ہی درست ہوسکتی ہے۔ عاتکہ بنت مرّہ وہ محترمہ تھیں جن کا بطن اس گوہر نایاب کا صدف بنا۔ سب سے چھوٹے بھائی مطلب تھے جو آپ کے ساتھ صلبی و بطنی ربط رکھتے تھے۔

عبد مناف کی اولادوں میں جناب ہاشم کی ہستی وہ ہستی تھی جو اپنے کردار

کی بدولت ساری دنیا پر چھا گئی۔ آپ کے جسم کا ایک ایک تار اسمٰعیلی رشتہ کا مظہر تھا اور اکثر و بیشتر یہ صدائے حق آپ کے کانوں سے ٹکرایا کرتی تھی کہ اے ہاشم! تمھیں مبارک ہو کہ اشرف موجودات کا ظہور تمھاری ہی نسل سے ہوگا۔

برہنہ لوگوں کو لباس عطا کرنا، بھوکوں کو سیر کرنا، تنگ دستوں کی دستگیری کرنا، بیواؤں اور یتیموں کی کفالت کرنا اور قرض داروں کا بوجھ ہلکا کرنا آپ کا شیوہ تھا۔ جب آپ کوئی دعوت کرتے یا معمولاً دسترخوان بچھاتے تو مہمانوں سے جو بچ جاتا تھا وہ دیگر مخلوق خدا کے لیے ہوتا۔ جناب ہاشم کی اس کرم گستری اور مہمان نوازی کی عکاسی اس دور کے شاعروں نے بھی کی ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے کہ اگر کبھی مکہ جانے کا موقع فراہم ہو تو ہاشم کے گھر جانا اور جب تو ان کے دروازے پر پہنچے گا تو جود و کرم کے ہاشمی مظاہرات تیری آنکھوں کو خیرہ بنا دیں گے۔ عالی ظرفی کا سمندر تجھ کو اپنی آغوش میں لے لے گا اور تو ہاشمی فضیلت و منزلت کو دیکھ کر دنگ رہ جائے گا۔

جناب ہاشم کے یہی وہ خد و خال تھے جسے دیکھنے کے لیے قیصر شام و روم اور نجاشی شاہ حبش کی گردنیں بلند تھیں اور یہ لوگ اپنے یہاں عقد کے خواستگار تھے جس کو جناب ہاشم کی عظمت نے پست سمجھا۔

قریش کا دور ارتقا اگرچہ قصی ابن کلاب سے شروع ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ ابتدا تھی۔ اصول ارتقا کے مطابق کسی بھی قوم اور ملک کی تمہید اور تکمیل ایک وقت میں ممکن نہیں ہے۔ قطرہ کو گہر ہونے تک بہت سے طوفان دیکھنے پڑتے ہیں۔ جناب قصی کی صلاحیت اور لیاقت کا ہر صاحب نظر معترف ہے۔ انھوں نے اپنی کارگزاری کے دور میں بہت کارآمد تدبیریں سوچیں اور اکثر کو جامۂ عمل پہنانے میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ساری

تدبیریں اور تجویزیں جناب ہاشم کے ہاتھوں منزل کمال تک پہنچیں۔

حرم (خانۂ کعبہ) کے انتظامی معاملات میں جناب ہاشم کے دادا قصی کے زمانے سے ہی کچھ شکایتیں چلی آ رہی تھیں جو عبدالدار کے دور میں بھی باقی رہیں، بلکہ حالات نے وہ موڑ اختیار کیا کہ جناب ہاشم مداخلت کے لیے مجبور ہوئے اور انھوں نے اپنے بھائیوں کو جمع کر کے اصلاحی امور ان کے سامنے پیش کیے۔ چونکہ جناب ہاشم کی تجاویز میں حرم کی خدمات کا بے لوث جذبہ کارفرما تھا۔ اس لیے کسی نے مخالفت نہ کی اور سب نے بالاتفاق یہ منظور کیا کہ بنی عبدالدار سے حرم کے انتظامات واپس لے لیے جائیں۔ چنانچہ عبدالدار کی اولادوں کو حرم کی خدمتیں واپس کرنے کا پیغام بھیجا گیا۔ ان لوگوں نے قطعی انکار کر دیا جس کے سبب سے باہمی اختلاف پیدا ہوا۔ یہ اختلاف یقیناً معرکۂ کارزار گرم کر دیتا اگر اس طرح مصالحت نہ ہو جاتی کہ سقایت، رفادت اور دار الندوہ کے خدمات جناب ہاشم کے پاس رہیں اور حجابہ و لواء کے معاملات کا انتظام بنی عبدالدار کریں۔ ان تینوں خدمات کو جناب ہاشم نے جس خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ آج تک یادگار ہیں۔

چنانچہ ابن سعد طبقات میں تحریر فرماتے ہیں۔

"تمام قبیلۂ قریش میں جناب ہاشم ایک مرفہ الحال بزرگ تھے۔ جب واردان حرم کی ضیافت اور سقایت ان کے سپرد ہوئی تو آپ نے قریش کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم اللہ کی جانب سے حرم کے پاسبان و نگہبان ہو اور زمانۂ حج میں جو جماؤ حاجیوں کا یہاں ہوتا ہے وہ سب تمھارے مہمان ہیں۔ خدا کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں ان کی خدمت کا موقع فراہم کیا ہے لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مہمانوں اور زائروں کا احترام کریں اور نہایت سیر چشمی کے ساتھ ان کی

ضیافت کے فرائض کو انجام دیں۔ اس تقریر و تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے بڑے پیمانے پر رفادہ کا سامان شروع کیا اور ہر امیر و غریب نے اپنی استطاعت کے مطابق اس خدمت کے لیے جو ممکن ہو سکا وہ نذر کیا۔ جناب ہاشم خود بھی اپنے سرمایہ سے اس مصرف کے لیے مال کثیر نذر کیا کرتے تھے۔ آپ نے حجاج کو آب رسانی کے لیے چمڑے کے بڑے بڑے حوض بنوائے تھے جو زمزم کے پاس رکھ دیے جاتے اور مکہ کے کنوؤں کے پانی سے لبریز کر دیے جاتے تھے اور دل کھول کر حاجیوں کی ضیافت کی جاتی۔"

ہاشمی فیاضیوں کے یہی وہ غیر فانی نقوش تھے جو عالم کے گوشے گوشے پر ثبت ہو چکے تھے اور تمام لوگ آپ کی ذاتی عظمت اور وجاہت سے اثر پذیر تھے۔ جہاں جہاں سے لوگ آتے وہاں وہاں ان کے وسیع دستر خوانوں، کشادہ دیگوں اور شکم نواز پیالوں کا چرچا ہوتا رہتا اور شکر کے جذبات نظموں اور بلند بانگ خطبوں میں ڈھل کر خاموش فضا میں گونجا کرتے تھے۔

قحط سالی کے دور میں اہل عرب پر جناب ہاشم کے ناقابل فراموش احسانوں کا تذکرہ طبقات کے صفحات میں موجود ہے۔ اور انھیں ہاشم کی نسل بنی ہاشم کہلائی جو ہر اعتبار و ہر زاویے سے اوصاف و صفات ہاشمی کی ورثہ دار تھی۔ چنانچہ بخاری، مسلم اور ترمذی وغیرہ میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے بنی کنانہ سے قریش کا انتخاب کیا اور قریش میں بنی ہاشم کو پسند فرمایا۔

قاضی عیاض نے "شفاء" میں لکھا ہے کہ اللہ نے اولاد ابراہیم میں اسمٰعیل کو، اسمٰعیل میں قریش کو، قریش میں بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں آنحضرتؐ کو منتخب روزگار قرار دیا۔

تاریخ ابوالفداء میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے جبرئیل امین نے بیان کیا کہ میں نے تمام عالم چھان ڈالا مگر کسی کو خدا کے حبیب سے افضل و بہتر نہ پایا اور زمین کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا مگر کسی باپ کی اولاد بنی ہاشم جیسی نہ ملی۔ الغرض جناب ہاشم اور بنی ہاشم کی فضیلت میں سیکڑوں روایتیں کتابوں میں موجود ہیں جو ان کی حق پرستی اور حق تبلیغی کی مظہر ہیں۔ مگر انھیں نظر انداز کرکے ان بندگانِ خدا پر تہمتِ شرک، ندوی صاحب کا وہ کارنامہ ہے جو ہمارے لیے انتہائی دل آزار اور قابل مذمت ہے۔

حضرت عبدالمطلب

حضرت عبدالمطلب کے حالات میں فاضل مؤلف نے ایک جملہ تحریر فرمایا ہے جو اہل اسلام کے لیے قابل التفات ہے اور انھیں دعوت فکر دیتا ہے تحریر فرماتے ہیں:۔

"ابرہہ کے سپاہی عبدالمطلب کے دو سو اونٹ بھگا کر لے گئے عبدالمطلب اس سے گفت و شنید کے لیے گئے، اس کے دربار میں جانے کی اجازت لی۔ ابرہہ نے ان کی تعظیم کی، اپنے تخت سے اتر کر فرش پر اپنے ساتھ بٹھایا اور پوچھا کہ کیا حاجت ہے جس کے لیے تکلیف کی عبدالمطلب نے فرمایا کہ میری حاجت یہ ہے کہ تمھارے آدمی میرے دو سو اونٹ بھگا کر لے آئے ہیں وہ واپس کر دو۔ عبدالمطلب کی زبان سے یہ بات سن کر ابرہہ نے حقارت آمیز نظروں سے ان کو دیکھا اور بولا، تم دو سو اونٹوں کے بارے میں بات چیت کرنے آئے ہو اور اس گھر کو فراموش کر رہے ہو جس سے تمھارا اور تمھارے

آبا و اجداد کا دین وابستہ ہے اور جس کو میں منہدم کرنے آیا ہوں۔"

(المرتضیٰ ص ۳۴۳-۳۴۴)

خط کشیدہ عبارت میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا (حضرت عبدالمطلب) کی شان میں گستاخی کی جسارت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ مولانا ندوی کی وہابیت پر "رشدیت" کا غبار بھی ہے۔

آپ نے اس انداز سے ابرہہ کا عبدالمطلب کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھنے کو پیش کیا ہے گویا خود آپ بھی بہ نفس نفیس ابرہہ کے پاس موجود تھے اور اس کی نظروں کا جائزہ لے رہے تھے کہ وہ کس نظر سے جناب عبدالمطلبؑ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کی کسی کتاب میں اس اہانت آمیز جملے کا کوئی وجود نہیں ہے اور نہ کوئی مورخ ایسا گستاخ تھا کہ وہ رسول اللہ کے جد بزرگوار کے بارے میں اپنی اس مبتذل رائے کا اظہار کرتا۔ بہر حال ان تحقیر آمیز کلمات کے ذمہ دار ندوی صاحب خود ہیں اور جو اصل واقعہ ہے اس کی وضاحت میں کیے دیتا ہوں۔

مورخین نے خانۂ کعبہ پر ابرہہ کے لشکر کشی کے واقعات کو یوں تحریر کیا ہے کہ اہل مکہ کے تجار کا ایک گروہ بغرض تجارت حبشہ گیا تھا۔ وہاں ان میں سے کچھ لوگ عیسائیوں کی ایک عظیم الشان عبادت گاہ کے قریب قیام پذیر ہوئے اور آگ جلا کر کھانا تیار کیا۔ جب جانے لگے تو آگ بجھا کر جانے کے بجائے یوں ہی چھوڑ گئے، جس سے چنگاری بھڑکی اور اس عبادت گاہ میں آگ لگ گئی۔ چنانچہ وہاں جو کچھ بھی تھا وہ سب جل کر خاک ہو گیا۔

یہ خبر جب حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو معلوم ہوئی تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا اور اس نے اپنے وزیر اعظم ابرہہ بن صباح کو بلا کر یہ حکم دیا کہ تم ابھی مکہ روانہ

ہو جاؤ اور وہاں جا کر اہل مکہ کی عبادت گاہ (خانۂ کعبہ) کو اسی طرح مسمار اور خاک کر دو جس طرح ان لوگوں نے ہماری عبادت گاہ کو تباہ کیا ہے۔ بغرض کہ ابرہہ کے ساتھ ایک لاکھ درندہ صفت انسانوں کی فوج جس میں چار سو جنگجو ہاتھی بھی شامل تھے مکہ کی طرف روانہ ہوئی، اور فوجوں کا یہ سیاہ بادل کوہ و دشت کو عبور کر کے سرزمین بطحا پر وارد ہوا۔ فوج کی کثرت اور ہاتھیوں کا جم غفیر دیکھ کر اہل مکہ گھبرا گئے اور جائے عافیت کی تلاش میں پہاڑوں کی طرف بھاگنے لگے۔ اس وقت پیغمبر اسلام کے جد بزرگوار اور پاسبان حرم حضرت عبدالمطلب نے انھیں تسلی و تشفی دیتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ اطمینان رکھو، اللہ کے گھر کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اس لیے کہ وہی اس کا نگہبان ہے اور اس کی طاقت و توانائی کے سامنے تمام دنیا کی طاقتیں ہیچ ہیں۔ اگر تم پہاڑوں پر جانے کے بجائے حرم ہی کو جائے عافیت بنا لو تو تمام آفتوں سے بچ سکتے ہو۔ لیکن حضرت عبدالمطلب کے اس یقین دلانے کے باوجود لوگوں کے اکھڑے ہوئے قدم نہ جم سکے، سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف کلید بردار کعبہ اور آپ کے گھر کے افراد باقی بچے۔ عبدالمطلب نے خانہ کعبہ کے ماحول کو سنسان دیکھ کر بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ میرے مالک اب تو ہی ہمارا معین و مددگار ہے اور یہ گھر (خانۂ کعبہ) تیرا ہے، تو ہی اس کا محافظ ہے اور میں تجھے واسطہ دیتا ہوں اپنے جد ابراہیم کا کہ اس کو تمام آفتوں سے محفوظ رکھ۔ حضرت عبدالمطلب کی یہ دعا تمام ہوئی اور پیشانی قدرت پر ابرہہ اور اس کی فوج کے لیے قہر و غضب کی شکنیں نمودار ہونا شروع ہو گئیں۔

اسی درمیان حضرت عبدالمطلب کو یہ خبر ملی کہ ابرہہ کے سپاہی آپ کے دو سو اونٹ زبردستی بھگا لے گئے ہیں۔ آپ نے نہایت پر اعتماد لہجہ میں فرمایا کہ میرے ناقوں میں وہ ناقے بھی شامل ہیں جو اللہ کی امانت ہیں اور زائرانِ حرم

کی تواضع کے لیے مخصوص ہیں۔ میں انھیں ابرہہ سے واپس لوں گا۔ یہ کہہ کر آپ نے دوش پر ردا ڈالی، پٹکا باندھا اور ایک ناقہ پر سوار ہوئے۔ عزیزوں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے۔ فرمایا کہ میں اس ظالم سے ملنا چاہتا ہوں جس کے سپاہیوں نے اللہ کے مال پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اس مال کو واپس لاؤں، یہ سن کر تمام اقارب سدِ راہ ہوئے مگر اس مجسمۂ عزم و استقلال نے کہا کہ مجھے جانے دو، میں انجام سے باخبر ہوں۔ الغرض جناب عبدالمطلبؑ ابرہہ کے لشکر میں اس طرح وارد ہوئے جیسے کوہ سیاہ کے مقابل ماہ تاباں آجائے۔ یا شب تار پر نور سحر چھا جائے۔ مخالفین میں جس کی نظر پڑی وہ مبہوت و دم بخود رہ گیا۔ اتنا پوچھ سکے کہ نور مجسم تم کون ہو؟ عبدالمطلبؑ نے نام بتایا اور کہا کہ ابرہہ بن صباح تک جانا چاہتا ہوں، دربانوں نے ابرہہ کو مطلع کیا۔ ابرہہ نے باریابی کی اجازت دی اور فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ ہاتھیوں کی فوج بھی بلاکر دورویہ کھڑی کردی گئی۔ یہ ہاتھی بھی مسلح تھے، سر پہ آہنی توئے، سونڈ میں تلواریں لیے اپنے سواروں کے حکم کے منتظر کہ اشارہ پاتے ہی کچل ڈالیں۔ مگر ہاشم کا نور نظر جب آگے بڑھا تو فوجوں کی صفیں دیکھتی رہ گئیں۔ یہاں تک کہ جب آپ ہاتھیوں کے اس درہ کو عبور کر رہے تھے کہ انھیں چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس وقت ابرہہ اور اس کے لشکر کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ جب ہاتھیوں کے اس جھومتے ہوئے پہاڑ نے عبدالمطلب کے سامنے سر نیاز خم کرکے گھٹنے ٹیک دیے جس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا کہ خوف زدہ کرنے والے خود ہی خوفزدہ ہو گئے۔ اس سے بنی ہاشم کی جلالت اور دبدبہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے جو خلافت الٰہیہ کے منصب پر فائز نہیں ہوتے وہ بھی باطل کے مقابلے میں انتہائی وزنی ثابت ہوتے ہیں۔

ابرہہ نے بڑھ کر حضرت عبدالمطلبؑ کا استقبال کیا۔ اپنے پہلو میں بٹھاکر

زحمت کشی کا سبب پوچھا۔ عبدالمطلب نے فرمایا کہ کعبہ اور حرم کے بارے میں مجھے کچھ کہنا نہیں ہے اس لیے کہ وہ اللہ کا گھر ہے، وہ اس کی حفاظت خود کریگا البتہ تمھارے سپاہی میرے دو سو اونٹ لائے ہیں اگر چاہو تو انھیں واپس کردو۔ فوراً ابرہہ نے حکم دیا اور وہ واپس ہوئے۔ اس کے بعد ابرہہ نے پھر پوچھا کہ اور کچھ مانگنا ہو تو مانگو، یہ گویا شکست کا مظاہرہ تھا۔ یقین کیجیے کہ ایسے موقع پر اگر عبدالمطلب کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ خانۂ کعبہ کے لیے کچھ کہہ جاتا۔ مگر حضرت عبدالمطلب اپنے یقین کامل کے آئینہ میں حرم کا درخشاں مستقبل دیکھ رہے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آئندہ یہ جھگڑا باقی رہے، اور آج ہی ایسی فیصلہ کن جنگ ہو جائے جو جارحانہ اقدام کے تصور کا خاتمہ ہمیشہ کے لیے کردے۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ دشمن کے استقلال میں خود ایک تزلزل پیدا ہو چکا تھا اور اس کو اپنی فتح مشکوک نظر آرہی تھی۔ چنانچہ جب دوبار عبدالمطلبؑ نے فرمایا کہ مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں کہنا تو ابرہہ نے کہا کہ حرم کے لیے مجھ سے کیوں نہیں کہتے؟ مگر عبدالمطلبؑ نے جواب میں وہی کہا کہ اس کا ایک کارساز ہے اور وہ بہتر جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے؟

حضرت عبدالمطلبؑ کا یہ جواب دراصل دشمن کے تقاضہ کا جواب نہیں تھا بلکہ ان الفاظ کے ذریعہ آپ نے وجود خدا اور اس کی وحدانیت کی پیامبری کی تھی۔ آخر میں ابرہہ نے کہا کہ کہو تو تمھارے شہر سے واپس چلا جاؤں۔

ہاشم کی یادگار کارساز کعبہ کا محرم راز تھا، تقدیر کعبہ سے اس کے ضمیر کی آواز بھلا کیونکر متصادم ہو سکتی تھی۔ وہ اگر کہہ دیتا تو ابرہہ ضرور واپس چلا جاتا لیکن اہل مکہ کو اہل حبشہ کے بار احسان سے دبنا پڑتا اور کعبہ کی

عظمت زیرِ نقاب رہ جاتی۔ خلیل اللہ کی تعمیر اور ذبیح اللہ کی محنتیں دنیا کی دیگر تعمیرات کی ہم پلّہ ہو کر رہ جاتیں اور اللہ کی قدرت و توانائی موضوع بحث بن جاتی۔ لہٰذا حضرت عبدالمطلبؑ یہ کہہ کر واپس آگئے کہ خانۂ کعبہ کے خلاف جو کچھ تمھارے دل میں ہے اسے کر کے اپنا انجام خود دیکھ لو۔

حضرت عبدالمطلب خود تو چلے آئے مگر دبدبۂ ہاشمی کے غیر فانی نقوش قلب دشمن پر چھوڑ آئے، جس کے اثرات ابرہہ کے اس اعتراف کی شکل میں ظاہر ہوئے کہ جب اس نے کہا کہ اس شخص کی زبردست ہیبت میرے دل میں سما گئی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے ہمراہیوں سے مشورہ لیا کہ تم لوگ بتاؤ کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ لوگوں نے تباہی و بربادی کا مشورہ دیا اور کہا کہ مکہ کو لوٹ لیں اور حرم کی ایک ایک اینٹ کھود کر جدّہ کے سمندر میں پھینک دیں۔ چنانچہ ابرہہ مع لشکر اپنے تخریبی اقدام کو جامۂ عمل پہنانے کی غرض سے چلا، اُدھر حضرت عبدالمطلب نے مکّہ خالی کر دیا اور کوہ ابوقبیس پر اس لیے چلے گئے کہ مشیت الٰہی کو اپنا حکم نافذ کرنے میں تردد نہ ہو، جس طرح انبیائے سابقین نے الٰہی قہر و غضب کا نشانہ بننے والی بستیوں کو چھوڑا تھا اسی طرح آپ نے مکہ کو خالی کر دیا اللہ سے نصرت کا طلبگار اِدھر پہاڑ پر پہنچا اُدھر حیوانیت کے بل پر مقابلہ کرنے والی جماعت حرم کی طرف بڑھی، مرضئ قدرت نے چاہا کہ ایک بار پھر غافلوں کو چونکا کر اتمام حجت کر لی جائے۔ چنانچہ حرم تک پہنچتے پہنچتے وہ کوہ پیکر ہاتھی جو گویا لشکر کے علم کی جگہ تھا، یکبارگی رُک گیا۔ ساری تدبیریں ناکام ہو گئیں لیکن وہ اس وقت تک آگے نہ بڑھا جب تک اس کا رخ خانۂ کعبہ سے دوسری طرف موڑا نہیں گیا۔ لیکن اس کے باوجود دشمنوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ اپنے ارادے پر قائم رہے البتہ اس درمیان ابرہہ نے مصالحت کی ایک بار پھر ناکام

کوشش کی اور ایک مخصوص قاصد عبدالمطلبؑ کی خدمت میں بھیج کر یہ کہلایا کہ ہم اب واپس جانے کو تیار ہیں۔ اگر اہل مکہ حرجانہ ادا کر دیں اور ہماری اس عبادت گاہ کا تاوان ادا کر دیں جو اُن کی بدولت جل کر خاک ہو چکی ہے۔ جواب میں حضرت عبدالمطلب نے فرمایا کہ بے گناہ افراد خطاکار کے اعمال کے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔ رہا حرم کا مسئلہ تو اس کے لیے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس کا ایک محافظ ہے وہ خود ہی اس کی حفاظت کرے گا تم اپنے سردار سے کہدو کہ وہ حملہ کرے یا واپس جائے۔ مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔

جناب عبدالمطلبؑ کا جب یہ جواب استغنا پہنچا تو ابرہہ نے مایوس ہو کر کہا کہ اب مصالحت کی گنجائش نہیں ہے، حملہ کرو۔ اس کے بعد وہ طوفانی فوج حرم کی طرف بڑھی۔ قہر الٰہی کو حرکت ہوئی اور اللہ کی ایک مخلوق نے (جو ابابیل کے نام سے موسوم ہے)، آسمان سے چھوٹی چھوٹی کنکریاں برسا کر ابرہہ کے سارے لشکر کو آن واحد میں جگالی کیا ہوا بھوسہ بنا دیا۔ نہ ابرہہ بچا، نہ اس کی فوج، عبدالمطلبؑ کو یقین محکم کے صلے میں اللہ نے فتح و ظفر سے ہمکنار کر دیا۔

اس واقعہ میں قہر الٰہی کی شانِ نزول بھی عجیب تھی۔ دستور قدیم کے مطابق نہ زمین شق ہوئی، نہ آگ برسی، نہ تیز و تند ہواؤں کا طوفان آیا، نہ انسانوں کو مسخ کیا گیا اور نہ تختہ پلٹا گیا۔ کیونکہ یہ وہ مقام تھا جو طوفان نوحؑ کے ہمہ گیر قہر کے موقع پر بھی عذاب کے پانی سے محفوظ رہا۔

چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعہ ننھی ننھی کنکریاں مرکز ظلم پر یوں برسائی گئیں کہ نہ حرم کو کوئی صدمہ پہنچا نہ سرزمین حرم کی بے حرمتی ہوئی، نہ کوئی بے قصور ہلاک ہوا اور نہ کوئی قصوروار بچ سکا۔

یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن سے انکار ناممکن ہے۔ مولانا ندوی کا یہ کہنا کہ ابرہہ

نے عبد المطلبؑ کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جد کی صریحًا توہین اور ہم اہل اسلام کے لیے انتہائی دل آزار، قابل اعتراض اور قابل مذمت جملہ ہے۔

حضرت ابو طالب علیہ السلام

مولانا ابوالحسن صاحب ندوی جناب ابو طالبؑ کے تذکرے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"ابو طالب نے اسلام قبول نہیں کیا۔" (المرتضیٰ ص ۳۹ سطر ۶)

اس کے بعد ندوی صاحب نے محض اسی جملے پر اکتفا نہیں کی بلکہ وہ حاشیہ پر اپنے نوٹ میں فرماتے ہیں کہ:-

"یہ بات کتب حدیث، سیرت قدیم وجدید سے ثابت اور مشہور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا بڑا ملال تھا لیکن یہ بات اس کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ دین اصول وعقیدہ کا مذہب ہے۔ نہ کسی فرد کی طرفداری کرتا ہے اور نہ کسی خاندان کی۔ بنیاد صرف وہ ہے جس کی دعوت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ شخصی محبت اور تنہا مدافعت وحمایت بھی کام نہیں آتی اگر اس کے ساتھ صحیح عقیدہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر ایمان نہ ہو۔"

(المرتضیٰ ص ۳۹)

امتداد زمانہ کے زیر اثر مختلف ادوار میں بخاری کی ایک مرسل روایت کی بنا پر (جس میں مسیب شامل ہے) کچھ ایمان فروش حضرت ابو طالبؑ کے ایمان واسلام پر اپنی گندی اور ناسور زدہ ذہنیت کا کیچڑ اچھالتے آئے ہیں جن کی

تقلید مولانا ندوی نے بھی المرتضیٰ میں کی ہے۔ حالانکہ اصول اور انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جب تک کسی انسان کا کفر ثابت نہ ہو، اس وقت تک اس کے ایمان یا اسلام کو چیلنج کرنا محض جہالت اور بے وقوفی کی دلیل ہے۔

مولانا ندوی کی بات بھی دیگر معترضین کی سابقہ گفتگو کی طرح اس لیے بے وزن اور ناقابل التفات ہے کہ وہ حضرت ابو طالبؑ پر تاریخ اور دلائل کی روشنی میں کفر کا فتویٰ صادر فرمانے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا صرف یہ کہہ دینا کہ "ابو طالب نے اسلام قبول نہیں کیا" یا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا بڑا ملال تھا" اور اپنے اس دعوے کی دلیل میں کوئی کتابی حوالہ نہ پیش کرنا، حضرت ابو طالب کی بلند پایہ ذات والاصفات کو سبک کر کے عالم اسلام کے سامنے پیش کرنے کی سعئ ناکام کے مترادف ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضروری ہے کہ مولانا ندوی اس مہمل گفتگو کے جواب میں جناب ابو طالب کی حیات طاہرہ کے ان لمحات کی ایک جھلک ناظرین کی خدمت میں پیش کر دی جائے جو آپ کے ایمان واسلام سے وابستہ ہیں۔ اس جھلک کی ابتدا میں اپنے ہی ایک شعر سے کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ

سراپا وہ ایمانِ کامل تھا جس نے رسالت کو پالا امامت کو ڈھالا
نبیؐ کے چچا کے مقابل وہ آئے جو اپنے کو کہتا ہو ایمان والا (مولف)

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتۂ حیات میں آٹھ گرہیں پڑ چکی تھیں کہ مشیت الٰہی کو منظور ہوا کہ حضرت عبد المطلب کو ان کے بار سے ہلکا کیا جائے اور جناب ابو طالبؑ کو یہ خدمت سپرد کی جائے جس کی تمنا انھوں نے اس وقت ظاہر کی تھی جب عبد اللہ کی قربانی کا مسئلہ در پیش تھا۔ حضرت عبد المطلب علیل ہوئے اور جب علالت میں شدت ہوئی تو آپ نے حکم دیا کہ بیت الحرام کے نزدیک لے چلیں اور کعبہ کے پردوں سے متصل رکھ دیں۔ تعمیل کی گئی اور آپ کی اولادیں

آپ کے چاروں طرف بیٹھ گئیں۔ ان کے علاوہ روسائے قریش اور شیوخ قبائل بھی سب موجود تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشک بار نہ ہو۔ اس کرب و اضطراب کے ماحول میں حضرت عبدالمطلبؑ نے کروٹ لی اور قریش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا تم سب پر میرا حق نہیں ہے؟ سب نے بیک آواز ہو کر کہا۔ ہم میں ہر خورد و کلاں پر آپ کا حق ہے اور آپ ہمارے بہترین قائد ہیں۔ اس اقرار کے بعد حضرت عبدالمطلب نے فرمایا کہ میں محمدؐ بن عبداللہ کے بارے میں تم کو وصیت کرتا ہوں اور اس امر کی تاکید کرتا ہوں کہ ان کی تعظیم و اکرام کرنا اور ان پر ظلم و جور نہ کرنا۔ اس کے بعد آپ نے جناب ابوطالب کی طرف کروٹ لی اور کچھ اشعار مرحمت فرمائے جن کا مفہوم یہ تھا کہ "ابوطالب میں تم کو وصیت کرتا ہوں اور اپنے قرۃ العین محمدؐ کو تمھارے سپرد کرتا ہوں تم اس کا خیال رکھنا اور اپنی آخری سانس تک اس کی تعظیم و متابعت کرنا اور اس کے دشمنوں سے خبردار رہنا۔

اس نادر روزگار امانت کے لیے امانت دار کی تشخیص میں صرف صلبی و بطنی یگانگت کا لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ مشورۂ الٰہی کو بھی مقدم سمجھا گیا۔ چنانچہ زرقانی مواہب میں تحریر فرماتے ہیں کہ: "عبدالمطلبؑ نے اولادوں کے درمیان قرعہ اندازی بھی کی اور قرعہ ابوطالب کے نام نکلا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ ایسے کو اپنی امانت سپرد کرے جو اس کا منکر اور اس کے قانون کا مخالف ہو؟"

ہاشم کے گھرانے کی یہ خصوصیت ہے کہ خلف کا طریقِ کار سلف کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہاں قول و عمل میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہوتا۔ برسوں باپ کا انداز تربیت قبول کرنے کے بعد یہ کیونکر ممکن تھا کہ جناب ابوطالب اپنے دور میں باپ کی تربیت کو فراموش کر دیتے۔ رسالت کے تحفظ کی ذمہ داری اور

فرائض کے احساس نے چچا کو رسولؐ کے باپ کا درجہ دیا اور چچی فاطمہ بنت اسد نے ماں کی جگہ لی اور ایسی شفقت و محبت سے پیغمبر اسلام کی پرورش فرمائی کہ والدین کی کمی کو محسوس نہ ہونے دیا۔

حضرت ابوطالبؑ کی شادی آپ کی حقیقی چچازاد بہن فاطمہ بنت اسد سے ہوئی تھی جو ابتدائے عمر سے ہی ملت ابراہیمی اور دین فطرت پر گامزن تھیں لیکن ان تفصیلات کے ساتھ کہ جو حضور سرور کائنات اپنے ساتھ لائے تھے آپ نے سنہ ۱ بعثت میں جناب خدیجۃ الکبریٰ کے ہمراہ اسلام قبول فرمایا تھا اور آپ کا شمار اسلام قبول کرنے والی خواتین کی صف اول میں ہوتا ہے۔ سنہ ۴ھ میں آپ اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ اس طرح مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد مکمل دس سال تک حضرت ابوطالبؑ کے ساتھ رہیں اور اس وقفہ میں دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی چچی کو اختلاف عقائد کی بنیاد پر ابوطالب سے علاحدہ ہونے کا مشورہ دیا نہ کوئی مواخذہ کیا جیسا کہ تفسیر کبیر، فخرالدین رازی جلد ۸ اور شرح بخاری قسطلانی ج ۹ ص ۲۴۹ سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت عمر کی زوجہ محترمہ ام کلثوم بنت عقبہ بن معیط کے پاس سے بھاگ کر آئیں اور انھوں نے اسلام قبول کیا تو ان کے رشتہ داروں نے پیغمبر اسلام صلعم سے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ لیکن پیغمبر نے یہ کہہ کر ان کے اس مطالبے کو ٹھکرا دیا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی عورت کافر کی زوجیت میں نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا اس ارشاد پیغمبرؐ کی روشنی میں یہ بات صاف طور پر واضح ہے کہ فاطمہ بنت اسد کی طرح حضرت ابوطالبؑ بھی راہِ حق پر اپنی آخری سانس تک گامزن رہے اور اپنے ایمان و اسلام کی تابندگی کے ساتھ سنہ ۱۰ بعثت میں جوار رحمت سے ہمکنار ہو گئے اور آپکے انتقال کے سال کو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "عام الحزن" کے نام سے موسوم کر دیا۔ حضرت ابو طالبؑ نے اپنی حیات کے آخری دور میں کچھ اشعار کہے تھے جن میں یہ دو شعر قابل توجہ ہیں:

ودعوتنی وعلمت انک صادق ولقد صدقت فکنت قبل امینا
ولقد علمت بان دین محمدٍ من خیر ادیان البریۃ دینا

ترجمہ: اے محمدؐ تم نے مجھے اسلام کی طرف دعوت دی اور میں خوب جانتا ہوں کہ تم صادق اور سچے ہو اور تم اس عہدۂ نبوت پر فائز ہونے سے پہلے بھی لوگوں کی نظر میں صادق اور سچے تھے، میں خوب جانتا ہوں کہ تمہارا دین تمام ادیان عالم سے بہتر ہے۔

حضرت فاطمہ بنت اسد سے عقد کے موقع پر جناب ابو طالب نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ بھی آپ کے ایمان کا مظہر اور تاریخ کے خزانے میں گوہر نایاب کی طرح محفوظ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس خدا کے لیے تمام خوبیاں مخصوص ہیں جو رب العالمین اور کائنات کی ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے اور جس نے ہم کو سید و سردار کی حیثیت سے منتخب کرکے عارفین و مخلصین میں شمار کیا۔ تمام عیوب سے پاک رکھا اور ہمیں تمام قبائلِ عرب پر فضیلت دے کر ان کا پیشرو بنایا ہم خلاصۂ نسل ابراہیمی، جوہر صفات خلیلی اور حضرت اسماعیل کی کشت بارآور ہیں۔ ہم نے فاطمہ بنت اسد سے شادی کی اور ان کا مہر شرعی ادا کرکے امر تزویج نافذ کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے متواتر سات دن تک دعوت ولیمہ کا اہتمام کرکے تمام قبائل عرب کی آنکھوں کو خیرہ بنا دیا۔ اس کا تذکرہ امیہ بن صلت نے اپنے اشعار میں کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابو طالب نے اپنی شادی کے ولیمہ سے ہمیں ڈھانپ لیا ہے اور نہایت خلق و محبت کے مظاہرات اس

شادی میں سامنے آئے ہیں۔

یہ حقیقت بھی ناقابل انکار اور آفتاب کی طرح روشن ہے کہ جب جناب خدیجہ نے پیغمبر اسلام سے شادی کی خواہش کی اور نسبت طے ہو گئی تو رسول اللہ صلعم کی جانب سے جو خطبۂ نکاح جناب ابو طالبؑ کی زبانِ مبارک پر جاری ہوا اس کی ابتدا ان لفظوں سے تھی: "الحمد للہ الذی جعلنا من ذریۃ ابراھیم" تمام تعریفیں اس خدا کی ہیں جس نے ہمیں ذریت ابراہیم میں قرار دیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ شکر ہے اس پروردگار کا جس نے ہمیں فضیلت عطا کی۔ یہ میرا بھتیجا محمدؐ میرے بھائی عبد اللہ کی یادگار اور فضل و شرف میں لاثانی ہے۔ پچیس اونٹوں اور چار سو دینار سرخ پر عقد ہوا۔ مہر کی رقم حضرت ابو طالبؑ نے اسی وقت ادا کر دی۔ (تاریخ اسلام ج ۲ ص ۸، تلخیص سیرۃ النبی ص ۹۹ الیعقوبی ج ۲ ص ۱۷ وغیرہ)

ڈپٹی نذیر احمد کا کہنا ہے کہ آپ عبد المطلب کی اولادوں میں سب سے زیادہ باوقار اور عقلمند تھے۔ عبد المطلب کے بعد آپ نے پیغمبرؐ اسلام کی پرورش کی اور تاحیات ان کی نصرت و حمایت کرتے رہے۔ مولوی شبلی نعمانی کا کہنا ہے کہ ابو طالبؑ کا طریقہ تازیست رہا کہ آنحضرتؐ کو اپنے ساتھ سلاتے تھے اور جہاں جہاں جاتے ساتھ لے جاتے۔ کفار قریش اور اشرار یہود سے آپ نے آنحضرتؐ کی حفاظت کی، اور انھیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچنے دیا۔ علامہ طریحی کا بحوالۂ امام جعفر صادق علیہ السلام کہنا ہے کہ ابو طالبؑ ایمان کے تحفظ میں اصحاب کہف کے مانند ہیں۔ شمس العلماء نذیر احمد فرماتے ہیں کہ ابو طالبؑ دل سے پیغمبر کو اللہ کا رسول اور اسلام کو خدا کا سچا دین سمجھتے تھے۔ علامہ شبلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرتے وقت بھی جناب ابو طالب کلمہ پڑھ رہے تھے۔ (ماخوذ از چودہ ستارے ص ۳۰-۳۱)

حضرت ابوطالب علیہ السلام کا ادبی کمال بھی نقطۂ عروج پر تھا جس کے ثبوت میں آپ کے اشعار موجود ہیں جن سے اسلام کی تبلیغ اور رسالت کی تائید کے جذبات کا پتہ چلتا ہے ۔ چنانچہ آپ اپنے بھائی حمزہؓ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے موقع پر فرماتے ہیں کہ اے بھائی آپ اللہ کے دین اور محمدؐ کی متابعت میں ثابت قدم رہیں اور استقلال کے ساتھ اظہار اسلام کرتے رہیں ۔ خدا آپ کو عزم و ثبات کی توفیق عطا کرے ۔

اسی طرح حضرت ابوطالب کے وہ بے شمار اشعار جو مختلف مواقع پر آپ نے ارشاد فرمائے ، اپنے دامن میں ایمان و اسلام کی دولت لیے آج بھی صفحۂ قرطاس پر موجود ہیں ۔ چونکہ یہ اشعار عربی زبان میں ہیں اس لیے طوالت کے خیال سے انھیں ترک کر کے ان کے مفہوم پر مبنی چند نمونے پیش کرتا ہوں ۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

(۱) جب کفار مکہ نے حضرت ابوطالب سے شکایت کی کہ آپ اپنے بھتیجے محمدؐ کو اس بات سے روکیں کہ وہ ہمارے خداؤں اور ہمارے دین کو برا بھلا کہتے ہیں تو آپ نے رسولؐ سے فرمایا کہ بیٹا تم تبلیغ حق کو جاری رکھو ، بخدا جب تک میں زندہ ہوں کفار تم تک نہیں پہنچ سکتے اور جب تک میرے بازوؤں میں قوت ہے یہ لوگ تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے ۔

(۲) جب کفار کے عہد نامہ کو دیمک دفتر بے معنی کی طرح چاٹ گئی تو حضرت ابوطالبؑ نے قریش کو آگاہ کیا اور فرمایا کہ بس اس میں اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے منکرین کو یقین نہ آیا تو آپ نے ان کے ظلم و ضد کو اپنے اشعار میں نظم کیا جن میں سے بعض کا مفہوم یہ ہے کہ عہد نامہ کی سرگزشت مقام عبرت ہے ۔ جب بے خبر کو اس کی خبر دی جاتی ہے تو وہ آئینۂ حیرت ہو جاتا ہے ۔ اس عہد نامہ میں جو

کفر و عناد کی باتیں تھیں ان کو اللہ نے محو کر دیا اور ایک مجسمۂ صداقت (رسول اللہ صلعم) کے خلاف جو زہر اگلا گیا تھا وہ نقش بر آب ہو کر رہ گیا ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ مخالفین کی تمام باتیں باطل ثابت ہوئیں ۔

(۳) ایک موقع پر آپ نے حضور کو اپنے اشعار کے ذریعہ کار تبلیغ جاری رکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ اے بیٹا اپنا کام کرتے رہو اور نہایت اطمینان سے دعوت حق میں سرگرم رہو کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے کفار مکہ تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے ۔

(۴) ایک موقع پر آپ نے کچھ اشعار پڑھے ، درمیان میں رسولؐ کی طرف اشارہ کرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے ۔ بے شک تم اللہ کے رسول ہو اور نورانی صورت والے بلند مرتبہ سردار ہو ۔ تم بھی پاک و پاکیزہ ہو اور تمھارے ماں باپ بھی پاک اور عالی نسب ہیں ۔

(۵) جب عثمان بن مظعون کو شاہراہِ حق اختیار کرنے پر کفار نے اذیتیں دیں اور انھیں مضروب کیا تو آپ کے حق نواز جذبات برانگیختہ ہوئے اور آپ نے اپنے اشعار میں فرمایا کہ کیا تم اس بے وفا زمانے کے ناروا سلوک پر گرفتہ خاطر ہو اور حزن و ملال کو دل میں جگہ دیتے ہو ۔ یہ تو اس کی طینت ہے کہ ہدایت یافتہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے ۔ اس کے اخلاق کا تو یہ عالم ہے کہ وہ فواحش کو ہنر سمجھتا ہے اور حیلہ سازی کو کمال انسانیت جانتا ہے ۔ خدا ظالموں کو ذلیل کرے ۔ اگر میں زندہ رہ گیا تو بہت جلد اس کا انتقام لوں گا اور یہ پیمانہ اسی طرح لبریز ہو گا جیسے ان کا پیمانۂ ظلم ۔ میرے اقدامات اس وقت تک جاری رہیں گے جب تک کفار اپنے کرتوت سے باز نہ آجائیں اور سر بذلت خم نہ کر دیں ، ان کے ظالمانہ اقداموں کا جواب دینے کے لیے میرے پاس صاعقہ بار تلوار موجود

ہے جو دماغی امراض کو دور کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ میری طرف سے یہ شمشیر زنی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ بد دماغ لوگ اپنے دماغوں کی اصلاح نہ کریں گے یا اس کتاب خدا پر ایمان نہ لائیں گے جو رسول کے لیے ہے اور جس کی حقانیت وصداقت کے محکم شواہد موجود ہیں۔

(۶) جناب ابو طالب علیہ السلام کا ایک لامیہ قصیدہ بہت مشہور ہے جو سو سے زائد اشعار پر مشتمل ہے ان میں سے بعض اشعار کا تذکرہ علامہ ابن ابی الحدید نے بھی شرح نہج البلاغہ میں کیا ہے اور علامہ دحلانی نے لکھا ہے کہ یہ قصیدہ ابو طالب کے ایمان پر یقین کی واضح دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن کثیر نے اس کی تعریف میں کہا ہے کہ یہ قصیدہ بے حد بلیغ ہے اور کوئی اس کی مثال ممکن نہیں ہے۔ یہ قصیدہ معلقات سبعہ سے بہتر وبلند تر ہے۔ اس کے بعض اشعار کا مفہوم درج ذیل کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

کفار مکہ کی دلی تمنا ہے کہ ہم ترک وطن کریں۔ اے کافرو! یہ آرزو بے بنیاد اور غلط ہے۔ حرم کی قسم ہم بغیر محمدؐ کی مرضی کے کبھی اس سرزمین سے جدا نہ ہوں گے۔ تم ہمیشہ یوں ہی جلتے اور کڑھتے رہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم محمدؐ کو بغیر مقابلہ کے تمہارے حوالے کر دیں گے۔ یاد رکھو یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے بچے اور خواتین تک محمدؐ پر قربان ہو جائیں۔ سمجھ لو اگر تمہاری یہی روش رہی تو تمہاری گردنیں ہوں گی اور ہماری تلواریں۔ تم لوگوں کی حالت سخت قابل تعجب ہے کہ تم اس کے دامن کو چھوڑ رہے ہو جس کے وسیلے سے بارش کی دعا کی جاتی ہے جو رحمت للعلمین، حق کا طرفدار، یتیموں کا والی اور بیواؤں کا سرپرست ہے۔ وہ ہماری روح وجان ہے اور ہم وہ ہیں کہ کبھی کسی کا خون بہا ہم کو دینا نہیں پڑا اور نہ ہم نے کسی بے گناہ وبے خطا کو قتل کیا۔ نہ ہم مصیبت

میں ذلیل لوگوں کے حلیف ہوئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں محمدؐ کا سچا جاں نثار ہوں اور انھیں اللہ کا سچا رسول مانتا ہوں۔ خدا نے ان کو دنیا کے لیے رحمت قرار دیا ہے۔ کوئی ان کا مثل نہیں ہے۔ ان کا ولی ایسا معبود ہے جو ان سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں رہتا۔ وہ ایسا ممتاز ہے کہ ہر بلندی اس کے آگے پست ہے اور اس کی حفاظت کے لیے ہم نے اپنے سینوں کو سپر بنا لیا ہے۔ خدا اس کو اپنی حمایت وحفاظت میں رکھے اور اس کے نہ مٹنے والے دین کو دنیا پر غالب کر دے۔

(۷) مورخ ابو الفداء نے جناب ابو طالبؑ کی ایک مسلسل نظم کو جلد اول میں تحریر کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ یہ نظم حضرت ابو طالبؑ کی طرف سے تصدیق رسالت پر کامل دلیل ہے۔ جس کے کچھ اشعار کا ترجمہ یوں ہے کہ :۔

بخدا کفار قریش اپنی جماعت سمیت تم تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ میں زمین میں دفن نہ ہو جاؤں، اے محمدؐ! تم کو جو خدا کا حکم ہے اس کا بے خوف اعلان کرو۔ اے محمدؐ تم نے مجھ کو اللہ کی طرف دعوت دی ہے اور مجھے تمہاری صداقت وامانت کا محکم یقین ہے اور تمہارا دین تمام مذاہب عالم سے بہتر اور ان کے مقابلہ میں کامل تر ہے۔

(۸) حضرت ابو طالبؑ نے اپنے خاندانی وقار اور رفعت کا تذکرہ بھی اپنی ایک نظم میں کیا ہے۔ سیرت ابن ہشام میں اس کے اشعار موجود ہیں۔ علامہ دحلانی نے اس نظم کو ابو طالب کی شاعری کا شاہکار قرار دیا ہے۔ یہ نظم بھی تصدیق نبوت کی دلیل میں ہے۔ جس میں ارشاد ہوا ہے کہ اشراف قریش اگر کسی موقع پر فخر ومباہات سے بزم آرائی کریں تو عبد مناف ان میں جوہر بے عیب ثابت ہوں گے، اور جب عبد مناف کی نسل میں شرافت ونجابت کا چرچا

ہو گا تو ہاشم اور بنی ہاشم کو فضیلت حاصل رہے گی اور بنی ہاشم اگر فخر و ناز کریں تو محمد مصطفیٰؐ کی ذات اقدس مخزن شرف ثابت ہوگی اور یہ وہ ہیں جنھیں اللہ نے نبوت عطا کی ہے۔

(۹) حضرت ابو طالبؑ نے ابولہب کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کے سلسلے میں اپنی ایک نظم میں ہدایت فرماتے ہوئے کہا کہ اے ابولہب! ایسا کام نہ کرو کہ جس سے زندگی بھر تمھیں عرب کے میلوں اور محفلوں میں گالیوں سے نوازا جائے۔ رسول کی مدد و نصرت میں زندگی گذارو کیونکہ تم بے دست و پا اور عاجز و مجبور نہیں پیدا کیے گئے۔ اس نظم کو بھی ابن ہشام نے اپنی سیرت میں درج کیا ہے۔

(۱۰) ابن ہشام کی سیرت میں حضرت ابو طالبؑ کی ایک نمایاں اور معرکۃ الآرا نظم اور بھی ملتی ہے جو حضرت علی علیہ السلام اور حضرت جعفر طیارؑ سے متعلق ہے اس نظم میں بھی آپ نے ترغیب نصرت کا نشان بلند کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ جناب ابو طالبؑ نے رسول اللہ کو دیر تک نہ دیکھا تو بے چین ہوئے اور آپ کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں کفار نے گرفتار نہ کر لیا ہو۔ آپ فوراً اپنے فرزند جعفرؑ کو لے کر تلاش میں نکلے دیکھا کہ مکہ کی ایک گھاٹی میں رسولؐ اور علیؑ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ ابو طالبؑ نے جعفرؑ سے کہا کہ آگے بڑھو اور اپنے بھائی کے ساتھ بازو جوڑ کر اس کا ساتھ دو۔ جناب جعفر طیارؑ نے حکم کی تعمیل کی اور مصروف نماز ہو گئے۔ یہ منظر دیکھ کر فرطِ مسرت سے ابو طالب کی آنکھیں چھلک پڑیں اور آپ نے کچھ اشعار فرمائے جن کا مفہوم یہ ہے کہ اے علیؑ و جعفرؑ دیکھو تم لوگ کبھی دین حق سے دست بردار نہ ہونا اور اپنے بھائی محمدؐ کو کبھی تنہا نہ چھوڑنا۔ میں محمدؐ کے دین کی تائید کرتا ہوں، بخدا نہ میں اس سے دستبردار

ہوں گا اور نہ میری نجیب الطرفین اولادیں اس کی نصرت سے دریغ کریں گی۔ اس نظم کو ابن ابی الحدید نے بھی شرح نہج البلاغہ کی تیسری جلد میں تحریر کیا ہے۔

(۱۱) حضرت ابو طالبؑ کی ایک نظم تنزیل وحی سے متعلق بھی ہے۔ اسے بھی ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ کی تیسری جلد میں تحریر کیا ہے۔ ابو طالب فرماتے ہیں کہ محمدؐ وہ نبی ہیں جن پر رب العالمین کی جانب سے وحی نازل ہوتی ہے جو اُن کی رسالت کو تسلیم کرے گا اس کو حشر میں شرمندہ ہونے کی نوبت نہ آئے گی۔ محمدؐ خدا کی قسم محبوب خدا ہیں، امین شریعت ہیں مہر نبوت من جانب اللہ ان پر ثبت ہے۔ اس کے بعد آپ کفار قریش کو متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خبردار رسولؐ کے معاملے میں احمق نہ بنو، اور منحوسوں، گمراہوں کا اتباع نہ کرو۔

(۱۲) حضرت ابو طالب علیہ السلام کا ایک قصیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بھی ہے جو ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ کی تیسری جلد میں موجود ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا نے محمدؐ کو مکرم بنایا اور اپنی تمام مخلوقات پر انھیں مشرف کیا، اے پروردگار! تو گواہ رہنا کہ میں دین محمدؐ پر ہوں اور ہدایت یافتہ ہوں۔ جس کو گمراہی پسند ہو وہ گمراہ ہے۔

ان نظموں کے علاوہ حضرت ابو طالبؑ کے اور بھی اشعار ہیں جو ایسے ہی پاکیزہ مقاصد اور بلند تر تعلیم پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت ابو طالب کے ایمان و اسلام پر بھرپور تبصرہ کیا جائے۔ اس امر کے لیے الگ سے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ بہرحال مذکورہ قصائد پر اگر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے تو حضرت ابو طالب کا اسلامی کردار اور عقیدہ آفتاب کی طرح روشن و منور نظر آتا ہے اور ہر انصاف پسند انسان ابو طالبؑ کے ان اشعار کی روشنی میں آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ آپ صرف مسلمان ہی نہیں تھے بلکہ آپ نے بعض مواقع

پر کارِ رسالت اور کارِ تبلیغ کے سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ کو حوصلہ دے کر ثبوت کی رہبری بھی فرمائی ہے۔ میرے نزدیک مولانا ندوی کا یہ دعویٰ کہ ابو طالبؑ نے اسلام قبول نہیں کیا بالکل غلط بے بنیاد اور باطل ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ ندوی صاحب حضرت ابو طالبؑ کے ایمان و اسلام کے پرکھنے کی کوشش کے بجائے خود اپنے ایمان و اسلام کا محاسبہ کرتے کہ وہ کیا ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بخاری میں یہ روایت کیوں پیش کی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ خلفائے ثلاثہ کے والدین کافر تھے اس لیے حضرت علی علیہ السلام کی عداوت میں ان کے والد بزرگوار کی فضیلت پر بھی ضرب لگائی گئی۔ ورنہ حقیقت سے اس روایت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مومن قریش حضرت ابو طالبؑ اور جناب خدیجۃ الکبریٰ کی قبریں مکّہ کے قبرستان حجون میں ایک پہاڑی پر واقع ہیں۔ ان قبروں پر پہلے کوئی گنبد نہیں تھا۔ مورخ ذاکر حسین کا کہنا ہے کہ مرزا اصغر علی فصیح لکھنوی نے تیرھویں صدی کے وسط میں مومنین کی مدد سے ان پر گنبد تیار کرایا تھا۔

جناب طالب علیہ السلام

جناب ابو طالبؑ کے سب سے بڑے صاحبزادے اور مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کے حقیقی بھائی کا نام طالب ہے جو امیر المومنینؑ سے تیس سال عمر میں بڑے تھے، انھیں کے نام سے حضرت ابو طالبؑ کی کنیت وابستہ ہے۔

جناب طالب کے متعلق مولانا ندوی فرماتے ہیں:۔

"طالب کی غزوۂ بدر کے بعد حالت شرک میں موت واقع ہوئی"

(المرتضیٰ ص ۴۰)

افسوس ہے کہ عام کتابوں میں جناب طالب کے حالات نہیں ملتے۔ علامہ ابن قتیبہ دینوری نے لکھا ہے کہ جناب ابو طالبؑ کے چار بیٹے ہوئے۔ طالب، عقیل، جعفر اور حضرت علیؑ۔ اور ہر بھائی دوسرے سے دس برس چھوٹا تھا۔ ان سب نے اولادیں چھوڑیں سوائے طالب کے کہ انھوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ (معارف ص ۳۹) اور عمدۃ المطالب ص ۱۵ میں ہے کہ جناب ابو طالبؑ کے چار بیٹے ہوئے اور ہر بھائی دوسرے بھائی سے دس سال چھوٹا تھا گویا جناب طالب جناب امیر سے تیس سال بڑے تھے۔ انھیں کی وجہ سے آپ کے باپ کی کنیت ابو طالب تھی۔ اور ان چاروں فرزندوں کی مادر گرامی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں۔ یہ پہلی ہاشمی خاتون تھیں جن کے بطن سے ہاشمی فرزند پیدا ہوئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علیؑ کی ہجرت کے بعد جناب طالب کا قیام مکہ ہی میں رہا یہاں تک کہ جب غزوۂ بدر واقع ہوا تو کفار قریش نے انھیں بھی اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ وہ روانہ ہوئے مگر راستہ ہی سے غائب ہو گئے۔ کیونکہ وہ اسلام کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کو تیار نہیں تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے سمندر کی طرف چلے گئے اور پھر پلٹ کر نہ آئے۔ بعض مورخین کی تحریروں سے اس امر کی نشان دہی بھی ہوتی ہے کہ اسلام کے خلاف جنگ پر آمادہ نہ ہونے کی پاداش میں کفار مکہ نے انھیں سمندر میں غرق کر کے ختم کر دیا۔

علامہ دیار بکری نے لکھا ہے کہ طالب غزوۂ بدر میں کام آئے جب مکہ کے مشرکین نے آپ پر ظلم وجبر اور تشدد کر کے آپ کو جنگ میں شامل کیا۔

(تاریخ خمیس ج ۱ ص ۱۸۴)

علامہ مسعودی نے تحریر کیا ہے کہ کفار قریش نے طالب بن ابو طالبؑ کو

غزوۂ بدر میں مجبور کر کے لڑنے کو بھیجا۔ چنانچہ وہ گئے مگر پھر ان کی کوئی خبر نہیں ملی البتہ ان کا یہ کلام اب تک محفوظ ہے۔

یارب اما خرجوا بطالب — فی مقنب من تلک المقانب
فاجعلهم المغلوب غیر الغالب — والرجل المسلوب غیر السالب

اے پروردگار اگر یہ لوگ طالب کو زبردستی اپنی فوج کے ساتھ لے جاتے ہیں تو ان کو شکست دے اور انھیں اس درجہ کمزور کر دے کہ یہ خوب لوٹے جائیں اور یہ خود کسی کو لوٹ نہ سکیں۔ (مروج الذہب برحاشیہ کامل ابن اثیر ج ۵ ص ۱۷۶)

جناب طالب کی یہ دعا قبول ہوئی اور غزوۂ بدر میں کفار کو شکست ہوئی۔
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب طالب بھی دل سے ایمان رکھتے تھے لیکن کفار قریش کے خوف سے اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے۔ اسی کا نام تقیہ ہے۔

مولود کعبہ حضرت علی علیہ السلام

اس ذیل میں مولانا ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

"صحیح روایتوں کے بموجب سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ بعثت نبوی سے دس سال پہلے پیدا ہوئے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ آپ کی پیدائش عام الفیل کے سنہ ۳۰ میں (چھٹی صدی عیسوی) رجب کی بارہ راتوں کے گزرنے کے بعد ہوئی۔ حاکم نے حکیم ابن حزام کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ تواتر سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد کے بطن سے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ خانۂ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے اور حکیم ابن حزام بھی کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے :۔ سیدنا علی علیہ السلام کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے

کہ کہاں ہوئی تھی۔ شیعوں کی بڑی جماعت کو یقین ہے کہ ان کی پیدائش اندرون کعبہ ہوئی۔ محدثین نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے ان کا خیال ہے کہ کعبہ میں جو صاحب پیدا ہوئے تھے وہ حکیم بن حزام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی ہیں۔"

(المرتضیٰ ص ۴۸-۴۹)

ہوئی جوت کعبہ میں جس کی ولادت جسے حق نے آغوش رحمت میں پالا
اسی فخر کعبہ سے یہ چشم پوشی اسی کی فضیلت میں گڑبڑ گھٹالا (مولف)

خانۂ کعبہ میں امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت ایسا شرف ہے جو انبیاء و مرسلین کو بھی نصیب نہ ہوا۔ لیکن المرتضیٰ کے مولف مولانا ندوی نے معاویہ کی "حدیث مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ" کی وضع کردہ ایک ناقص اور موضوع حدیث کی تلوار سے اس عظیم شرف اور فضیلت پر وہابیت کی ضرب لگا کر ایک درخشاں حقیقت کو افسانہ بنانے کی جو مذموم سعی فرمائی ہے وہ ہمارے لیے دل آزار اور کرب و اضطراب کا باعث ضرور ہے مگر ہمیں موصوف کی اس حرکت پر حیرت و استعجاب اس لیے نہیں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ علی کو وہ دوست نہیں رکھ سکتا جو حرامی ہوگا اور علی کو وہ شخص کبھی دشمن نہیں رکھ سکتا کہ جو حلالی ہوگا۔ (اس حدیث کے راوی حضرت ابوبکر ہیں اور یہ حدیث ریاض النضرہ ج ۲ ص ۱۸۹ پر درج ہے)

مولود کعبہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت کی وضاحت سے پہلے یہ صراحت ضروری ہے کہ اس امر کا اجمالی جائزہ لیا جائے کہ خانۂ کعبہ (جو امیرالمومنین کی جائے ولادت ہے) کی عظمت کیا ہے؟

اس ذیل میں قرآن مجید کے سورۂ آل عمران پ ۴ آیت ۹۶-۹۷ میں ارشاد

ہوتا ہے کہ "لوگوں کی عبادت کے واسطے جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا وہ یقیناً یہی کعبہ ہے جو مکہ میں بڑی (خیر و) برکت والا اور تمام عالم کا رہنما ہے اور اس میں (حرمت کی) بہت سی واضح اور روشن نشانیاں ہیں (منجملہ اس کے) مقام ابراہیم اور جہاں آپ کے قدموں کا نشان پتھر پر ہے اور جو اس گھر میں داخل ہوا وہ امن (کے حصار) میں آگیا۔ اور لوگوں پر واجب ہے کہ محض اللہ کے لیے خانۂ کعبہ کا حج بجالائیں جنھیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت (قدرت) ہو اور جس نے قدرت رکھتے ہوئے انکار کیا تو وہ یاد رکھے اللہ سارے جہاں سے بے پرواہ ہے۔"

مذکورہ آیت کے ذیل میں علامہ بیضاوی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "یہ سب سے پہلا گھر ہے جس کو حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا تھا، لیکن طوفان نوح میں وہ بے نشان ہوگیا۔ پھر حضرت آدمؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اس کی از سر نو تعمیر کی۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس جگہ پر تخلیق آدمؑ سے پہلے ایک گھر تھا، جس کا نام "ضراح" تھا اور ملائکہ اس کا طواف کیا کرتے تھے۔ جب آدمؑ زمین پر اتارے گئے تو انھیں حکم ہوا کہ وہ اس گھر کا حج کریں اور اس کے گرد طواف کریں، طوفان نوح میں یہ گھر فلک چہارم پر اٹھا لیا گیا تاکہ ملائکہ اس کا طواف کرتے رہیں۔" (تفسیر بیضاوی ص ۱۸)

علامہ قطب الدین حنفی فرماتے ہیں کہ "حضرت آدم کی خلقت سے قبل خانۂ کعبہ کی جگہ ایک گھر تھا جس کا نام "ضراح" تھا، ملائکہ اس کا طواف کیا کرتے تھے، پہلی بار ملائکہ مقربین نے اس گھر کی تعمیر کی، دوسری بار حضرت ابراہیم نے اسے بنایا۔ (علام بیت الحرام ص ۱۲ مطبوعہ مصر)

معلوم ہوا کہ خانۂ کعبہ کی امتیازی خصوصیت شرف اور فضیلت یہ ہے کہ اس کی تعمیر عصمت (ملائکہ اور انبیاء) کے ہاتھوں عمل میں آئی اور فلک چہارم پر یہ ملائکہ کی عبادتوں کا مرکز بنا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ کافروں کے غاصبانہ قبضہ یا اس

مقدس گھر میں خود ساختہ بتوں کی موجودگی کے باوجود نہ اس کی عظمت متاثر ہوسکی نہ اس کے شرف پر آنچ آسکی۔ اس کے علاوہ خانۂ کعبہ سے اخراج اصنام کے قبل، تحویل قبلہ، وجوب حج، طواف کے احکام اور ابرہہ کے لشکر سے اللہ کا خانۂ کعبہ کو بچانا اس کی عظمت، فضیلت اور تقدیس کی ناقابل تردید دلیل ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام چونکہ فخر کعبہ تھے۔ اسی لیے اللہ نے اپنے اس محبوب بندہ کی ولادت کے لیے اپنے ہی گھر کا انتخاب کیا جو تمام عالم میں مقدس اور مشرف گھر ہے۔

مولانا ندوی نے مروج الذہب (مسعودی) اور سیرت حلبیہ (ابن ابی الحدید) کا حوالہ دے کر جناب خدیجۃ الکبریٰ کے بھتیجے حکیم بن حزام کی ولادت کو اندرون کعبہ بتانے کی جو ناکام کوشش کی ہے اس سے آپ کی علمی استعداد کا پتہ چلتا ہے۔ اس روایت کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"حکیم بن حزام کی ماں چند زنانِ قریش کے ساتھ کعبہ میں داخل ہوئیں حالانکہ وہ حمل سے تھیں، پس انھیں اچانک درد زہ لاحق ہوا اور فرش لاکر بچھایا گیا جس پر حکیم بن حزام پیدا ہوا۔" (الاستیعاب فی فضائل الاصحاب ص ۱۴۲)

تمام اصولوں سے ہٹ کر اگر اس روایت کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور اس پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے تو کہیں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حکیم بن حزام کی ماں خانہ کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے درد زہ میں مبتلا تھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ تصور کیا جاسکتا تھا کہ خانہ کعبہ میں داخل ہونے کے بعد درد زہ میں شدت پیدا ہوئی اور اس وقت اس کو کسی دوسرے مقام پر منتقل کرنا دشوار تھا۔ اس لیے حکیم بن حزام کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوگئی۔ لیکن مذکورہ روایت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم بن حزام کی ماں جب کعبہ میں داخل ہوئی تو اس وقت وہ درد زہ میں مبتلا نہیں تھی۔ بلکہ کعبہ میں داخل ہونے کے بعد درد شروع ہوا۔ ہر انسان یہ جانتا

ہے کہ دردِ زہ شروع ہونے کے کئی گھنٹوں کے بعد زچگی ہوتی ہے۔ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ دردِ زہ شروع ہوتے ہی پہلی منزل میں بچہ پیدا ہو گیا ہو، اور حاملہ عورت کو اتنا موقع نہ ملا ہو کہ وہ کسی دائی یا اسپتال کی طرف رجوع ہو سکے۔ حکیم بن حزام کی ولادت کا واقعہ ایسا انوکھا اور عجیب و غریب ہے جس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ مشاہدات و تجربات کی روشنی اس واقعہ کی صحت کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ روایت کے ذیل میں ابن جوزی کا کہنا ہے کہ اس روایت کو حافظ ابو نعیم نے بیان کیا ہے، اور اس کی فضیلت میں ایک طولانی حدیث نقل کی ہے۔ لیکن انھوں نے سند میں روح بن صلاح کا نام لیا ہے جس کو ابن عدی نے ضعیف قرار دیا ہے اس لیے ہم اس روایت کا تذکرہ نہیں کرتے۔ (تذکرہ خواص الامہ فی فضائل ائمہ)

ابن جوزی کے اس بیان کی تصدیق فصول المہمہ ص ۱۴ مطبوعہ ایران، روضۃ الشہدا ص ۱۴۳ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۳ء اور ازالۃ الخفا وغیرہ سے ہوتی ہے۔

ابن عرفہ نفطویہ جن کا شمار اہل سنت کے بڑے محدثین میں ہوتا ہے اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ "ہزاروں کی تعداد میں موضوع حدیثیں بنی امیہ کے دور میں خلفائے ثلاثہ کے فضائل میں وضع کی گئیں اور کھل کر علی کے فضائل پر ضرب لگائی گئی۔ بنی امیہ ان حدیثوں کے تحت خلفائے ثلاثہ کے ہمراہ خود بھی رسول اکرم اور ان کے خاندان سے نزدیکی اور تقرب پیدا کرنا چاہتے تھے اور وہ اپنی جگہ یہ بھی گمان کرتے تھے کہ ان حدیثوں اور روایتوں کی بنا پر بنی ہاشم کی ناک مروڑ رہے ہیں۔" (ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ الجزو الثالث ص ۱۵-۱۶)

میں اپنی "اہم گفتگو" میں اس امر کی وضاحت کر چکا ہوں کہ معاویہ نے عثمان کی شان میں جھوٹی حدیثیں اور غلط روایتیں اپنے کارخانہ حدیث سازی میں تیار کرانے کے بعد اپنے حاکموں اور گورنروں کو یہ فرمان جاری کیا تھا کہ عثمان کی شان میں حدیثوں اور روایتوں کا کافی سرمایہ اکٹھا ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب سلسلے کو بند کر کے شیخین (حضرت ابو بکر و عمر) کے لیے بالکل ویسی حدیثیں اور روایتیں بیان کی جائیں جیسی کہ علی کی شان میں موجود ہیں کیونکہ یہ طریقہ میرے لیے پسندیدہ اور باعث مسرت و شادمانی ہے۔ لہٰذا ان حالات میں معاویہ کے خود ساختہ اور دروغ گو راویوں کی طرف سے حکیم بن حزام کا خانۂ کعبہ میں زبردستی پیدا ہو جانا یا پیدا کر دیا جانا حیرت انگیز و تعجب خیز ہرگز نہیں ہے۔

ابو عثمان جاحظ (جو حضرت علی اور ان کے شیعوں کا بدترین دشمن تھا) نے اپنی کتاب "عثمانیہ" میں حضرت علیؑ کے فضائل کو اخفا کر کے ان کے مقابلہ میں خلفائے ثلاثہ و دیگر اصحاب کی شان بڑھانے کے لیے بہت سی جھوٹی حدیثیں اور غلط روایتیں نقل کی ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ دیگر فضیلتوں کے ساتھ خانۂ کعبہ میں علیؑ کی ولادت کی انفرادیت، ان کے شرف، فضیلت اور عظمت کو اس روایت کے ذریعہ سبک کیا جائے۔ لیکن جسے اللہ فضیلت اور بزرگی عطا کرتا ہے اس کی عظمتوں کو نہ کوئی چھین سکتا ہے اور نہ انوار الٰہی کو مادی طاقتیں چھپا سکتی ہیں۔

حالانکہ معاویہ کا کارخانۂ حدیث سازی بنی عباس کے دور میں بھی اپنا کام کرتا رہا اور پیغمبر اسلام کے بعد مختلف طریقوں سے علیؑ اور اولاد علیؑ پر مظالم کا سلسلہ روا رکھا گیا۔ یوں ہی زمانہ گذرتا رہا، چودہ صدیاں بیت گئیں لیکن علیؑ اور اہل بیتؑ اطہار کے انوار فضیلت کو باطل کی سیاہی معدوم نہ کر سکی، ارباب اقتدار نے جس شد و مد کے ساتھ آلؑ رسول کے فضائل کو اخفا کرنے کی کوشش

کی اسی قدر معجزانہ طور پر ان کے فضائل دشمنانِ اہل بیت ہی کے قلم سے اجاگر ہوتے گئے۔ حیرت ہے کہ ظالم و جابر حکمرانوں اور آلِ رسولؐ کے سخت ترین دشمنوں کی نظروں سے فضائل آلِ محمدؐ کیوں کر پوشیدہ رہے اور ان علمار کے خلاف تادیبی کارروائی کیوں نہیں کی گئی جنھوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی آلِ رسول کے فضائل کو اپنی کتابوں میں بیان کر کے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ یقیناً یہ معجزہ ہی ہے جو آلِ محمدؐ کی فضیلتیں کتابوں میں محفوظ ہیں اور امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اپنی تابندہ و درخشندہ شخصیت کے ساتھ آج بھی آسمانِ فضیلت پر آفتاب کی طرح جلوہ گر ہیں۔

خانۂ کعبہ میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت کی تصدیق جن علمائے اہل سنت نے کی ہے ان کی عربی عبارتوں کو اختصار کی بنا پر نظر انداز کر کے صرف اردو ترجمہ نقل کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیں:۔

(۱) ابن جوزی (المتوفی ۶۵۴ھ) تذکرہ خواص الامہ میں رقم طراز ہیں:۔
"روایت ہے کہ فاطمہ بنت اسد طواف خانۂ کعبہ میں مشغول تھیں اور انھیں دردِزہ لاحق تھا، جس کے لیے آپ مصروفِ دعا تھیں کہ خانۂ کعبہ میں ایک در بنا اور وہ اندر داخل ہوئیں اور بچہ کعبہ کے اندر پیدا ہوا۔

(۲) ابو الحسن علی بن حسین بن علی مسعودی (المتوفی ۳۴۶ھ) اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ علی ابن ابی طالب سے اس روز بیعت کی گئی جس دن عثمان بن عفان قتل ہوئے اور جائے ولادت ان حضرت کی خانۂ کعبہ ہے۔

(۳) کمال الدین، ابو سالم قاضی محمد بن طلحہ شافعی (المتوفی ۶۵۲ھ) فرماتے ہیں۔ آپ کعبہ میں خاص بیت الحرام کے اندر پیدا ہوئے اور آپ کی ولادت پیغمبرؐ کی خدیجہ سے شادی کے تین برس بعد ہوئی اور رسول اللہؐ کی عمر اس دن

اٹھائیس برس کی تھی۔ (مطالب السئول فی مناقب آلِ رسول ص ۲، مطبع جعفری) [ص ۳۰۲]

(۴) محمد بن منصور گازرونی (المتوفی [illegible]ھ) فرماتے ہیں۔ ان کی ماں فاطمہ بنت اسد تھیں۔ وہ پہلی ہاشمیہ ہیں جن سے ہاشمی ہی اولاد پیدا ہوئی۔ اور علیؑ فاطمہ کے بطن سے کعبہ میں پیدا ہوئے۔

(۵) قاضی شہاب الدین دولت آبادی (المتوفی ۸۴۹ھ) تحریر فرماتے ہیں۔ "روایت کی گئی ہے کہ قبل ازیں کعبہ میں دو سانپ رہا کرتے تھے، جن کو معیار الولد کہتے تھے۔ اس لیے کہ جو بچہ مکہ میں پیدا ہوتا تھا تیسرے دن خانۂ کعبہ میں لایا جاتا تھا اور رکھ دیا جاتا تھا۔ وہ سانپ کہ جس کا نام محک (کسوٹی) تھا دیوار سے ظاہر ہوتا اور بچہ کو سونگھتا تھا۔ اگر بچہ حلالی ہوتا تو چلا جاتا تھا اور اگر حرامی ہوتا تو وہ پھنکار مارتا کہ جس سے وہ بچہ غش کھا جاتا۔ جب شاہِ ولایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ اندرونِ کعبہ پیدا ہوئے تو روایت ہے کہ دونوں سانپ نمودار ہوئے، ور سونگھنا چاہتے تھے کہ شاہِ ولایت نے دونوں کو چیر ڈالا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ مکہ والوں میں غلغلہ ہوا کہ کسوٹی کو فنا کر دیا، سب رونے لگے۔ سرورِ کائنات صلعم نے فرمایا کہ رنجیدہ نہ ہو۔ اللہ نے تمام عالم کے لیے علی کو کسوٹی قرار دیا ہے۔ یک جگہ دو کسوٹیاں نہیں رہ سکتیں جو شخص علیؑ اور ان کے بچوں کو دوست رکھے گا وہ حلال زادہ ہے اور جو دشمن رکھے گا وہ حرام زادہ ہوگا۔"

(ہدایۃ السعداء)

(۶) شیخ الامام نور الدین علی بن احمد المعروف بہ صباغ مالکی مکی (المتوفی ۸۵۵ھ) رقم طراز ہیں۔ ولادت علیؑ مکہ مشرفہ میں اندرون کعبہ ۱۳ ماہ رجب کو جو خدا کا مہینہ ہے اور جس میں کشت و خون حرام ہونے کی وجہ سے آلات حرب کی جھنکار کبھی سنائی نہیں دی اور جو سلسلہ میں فردیت ۳۰ عام الفیل میں ہجرت سے ۲۳ یا ۲۵ سال

پہلے اور بعثت سے دس بارہ سال پہلے پیدا ہوئے۔ آپ کے سوا خانۂ کعبہ میں کبھی کوئی شخص پیدا نہیں ہوا۔ یہ وہ فضیلت ہے کہ حق تعالیٰ نے ان جناب کو اس سے اجلال منزلت اور اعلیٰ مرتبت اور اظہار کرامت میں مخصوص کیا ہے۔ (فصول المہمہ مطبوعہ ایران ص ۱۴)

(۷) ملا حسین کاشفی (المتوفی سنہ ۹۱۰ھ) تحریر فرماتے ہیں۔ کتاب بشائر المصطفیٰ میں یزید بن قعنب سے منقول ہے کہ میں عباس بن عبد المطلب اور اولاد عزیٰ کے ایک گروہ کے ساتھ روبروئے بیت الحرام بیٹھا تھا کہ فاطمہ بنت اسد مسجد کے قریب تشریف لائیں، وہ مضطرب و بے چین تھیں، دردِ زہ اور وضع حمل کی علامتیں نمایاں تھیں۔ انھوں نے خانۂ کعبہ کا طواف کیا اور بارگاہِ صمدیت میں عرض کیا کہ اے گھر کے مالک، تجھے اس کے بنانے والے کی بزرگی کا واسطہ، اس سختی کو مجھ پر آسان کر۔ راوی کہتا ہے کہ فوراً دیوار شق ہوئی اور فاطمہ اندر چلی گئیں اور ہماری آنکھوں سے غائب ہو گئیں اور ہم نے چاہا کہ کعبہ میں ہم بھی داخل ہو جائیں تو کسی طرح اندر نہ پہنچ سکے۔ چوتھے دن نکلیں تو علیؑ کو ہاتھوں پر لیے ہوئے تھیں۔ امام داؤد کہتے ہیں کہ علیؑ سے پہلے نہ ان کے بعد کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ وہ کعبہ میں پیدا ہوا ہو۔" (روضۃ الشہداء ص ۳۴۲ سنہ ۱۲۷۳ھ)

(۸) علامہ نور الدین علی بن برہان حلبی شافعی (المتوفی سنہ ۱۰۴۴ھ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں۔ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ خانۂ کعبہ میں پیدا ہوئے اور آپ پیغمبر سے تیس برس چھوٹے تھے۔

(انسان العیون فی سیرت الامین المامون ملقب بہ سیرت جزو سوم ص ۱۴۷ سنہ ۱۲۸۰ھ)

(۹) شیخ عبد الحق محدث بن سیف الدین محدث دہلوی بخاری (المتوفی سنہ ۱۰۵۲ھ) فرماتے ہیں۔" علی بن ابی طالب کا نام ان کی ماں فاطمہ بنت اسد نے حیدر رکھا اور

جب ابو طالبؑ آئے تو انھوں نے علیؑ نام رکھا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدیق نام رکھا جیسا کہ ریاض النضرہ میں ہے اور کنیت ابو الریحانتین، امین، شریف، ہادی، مہدی، ذو الاذن، الواعیہ اور یعسوب الامۃ وغیرہ رکھی اور راویوں کا بیان ہے کہ ولادت ان حضرت کی اندرون کعبہ ہوئی۔ (مدارج النبوۃ)

(۱۰) فاضل سعید گجراتی، شیخ قطب الدین حنفی کی مشہور کتاب "کتاب الاعلام یا اعلام مسجد الحرام" کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔ مولد علی کرم اللہ وجہہٗ خود کعبہ کے اندر ہے جیسا کہ ثقات کی روایتیں بتاتی ہیں۔ لیکن قول مصنف ہے کہ مکہ میں مبارک جگہیں، مقامات پیدائش اور مشہور مسجدیں ہیں۔ منجملہ اس مقام پیدائش کے کہ جو حضرت علی ابن ابی طالب ہے اور جو مولد نبی سے قریب ہے اور کوہ ابو قبیس کے نزدیک اس کی پشت پر واقع ہے جسے شعب علی کہتے ہیں وہاں ایک مسجد ہے جس میں لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ عظیم بہتان ہے، ایسے اقوال اہل بیت نبوت سے تعصب رکھنے والوں نے گڑھ لیے ہیں۔ (حاشیہ کتاب الاعلام)

(۱۱) محمد بن معتمد خاں بدخشاں کا کہنا ہے کہ "حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ولادت بروز جمعہ ۱۳ رجب سنہ ۳۰ عام الفیل میں بمقام مکہ واقع ہوئی اور روایت ہے کہ وہ جناب خانۂ کعبہ میں پیدا ہوئے اور حجرۂ کعبہ میں نہ ان سے پہلے کوئی پیدا ہوا نہ بعد میں۔ یہ وہ فضیلت ہے جس سے خدا نے انھیں مخصوص کیا تھا۔

(نزول الابرار)

(۱۲) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ:۔ اخبار متواترہ سے ثابت ہے کہ امیر المومنین علی فاطمہ بنت اسد کے بطن سے کعبہ کے اندر ۱۳ رجب بروز جمعہ سنہ ۳۰ عام الفیل میں پیدا ہوئے اور کعبہ میں ان کے سوا کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا، نہ ان سے پہلے نہ بعد۔" (ازالۃ الخفاء)

(۱۳) مولوی صدر الدین احمد بردوانی تحریر فرماتے ہیں:۔ "ولادت ان حضرت کی خانۂ کعبہ میں جمعہ کے دن ۱۳ رجب ۳۰ عام میں واقع ہوئی۔"
(روائح المصطفیٰ ص ۱۰ مطبوعہ مطبع احمدی کانپور ۱۲۹۹ھ)

(۱۴) شاہ محمد حسین صابری چشتی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔ "تاریخ ۱۳ رجب بعد گذرنے ۳۰ سال عام الفیل روز جمعہ وقت چاشت اور دس سال چھ دن پہلے بعثت رسول خدا سے، خانۂ کعبہ میں آپ پیدا ہوئے۔" (آئینۂ تصوف ص ۹ مطبوعہ رام پور ۱۳۱۲ھ)

(۱۵) مولوی عبید اللہ بسمل امرتسری رقم طراز ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جناب ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے شادی کے تین برس بعد آپ عین خانۂ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سن مبارک اٹھائیس برس کا تھا۔ (ارجح المطالب ص ۳۹۶ مطبوعہ نول کشور لاہور)

(۱۶) مولوی عبد الحمید خاں دہلوی سیر الخلفاء میں تحریر فرماتے ہیں "طبقات ابن سعد اور اسد الغابہ میں ہے کہ حضرت علیؑ مکہ مکرمہ میں بروز جمعہ ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل میں پیدا ہوئے اور آپ سے پہلے خاص بیت اللہ کی چار دیواری کے اندر کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔" (رسالہ مولوی دہلی جلد ۲ نمبر ۲، ۲ شعبان ۱۳۴۳ھ)

مذکورہ علمائے اہل سنت کی کتابوں اور عبارتوں سے یہ ثابت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام خانۂ کعبہ میں پیدا ہوئے، ان سے پہلے کوئی دوسرا شخص خانۂ کعبہ کے حدود میں نہ پیدا ہوا ہے نہ قیامت تک ہوگا۔

مولانا ندوی نے اپنی فریب کاری سے اس مسلمہ تاریخی حقیقت کے تابندہ نقوش کو معدوم اور مسموم کرنے کی جو کوشش فرمائی ہے وہ نہ اہل علم کے نزدیک

مستحسن ہے نہ قابل ستائش۔ بلکہ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو وہابیت کی عینک سے آل محمدؐ کی منقصت میں باطل روایتوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مولانا موصوف غالباً حضرت شمس تبریز، مولانا جلال الدین رومی، عبد الرحمٰن نور الدین جامی، شیخ مصلح الدین سعدی، بوعلی قلندر، حضرت نظام الدین اولیاء، خواجہ فرید الدین عطار، شاہ نعمت اللہ ولی، شاہ نیاز بریلوی، امیر خسرو، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری وغیرہ سے واقف اور روشناس ہوں گے۔ ان صوفیائے کرام کا تصور حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے بارے میں کیا تھا؟ چند نمونے ملاحظہ فرمالیں تاکہ کسی اعتراض کی گنجائش نہ رہ جائے۔

جامی فرماتے ہیں:۔

تو سلطان صاحب سریر آمدی — علیٰ کل شئی قدیر آمدی
بہ ہر صورت دل پذیر آمدی — سمیعٌ، علیمٌ بصیر آمدی
علی نام کردی بہ ملک عرب — بہ سوئے غریباں امیر آمدی

نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں:۔

امامت را کسے شاید کہ شاہ اولیاء باشد — بہ زہد و عصمت و دانش مثال انبیاء باشد
امام حق کسے باشد کہ باشد ہمسر احمد — چنیں رفعت کہ می بینی بجز حیدر کجا باشد

بوعلی قلندر فرماتے ہیں:۔

اے علی قصر شان تو، روح القدس دربان تو — تا رفتہ تا ایوان تو شہباز فکر انبیاء
نور شمع حق زیب سپہر نہم طبق — گیرد ملک از تو سبق اے پیشوائے اولیاء

حضرت احمد جام المعروف بہ زندہ پیل فرماتے ہیں:۔

گر نجات آں جہاں مطلوب داری اے عزیز — دست در داماں آل مصطفیٰ باید زدن

امام شافعی نے یہاں تک کہہ دیا:۔

مات شافعی ولیس یدری　　　　علی ربه ام ربه اللہ

(شافعی مرگیا مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ اس کا رب علی ہے یا اللہ ہے)

اس کا مطلب سمجھنے کے لیے اللہ اور رب کے معنوی فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے ۔ یہاں علی کو اللہ کہنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ اپنا کار راست خود چلاتا ہے یا علی کو اپنا ہاتھ، اپنا چہرہ، اپنی آنکھ اپنی زبان اپنا نفس اور اپنی آیت کہہ کر ان کے ذریعہ چلاتا ہے جس طرح کہ اس نے عاملان قضا و قدر مقرر فرمائے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں:-

صاحب ذوالفقار است　　　　نائب کردگار است

(علیؑ صاحب ذوالفقار ہے، اور علیؑ اللہ کا نائب ہے۔)

حضرت شمس تبریز فرماتے ہیں:-

بود با جملہ انبیاء در سِر　　　　بود با مصطفیٰؐ نبی جہرا

(حضرت علیؑ ہر نبی کی خفیہ طور پہ مدد کرتے رہے لیکن محمد مصطفیٰؐ کیلئے کھل کر ظاہر بہ ظاہر آگئے)

تاریخ گواہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی سخت مرحلہ درپیش آیا تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا۔ نَادِ عَلِیاً مَظْهَرَ الْعَجَائِبِ.... الخ

اے رسول مدد کے لیے علی کو آواز دو جو عجائبات کا مظہر ہے اور تم ہر موقع پر اسے اپنا مددگار پاؤ گے۔

حضرت علیؑ کے ان الوہیانہ صفات اور محیر العقول کمالات سے یہ عقدہ کھلتا ہے کہ ایسی پر فضیلت اور فخر روزگار ہستی کی ولادت کے لیے خانۂ کعبہ کا قیام اور تعمیر ضروری تھی جو حضرت آدم، حضرت ابراہیم اور ملائکہ مقربین کے ہاتھوں اس لیے عمل میں لائی گئی تاکہ آپ کی ولادت کا شرف اسے حاصل ہو سکے۔

میرے نزدیک حضرت علی خانۂ کعبہ میں پیدا ہو کر مشرف نہیں ہوئے بلکہ خانۂ کعبہ کو اللہ نے علیؑ کی جائے ولادت قرار دے کر اسے مزید شرف بخشا ہے۔

ان تمام ناقابل تردید شواہد کی موجودگی میں نہ حکیم بن حزام کا من گھڑت اور فرضی افسانہ کوئی حقیقت رکھتا ہے نہ مولانا ابوالحسن ندوی کی بچکانی تحریر کی کوئی اہمیت ہے۔

MOWLANA NASIR DEVJANI
MAHUVA, GUJARAT, INDIA
PHONE . 0091 2844 28711
MAIL . devjani@netcourner.com

باب الثالث

حضرت عمر بن الخطاب

خدا کی قدرت کہ ابن حنتمہ بن حنتمہ سے عمر ہوا
اور پھر، عمرا سے عمر بنا، بن گیا
(ازالۃ الخفار ص ۵۸.)

پیدائش

تاریخ کی کتابوں میں حضرت ابوبکر کی طرح، حضرت عمر کی تاریخ پیدائش کا بھی کوئی وجود نہیں ہے۔ عمر نواز علمار کا صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ طلوع آفتاب رسالت سے ستائیس برس قبل اور ہجرت نبوی سے چالیس سال قبل کفر کی تاریکی میں کفار مکہ کی ایک شاخ بنی عدی سے تعلق رکھنے والے ایک لکڑہارے خطاب بن نوفل کے یہاں پیدا ہوئے۔

علامہ شبلی بھی حضرت عمر کی تاریخ پیدائش بتانے سے قاصر ہیں، اور بڑی تحقیق و جستجو کے بعد صرف اتنا ہی تحریر کر سکے کہ "حافظ عساکر نے تاریخ دمشق میں عمرو بن عاص کی زبانی ایک روایت نقل کی ہے کہ میں اپنے چند اصحاب کے ساتھ ایک جلسہ میں بیٹھا تھا کہ دفعتاً ایک شور اٹھا، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خطاب کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا ہے۔" (الفاروق ص ۲۷-۲۸)

ترجمہ اسد الغابہ ج ۷، ص ۴۷ میں ابن اثیر کے حوالے سے ہے کہ حضرت عمر کی

پیدائش واقعہ فیل کے تیرہ برس بعد ہوئی۔ حضرت عمر کا قول ہے کہ میں واقعۂ فجار اعظم کے چار سال پہلے پیدا ہوا۔ (واللہ اعلم)

حضرت عمر کی تاریخ پیدائش کا ظہور میں نہ آنا اس بات کی دلیل ہے ان کی خاندانی حیثیت یا ذاتی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ ابتدائی دور کے مورخین ان کی طرف متوجہ ہوتے۔

نام، کنیت اور القاب

حضرت عمر کی اختلافی شخصیت کی طرح ان کے نام میں اختلاف ہے۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ پہلے آپ کا نام یہودیوں کے نام کی طرح عمیر تھا، بعد میں اپنی ہیئت بدل کر عمر ہو گیا۔ کنیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ابو حفص یا ابو حفصہ تھی۔ لقب فاروق اعظم مشہور ہے۔ مگر معلوم نہیں کیوں؟ جب کہ آنحضرت نے یہ لقب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو مرحمت فرمایا تھا اور تمام مسلمانوں پر واضح کر دیا تھا کہ میرے بعد اسلام میں فتنہ و فساد برپا ہوگا اور جب یہ وقت آئے تو تم علی کا ساتھ دینا اور ان کی پیروی کرنا کیونکہ وہی حق و باطل کے درمیان فاروق ہیں (کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۵) اسی صفحہ پر یہ بھی تحریر ہے کہ علیؑ مجھ پر سب سے پہلے ایمان لائے، علیؑ ہی سب سے پہلے مجھ سے مصافحہ کریں گے۔ علیؑ ہی جملہ مومنین کے سردار ہیں اور علیؑ ہی صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہیں۔

ریاض النضرہ میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ میں نے سنا ہے کہ آنحضرتؐ علیؑ سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ تم ہی صدیق اکبر اور تم ہی فاروق اعظم ہو۔
(ریاض النضرہ ج ۲ ص ۱۵۵)

شاہ عبد العزیز محدث کا کہنا ہے کہ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کی کنیت ابو تراب، ابو الریحانتین اور القاب

ذوالقرنین، یعسوب الدین، یعسوب قریش، امین، ہادی، مہدی، سابق، یعسوب الامۃ، یعسوب المومنین، صدیق اور فاروق تجویز فرمائے تھے۔ ان سب کی روایتیں موجود اور ثابت ہیں۔ (فتاوائے عزیزی ج ۲ ص ۲۱۱)

تاریخ الامم والملوک میں ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ میں بندۂ خدا، رسولؐ کا بھائی اور صدیق اعظم اور فاروق اعظم ہوں۔ میرے سوا اگر کوئی دوسرا اپنے کو صدیق یا فاروق کہتا ہے تو وہ جھوٹا ہے (تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۲۱۱)

حُلیہ

حضرت عمر کے حقیقی جاں نثار اور پرستار مولوی عبدالشکور پاٹنا نالوی (لکھنوی) نے اپنی کتاب خلفائے راشدین میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عمر کا رنگ سفید سرخی مائل تھا۔ زمانۂ قحط میں ناموافق غذا کے استعمال سے کالا ہو گیا تھا، رخساروں پر گوشت بہت کم تھا۔ قد اتنا لمبا تھا کہ جب لوگوں کے درمیان کھڑے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کسی سواری پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ (خلفائے راشدین ص ۵۲) مولوی مسیح الدین کاکوروی نے تحریر کیا ہے کہ حضرت عمر بھینگا (احول) دیکھتے تھے۔ (تاریخ خلفاء ص ۴۴۲) علامہ حجر عسقلانی کا کہنا ہے کہ حضرت عمر، لانبے ڈیل ڈول والے اور گنجے تھے۔ جسم پر سرخ رنگ کے بالوں کی کثرت تھی۔ مونچھیں لمبی تھیں جن کے دونوں کناروں پر سرخی نمایاں رہتی تھی، دونوں رخسار پچکے ہوئے اور اندر کو دھنسے تھے۔

یعقوب بن سفیان نے اپنی تاریخ میں سند جید سے جو زر بن حبیش تک پہنچتی ہے یہ روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عمر کو دیکھا ہے وہ بائیں ہتھے، گنجے اور سیاہ فام تھے اور اس قدر لمبے تھے کہ معلوم ہوتا کسی جانور پر بیٹھے ہیں۔ ترجمہ اسد الغابہ میں سماک سے روایت ہے کہ حضرت عمر کی صورت قبیلہ بنی سدوس کے لوگوں سے ملتی تھی اور جب وہ چلتے

تو ایسا لگتا کہ سواری پر ہیں۔ داڑھی اتنی گھنی اور لمبی تھی کہ جب آپ چولھا پھونکتے تھے تو دھواں داڑھی کے درمیان سے خارج ہوتا تھا (خلاصہ عبارت ترجمہ اسد الغابہ ص ۹۲ تا ۱۰۲) اصابہ میں ہلال ابن عبداللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر کو میں نے دیکھا ہے وہ ایسے ڈیل ڈول والے تھے گویا قبیلۂ بنی سدوس سے ہوں۔ علامہ ابن عبدالبر کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کا قد طویل اور رنگ سیاہی مائل تھا، سر گنجا، مونچھیں لمبی اور داڑھی جھاڑی نما تھی۔ پیروں سے معقل تھے، ایسا لگتا کہ پیر بندھے ہوئے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے کام کاج کرتے اور اسی سے کھانا کھاتے۔ رنگ کے بارے میں آپ کی اولادوں کا کہنا تھا کہ یہ سیاہی ہم لوگوں کو ننہال سے وراثت میں ملی ہے (الاستیعاب ج ۲ ص ۵)

ننہالی وراثت کی بنا پر حضرت عمر کا سیاہ فام ہونا زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ آپ کی ماں حبشن تھیں۔ بعض مورخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ زمانۂ قحط میں گھی اور گوشت کا استعمال ترک کر دینے سے آپ کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ یہ تاویل اس لیے قابل قبول نہیں ہے کہ عرب کی آب و ہوا میں یہ تاثیر نہیں پائی جاتی کہ گھی اور گوشت کا استعمال نہ کرنے والا انسان سیاہ فام ہو جائے۔ آج بھی عرب میں ہزاروں لاکھوں لوگ گھی کے بجائے صرف روغن زیتون پر اکتفا کرتے ہیں اس کے باوجود وہ لوگ سرخ و سفید نظر آتے ہیں۔ میرے خیال میں حضرت عمر کا زمانۂ قحط میں گھی کے بجائے روغن زیتون کھا کر سیاہ ہو جانے کی داستان کو آپ کے ننہالی عیب کو پوشیدہ رکھنے کی غرض سے وضع کیا گیا ہے۔

حضرت عمر کے پیروں کا معقل ہونا یا ان کی ایڑیوں کے ملے ہونے کا سبب بھی پیدائشی اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی بھی ایک تاریخ ہے اور وہ یہ ہے کہ خالد بن ولید نے موصوف کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ خالد بن ولید اور حضرت عمر جب بچپن کی سرحدوں میں تھے تو ایک دن کسی بات پر دونوں آپس میں لڑ پڑے۔ خالد نے (جو حضرت عمر کے خالہ زاد بھائی بھی تھے) حضرت عمر کو پٹک دیا اور نہ جانے کون سا داؤں استعمال

کیا کہ آپ کی ٹانگ ہی ٹوٹ گئی بعد میں علاج سے وہ جڑ تو گئی لیکن عیب باقی رہ گیا۔ چنانچہ خالد بن ولید اور حضرت عمرؓ کے درمیان عداوت کی یہ خاص وجہ یہ بھی تھی جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے خالد بن ولید کو یہ کہہ کر معزول کر دیا کہ خالد زندگی میں کسی عہدہ پر نہیں رہ سکتے۔ (خلاصۂ عبارت سیرت حلبیہ ص ۱۹۸ ج ۳)

والدین اور نسب

حضرت عمرؓ کے باپ خطاب ابن نوفل تھے جو کفار مکہ کی شاخ بنی عدی سے تھے۔ ان کی ماں حنتمہ جنھیں عام طور پر ہشام بن مغیرہ کی بیٹی کہا جاتا ہے۔ نسلی اعتبار سے حبشن تھیں۔ (مروج الذہب برحاشیہ کامل ج ۵ ص ۹، مطبوعہ مصر) مسعودی کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی ماں حنتمہ کا نسلی تعلق عرب سے نہیں تھا بلکہ وہ حبشی نسل کی ایک سیاہ فام عورت تھیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں ہشام بن مغیرہ کی بیٹی کیوں کر ہو سکتی ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ہشام نے کوئی حبشن لڑکی کہیں پائی ہو اور وہ اٹھا کر اپنے گھر لے آئے ہوں اور اس کی پرورش کی ہو۔ اسی بنا پر اہل عرب نے اسے ہشام کی بیٹی تسلیم کر لیا ہو کیونکہ اس زمانے میں عربوں میں یہ دستور تھا کہ اگر کوئی شخص کسی کی اولاد کی پرورش کرتا تھا تو وہ اسی کی اولاد کہی جاتی تھی جیسے کہ زید کو آنحضرتؐ نے پالا تھا اس لیے لوگ انھیں زید بن محمد کہنے لگے تھے۔

اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ درحقیقت حضرت عمرؓ کا نانا کون تھا؟ علامہ شبلی نے ہشام بن مغیرہ بتایا ہے جبکہ ابن اثیر نے اپنی کتاب میں "حنتمہ بنت ہاشم بن مغیرہ" لکھا ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی کی تحقیق کے مطابق حنتمہ ابو جہل کی چچا زاد بہن ہوتی ہے اور ابن اثیر کے مطابق ابو جہل کی حقیقی بہن قرار پاتی ہے۔ اسد الغابہ میں ابن مندہ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کی ماں ابو جہل کی حقیقی بہن تھیں اور ابو نعیم سے روایت

ہے کہ اس ہشام کی بیٹی تھیں جو ابو جہل کی بہن کا بیٹا تھا۔ اس طرح ابو جہل ہشام کا ماموں قرار پاتا ہے۔ (ترجمہ اسد الغابہ ج ۶ ص ۳۷)، علامہ حجر عسقلانی کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ کا نانا ہاشم بن مغیرہ تھا جو قبیلہ بنی مخزوم سے تھا۔

ان اختلافات کے درمیان یہ مسئلہ دشوار ہے کہ حنتمہ دراصل کس کی بیٹی تھی یا اس کا نسلی تعلق کس عرب سے تھا تو اس کا حقیقی باپ کون تھا؟ ہشام یا ہاشم؟ اور ابو جہل حضرت عمرؓ کا کون تھا؟ ماموں یا کچھ اور؟ چونکہ انساب عرب کی کتابیں ناپید ہیں اس لیے یہ تحقیق محال ہے کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ کس نے کس کی کوکھ سے جنم لیا اور کس کے ساتھ کون بیاہی گئی۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس دور میں حبش کی لڑکیاں بکثرت عرب کے بازاروں میں فروخت ہونے کے لیے آتی تھیں اور لوگ انھیں خرید کر اپنی بیٹی یا بیوی بنا لیا کرتے تھے۔ اس لیے حضرت عمرؓ کی ماں کا حبشن ہونا یا حضرت عمرؓ کے فرزند کا یہ کہنا کہ سیاہی ہم لوگوں کو ننہال سے وراثت میں ملی ہے بعید از قیاس ہرگز نہیں ہے۔

ان تمام باتوں سے ہٹ کر حنتمہ کے بارے میں ابن قتیبہ کا یہ کہنا ہے کہ "حضرت عبدالمطلبؑ نے حنتمہ نام کی ایک کنیز خریدی تھی جو جنگلوں میں بکریاں چرایا کرتی تھی نوفل نامی ایک نوجوان نے اس کنیز سے ناجائز تعلق پیدا کیا اور اس کے ساتھ زنا کا مرتکب ہوا اور وہ اکثر و بیشتر جنگلوں میں جا کر اس کی عصمت دری کرتا رہا جس سے ایک لڑکا خطاب نامی پیدا ہوا اور جب وہ جوان ہوا تو اس نے اپنی ماں (حنتمہ) کو اپنے تصرف میں لے لیا جس سے حضرت عمرؓ پیدا ہوئے۔

ابن حجاج بغدادی اپنی کتاب لسان الواعظین میں لکھتے ہیں کہ "جناب عبدالمطلب کی ایک کنیز حبشیہ کا نام صہاک تھا وہ بلا کی چلبلی اور شہوت پرست تھی اس لیے اکثر وہ بے احتیاطی کی مرتکب ہو جایا کرتی تھی۔ ایسی شہوت پرست عورت

کی نگرانی مشکل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کو چرمی پائجامہ پہنا کر قفل لگا دیا جاتا تھا تاکہ پائجامہ نہ کھل سکے اور نہ اس سے کوئی فعل بد سرزد ہو سکے۔ اس کا کام جنگلوں میں اونٹوں کا چرانا تھا۔ ایک دن وہ جنگل میں اونٹ چرا رہی تھی کہ حضرت عمر کے دادا نوفل سے ملاقات ہو گئی۔ موصوف نے بھی ضحاکہ کی سی طبیعت پائی تھی چلبلی حبشن پر نظر جو پڑی تو طبیعت بے قابو ہو گئی۔ اپنی تہہ بند کو اتار کر درخت میں لٹکایا اور آہستہ آہستہ اس کا پائجامہ کھولا اور جی بھر کے منہ کالا کیا جس سے حضرت عمر کے باپ خطاب پیدا ہوئے جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو جوانی کے غیر شائستہ جذبات نے انھیں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ضحاکہ مسن ہونے کے باوجود نوخیز نوجوانوں کو اپنے نفسانی خواہشات کا نشانہ بنایا کرتی تھی۔ چنانچہ بڑھاپے میں طوفان خیز نفسانی جذبات نے اپنے بیٹے خطاب ہی کو تکمیل ذوق کا نشانہ بنایا اور اس سے اپنی ہوس پوری کی اس طرح حنتمہ عالم وجود میں آئی۔ اس نے بھی اپنی ماں جیسی طبیعت پائی تھی جب جوان ہوئی تو خطاب نے اسے بھی نہ چھوڑا اور اس کے ساتھ وصل کی لذتوں سے لطف اندوز ہوئے اور انھیں لذتوں کا نتیجہ حضرت عمر ہیں۔ (رسالہ شرح کنز مکتوم ص ۵۰-۵۱ مطبوعہ ۱۳۵۰ھ)

ابن حجاج کے اس بیان کے تحت حضرت عمر کی والدہ حنتمہ اور باپ خطاب کے درمیان تین طرح کے رشتے تھے۔ پہلا رشتہ باپ اور بیٹی کا تھا، دوسرا بھائی بہن کا اور تیسرا رشتہ بیوی اور شوہر کا تھا۔

ابن قتیبہ دینوری کا کہنا ہے کہ:۔ "خاندان فہم کی ایک عورت حضرت عمر کے دادا نوفل کے تصرف میں تھی اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے یعنی حضرت عمر کے چچا عمرو نے اس عورت کو اپنے تصرف میں لے لیا جس سے زید پیدا ہوا، اس طرح زید بن عمرو کی ماں خطاب کی بھی ماں تھیں اور زید سعید کے باپ تھے۔

(معارف مطبوعہ مصر ص ۴۷)

نسبی رشتہ سے زید حضرت عمر کے چچا زاد بھائی بھی تھے اور چچا بھی اور خاندان فہم کی وہ عورت حضرت عمر کی دادی بھی تھی اور چچی بھی اور عمرو اپنے باپ نوفل کے بیٹے بھی تھے اور ہم زلف بھی اور نوفل اس عورت کے شوہر بھی تھے اور سسر بھی، اور وہ عورت عمر کے باپ خطاب کی ماں بھی تھی اور بھاوج بھی۔ غرض کہ نہ جانے کون کون سے رشتے پیدا ہو گئے

اس تاریخی تجزیہ سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حضرت عمر صحیح النطفہ یا صحیح النسب نہیں تھے۔ غالباً یہی سبب تھا کہ حضرت عمر کسی خاندانی یا نسلی تذکرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ علامہ ابن ابی الحدید نے ابوعثمان سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر کو اپنے دور خلافت میں جب یہ معلوم ہوا کہ اشعار کے راویوں اور حالات سے واقف کار لوگوں میں کچھ لوگ ماضی کے نسبی عیبوں کو بیان کرتے ہیں اور گڑے مردے اکھاڑتے ہیں تو آپ منبر پر گئے اور فرمایا کہ خبردار نسب کے عیبوں اور آباء واجداد کی اصلیت پر بحث نہ کیا کرو کیونکہ اگر آج یہاں میں یہ حکم دوں کہ ان دروازوں سے اس شخص کے علاوہ کہ جو نسبی عیوب سے پاک ہو، کوئی نہ نکلے تو مجھے یقین ہے کہ تم میں سے کوئی بھی نکل کر باہر نہ جا سکے گا۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۲۴ مطبوعہ مصر)

ابتدائی حالات

حضرت عمر کی ابتدائی زندگی کے حالات تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ اگر تاریخ کے آئینہ میں آپ کی ابتدائی زندگی کے عکس پر نگاہ ڈالی جائے تو آپ صرف ضجنان کے میدان میں اونٹ چراتے، جنگلوں اور پہاڑوں سے لکڑیاں کاٹ کر گلی گلی بیچتے ہوئے عکاظ کے میلوں اور دنگلوں میں لنگوٹ باندھ کر کشتیاں لڑتے ہوئے اور شراب خوری کے ساتھ عرب کی حسیناؤں سے عشق فرماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

علامہ شبلی کا کہنا ہے کہ سن رشد کو پہنچ کر ان کے باپ خطاب نے جو خدمت ان کے سپرد کی وہ اونٹ چرانا تھا۔ خطاب ان کے ساتھ نہایت بے رحمی کا سلوک کرتے، تمام دن ان سے اونٹ چرانے کا کام لیتے اور جب یہ تھک کر دم لینا چاہتے تو انھیں سزا دیتے۔ جس میدان میں حضرت عمر کو یہ خدمت انجام دینا پڑتی اس کا نام ضجنان تھا جو مکہ سے مقام قدید دس میل کے فاصلے پر تھا۔ زمانۂ خلافت میں حضرت عمر کا ایک بار ادھر سے گذر ہوا تو آپ کو نہایت عبرت ہوئی اور آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اللہ اکبر ایک زمانہ تھا کہ میں یہاں نمدے کا ایک کرتا پہنے ہوئے اونٹ چرایا کرتا تھا اور جب تھک کر بیٹھ جاتا تو باپ کے ہاتھ کی مار کھاتا۔

(الفاروق ۲۷-۲۸)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ بچپن میں لوگ حضرت عمر کو ان کی ماں کی نسبت سے عکاظ[1] کے میلوں اور بازاروں میں حنتمہ وای کہہ کر پکارتے تھے، حتیٰ کہ عورتیں بھی اسی نام سے پکارتی تھیں۔ مسماۃ خولہ کا قول تھا کہ خدا کی قدرت ہے کہ ابن حنتمہ، ابن حنتمہ سے عمرا ہوا اور پھر عمرا سے عمر بن گیا (ازالۃ الخفاء ص ۱۵۸)، شاہ صاحب کے اس بیان سے دو باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اول یہ کہ حضرت

---

[1] عکاظ اس مقام کا نام ہے جہاں زمانۂ جاہلیت میں ہر سال ایک میلہ لگتا تھا۔ چونکہ اس میلے میں زیادہ تر کھالوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی اس لیے چمڑے کی نسبت سے اس کا نام عکاظ ہوا۔ اس میلے میں شعر و سخن کی محفلیں بھی جمتی تھیں، اور عرب کے شعراء قابل ذکر کارناموں کو نظم کر کے عوام سے خراج تحسین لیتے تھے۔ دنگلوں کا بھی اہتمام ہوتا تھا جس میں لوگ کشتی بازی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اسلام کے بعد حج کے اجتماع نے اس بازار کو سرد کر دیا۔

عمر کو ماں کی طرف منسوب کر کے پکارا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ لوگ ان کی ولدیت سے مطمئن نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ عورتیں آپ کا شمار صنف نازک میں کرتی تھیں۔

شاہ صاحب نے ایک اور دلچسپ وضاحت فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ عمرو عاص حضرت عمر کی نسبی فضیلت کے قائل نہیں تھے اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ خدا لعنت کرے اس دن پر کہ جس دن میں حضرت عمر کی طرف سے حاکم بنوں۔ خدا کی قسم میں نے انھیں اور ان کے باپ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ بجز قطران[1] کی ایک چادر کے کوئی دوسرا کپڑا ان کے تن پر نہیں رہتا تھا اور وہ جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر اسے گلی گلی بیچا کرتے تھے۔ (ازالۃ الخفاء مقصد دوم ص ۱۸۲)

اس کا مقصد یہ ہوا کہ حضرت عمر اور ان کے باپ عمرو عاص کی نظر میں بھی انتہائی پست اور کمتر تھے۔ جبکہ خود عمرو عاص کی ماں نابغہ عرب کی ایک مشہور طوائف تھی اور اجرت پر اوباش و بدقماش لوگوں کے خلوت کدے آباد کیا کرتی تھی۔ اس کے مکان پر رایت زنا لہرایا کرتا تھا۔ چنانچہ عمرو جب پیدا ہوا تو ابولہب، امیہ، ہشام بن مغیرہ (حضرت عمر کے نانا) عاص بن وائل اور ابوسفیان نے عمرو کے باپ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ معاملہ یوں طے ہوا کہ عمرو کی ماں (نابغہ) نے ان پانچوں آدمیوں کے درمیان یہ تجویز رکھی کہ عمرو کی صورت جس سے مل جائے اسی کا بیٹا تسلیم کر لیا جائے چنانچہ اس کی صورت عاص سے مل گئی اور وہ اسی کا بیٹا مان لیا گیا۔

ظاہر ہے کہ جب عمرو بن عاص ایسے شخص کی نظر میں حضرت عمر اور ان کے باپ خطاب کی یہ منزلت تھی تو عرب کے شرفاء میں ان کا کیا مقام رہا ہوگا۔

---

[1] قطران ایک بہت ہی معمولی قسم کا کپڑا ہوتا تھا جو گھوڑوں اور اونٹوں کا جامہ بنانے کے کام آتا تھا۔

علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ :۔ "آغاز شباب میں حضرت عمر ان شریفانہ مشغلوں میں مشغول ہوئے جو عرب کے شرفا میں معمول تھے۔" (الفاروق ص ۲۰)

زمانۂ جاہلیت اور کفر کی تاریکی میں پروان چڑھنے والے عرب کے بدو، ان جاہل بدوؤں میں شرفا اور ان شرفا میں شریفانہ مشغلے ایسی عجیب و غریب بات ہے جسے عقل قبول نہیں کرتی۔ ممکن ہے علامہ شبلی کا یہ اشارہ حضرت عمر کی اس مخصوص شریفانہ عادت کی طرف ہو جسے کے راز دار صرف اللہ تھے۔

تعلیم، رنگین مزاجی، پہلوانی اور شراب نوشی

تعلیم کے بارے میں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ حضرت عمر اپنے ماموں علامہ ابو جہل کے شاگرد تھے۔ کیونکہ آپ کے مدبرانہ کارناموں میں بھی جہل نمایاں ہے آپ کی رنگین مزاجی کی داستانیں بھی تاریخ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں جن کی وضاحت آگے ہوگی۔ مکہ کے دوسرے نوجوانوں کی طرح آپ کو بھی حسینان عرب سے بلا کا شغف رہا ہے۔ آپ بنت رز کے عاشق بھی تھے اور اپنے اس مشغلہ کو آپ نے اپنی آخری سانس تک برقرار رکھا۔

مصر کے مشہور ادیب اور مصنف محمد حسین ہیکل نے کھل کر ان واقعات کا اعتراف کیا ہے چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔ "جب حضرت عمر کی جوانی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ رخصت ہوگئی تو (بڑھاپے میں) ان کے دل میں پھر نکاح کی خواہش پیدا ہوئی۔ انھوں نے نو عورتوں سے شادیاں کیں۔ حضرت عمر کی زندگی اگر اور وفا کرتی تو وہ اور بھی شادیاں کرتے۔ (عمر فاروق اعظم مترجم حبیب اشعر ص ۷۴)

حضرت عمر کو پہلوانی اور کشتی بازی کا بھی بے حد شوق تھا، گویا موصوف اپنے

اپنے وقت کے گاما تھے اور میدان جنگ کے علاوہ ہر میدان میں باضابطہ لنگوٹ باندھ کر اپنی پہلوانی اور طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ علامہ شبلی نے آپ کی کشتی بازی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے اور علامہ بلاذری کی کتاب، کتاب الاشراف سے بہ سند یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ عکاظ کے میلوں اور دنگلوں میں کشتیاں لڑتے تھے۔ (الفاروق ص ۲۸)

حضرت عمر بچپن سے شراب کے شوقین تھے۔ اسلام اختیار کرنے کے بعد بھی آپ نے شراب ترک نہیں کی۔ تاریخ میں یہ واقعہ انتہائی عبرت ناک اور قابل افسوس ہے کہ ملت مسلمہ کے خلیفہ ہونے کے باوجود آپ نے ماہ رمضان میں شراب کا استعمال کیا اور نشہ کی حالت میں عبد الرحمٰن بن عوف کو ہڈی سے مارا اور شعر پڑھے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تم اپنے خدا سے کہہ دو کہ وہ مجھے شراب پینے سے منع کرے اور ہمارا کھانا پانی بند کرے۔ ہم نے آج سے روزہ رکھنا چھوڑ دیا۔ (نور ایمان، ص ۴۶ بحوالۂ ربیع الابرار و فتح الباری فی شرح بخاری)

حضرت عمر نے خود بھی اپنی شراب نوشی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :۔ "میں اسلام سے کوسوں دور تھا، جاہلیت میں شراب پیتا تھا اور خوب چاؤ سے پیتا تھا۔ ہماری ایک محفل جمتی تھی جس میں اکثر نوجوان شریک ہوتے تھے۔" (عمر فاروق اعظم مترجم حبیب اشعر ص ۲۷)

پیشہ

حضرت عمر کا خاندانی پیشہ دلالی تھا۔ مولوی وحید الزماں کا کہنا ہے کہ آپ بھی زمانۂ جاہلیت میں بائع و مشتری کے درمیان دلالی کیا کرتے تھے (انوار اللغہ پارہ ۲ ص ۳۴) دلالی کے علاوہ آپ لکڑہارے کا پیشہ بھی اختیار کیے ہوئے تھے اور جنگلوں سے لکڑیاں

کاٹ کر اسے گلی گلی فروخت کیا کرتے تھے، اونٹوں کا چرانا بھی آپ کا پیشہ تھا۔ ابن ابی الحدید نے ابواحمد کے مصنفات سے بہ سند یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت عمر ولید بن مغیرہ کے یہاں خدمت گاری پر مامور تھے اور اکثر انھوں نے ولید کے تجارتی قافلہ کے ہمراہ دور دراز کا سفر بھی کیا۔ دوران سفر آپ کا کام اونٹوں کا چرانا ہوتا اور جب قافلہ بغرض تجارت کہیں قیام پذیر ہوتا تو آپ سامان تجارت اپنے سر پر بار کرکے فروخت کنندہ کے ہمراہ پھیری کیا کرتے تھے۔ (خلاصہ عبارت شرح ابن الحدید ج ۳ ص ۱۴۲)

حضرت عمر کا ڈرامائی اسلام

حضرت عمر نے اسلام کیونکر قبول کیا؟ اس کی اجمالی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدترین دشمن ابوجہل (جو حضرت عمر کا ماموں بھی تھا) نے کفار مکہ کے ایک اجتماع میں یہ اعلان کیا جو شخص محمدؐ کا سر کاٹ کر لائے گا اسے سو اونٹ یا چالیس ہزار درہم انعام میں دیے جائیں گے۔ یہ اعلان سن کر حضرت عمر کے دل میں بھی یہ حوصلہ پیدا ہوا کہ کیوں نہ اس انعام کو حاصل کرکے معاشی بدحالی کو دور کیا جائے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت آپ نے اپنے دل میں یہ ارادہ کیا کہ میں محمدؐ کو قتل کروں گا۔ تلوار لے کر ارقم کی گھر کی طرف جہاں سرکار دو عالم قیام فرما تھے، روانہ ہوئے۔ راستہ میں کسی نے پوچھا کہ اے عمر! یہ تلوار لے کر کہاں چلے۔ کہا محمدؐ کو قتل کرنے۔ اس شخص نے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر کیوں نہیں لیتے۔ تمھارے بہنوئی اور بہن بھی تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ غیظ و غضب کا طوفان بہنوئی کے گھر کی طرف مڑ گیا، اور آپ جاکر ان سے بھڑ گئے۔ خوب جم کر مار پیٹ ہوئی۔ بہن نے مداخلت کی تو اس بیچاری کے منہ پر ایسا زوردار گھونسہ رسید کیا کہ وہ لہو لہان ہو گئی۔ اس

حرکت پر آپ کے بہنوئی نے آپ کی وہ خاطر کی کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ غرض کہ آپ اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگے اور مجنوں حلیہ میں ارقم کے گھر پہنچے۔ آنحضرتؐ نے عمر کے خطرناک ارادوں کو فوراً بھانپ لیا۔ آپ نے آگے بڑھ کر کلائی پکڑی اور فشار دینا شروع کیا۔ معمولی فشار کچھ ایسا تھا کہ آپ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے رسول اللہؐ نے فرمایا اے عمر اب بتا کہ تو کس ارادے سے آیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟ فشار کی شدت سے حضرت عمر کو دن میں تارے نظر آنے لگے اور جب یہ یقین ہو گیا کہ اب جان کا بچنا مشکل ہے تو بولے، حضور میں تو اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ الغرض رسول اللہؐ ایک طرف حضرت عمر کی کلائی تھامے فشار دے رہے تھے اور دوسری طرف آپ کی زبان پر اشہد ان لا الہ الا اللہ تھا۔

علامہ شبلی نعمانی نے اس واقعہ کو معمولی ترمیم کے ساتھ قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"حضرت عمر کا ستائیسواں سال تھا کہ جب عرب میں آفتاب رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ مبعوث بہ رسالت ہوئے اور اسلام کی صدا بلند ہوئی۔ حضرت عمر کے گھرانے میں زید کی زوجہ کی وجہ سے توحید کی آواز بالکل غیر مانوس نہیں رہی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعید اسلام لائے۔ سعید کا نکاح حضرت عمر کی بہن فاطمہ سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہ بھی مسلمان ہو گئی تھیں۔ اسی خاندان میں ایک اور شخص نعیم بن عبداللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن حضرت عمر ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو وہ سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ جو لوگ قبیلہ میں اسلام لا چکے تھے ان کے سخت دشمن ہو گئے لبینہ ان کے خاندان میں ایک کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کو بے تحاشہ مارتے، اور مارتے مارتے جب تھک جاتے تو کہتے، ذرا دم لے لوں تو پھر ماروں گا۔

لبینہ کے سوا اور بھی جس جس پر ان کا قابو چلتا اسے زدوکوب کرنے سے باز نہ آتے۔
لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس پر چڑھ جاتا اترتا نہ تھا۔ ان تمام سختیوں پر بھی وہ ایک شخص کو بھی اسلام سے بدل نہ سکے۔ آخر مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ بانی اسلام ہی کا قصہ پاک کر دیں۔ تلوار کمر سے لگائے سیدھے رسول اللہ کی طرف چلے۔ راہ میں نعیم نے کہا خود تمہاری بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں فوراً پلٹے اور بہن کے گھر پہنچے اور بولے کہ میں سن چکا ہوں کہ تم دونوں مرتد ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی سے دست بہ گریباں ہوئے اور جب بہن بچانے آئیں تو ان کی بھی خبر لی یہاں تک کہ ان کا بدن لہولہان ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رسول اللہ کی طرف روانہ ہوئے اور آستانہ مبارک پر دستک دی۔ اندر قدم رکھا تو رسول اکرم (صلعم) خود بڑھے اور دامن پکڑ کر فرمایا کہ کیوں عمر کس ارادے سے آیا ہے۔ نبوت کی پر رعب آواز نے انھیں کپکپا دیا۔ نہایت خضوع کے ساتھ بولے کہ ایمان لانے حاضر ہوا ہوں۔"

(خلاصہ عبارت الفاروق ص ۳۲-۳۳)

علامہ شبلی نے "اعلان ابو جہل" اور "فشار رسالت" کے واقعہ کو نظر انداز کیا ہے جو اُن کے مسلک کے اعتبار سے ان کے لیے مناسب نہیں تھا۔

کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت عمر جب ولید بن مغیرہ کے تجارتی قافلہ کے ساتھ روم کے سفر پر تھے تو وہاں کے راہبوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ اسلام کے توسل سے آپ کو حکومت ملے گی لہٰذا آپ اس پیشین گوئی کو نظر میں رکھ کر مسلمان ہوئے۔ پیشین گوئی کے اس واقعہ کو طبری نے ج ۲ ص ۲۲۵ میں بیان کیا ہے۔ ازالۃ الخفاء میں بھی ہے۔ مسعودی نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہر حال واقعہ کچھ بھی ہو یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ حضرت عمر کا اسلام خلوص اور عقیدت سے کوسوں دور تھا۔

عمری نوشتہ

حضرت عمر کے منافقانہ اسلام، مشرکانہ زندگی، عقیدۂ بت پرستی اور آل محمدؐ سے دشمنی کے واضح ثبوت میں تمام تاریخی شواہد سے قطع نظر، عمر ہی کے ہاتھ کا تحریر کیا ہوا ایک اہم نوشتہ پیش خدمت ہے۔ اس نوشتہ کے بعد مزید کسی تبصرہ یا ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس خفیہ تحریر کا راز اس وقت کھلا جب ۶۱ھ ہجری میں حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے بہتر جاں نثاروں کے ساتھ میدان کربلا میں تین دن کے بھوکے پیاسے شہید کر دیے گئے تو عبداللہ ابن عمر نے یزید کو ایک خط لکھا اور کہا کہ تو نے آل رسولؐ کو شہید کر کے اسلام میں ایک فتنۂ عظیم پیدا کر دیا ہے۔ اس خط کے جواب میں یزید نے عبداللہ ابن عمر کو لکھا کہ اے احمق! یہ راہ تو تیرے باپ ہی کی دکھائی ہوئی ہے لہٰذا حسینؑ کے قتل کا الزام بھی تیرے باپ ہی کے سر جاتا ہے۔ اور اگر اس امر میں تجھے کوئی اختلاف ہے تو تیرے باپ کی تحریر میرے پاس موجود ہے۔

یزید کا یہ خط پہنچا تو عبداللہ ابن عمر عازم دمشق ہوئے اور وہاں پہنچ کر یزید سے گفتگو کی۔ یزید نے عبداللہ سے دریافت کیا کہ کیا تم اپنے باپ کے ہاتھ کی تحریر پہچانتے ہو۔ عبداللہ ابن عمر نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ تب یزید نے ایک صندوق اندر سے منگوایا اور اس میں سے ایک خط نکال کر عبداللہ ابن عمر کے سامنے رکھا اور پوچھا کہ یہ تمہارے باپ کے ہاتھ کی تحریر ہے یا نہیں۔ عبداللہ نے کہا ہاں میرے باپ کی تحریر ہے اور بے شک اس پر مہر بھی میرے باپ عمر بن خطاب کی ہے۔ تب یزید نے کہا کہ اب تو اسے پڑھ لے۔ عبداللہ ابن عمر نے پڑھنا شروع کیا۔ اس خط میں لکھا تھا۔

"اے معاویہ! آگاہ ہو کہ محمدؐ نے حیلہ، بہانہ اور جادو کے ذریعہ مجھے لات و ہبل

کی پرستش اور عبادت سے روکا اور محمد کا جادو، موسیٰ کے جادو سے زیادہ کارگر تھا۔ لیکن ہم اپنے سابقہ دین پر قائم ہیں۔ ہمارے دل سے لات و منات وغیرہ کی محبت ہرگز نہیں گئی اور نہ کبھی جائے گی۔ محمدؐ نے جب دنیا سے رحلت کی تو میں نے اپنی تدبیروں کو بروئے کار لاکر اپنے قبیلے کی مدد سے اسلام کی زمین کو روند ڈالا، اور علیؑ کے خلاف چالیس آدمیوں کو جھوٹی گواہی پر مامور کیا کہ محمدؐ فرما گئے تھے کہ خلیفہ قریش سے ہوگا۔ اس طرح خلافت ہم نے علی کے ہاتھ سے چھین لی۔ میں اگرچہ ظاہرہ طور پر پیغمبر کی متابعت کرتا رہا مگر میرا باطن آج بھی وہی ہے جو قبل اسلام تھا۔ اور جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا میں نے اولاد محمدؐ کی ایذا رسانی میں کوئی رعایت یا کمی نہیں کی اور جب تک زندہ رہوں گا کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔

اے معاویہ! میری یہ نصیحت تجھ کو ہے کہ آل رسولؐ کو جہاں تک ہو سکے ذلیل و رسوا اور تباہ و برباد کرنا اور خاندانِ رسالت میں سے کسی بھی فرد کو زندہ نہ چھوڑنا اور امکانی کوشش اس بات کی کرنا کہ آل رسول کسی بھی حالت میں قوت نہ پکڑنے پائیں۔ لیکن خبردار ظاہر میں مسلمان بنے رہنا تاکہ لوگ تجھ پر خروج نہ کر سکیں اور میرے اس خط کو مکمل راز میں رکھنا!

والسلام

عمر بن الخطاب

(خلعت فلائم ص ۲۵۵، انوار النعمانیہ ج ۱ ص ۲۱، ثبوت خلافت دوم ص ۱۰۲)

اس عمری نوشتہ کی تمام باتیں واضح ہیں۔ کسی مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا خط

جنگ صفین کی معرکہ آرائی سے کچھ پہلے محمد بن ابو بکر نے ایک خط معاویہ کو

لکھا اور اس میں آگاہی دی کہ خلفاء نے علیؑ ابن ابی طالبؑ کے حقوق کو غصب کیا اور اب تو بھی ضلالت و گمراہی میں پڑا ہوا ہے۔ عنقریب تجھ کو معلوم ہوگا کہ حق اور عاقبت کن لوگوں کے ساتھ ہے۔

جواب میں معاویہ نے محمد بن ابو بکر کو لکھا کہ خلفاء علیؑ کے حقوق سے اچھی طرح آگاہ تھے لیکن تمہارے باپ ابو بکر اور فاروق (عمر) نے باہم اتفاق کرکے علیؑ سے ان کے حق کو چھین لیا، پس تو مجھے کیا نصیحت کرتا ہے جبکہ تیرے باپ بن قحافہ نے استبدادی طور پر اس کی ابتدا کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم سب اس فعل میں تیرے باپ کے ساتھ شریک تھے۔ اگر تیرا باپ عمر کے ساتھ مل کر ایسا فعل زشت نہ کرتا اور وہ علیؑ کا مطیع رہتا تو ہم بھی مطیع رہتے اور خاندان رسالت کی مخالفت نہ کرتے۔ اس صورت میں اسلام اپنے حقیقی مرکز پر قائم رہتا مگر اسلام کا اپنے حقیقی مرکز پر قائم رہنا ہم سب لوگوں کو منظور نہ تھا۔ (تاریخ کامل ج ۶ ص ۹۷)

معاویہ کے اس جواب سے حسب ذیل باتوں کی وضاحت ہوتی ہے:

۱۔ خلفاء حقوق علیؑ سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

۲۔ ابو بکر اور عمر نے باہم اتفاق اور سازش کے ذریعہ حقوق علیؑ کو غصب کیا۔

۳۔ ابو بکر و عمر کی اس سازش میں معاویہ بھی شریک تھا۔

۴۔ اگر خلفاء علیؑ کی مخالفت میں صف آرا نہ ہوتے تو اسلام اپنے سچے مرکز پر قائم رہتا۔

۵۔ اسلام کا اپنے حقیقی مرکز پر قائم رہنا معاویہ یا خلفاء کو منظور نہ تھا۔

بت پرستی

مکہ کے بت پرستوں میں حضرت عمر کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ چنانچہ آپ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد بھی انتہائی مستقل مزاجی سے اپنے اس مسلک پر

قائم رہے۔ بخاری کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کے گھر میں مورتیاں نصب تھیں اور لات وہبل کے مرقعے آراستہ رہتے تھے جس کی وجہ سے باایمان لوگ ان کے ہاتھ کی کوئی چیز یا کھانا وغیرہ کھانے سے اجتناب کرتے تھے۔ چنانچہ ابن مسعود ان کے گھر میں یہ منظر دیکھ کر بغیر کھانا کھائے ہوئے واپس آئے اور یہی واقعہ ابوایوب انصاری کے ساتھ پیش آیا۔ (صحیح بخاری پارہ ۲۳ ص ۲)

حضرت عمر اور عقد ام کلثوم

کتاب اپنی معینہ ضخامت کی منزل میں پہنچ چکی ہے۔ حضرت عمر کے باقی حالات، عثمانی زندگی کا تاریخی عکس اور مولانا ندوی کی معترضہ باتوں کے مسکت جوابات کے لیے الخلفاء حصہ دوم کا مطالعہ فرمائیں جو انشاء اللہ بہت جلد منظر عام پر آرہا ہے۔ آخر میں حق کی طرف سے باطل کے لعنت زدہ چہرے پر ایک بھرپور طمانچہ اور سہی تاکہ دوسرے حصہ کی اشاعت تک (پنجے کا) نشان برقرار رہے۔

مولانا ندوی کا کہنا ہے کہ:۔

"حضرت علیؑ نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کو حضرت عمر کی زوجیت میں دے دیا تھا اور یہ دلیل ہے کہ وہ کتنی عزت حضرت عمر کی دل میں رکھتے تھے اور ان کا آپس میں کس درجہ ارتباط تھا۔"

(المرتضیٰ ص ۱۷۶)

حضرت عمر کے خطا کار اور گناہ آلود دامن پر آل رسول کی عداوت اور دشمنی کے جو بدنما داغ اور غیر فانی دھبے ہیں انھیں مٹانے کی کوششیں عہد معاویہ سے مسلسل جاری ہیں اور انھیں غیر اصولی کوششوں کے نتیجہ میں لاتعداد و بے شمار غلط روایتیں اور باطل حدیثیں عالم وجود میں آئیں جن کی نہ کوئی حقیقت ہے اور

نہ ہی وہ صداقت پر مبنی ہیں۔ انھیں غلط روایتوں میں سے ایک روایت عقد ام کلثوم کی بھی ہے جو حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے عمر کی قربت و قرابت کا رشتہ جوڑنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔

حالانکہ اس مہمل روایت کی تردید میں شیعوں کی طرف سے متعدد رسائل اور کتابیں لکھی جاچکی ہیں جو بہ اعتبار دلائل ایسی مستحکم ہیں کہ جن کا جواب ممکن نہیں ہے مثلاً مرزا احمد کامل صاحب کی کتاب نزہۃ اثنا عشری، سید علی اظہر صاحب کا رسالہ کنز مکتوم، سید سجاد حسین صاحب کی شرح کنز مکتوم، برکات حسین صاحب سجادہ نشین مارہرہ کی کتاب قول موثوق بہ ثبوت عقد ام کلثوم اور عبدالکریم مشتاق کی کتاب افسانۂ عقد کلثوم وغیرہ۔

ان سب کتابوں میں عقد ام کلثوم کے موضوع پر مسکت اور مدلل بحث موجود ہے مگر اس کے باوجود کچھ نافہم لوگ ضد کی فصیل پر بیٹھ کر اس عقد مفروضہ کی خوشی میں جہالت کی شہنائی پر ایک فرسودہ روایت کا گیت الاپتے ہوئے نظر آتے ہیں، جو ان کی بے وقوفی کا بین ثبوت ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی اسی موضوعہ اور بے ہودہ روایت کے زیر اثر خوش فہمی اور خوش فریبی کا شکار نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اصل واقعہ صرف یہ ہے کہ اسماء بنت عمیس اولاً جناب جعفر طیارؑ کے عقد میں تھیں۔ اس کے بعد وہ حضرت ابوبکر کے عقد میں آئیں اور ابوبکر کے صلب سے ایک لڑکی ام کلثوم پیدا ہوئی۔ ابوبکر کے بعد اسماء کا عقد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے ہوا اور ام کلثوم جو اس وقت آغوش مادر میں تھیں اپنی ماں کے ہمراہ حضرت علیؑ کی کفالت میں آگئیں۔ اور انھیں کے گھر میں رہنے لگیں۔ جیسا کہ بوارق کے مصنف نے اس واقعہ کو بحوالۂ کنز العمال اور استیعاب تحریر فرمایا ہے کہ:۔ ام کلثوم دختر ابوبکر بود

مادرش اسماء بنت عمیس کہ اولاً زن جعفر طیار بود باز در نکاح ابوبکر آمد، عبدالرحمن پسر و دختر ام کلثوم نام زائید، بعد ازاں بہ نکاح حضرت علی ابن ابی طالب در آمد، ام کلثوم ہمراہ مادر آمد بعدہ عمر بن خطاب با ام کلثوم دختر ابوبکر نکاح کرد۔"

لیکن حضرت عائشہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان کی بہن حضرت علیؑ کے زیر سایہ پروان چڑھے اس لیے جب ام کلثوم کی عمر چار یا پانچ برس کی ہو گئی تو انھوں نے خلیفۂ وقت حضرت عمر سے رابطہ قائم کیا اور حکومت کی طاقت کا سہارا لے کر عمر کے ذریعے ام کلثوم کا مطالبہ کیا۔ حضرت علیؑ معاملات کی نزاکت اور سنگینی سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ آپ نے ام کلثوم کی کمسنی کا معقول عذر پیش کر کے پہلے تو انکار کیا لیکن حکومت کے دباؤ اور عائشہ کی سابقہ طینت کے تحت یہ سوچ کر کہ حضرت عائشہ ابوبکر کی ہمہ صفات بیٹی اور ام کلثوم کی مختلف البطن بہن اور وارث ہیں، ام کلثوم کو ان کی درخواست پر ان کے پاس بھیج دیا۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت عائشہ کے کردار نے اپنی اس کم سن بہن کو بنا سنوار کر، ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کھوسٹ کے پاس اس کی بوالہوسی کا نشانہ بننے کے لیے محل خلافت میں بغیر عقد کے بھیجا دیا۔ حضرت عائشہ کے اس طرز عمل پر پردہ ڈالتے ہوئے ابتدائی دور کے ضمیر فروش محدثین اور مورخین نے اس افسوس ناک اور عبرت انگیز واقعہ کو روایت کا لباس پہنا کر، عقد ام کلثوم پر محمول کر کے عائشہ کی غلطیوں کو مولائے کائنات کی ذات گرامی سے منسوب کر دیا، تاکہ حضرت علیؑ سے عمر کی قرابت بھی ثابت ہو جائے اور حضرت عائشہ پر کوئی الزام بھی نہ آسکے۔

چونکہ یہ روایت کثرت اور تواتر سے کتابوں میں مرقوم ہوئی ہے اس لیے اس کا تنقیدی جائزہ بھی ضروری ہے اور یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ان کتابوں کے مصنف کون تھے؟ اور مذکورہ روایت کے راویوں کی حیثیت کیا تھی؟ چند کتابوں کے اقتباسات

ملاحظہ ہوں:-

(۱) حضرت عمر نے حضرت علیؑ سے ان کی دختر ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا، حضرت علیؑ نے فرمایا وہ ابھی کم سن ہے۔ پس عمر نے کہا کہ نہیں خدا کی قسم ایسا نہیں ہے بلکہ آپ مجھ کو رشتہ دینا نہیں چاہتے۔ اگر وہ کم سن ہے تو بھی آپ اس کو میرے پاس بھیج دیں۔ پس حضرت علیؑ نے ام کلثوم کو بلایا اور ایک پوشاک دی اور فرمایا کہ اس کو عمر کے پاس لے جاؤ اور ان سے پوچھو کہ یہ پوشاک کیسی ہے؟ ام کلثوم جب پوشاک لے کر آئیں تو عمر نے ام کلثوم کو بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ ام کلثوم نے کہا کہ میرا بازو چھوڑ دو۔ عمر نے چھوڑ دیا اور کہا کہ کتنی حسین اور کتنی خوبصورت ہے پھر علیؑ نے ام کلثوم کی شادی عمر سے کر دی۔ (ذخائر العقبیٰ ص ۱۶۸)

اس واقعہ کو ابن اسحاق نے عاصم بن عمر بن قتادہ سے روایت کیا ہے، ابن اسحاق کے بارے میں یحییٰ قطان نے کہا ہے کہ "ابن اسحاق" کذاب ہے۔ مالک نے کہا ہے کہ "ابن اسحاق دجال ہے"۔ سلیمان تیمی نے کہا ہے کہ "ابن اسحاق جھوٹا ہے"۔ دار القطنی نے کہا ہے کہ ناقابل توجہ ہے۔

(۲) عمر نے حضرت علیؑ سے ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ ابھی بچی ہے۔ عمر نے کہا کہ میری اس سے شادی کر دیں میں اس کے ذریعے فضیلت چاہتا ہوں۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ میں ام کلثوم کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں تم اس کو پسند کر کے یہ سمجھ لینا کہ میں نے اس کی شادی تم سے کر دی ہے۔ پس حضرت علیؑ نے اس کو ایک چادر دے کر بھیجا اور کہا کہ اس سے کہنا کہ یہی وہ چادر ہے جسے تم طلب کر رہے تھے۔ ام کلثوم نے جا کر عمر سے یہ بات کہی تو انھوں نے کہا کہ میں نے اسے پسند کر لی اور بے تابانہ ام کلثوم کی پنڈلی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے کھول دیا۔ ام کلثوم نے کہا کہ اگر تم خلیفہ نہ ہوتے تو اس بدتمیزی پر میں

تمھاری ناک توڑ دیتی پھر ام کلثوم واپس گئیں اور عمر مہاجرین کی محفل میں آئے اور کہا کہ مجھے تم لوگ مبارک باد دو، کہا کس لیے، کہا میں نے ام کلثوم بنت علیؑ سے شادی کرلی (استیعاب ج ۴ ص ۴۶۷)

اس کو ابو عمر و نے زبیر بن بکار سے روایت کیا ہے، اور زبیر بن بکار کے متعلق میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۴۰ میں ہے کہ اس کی حدیثیں و روایتیں ناقابل قبول ہیں کیونکہ یہ جھوٹی حدیثیں اور روایتیں وضع کرتا تھا۔

(۳) عمر بن خطاب نے جب حضرت علی سے ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ ابھی کم سن اور صغیرہ ہے۔ حضرت عمر کو بتایا گیا کہ علیؑ نے رشتہ دینے سے انکار کیا ہے۔ پس انھوں نے پھر طلب کیا تو حضرت علیؑ نے کہا کہ میں ام کلثوم کو تمھارے پاس بھیج دوں گا، اگر وہ تم کو پسند آگئی تو وہ تمھاری بیوی ہوگی۔ علیؑ نے ام کلثوم کو بھیج دیا۔ عمر نے ان کی پنڈلی کھولی۔ ام کلثوم نے کہا کہ اگر تو خلیفہ نہ ہوتا تو میں تیرے منھ پر تھپڑ مارتی۔" (اصابہ ج ۴ ص ۴۶۲)

اس روایت کو سفیان نے عمر بن دینار سے روایت کیا ہے۔ امام احمد کا کہنا ہے کہ ابن دینار ضعیف ہے اور امام نسائی اور مرۃ نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۸۷)

(۴) عمر بن خطاب نے حضرت علیؑ سے ان کی بیٹی ام کلثوم کا رشتہ طلب کیا۔ علیؑ نے جواب دیا کہ وہ ابھی بچی ہے۔ عمر نے کہا خدا کی قسم ایسی بات نہیں۔ مگر مجھے علم ہے کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟ پس علیؑ نے حکم دیا اور بچی کو سجایا سنوارا گیا اور ایک چادر اس کو اوڑھائی گئی اور آپ نے کہا کہ جاکر خلیفہ سے کہنا کہ اگر چادر آپ کو پسند آئے تو رکھ لیں ورنہ واپس کردیں۔ وہ بچی آئی تو عمر نے کہا اللہ تجھ میں برکت کرے تو مجھے پسند ہے۔ بس وہ علیؑ کے پاس واپس گئی اور

عمر کا فیصلہ سنایا۔ علیؑ نے اس کی شادی عمر سے کردی اس سے ایک لڑکا زید پیدا ہوا۔" (طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۴۶۴)

اس روایت کو ابن سعد نے محمد بن عمر واقدی سے حاصل کیا ہے۔ امام نسائی کا کہنا ہے کہ واقدی کذاب ہے اور بغداد میں اپنی کذب بیانی کی وجہ سے مشہور تھا (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۶۶) امام بخاری کا کہنا ہے کہ واقدی متروک الحدیث ہے۔ مرۃ نے کہا ہے کہ واقدی کوئی چیز نہیں ہے۔ یحیٰی بن معین نے کہا ہے کہ واقدی ضعیف ہے۔ ابن مدائنی کا قول ہے کہ واقدی کی بیس ہزار حدیثیں مہمل اور غلط ہیں۔ امام شافعی کا کہنا ہے کہ واقدی کی تمام کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں۔ ابن سعد نے انس بن عیاض، عمار بن ابی عامر، ابو حصین اور ابو خالد اسماعیل وغیرہ سے بھی روایت کی ہیں۔ میزان الاعتدال میں ان تمام راویوں کو مجہول الحال قرار دیا گیا ہے۔ (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۹۵)

اسی طرح ہشام بن سعد بھی راوی ہے جسے نسائی نے ضعیف کہا ہے۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۵۴) اسماعیل بن عبد الرحمٰن اسدی کو یحیٰی بن معین نے ضعیف لکھا ہے اور لیث نے کاذب قرار دیا ہے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۱۰) عطا بن مسلم خراسانی کو بخاری نے ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی حدیث سے احتجاج باطل ہے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۱۹) عبید اللہ بن موسیٰ کو امام احمد بن حنبل نے صاحب تخلیط کہا ہے اس کی حدیثیں بدترین ہیں (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۷۰) عبد الرحمٰن بن زید کو امام نسائی نے ضعیف کہا ہے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۰۵) اسی طرح ابن شہاب زہری کا ناصبی اور دشمن علیؑ ہونا مشہور رہا ہے۔ الغرض یہ واقعہ ایسے ناقابل اعتبار راویوں پر انحصار کرتا ہے جن کی حیثیت علم رجال کے دائرے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

ASSOCIATION KHOJA
SHIA ITHNA ASHERI
JAMATE
MAYOTTE

سبط ابن جوزی اس شرمناک واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے نانا نے کتاب المنتظم میں اس کا ذکر کیا ہے کہ علیؑ نے ام کلثومؑ کو عمر کے پاس بھیجا تھا کہ وہ انھیں دیکھیں اور عمر نے ان کی پنڈلی کھول دی۔ انھیں ہاتھ سے چھوا۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کی قسم یہ بدترین بات ہے۔ اگر یہاں کوئی کنیز بھی ہوتی تو عمر اس سے یہ بدسلوکی نہ کرتے کیونکہ اجنبی عورت کو مس کرنا حرام ہے۔ لہٰذا یہ بات حضرت عمر کی طرف کیسے منسوب کی جائے۔

اہل سنت کی صحاح ستہ میں اس نکاح کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا حالانکہ یہ کتابیں حضرت عمر کے جھوٹے فضائل اور مناقب سے بھری پڑی ہیں۔ مذکرہ بالا روایات کو اگر تنقید کی نظروں سے دیکھا جائے تو ہر تعلیم یافتہ ذہن حسب ذیل نتائج کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

(الف) حضرت عمر ساٹھ سال کی عمر میں ایک کم سن اور بروایتے صبیہ یعنی دودھ پیتی بچی سے عقد کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور حضرت علی عذر پیش کرتے ہیں کہ بچی شادی کے قابل نہیں ہے۔ مگر حضرت عمر اپنی حکومت کے زعم میں حضرت علیؑ کی بات کو جھٹلاتے ہیں اور خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ جو تمھارے دل میں ہے اس سے میں واقف ہوں۔ یہاں قسم کھا کر حضرت علیؑ کی بات کو جھٹلایا جاتا ہے جبکہ مولانا ندوی کی نظر میں دونوں بزرگ ایک دوسرے پر کامل بھروسا کرتے تھے۔

(ب) اس شادی کی تعجب خیز نوعیت یہ ہے کہ عقد کے لیے نہ کوئی محفل منعقد ہوئی اور نہ اکابرین صحابہ مہاجرین و انصار میں سے کسی کو مدعو کیا گیا، نہ کسی کو خبر ہو سکی۔ بلکہ اصول اور رسم و رواج کے خلاف لڑکی کا باپ اس پر آمادہ ہے کہ میں اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا اگر تم نے پسند کر لی تو وہ تمھاری بیوی ہے (لاحول ولا قوۃ)

(ج) یہ پہلو کس قدر شرمناک ہے کہ ایک اسلامی خلیفہ اور صحابی رسولؐ، غیر شرعی طور پر ایک نامحرم، نابالغ اور کم سن بچی سے دست درازی کرتا ہے۔ اسے اپنے سینے سے چمٹاتا ہے، بازو پکڑ کر کھینچتا ہے، پنڈلی کھولتا ہے اور بوس و کنار کرتا ہے اور وہ بچی اپنی آبرو کو خطرے میں محسوس کرکے یہ کہتی ہے کہ اگر تم خلیفہ نہ ہوتے تو میں تمھاری ناک توڑ دیتی۔

(د) اگر ان روایات کو درست مان لیا جائے تو یہ اعتراف بھی کرنا پڑے گا کہ حضرت عمر نے ساٹھ برس کی عمر میں ایک نامحرم اور نابالغ و کم سن بچی پر مجرمانہ حملہ کیا، اور اگر عمر کی جگہ کوئی دوسرا شخص اس بے حیائی اور بے غیرتی کے ساتھ اس جرم کا مرتکب ہوتا تو اس کو عبرت ناک سزا کا سامنا کرنا پڑتا مگر چونکہ خود حاکم وقت نے یہ قدم اٹھایا تھا اس لیے تمام تعزیری کارروائیاں ساکت اور خاموش رہیں۔

ان روایات سے حضرت عمر کا صریحاً ظالم، فاسق و فاجر ہونا ثابت ہے۔

(ھ) مذکورہ روایت سے یہ بات بھی واضح ہے کہ اس نکاح کو صحابۂ رسول سے مخفی رکھا گیا۔ ان کو اس عقد کی خبر تک نہ ہوئی اور جب ام کلثوم ناراض ہو کر واپس چلی گئیں تو حضرت عمر نے مبارک باد کا مطالبہ کیا۔ جب صحابہ نے وجہ دریافت کی تو انھوں نے ام کلثوم سے شادی کی خبر دی۔ حلبی نے تو شرافت کے بخیے تک ادھیڑ کر رکھ دیے، یہاں تک لکھ دیا کہ ”حضرت عمر نے مہاجرین کی مجلس میں جا کر یہ کہا کہ مجھے مجامعت کرائیے۔ صحابہ نے پوچھا، کس سے؟ تو آپ نے کہا کہ میں نے ام کلثوم سے شادی کر لی ہے۔“ (کتاب السیرت ص ٢٦٣)

ان تمام باتوں کے علاوہ اہل سنت والجماعت کے مذاہب اربعہ میں از روئے فقہ اس فرضی عقد کی تردید کر کے اسے باطل قرار دیا گیا ہے۔ اور اس ضمن میں حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ کے مطابق دلائل کی بنیاد پر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ نکاح باطل

اور شریعت اسلامیہ کی نفی میں ہے۔ کیونکہ عقد مفروضہ میں ایجاب وقبول واقع نہیں ہوا اور نہ ہی اس میں گواہان مقرر کیے گئے۔ اہل سنت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ایجاب وقبول نکاح کا رکن ہے کسی مسلمان کا نکاح بغیر دو عادل آزاد اور بالغ مسلمانوں کی شہادت کے منعقد نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس نکاح میں یہ تمام شرائط مفقود ہیں اس لیے یہ نکاح قطعی باطل اور غیر اسلامی قرار پاتا ہے۔

روایت میں یہ ہے کہ حضرت عمر کے سخت اور جابرانہ مطالبہ کے بعد لڑکی کے ولی نے یہ فرمایا کہ میں ام کلثوم کو تمھارے پاس بھیجوں گا اگر تم کو پسند آگئی تو اس کی شادی تم سے کر دوں گا۔ (استیعاب ج ۴ ص ۲۷۰) یا یہ کہا کہ "اگر تم نے پسند کر لی تو وہ تمھاری بیوی ہے۔" (استیعاب ج ۴ ص ۴۶۹)

"اگر" کے لفظ پر منحصر عقد اصطلاح کی زبان میں عقد معلق کہلاتا ہے اور مالکیوں، شافعیوں اور حنبلیوں یا حنفیوں کے نزدیک نکاح معلق باطل ہے۔ نکاح کو منجز ہونا چاہیے۔

روایت سے یہ بات بھی آفتاب کی طرح روشن ہے کہ ام کلثوم اس وقت کم سن اور نابالغ تھیں۔ نابالغ بچی کی رسم نکاح میں ایک وکیل اور ایک گواہ کا ہونا کافی ہے لیکن حنفی مسلک کے مطابق باپ کی موجودگی شرط ہے اگر باپ موجود نہیں ہے تو نکاح جائز نہیں ہو سکتا۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ام کلثوم کی عمر اس نکاح کے وقت دس گیارہ برس کی تھی تو یہ مفروضہ اور بھی خطرناک ہوگا کیونکہ روایتیں یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ ام کلثوم سے حضرت عمر کے ساتھ عقد کرنے کی کوئی اجازت لی گئی ہو۔ بلکہ حضرت عمر کی دست درازی کے بعد انھیں بتایا جاتا ہے کہ وہ تمھارا شوہر ہے۔ (استیعاب ج ۴ ص ۴۶۹) یعنی حضرت عمر کی بدتمیزی سے قبل لڑکی کو کچھ نہیں معلوم۔ جب کہ اہل سنت کے یہاں یہ امر مسلمہ ہے کہ حرہ، بالغہ

اور عاقلہ کا نکاح اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے اور نہ ہی کسی ولی کے لیے جائز ہے کہ وہ بالغہ اور ناکتخدا کو کسی شخص سے نکاح پر مجبور کرے۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں نکاح باطل قرار پاتا ہے۔ شریعت کا حکم ہے کہ نکاح کو بر سر عام کرو تا کہ حرام وحلال کا فرق معلوم ہو سکے۔ خود حضرت عمر کا قول ہے کہ نکاح کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس کا اعلان کیا جائے۔ حضرت عمر کے دوسرے نکاح بھی بر سر عام ہوئے اور کسی صحابی نے بھی چوری چھپے نکاح نہیں کیا۔

ابن سعد کی طبقات اور دیگر کتابوں میں مرقوم ہے کہ ام کلثوم کا مہر چالیس ہزار درہم مقرر ہوا۔ مہر شرعی کی یہ رقم خود حضرت عمر کے اپنے ہی قول کے خلاف ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ حق مہر زیادہ نہ ہو کیونکہ رسول اللہ (صلعم) نے اپنی کسی بیٹی کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ مقرر نہیں فرمایا۔ (ازالۃ الخفاج ۲ ص ۱۱۲) شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا کہنا ہے کہ "حق مہر کا بڑھانا خلاف اصول پیغمبرؐ ہے، چونکہ صحیح احادیث میں حق مہر بڑھانے کی ممانعت ہے اس لیے حق مہر آسان باندھو۔"

(تحفہ اثنا عشری ص ۵۹۱ فارسی)

مولانا شبلی نعمانی نے بھی اسی حق مہر یعنی چالیس ہزار درہم کا ذکر اپنی کتاب الفاروق کے صفحہ ۵۰۰ پر کیا ہے جو شریعت اسلامی اور خود اصول عمری کے خلاف ہے کیونکہ حضرت عمر دوسروں کو تو زیادہ مہر سے روکتے تھے اور خود ساٹھ سال کی عمر میں ایک نابالغ اور کم سن دلھن کا چالیس ہزار درہم مہر دینے پر آمادہ ہو گئے۔

زیر بحث روایت سے یہ عقدہ بھی کھلتا ہے کہ ۱۷ھ میں حضرت عمر سے اس فرضی شادی کے وقت ام کلثوم کی عمر صرف چار یا پانچ سال کی تھی۔ بعض مورخین کے نزدیک صبیہ یعنی دودھ پیتی بچی تھیں یا صغیرہ و نابالغہ تھیں۔ ابن حجر کی صواعق

محرقہ میں ہے کہ وہ بہت چھوٹی تھیں ورنہ حضرت علیؑ ان کو عمر کے پاس نہ بھیجتے۔ شہاب الدین دولت آبادی کے نزدیک ان کی عمر پانچ برس کی تھی۔ یاسین موصلی نے المہذب ص ۹۸ پر اور عمر رضا کحالہ نے اعلام النساء ص ۲۵۶ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت عمر نے ذیقعدہ ۱۷ھ میں یہ شادی کی اور شادی کے ایک سال بعد دخول کیا حالانکہ نابالغ بچی سے دخول فعل حرام ہے خواہ وہ منکوحہ ہی کیوں نہ ہو لہذا عمر رضا کحالہ کی نظروں میں حضرت عمر فعل حرام کے مرتکب قرار پاتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن ندوی نے اپنے بیان کے اثبات میں دو شیعہ علماء قاضی نور اللہ شوستری اور ابوالقاسم قمی کی کتابوں کو دلیل قرار دے کر عام مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی جو سعی فرمائی ہے وہ انتہائی مذموم ہے اور اس سے ان کی تاریخی بددیانتی ظاہر ہوتی ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری شہید ثالث کا بیان اس نکاح کی تردید میں ہے اور "اگر" سے مفروضہ قائم کیا گیا ہے کہ بالفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی احتمال خطا کی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ حضرت عمر کلمہ گو تھے اور شیخ قمی نے اس واقعہ کو صرف کتابوں میں لکھا ہونا بیان کیا ہے نہ کہ انھوں نے تائید فرمائی ہے۔

میرا یہ مشورہ ہے کہ عام مسلمانوں کو دھوکا دینے کے بجائے ندوی صاحب ایک بار پھر شہید ثالث اور شیخ قمی کی روایتوں پر غور فرمائیں اور اگر آپ کو شیعہ علماء کی تحقیق پر بھروسا ہے تو ابو محمد بن شاذان بن خلیل نیشاپوری کی تحقیق پر غور فرمائیں۔ جو جلیل القدر فقہاء و ثقہ اور متکلمین میں سے ہیں اور آپ امام رضا علیہ السّلام، امام محمد تقی علیہ السّلام، امام علی نقی علیہ السّلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام کے معتمد صحابی تھے اور اہل سنت نے بھی آپ کو معتمد علیہ تسلیم کیا ہے۔

ابو محمد علیہ الرحمہ نے اس عقد کے بارے میں جو تاثرات پیش کیے ہیں ان

سے اس واقعہ کی تردید ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں :۔ "لوگوں نے غلط طور پر یہ وہم کر لیا ہے کہ عمر نے ام کلثوم الکبریٰ بنت امیر المومنین کا رشتہ طلب کیا بلکہ انھوں نے تو ام کلثوم بنت جرول خزاعیہ سے نکاح کیا تھا۔ (تاریخ قم حسن بن محمد بن حسن نیشاپوری قمی معاصر شیخ صدوق ص ۱۹۳)

اس مفروضہ روایت کے سلسلے میں سرکار علامہ شیخ مفید علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ :۔

یہ روایت جو وارد ہوئی ہے کہ جناب امیر المومنین نے اپنی صاحبزادی کی شادی حضرت عمر سے کر دی تھی، بالکل ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا راوی زبیر بن بکار ہے جس کے لیے مشہور ہے کہ یہ ناقابل اعتماد اور متہم ہے۔ چونکہ یہ حضرت علی کا دشمن تھا اس لیے ان کے خلاف غلط روایتیں وضع کرتا رہتا تھا شیعہ کتابوں میں یہ روایت اس لیے نقل ہو گئی ہے کہ ابو محمد یحیٰ ابن حسن علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب میں اس کو لکھ دیا اور لوگوں نے علوی سمجھ کر اس پر اعتماد کر لیا۔ حالانکہ انھوں نے یہ روایت زبیر بن بکار سے لی ہے اور یہ روایت بہ ذات خود بھی مختلف طریقوں سے نقل ہوئی ہے۔ زبیر بن بکار کبھی یہ نقل کرتا ہے کہ امیر المومنین نے خود اپنی بیٹی کا نکاح کیا۔ کبھی روایت کرتا ہے کہ عباس کو اس عقد کا متولی بنایا، کبھی کہتا ہے کہ اختیار وایثار پر یہ نکاح ہوا۔ پھر بعض نے اس روایت کو اور آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ حضرت عمر سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا جس کا نام زید ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زید بن عمر لاولد مر گیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کی بھی اولاد ہے۔ کئی کہتے ہیں کہ یہ اور اس کی ماں دونوں قتل کر دیے گئے، کسی نے کہا کہ ماں بعد میں بھی زندہ رہی کوئی کہتا ہے کہ عمر نے چالیس ہزار درہم حق مہر مقرر کیا، کوئی کہتا ہے کہ چار سو درہم پر نکاح ہوا، کسی نے کہا پانچ سو درہم مہر مقرر ہوا۔ اس قول کی ابتدا اور اس واقعہ

میں اختلاف کی کثرت اصل روایت کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔

(المسائل السرویہ ص ۱۶۱ المسئلۃ العاشرہ مطبوعہ نجف اشرف)

اسی طرح شیعہ علمائے کرام کی طرف سے لاتعداد کتابیں اس نکاح کی تردید میں موجود ہیں جو اس کی روایت مفروضہ کو باطل قرار دیتی ہیں۔ ضروری ہے کہ اس واقعہ کی تاریخی خامیوں کو بھی اجاگر کیا جائے تاکہ اس مسئلہ پر مزید بحث کی گنجائش نہ رہ جائے۔ مورخین کی اکثریت نے اس عقد کو ذیقعدہ سنہ ۱۷ھ میں ہونا بیان کیا ہے۔ اسی سال حضرت زینبؑ بنت علی علیہ السلام کا عقد عبداللہ بن جعفر سے ہوا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بڑی بیٹی کی موجودگی میں چھوٹی دختر کا نکاح پہلے کیوں کیا گیا؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ تاریخ میں یہ صراحت موجود ہے کہ ام کلثوم اور ان کے صاحبزادے زید جن کی عمر بیس سال کی تھی کا انتقال ایک ہی وقت میں ہوا، امام حسنؑ نے عبداللہ بن عمر کو نماز جنازہ پڑھنے کو کہا جب کہ ام کلثوم سنہ ۶۱ھ میں واقعہ کربلا کے بعد اسیران کے قافلہ میں شامل تھیں اور عبداللہ بن عمر کا یزیدی حکومت پر اثر و رسوخ بھی تھا۔ یہاں تک کہ جناب مختارؒ کو انھیں عبداللہ ہی کی سفارش پر رہا کیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ اعلانیہ بنی امیہ کے جانی دشمن تھے۔ مگر عبداللہ نے اپنی سوتیلی ماں کی سفارش نہیں کی۔ اگر ام کلثوم عبداللہ کی سوتیلی ماں ہوتیں تو وہ یقیناً اپنی غیرت اور باپ کی عزت کو بازاروں میں دربدر نہ ہونے دیتے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ مورخین کا کہنا ہے کہ عمر کے مرجانے کے بعد ام کلثوم کا عقد ثانی عون بن جعفر سے ہوا۔ حالانکہ شیعہ روایتوں کے مطابق حضرت زینب اور ام کلثوم کا عقد ایک ساتھ اور ایک ہی وقت میں عبداللہ اور عون پسران جعفر سے ہوا۔ عمر کے مرنے کے بعد بنت ابوبکر کا عقد عون بن جعفر سے اس لیے ناقابل تسلیم ہے کہ عون حضرت عمر کی زندگی ہی میں جنگ فارس میں کام آچکے تھے۔

تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ ام کلثوم بنت ابوبکر کے علاوہ ام کلثوم نام کی چار بیویاں اور بھی تھیں۔

۱۔ ام کلثوم جمیلہ بنت عاصم بن ثابت، جو عاصم بن عمر کی ماں تھیں۔

(تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۵۱)

۲۔ ام کلثوم بنت جرول خزاعی، ان کا اصل نام ملیکہ تھا۔ یہ زید بن عمر کی ماں تھیں۔ (کامل ج ۳ ص ۲۲)

۳۔ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط۔

(یہ زمانۂ جاہلیت میں عمرو بن عاص کے پاس سے بھاگ کر آئی تھیں اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے قرابت داروں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ جو عورت اسلام قبول کر لے وہ کسی کافر کے ساتھ نہیں رہ سکتی لہذا واپس نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ حضرت عمر نے اس سے نکاح کر لیا۔ (تفسیر کبیر ج ۸ اور شرح بخاری قسطلانی ج ۴ ص ۳۴۹)

۴۔ ام کلثوم بنت راہب (سنن ابن ماجہ اور سنن ابی داؤد)

بعض مورخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ام کلثوم بنت ابوبکر کے لیے حضرت عمر نے حضرت عائشہ کے پاس عقد کا پیغام بھیجا تھا اور وہ راضی ہوگئی تھیں۔ یہ بات مندرجہ ذیل حوالہ جات سے ثابت ہے۔

(۱) تاریخ خمیس، علامہ حسین دیار بکری ج ۲ ص ۲۶۷ (۲) تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۱ مطبوعہ مصر (۳) الاستیعاب ج ۲ ص ۹۵، وغیرہ

ان تمام شواہد اور تاریخی تجزیہ کے بعد معمولی عقل کا انسان بھی آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ روایت محض حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی تحقیر کے لیے وضع کی گئی ہے۔ اس نکاح سے نہ حضرت عمر کی فضیلت میں کوئی

اضافہ ہوتا ہے اور نہ اسلام کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے بلکہ عمری کردار سیاہ اور اسلامی تعلیمات مکروہ دکھائی دیتی ہیں۔

مولانا ندوی کی عقد ام کلثوم پر مبنی معترضہ تحریر کے اس جواب کے بعد الخلفاء کا حصہ اول تمام ہوا۔ باقی جوابات حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائیں اور میری ذاتی درخواست پر میرے والد مرحوم کے لیے ایک سورہ فاتحہ ارسال فرمائیں

شکریہ

شیعیت زندہ باد... حُسینیت پائندہ باد... یزیدیت مردہ باد

خادم ملت

فروغ کاظمی

کتاب کے مآخذ

(بر اعتبار حروف ابجدی)

نمبر شمار	کتابیات
۱	قرآن مجید
۲	نہج البلاغہ
۳	احیاء العلوم
۴	ارجح المطالب
۵	ازالۃ الخفاء
۶	اصحاب ثلاثہ
۷	استیعاب
۸	اسد الغابہ
۹	الفاروق
۱۰	الوافی
۱۱	امہات الامہ
۱۲	الامامت والسیاست
۱۳	اصابہ
۱۴	انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون ملقب بہ سیرت
۱۵	انوار النعمانیہ
۱۶	انوار اللغۃ
۱۷	المہذب (یاسین موصلی)
۱۸	اعلام النساء (عمر رضا کحالہ)
۱۹	المسئلۃ العاشرہ
۲۰	جامع ترمذی
۲۱	جامع الاصول
۲۲	جہاد حسین
۲۳	چودہ ستارے
۲۴	در منثور
۲۵	ہدایت السعداء
۲۶	حیوۃ الحیوان
۲۷	حبیب السیر
۲۸	طبقات ابن سعد
۲۹	کنز العمال

نمبر شمار	کتابیات	نمبر شمار	کتابیات
۳۰	کنز العمال	۴۹	نزول الابرار
۳۱	کتاب الفتن	۵۰	ینابیع المودۃ
۳۲	کوکب دری	۵۱	نور ایمان
۳۳	کتاب البشائر المصطفیٰ	۵۲	نہایہ ابن اسیر
۳۴	کتاب السیرت	۵۳	سیرۃ النبی (علامہ شبلی نعمانی)
۳۵	لغات کشوری	۵۴	سنن ابی داؤد
۳۶	مستدرک حاکم	۵۵	سوانح عمری حضرت ابو بکر (محمد حسین ہیکل)
۳۷	مروج الذہب		
۳۸	میزان الکبریٰ	۵۶	سوانح عمری حضرت ابو بکر (عبدالرحمٰن)
۳۹	مدارج النبوۃ	۵۷	سیرۃ النبی (ابو محمد بن عبد الملک)
۴۰	مسند امام حنبل	۵۸	سیرۃ العلویہ
۴۱	مشکوٰۃ شریف	۵۹	سیرۃ محمدیہ
۴۲	مواہب	۶۰	سیرۃ حلبیہ
۴۳	ماہنامہ منادی	۶۱	سر العالمین
۴۴	معارف	۶۲	سیرۃ ابن ہشام
۴۵	مشکوٰۃ المصابیح	۶۳	سیرۃ الخلفاء
۴۶	مطالب السؤل فی مناقب آل رسول	۶۴	سنن ابن ماجہ
۴۷	مفتاح الفتوح	۶۵	عقد الفرید
۴۸	میزان الاعتدال	۶۶	عمر فاروق اعظم (مترجم حبیب اشعر لاہور)

نمبر شمار	کتابیات	نمبر شمار	کتابیات
۶۷	عمدۃ المطالب	۸۶	شفاء (قاضی عیاض الدین)
۶۸	فتح الباری فی شرح بخاری	۸۷	شرح زرقانی
۶۹	فردوس الاخبار	۸۸	شواہد النبوۃ
۷۰	فصول المہمہ	۸۹	شرح مسلم (نووی)
۷۱	فتاوائے عزیزی	۹۰	تاریخ کامل
۷۲	صواعق محرقہ	۹۱	تاریخ طبری
۷۳	صحیح مسلم	۹۲	تفسیر در منثور
۷۴	صحیح بخاری	۹۳	تفسیر معالم التنزیل
۷۵	صحیح ترمذی	۹۴	تحفۃ العباد
۷۶	قرۃ العینین	۹۵	تاریخ الامم والملوک
۷۷	ریاض النضرۃ	۹۶	تفسیر کبیر
۷۸	روض الانف	۹۷	تہذیب التہذیب (علامہ ذہبی)
۷۹	روضۃ الصفا	۹۸	تہذیب التہذیب (علامہ حجر عسقلانی)
۸۰	روضۃ الاحباب	۹۹	تاریخ خمیس
۸۱	روضۃ الشہدا	۱۰۰	تاریخ احمدی
۸۲	روائح المصطفیٰ	۱۰۱	تاریخ ابن اثیر
۸۳	رسالہ مولوی	۱۰۲	تاریخ ابن خلدون
۸۴	رسالہ کنز مکتوم	۱۰۳	تاریخ بغداد
۸۵	شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید	۱۰۴	تاریخ عروج وزوال سلطنت روم

نمبر شمار	کتابیات	نمبر شمار	کتابیات
۱۰۵	تاریخ یعقوبی	۱۱۲	تجرید بخاری
۱۰۶	تاریخ الاعیان	۱۱۳	تذکرہ خواص الائمہ
۱۰۷	تاریخ ابوالفدا	۱۱۴	تحفۂ اثنا عشری
۱۰۸	تاریخ اسلام	۱۱۵	ثبوت خلافت اول و دوم
۱۰۹	تاریخ قم (حسن بن محمد بن حسن نیشاپوری)	۱۱۶	خلفائے راشدین (مولوی عبدالشکور)
		۱۱۷	خلافت الٰہیہ
۱۱۰	تاریخ خلفاء (مولوی سیع الدین کاکوری)	۱۱۸	خصائص نسائی
۱۱۱	تلخیص سیرۃ النبی	۱۱۹	خلعت فلاطم

شیؑ اور علیؑ

ہدیہ: آٹھ روپے

حکیم سید محمود گیلانی کی دو بیش بہا تحریریں

ایلیا

ہدیہ
دس روپیے

ملنے کا پتہ
عباسؑ بک ایجنسی، درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ

باسمہ سبحانہ

شہید محراب
آیۃ اللہ سید عبدالحسین دستغیب شیرازی
کی
دو گراں قدر تصنیف

استعاذہ
(اللہ تعالیٰ کے حضور میں پناہ طلبی)
ہدیہ ۳۵/-

قلب سلیم
دونوں حصے ایک جلد میں دستیاب ہیں
ہدیہ: ستّر روپئے

ملنے کا پتہ

عباسؑ بک ایجنسی
درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ (انڈیا)
فون نمبر: ۲۶۰۷۵۶

الخلفاء

بجواب

المرتضیٰ

مولف

فروغ کاظمی

جملہ حقوق بحق مؤلف و ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : ——— الخلفاء
مولف : ——— فروغ کاظمی
تعداد اشاعت : ——— ایک ہزار
سن اشاعت : ——— ۱۹۹۵ء
طباعت : ——— سرفراز پریس، لکھنؤ ۳
قیمت : ——— ۶۰/- ساٹھ روپے
ناشر : ——— ادارہ تہذیب و ادب ۳۹۲/۸ میدان ایل ایچ خاں خمینی لین، لکھنؤ ۳

— : —

ملنے کے پتے :

- عباس بک ایجنسی رستم نگر لکھنؤ ۳ (درگاہ حضرت عباسؑ)
- ادارہ تہذیب و ادب ۳۹۲/۸ میدان ایس۔ایچ خاں، خمینی لین لکھنؤ ۳
- صادق بک ایجنسی، چوک، لکھنؤ ۳
- صدیق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ ۳۶
- احباب پبلشرس مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ
- حیدری کتب خانہ ۱۵/۴ مرزا علی اسٹریٹ بمبئی
- شیعہ جامع مسجد کشمیری گیٹ دہلی
- شاندار بک ڈپو بنز دکراس رکاب گنج لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴
- کتب خانہ اثنا عشری، چوک، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ

اما بعد

اس

کتاب

کی

تالیف کا مقصد

کسی مسلمان کی دل آزاری نہیں

بلکہ

میرے مخاطب

صرف ابوالحسن ندوی اور وہابی مسلک کے افراد ہیں

اور

میری یہ کتاب

مولانا ندوی کی کتاب المرتضیٰ کے جواب میں ہے۔

فروغ کاظمی

انتساب

اس مظلوم شہزادے کے نام

جو ضربِ عمری کا شکار ہو کر

بطنِ مادر میں شہید ہو گیا

فروغ کاظمی

انڈکس

عنوانات	صفحہ نمبر
عرض مولف	۹
ابتدائیہ	۱۲
مختصر مختصر	۱۷
پہلا باب	
سید ابوالحسن ندوی کے نام ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی کا کھلا خط	۱۹
کھلا خط بنام شیخ عزیز الرحمٰن صاحب مفتی جماعت اسلامی ہند بمبئی	۳۷
کھلا خط جناب ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی تیونسی	۷۳
دوسرا باب	
عمری بسیار خوری	۷۸
پیٹ میں قراقر	۷۸
مال کا درد	۷۹
گھوڑے کی سواری	۸۰

عنوانات	صفحہ نمبر
گھوڑے کی لید	۸۱
ایستادہ پیشاب	۸۲
عمری استنجاء	۸۳
سٹیا بازی	۸۳
حالت صوم میں جماع	۸۴
عمری جوئیں	۸۵
جوتیوں کا رومال	۸۶
اعتراف منافقت	۸۷
حضرت عمر کی یہودیت	۸۸
اسلامی غزوات سے حضرت عمر کا فرار اور شجاعت	۹۳
عمری تشدد	۱۰۱
ابوہریرہ	۱۰۱
سعد بن ابی وقاص پر تشدد	۱۰۴
نصر بن حجاج پر تشدد	۱۰۶
ابوشحمہ پر تشدد	۱۰۷
جبلہ بن ایہم پر تشدد	۱۰۹

عمری جھوٹ ۱۱۰
عمری تجسس ۱۱۱
سرمہ دانی میں سلائی ۱۱۴
جو چاہے کرے ۱۱۵
حفصہ کی پیش کش ۱۱۵
تین، چار ماہ میں ۱۱۷
اسلام کے والدین ۱۱۸
اولاد ایک فتنہ ۱۱۹
ایسی عورت ملتی ۱۲۰
بیت المال کا مال ۱۲۱
کبشہ کا بیٹا ۱۲۲
ضبیع تمیمی کی پٹائی ۱۲۵

تیسرا باب

واقعۂ حدیبیہ ۱۲۶
جیش اسامہ سے تخلف ۱۳۳
واقعہ قلم و قرطاس ۱۳۵
توجیہات و تاویلات ۱۴۵

چوتھا باب

ڈنڈے کے زور پر اعلان خلافت ۱۶۴
ابوبکر پر عمری غلبہ ۱۶۷
عہدِ عمری کے اہم واقعات ۱۶۸
فتوحات عمری پر ایک نظر ۱۷۱
فتوحات سے رسول اکرمؐ کو پریشانی ۱۷۹
اسلامی اور غیر اسلامی فتوحات ۱۸۳
عمری نکتہ چینیاں اور منصب نبوت ۱۹۱
دینی و مذہبی اصلاحیں، متعۂ حج و
متعۃ النساء ۱۹۷
تراویح کی بدعت ۲۰۳
چار تکبیریں ۲۰۶
عمری جہالت اور علوی فراست ۲۰۶

پانچواں باب

مجلس شوریٰ کی تشکیل اور اس کا
لائحۂ عمل ۲۱۱
حضرت عمر کی وفات ۲۱۵
ازواج ۲۱۷
اولادیں ۲۱۷

چھٹا باب حضرت عثمان

نام و نسب ۲۱۹

عثمانی خانوادہ ۱۲۱
اروی بنت کریز ۲۲۲
پیدائش ۲۲۴
حلیہ ۲۲۴
ابتدائی حالات ۲۲۵
تعلیم و تربیت اور پیشہ ۲۲۶
پوشاک و خوراک ۲۲۷
عثمانی اسلام ۲۲۷
کفار مکہ کا ریلا اور آپ کی ہجرت ۲۲۹
مواخات ۲۳۰
غزوات میں عثمانی حصہ ۲۳۱
جنگ بدر ۲۳۲
جنگ احد ۲۳۴
دیگر غزوات ۲۳۶
حضرت عثمان عہد رسالت میں ۲۳۸
حضرت عثمان عہد شیخین میں ۲۴۰
عثمان کے بارے میں رسول اللہؐ کی
پیشین گوئی ۲۴۲
شوریٰ پر تبصرہ ۲۴۳
شوریٰ کا انجام ۲۴۷
خاموش انتقام ۲۵۰
خلافت عثمانیہ کی ابتدا ۲۵۱

ساتواں باب

عثمانی نظام حکومت ۲۵۲
حکم بن عاص ۲۶۰
مروان بن حکم ۲۶۴
حارث بن حکم ۲۶۵
سعید بن عاص ۲۶۶
ولید بن عقبہ ۲۶۷
عبداللہ بن سعد بن سرح ۲۷۰
عبداللہ بن خالد ۲۷۰
عاملوں کی معزولی اور تقرری ۲۷۲
دور عثمانیہ کے اہم واقعات ۲۷۴
قتل ہرمزان ۲۷۴
حضرت ابوذر غفاری کی جلاوطنی ۲۷۸
حضرت عمار بن یاسر پر عمری تشدد ۲۸۲
عبداللہ بن مسعود ۲۸۷
عثمانی فتوحات ۲۹۱
مسجد نبوی کی توسیع ۲۹۳
مسجد الحرام کی توسیع ۲۹۳
جمع قرآن ۲۹۴
منیٰ میں عثمانی نماز ۲۹۹

آٹھواں باب

سیرت شیخین	۳۰۲	مدت اقتدار	۳۴۷
مسلمانوں میں ہیجان	۳۰۷	ازدواج	۳۴۸
حضرت عثمان سے حضرت عائشہ کا اختلاف	۳۰۸	اولادیں	۳۴۹
حضرت عثمان پر پتھراؤ	۳۲۴	فہرست قاتلین عثمان (ازواج واصحاب رسولؐ)	۳۴۹
حضرت علیؑ سے فریاد	۳۲۵	حضرت عائشہ کے قاتل ہونے پر صحابۂ کرام کی گواہیاں (تاریخ کی روشنی میں)	۳۵۱
مروان کا فریب اور عثمان کا جھوٹ	۳۲۶	حضرت عائشہ کا اقرار	۳۵۳
نائلہ اور مروان کی مبتذل گفتگو	۳۲۷	تاثرات	۳۵۶
قتل عثمان کا فتویٰ اور اس پر عمل درآمد	۳۳۴	اظہار تشکر	۳۶۰
حضرت عثمان کا محاصرہ اور قتل	۳۳۸	کتابیات	۳۶۱
مدفن	۳۴۵		

حضرت فروغ کاظمی کا ایک اور قلمی شاہکار

حضرت عائشہ کی تاریخی حیثیت

بہت جلد منظر عام پر آرہی ہے

ASSOCIATION KHOJA SHIA ITHNA ASHERI JAMATE MAYOTTE

عرض مؤلف

"ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا"

"الخلفاء حصہ اول" اور "تفسیر کربلا" کی مقبولیت اور کامیابی کے بعد محترم قارئین کے پیہم اصرار اور حوصلہ افزائی کا تقاضہ تو تھا کہ الخلفاء کی یہ دوسری جلد بہت پہلے منظر عام پر آجاتی مگر افسوس! کہ یہ ممکن نہ ہو سکا اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ میری اہلیہ ثانیہ ایک قلبی دورہ میں مبتلا ہو کر ۱۶/ اگست ۱۹۹۳ء کو اچانک اس دنیا سے رحلت فرما گئیں۔ یہ وہ حادثہ تھا کہ جس کے بعد میری زندگی مکمل ایک سال تک غم و آلام کی آماجگاہ بنی رہی اور تالیفات و تصنیفات کا سلسلہ اپنی جگہ مفلوج و منجمد رہا۔
بہرکیف یہی وجہ تھی کہ میری یہ کتاب کافی تاخیر سے میرے محترم قارئین کی خدمت میں پہنچ رہی ہے جس کا مجھے شدت سے احساس ہے اور اس تاخیر کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔

میری یہ کتاب بھی الخلفاء حصہ اوّل کی طرح مولوی سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "المرتضیٰ" کے جواب میں ہے اور میں نے موصوف کی تمام معترضہ باتوں کے جوابات کو اس کی تحریروں ہی میں منحصر کر دیا ہے جسے ہر جستجو آمیز نظر آسانی سے تلاش کر سکتی ہے۔ الگ الگ جوابات کی صورت

میں یہی کتاب کئی جلدوں میں مشتمل ہوتی اور طوالت کی بنا پر قارئین کرام کے ذوق مطالعہ پر بار ہوتی۔

یہ بھی واضح کر دوں کہ اس کتاب کی تالیف کا مقصد کسی مسلمان کی دل آزاری ہرگز نہیں، درحقیقت یہ کتاب المرتضیٰ کے جواب میں ہے اور اس کا مقصد اسلام کی ان منافق اور تخریب کار شخصیتوں کے "ڈھکے چھپے" کردار کو سامنے لانا ہے جو ندوی صاحب کی عقیدتوں کا محور و مصدر ہیں اور جن کے سیاہ کارناموں کی بدولت اسلام تہتر فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔

میں ان تمام حضرات کا ممنون و متشکر ہوں جنھوں نے الخلفا حصہ اول اور تفسیر کربلا کے مطالعہ کے بعد اپنے مخلصانہ تاثرات کا اظہار فرمایا اور تحسین آمیز خطوط کے ذریعہ حوصلہ افزائی کی، اس کے ساتھ ہی میں ان لوگوں کا شکر گزار بھی ہوں جنھوں نے الخلفاء (اول) کی اشاعت کے بعد مجھے گالیوں بھرے مکتوب سے نوازا اور دھمکیاں دیں۔

خصوصی طور پر میں برادرِ محترم سید علی عباس طباطبائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی حق پرستی اور انسانیت نوازی نے اس کتاب کی تالیف کے دوران میرا بھرپور ساتھ دیا۔

میں نواب باقر علی خاں روش لکھنوی اور جناب فرحت صاحب رضوی دراجہ جی پورم، کا ممنون بھی ہوں جن کی کوششوں کے نتیجہ میں میری پہلی کتاب "الخلفاء حصہ اول" اشاعت پذیر ہوئی۔

آخر کلام میں یہ مسرت خیز اعلان بھی سماعت فرمالیں کہ "حضرت عائشہ کی تاریخی حیثیت" مکمل ہو کر کتابت کی منزلوں سے گزر رہی ہے انشاءاللہ عنقریب منظر عام پر آئے گی اور یقیناً آپ اس سے لطف اندوز

ہوں گے۔

تاریخ اسلام پر ایک مکمل، مستند اور معتبر کتاب "تفسیر اسلام" کی تالیف کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے جو کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ لیکن اس کی تالیف، کتابت اور طباعت میں کافی سرمایہ اور وقت کی ضرورت ہے۔ دعا کیجیے کہ خداوند عالم اپنے خزانۂ غیب سے اس کا انتظام فرمائے۔

والسلام

خادمِ شیعیت

فروغ کاظمی

۱۳ اپریل ۱۹۹۵ء

ابتدائیہ

اسلام نے تمام مذاہب کے لوگوں کو اپنے اپنے مذہب کے بارے میں تبلیغ کی اجازت بھی دی ہے اور مناظرہ کے آداب بھی سکھائے ہیں چنانچہ آدابِ مناظرہ میں پہلی چیز جو غور و فکر کی محتاج ہے وہ "حق" اور "حقیقت" کا اظہار ہے۔ مثلاً کوئی شخص، کسی شخص کو بغیر ثبوت و دلیل کے اگر زناکار کہتا ہے تو اسے فتنہ انگیزی، بہتان، تہمت، اور دل آزاری کہا جائے گا۔ لیکن اگر وہی زناکار کہنے والا شخص عدالت کا فیصلہ اور جیلر کا صداقت نامہ حاصل کر کے دوسرے شخص کو زناکار کہے اور یہ ثبوت فراہم کرے کہ وہ زناکاری کے جرم میں عدالت سے سزایاب بھی ہو چکا ہے تو نہ یہ فتنہ انگیزی ہوگی نہ بہتان نہ تہمت اور نہ دل آزاری، بلکہ حق کا اظہار ہوگا اور ہر انصاف پسند انسان عدالت کے حکم اور جیلر کے صداقت نامہ کی روشنی میں یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ پہلے شخص نے دوسرے شخص کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے، حق ہے اور حقیقت ہے۔

معلوم ہوا کہ حق کا اظہار نہ فتنہ انگیزی ہے نہ بہتان ہے نہ تہمت ہے اور نہ دل آزاری ہے۔ اس طرح مناظرہ کا ایک بنیادی اصول یہ طے پایا کہ حق کا اظہار فتنہ انگیزی یا دل آزاری ہرگز نہیں ہے۔ اور اگر اس اصول کو تسلیم نہ کیا گیا تو اسلام کا "کلمہ" دل آزاری کی تعریف میں

داخل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ پیغمبر اسلامؐ کی بعثت سے پہلے کفار مکہ ہزاروں "معبودوں" کو اپنا خدا مانتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے ان تمام معبودوں کی نفی کر کے صرف ایک خدا کے وجود کو صحیح کہنا کفار کی دل آزاری نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

بہر حال حقیقت و حقائق کا اظہار نہ فتنہ انگیزی ہے نہ عصبیت اور نہ دل آزاری بلکہ کسی اختلاف کی بنا پر حق پر باطل کا پردہ ڈالنا فتنہ انگیزی بھی ہے عصبیت بھی ہے اور دل آزاری بھی۔

گزشتہ چند برسوں سے شیعوں، شیعیت اور آل رسولؐ کے خلاف ایک مخصوص گروہ کی طرف سے کچھ ایسی کتابیں اشاعت پذیر ہو رہی ہیں جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ منافقین صرف رسولؐ ہی کے عہد میں نہیں تھے بلکہ آج بھی موجود ہیں جو اپنے مکروہ چہروں پر اسلام کی نقابیں ڈال کر اسلام دشمنی کے منصوبوں کی تکمیل میں مصروف ہیں اور جن کی تائید مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی کتاب "المرتضیٰ" نیز مولوی عتیق الرحمٰن سنبھلی کی کتاب "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" سے ہوتی ہے۔

خدا سلامت رکھے محقق بصیر جناب فروغ کاظمی کو کہ انھوں نے مذکورہ دونوں کتابوں کے جوابات مندرجہ بالا اصول مناظرہ کے تحت "الخلفاء" اور "تفسیر کربلا" کی شکل میں تحریر کر کے شیعوں اور شیعیت پر بہت بڑا احسان کیا ہے جیسا کہ ملاذ العلماء مولانا سید حسن صاحب قبلہ مجتہد نے تفسیر کربلا کی رسم اجرا کے موقع پر بعد نماز جمعہ مسجد آصفی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"ایک خاص گروہ ہے جسے امت مسلمہ کے تمام فرقے ازروئے اسلام غیر مسلم ٹھہراتے ہیں۔ اس گروہ کا کوئی تعلق رابطہ اسلام سے نہیں ہے۔ یہ شیعہ سنی فیلنگ پھیلاکر اس کو مسئلہ بناتا ہے جس کے نتیجہ میں ہر سنی یہ سمجھتا ہے کہ میرے خلاف ایک کام ہو رہا ہے، ایک اقدام ہو رہا ہے۔ ہمیں، آپ کو، سب کو یہ سمجھانا چاہیے کہ شیعہ سنی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

ابھی کل پرسوں آپ نے قومی آواز میں پڑھا ہوگا کہ نسلیں گزر گئیں راون کو برا کہتے مگر آج لکھنؤ میں یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ہمیں راون کی پوجا کرنے اور اس کی حمایت میں جلوس نکالنے کی اجازت دی جائے۔ راون کی مدح کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی فطرت میں ظلم پرستی آگئی ہے۔ لہٰذا ہر مظلوم کے ساتھی کو ان ظلم کی پرستش کرنے والوں کو طمانچہ لگانا چاہیے۔

میں امت مسلمہ کے درمیان اتحاد کا حامی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں یزید کو اچھا کہنے لگوں، اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ میں ابوسفیان کو اچھا کہنے لگوں، اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ میں قنفذ کو رضی اللہ عنہ کہنے لگوں، اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ میں شمر کو رضی اللہ کہنے لگوں۔

اگر اسلام کے معاملات کچھ اور ڈھیلے ہوئے تو یہی گروہ ایک دن کہنے لگے گا کہ اسلام کے سائے میں ہم کو پھر ان پرانے بتوں کی پوجا کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ اس گروہ سے جس طرح پیغمبر اسلامؐ کو لڑنا تھا، حیات پیغمبرؐ کے بعد ہر معصوم لڑا ہے، اسی طرح ہم بھی

لڑ رہے ہیں اور ہماری یہ لڑائی جاری ہے۔

خدا جزائے خیر دے، مجھ تک کلب صادق صاحب کی جو لفظیں پہنچی ہیں میں انھیں نقل کر رہا ہوں کہ فروغ کاظمی صاحب نے وہ کام انجام دیا ہے جو مولویوں کو کرنا چاہیے تھا۔

بے شک یہ ایک شاعر کا کام نہیں ہے۔ نظم کے ذریعہ حالات بدلنا، قوم پر اثر انداز ہونا ازل سے چلا آرہا ہے۔ شعرا اثر ڈالتے رہے ہیں اور قومی خدمتیں کی ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے بھی غدیر کے اعلان کو صرف نثر میں نہ رہنے دیا بلکہ اسے نظم میں بھی نشر کیا۔

یہ کام تو ان لوگوں کا ہے جو دین کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں، ان کو چاہیے تھا کہ اس گروہ کے خلاف کتاب لکھتے۔ فروغ کاظمی صاحب نے ہماری پوری قوم پر احسان کیا ہے اور وہ کتاب لکھی ہے جو ابھی آپ کے سامنے آنا چاہتی ہے۔

آپ کو علم ہوگا کہ ایک طریقہ جڑ کاٹنے کا وہ انداز ہے کہ خنجر پر مخمل کا غلاف چڑھا ہو، تو اس کا نام "المرتضیٰ" ہوگا اور جب خنجر نمایاں ہو جائے، برہنہ ہو جائے تو وہ عتیق الرحمٰن سنبھلی کی کتاب "واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر" ہے جو انھوں نے اپنی نئی نظر سے مطالعہ کے بعد ترتیب دی ہے۔ کاش اسلام کی عینک لگاکر مطالعہ کرتے تو نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ انھوں نے اسلام کی عینک اتار دی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے جدی آبائی نگاہ واپس آگئی۔"

اس کتاب "تنبیہ کربلا" کو فروغ کاظمی صاحب کی کتاب کہیے یا یہ کہیے کہ نیا ٹیسٹ کرکے چشمہ چڑھایا جا رہا ہے۔ پوری قوم کو

فروغ کاظمی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ پوری قوم کو خوش آمدید کہنا چاہیے اور پوری قوم کو ادب سے سر جھکانا چاہیے کیونکہ انھوں نے اپنے لیے کچھ نہیں کیا بلکہ پوری قوم کی عزت بچالی۔ (صلواۃ)

ہم سب ان کے ممنون ہیں۔ یہ مشہور شاعر ہیں اور بحیثیت شاعر آپ انھیں پہچانتے ہی ہوں گے۔ لیکن میں ان کا جو تعارف کرا رہا ہوں وہ بحیثیت شاعر نہیں بحیثیت مصنف کے کرا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ادب میں کوئی تنقیدی مقالہ لکھتے مگر انھوں نے جو کام انجام دیا ہے وہ تحقیقی مقالہ واقعۂ کربلا پر ہے جو ایک یزیدی کا جواب ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر تنقیدی مقالہ لکھتے تو دنیا میں واہ واہ ہوتی مگر میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ انھیں نے جو مقالہ لکھا ہے اس کا شکریہ میں نہیں بلکہ فاطمہ زہراؑ ادا کریں گی۔ (صلواۃ)

لہٰذا آپ حضرات پذیرائی کیجیے، انھیں ویل کم کہیے اور انھیں آگے بڑھائیے تاکہ یہ اہل بیت کے دشمنوں کو اور بھی جواب پر جواب دیتے رہیں۔"

ملاذ العلماء کے اس تقریری اقتباس کے بعد جناب فروغ کاظمی صاحب کے بارے میں مزید کچھ کہنا میرے لیے قطعی مناسب نہیں ہے۔ مگر یہ کہ الخلفاء حصہ اول اور تفسیر کربلا کی کامیابی کے بعد موصوف کی تیسری پیش کش الخلفا حصہ دوم جس کا قارئین کرام کو بے چینی سے انتظار تھا، منظر عام پر آرہی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب الخلفاء حصہ اول سے زیادہ کامیاب ثابت ہوگی اور مومنین کرام اس کے مطالعہ سے انشاء اللہ بے حد لطف اندوز ہوں گے۔ والسلام

خادم ملت

سید علی عباس طباطبائی

مختصر مختصر

محقق بصیر جناب فروغ کاظمی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ ایک حق پرست اور کامیاب شاعر ہیں۔ یہ تائیدِ غیبی ہے کہ آپ نے تالیفات کے میدان میں قدم رکھا تو یکایک ایک شاعر سے مصنف، محقق اور تاریخ داں بن گئے اور آپ نے "الخلفاء" لکھ کر جاں نثارانِ اہلبیتؑ میں اپنا نام شامل کر لیا۔ یہ مرتبہ وہ ہے جس کے لیے جتنی بھی دعائے خیر کی جائے کم ہے۔

فروغ کاظمی کے زور قلم کا نتیجہ "الخلفاء" کی دوسری جلد اب منظرِ عام پر آرہی ہے۔ تمام مومنین کو اس کی کامیابی کی دعا کرنی چاہیے۔ چونکہ کاظمی صاحب صحیح النسل ہیں اس لیے اہلِ بیتؑ اطہار کی محبت سے سرشار و مالا مال ہیں۔ جب آپ نے دیکھا کہ کچھ یزیدی اپنے مشن میں آج بھی لگے ہیں اور حسینؑ مظلوم کو (معاذ اللہ) باغی، ہٹ دھرم اور خطا کار ثابت کرنے میں تن، من، دھن سے مصروف ہیں اور یزید، معاویہ اور ان کے جرگہ کے لوگوں کی برتری ثابت کرتے ہیں یعنی کذابوں، زانیوں اور شراب خواروں کے جسموں پر لگی ہوئی غلاظت کو اپنی ناپاک اور نجس زبان سے چاٹ چاٹ کر صاف کرنے کی سعئ لاحاصل کر رہے ہیں تو فروغ کاظمی کا جذبہ ایمانی بیدار ہوا

اور آپ نے اپنے قلم کی نوک سے باطل کا پردہ چاک کرنا شروع کر دیا خدا کا شکر ہے کہ کاظمی صاحب اپنے اس جہاد میں بہت کامیاب ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی آلِ رسولؐ پر مظالم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان کے فضائل و مناقب کے مقابلہ میں جھوٹی حدیثوں کے کارخانے کھل گئے اور جب جھوٹی حدیثیں ہوں گی تو وہ جھوٹے اور چھچھورے لوگوں کی ہی تعریف میں ہوں گی۔ وہ زمانہ درہم و دینار کا تھا لالچ میں علماء، مورخین اور محدثین گونگے اور بہرے بن گئے، باطل کو حق اور حق کو باطل کہنے لگے۔ مگر اب نہ درہم ہے اور نہ دینار اور نہ وہ زمانہ البتہ سعودیت باقی ہے جو عتیق سنبھلی جیسے ناپاک و نامراد انسانوں کو خرید کر معاویہ و یزید کی وکالت کے لیے چھوڑ دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر" جیسی کتابیں وجود میں آتی رہتی ہیں اور فروغ کاظمی ایسے حق پرست "تفسیر کربلا" کے ذریعہ اس کا جواب دیتے رہتے ہیں۔

یہ ملت اسلامیہ کی بدقسمتی ہے کہ ایسے لوگوں کی تعریفیں ہو رہی ہیں جو رسول اکرمؐ کے جنازہ کو چھوڑ کر ایک نابکار عورت کی انگلیوں پر ناچ رہے تھے اور پیغمبرؐ کا جانشین بننے کے لیے انسانی اور شریفانہ حدود کو تجاوز کر چکے تھے۔

فروغ کاظمی صاحب انھیں خوشامدی لوگوں کے چہروں سے نقابیں اٹھا رہے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ خداوند عالم کاظمی صاحب کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین۔

احقر العباد

حکیم آغا شیرازی، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

(پہلا باب)

سید ابوالحسن علی ندوی ہندی کے نام ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی تیونسی کا کھلا خط!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مجھے محمد تیجانی سماوی تیونسی کہتے ہیں۔ خدا نے ہدایت و توفیق کے ذریعہ مجھ پر احسان کیا اور میں طویل تحقیق کے بعد مذہب شیعہ سے متمسک ہو گیا ہوں جبکہ اس سے قبل میں مالکی تھا اور شمالی افریقہ صوفیوں کے مشہور سلسلہ تیجانیہ کا پیرو کار تھا۔ شیعہ علماء کے پاس آمد و رفت کے ذریعہ میں نے حق کو پہچانا اور اس سے متعلق ایک کتاب لکھی اور اس کا نام "ثم اهتديت" رکھا جو آپ کے ملک ہندوستان میں بھی "مجمع علمی اسلامی" کی طرف سے متعدد زبانوں میں چھپ کر ختم ہو چکی ہے۔ اسی مناسبت سے مجھے ہندوستان آنے کی دعوت دی گئی۔

سیدی عزیز! میں مختصر زیارت کے لیے ہند آیا۔ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے آپ کے بارے میں سنا تھا کہ اہل سنت والجماعت کے مرجع آپ ہی ہیں لیکن مسافت کی زیادتی اور وقت کی تنگی کی بنا پر ملاقات نہ کر سکا

اور صرف بمبئی، پونہ، جبل پور اور گجرات کے کچھ شہروں تک ہی جا سکا لیکن ہندوستان میں سنی اور شیعوں کے درمیان بغض و عداوت دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی۔

یقیناً یہ بات میں پہلے بھی سنتا تھا کہ ہندوستان میں مذہب کے نام پر جنگ وجدل ہوتی ہے اور کبھی نیک مسلمانوں کا خون بہہ جاتا ہے۔ میں اس کی تصدیق نہیں کرتا تھا سوچتا تھا کہ مبالغہ آرائی ہے لیکن جو میں نے اپنے سفر کے دوران وہاں دیکھا اور سنا اُس سے میری حیرت و تعجب ہوا ہو گئی اور مجھے یہ یقین ہو گیا کہ (یہاں) اسلام اور شیعہ سنی مسلمانوں کے خلاف پست سازشیں اور بڑی منصوبہ بندی سے کام ہو رہا ہے۔ میرے اس علم و یقین کو اُسس بالمشافہہ گفتگو نے اور تقویت بخشی جو میرے اور اہل سنت کے علمار کی ایک جماعت کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جماعت میں جماعت اسلامی کے مفتی شیخ عزیز الرحمٰن پیش پیش تھے۔ یہ ملاقات ان ہی کی دعوت پر بمبئی میں ان ہی کی مسجد میں ہوئی تھی۔

میں صحیح طریقہ سے ان کے درمیان پہنچا بھی نہیں تھا کہ انھوں نے شیعان اہل بیتؑ پر لعن طعن کرنا شروع کر دی اور زہر اُگلنے لگے۔ وہ مجھے ذلیل اور قتل کرنا چاہتے تھے کیونکہ انھیں یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ میں نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اہل سنت کو مذہب اہل بیتؑ اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔ لیکن میں ان کے ارادوں کو بھانپ گیا۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو کیا اور مسکراتے ہوئے کہا: "میں تمھارا مہمان ہوں، تم نے مجھے دعوت دی" میں حاضر ہو گیا۔ کیا تم نے مجھے اسی لیے بلایا ہے کہ مجھ پر سب و شتم کرو، کیا اسلام نے تمھیں اسی اخلاق کی تعلیم دی ہے؟ انھوں نے بہت ہی

منھ پھٹ انداز میں اور حلفیہ جواب دیا کہ میں اپنی عمر کے کسی دن میں مسلمان تھا ہی نہیں کیونکہ میں شیعہ ہوں اور شیعہ مسلمان نہیں ہیں۔

میں نے کہا: میرے بھائیو! خدا سے ڈرو۔ ہمارا ایک خدا، ایک نبیؐ ایک کتاب اور ایک قبلہ ہے اور شیعہ خدا کو ایک جانتے ہیں اور نبیؐ و اہلبیتؑ کی اقتدا کرتے ہوئے اسلام پر عمل کرتے ہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، حج کرتے ہیں۔ انھیں کافر قرار دینا تمھارے لیے کیسے جائز ہو گیا؟

انھوں نے جواب دیا: تمھارا قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ تم منافق ہو، تقیہ پر عمل کرتے ہو، تمھارے امام کہتے ہیں کہ تقیہ میرے آبا و اجداد کا دین ہے، تم یہودی ہو، کیونکہ اس کا مؤسس عبداللہ ابن سبا یہودی ہے۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا: مجھ سے شیعہ ہونے کی حیثیت سے گفتگو نہ کریں۔ میں خود تمھاری ہی طرح مالکی تھا اور تحقیق و چھان بین کے بعد میں اس بات سے مطمئن ہو گیا کہ اہل بیتؑ کا اتباع کرنا بہتر ہے۔ کیا تمھارے پاس ایسی کوئی دلیل ہے کہ جس کے ذریعہ مجھ سے مجادلہ کر سکو یا پھر تم مجھ سے سوال کرو کہ میری دلیل کیا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھا سکیں۔

انھوں نے کہا: اہل بیتؑ ازواج نبی ہیں، تم قرآن کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔

میں نے کہا: صحیح بخاری اور مسلم سے تو تمھارے قول کی مخالفت ثابت ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا: جو کچھ صحیح بخاری و مسلم اور دوسری حدیث کی کتابوں میں ایسی چیزیں مرقوم ہیں جس سے تم حجت قائم کرتے ہو، وہ شیعوں کی گڑھی ہوئی حدیثیں ہیں جنھیں ہماری کتابوں میں سمو دیا گیا ہے۔

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا: جب شیعوں نے تمہاری کتابوں میں غلط حدیثیں بھر دی ہیں تو ان کتابوں کا اور اس پر قائم تمہارے مذہب کا کوئی اعتبار نہیں رہا ہے۔ (میرے اس جملے سے) وہ خاموش ہو گئے لیکن ان میں سے ایک نے بے جوڑ گفتگو کا از سر نو آغاز کیا اور کہا: جو بھی خلفائے راشدین سیدنا ابوبکر، سیدنا عمر، سیدنا عثمان، سیدنا علی، سیدنا معاویہ اور سیدنا یزید رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ایمان نہیں رکھتا وہ مسلمان نہیں ہے۔

میں اُس کی یہ بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس لیے کہ میں نے اپنی زندگی میں یہ بات کبھی نہیں سنی تھی کہ جو معاویہ و یزید کی خلافت پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: یہ بات تو کسی حد تک صحیح ہے کہ مسلمان ابوبکر و عمر اور عثمان سے راضی ہو جائیں لیکن یزید کے بارے میں تو میں نے ہندوستان کے علاوہ کہیں نہیں سنا تھا۔ میں نے ان سب کو مخاطب کیا اور سوال کیا کہ کیا تم سب اس شخص کی رائے سے متفق ہو؟

ان سب نے بیک زبان کہا: ہاں۔

اب میں نے یہ سوچا کہ ان سے گفتگو کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ وہ مجھے غیظ دلا کر مجھ سے انتقام لینا چاہتے ہیں اور صحابہ پر لعنت کے الزام میں مجھے قتل کر دیں گے اور کسی کو خبر نہ ہوگی۔

میں نے ان کی آنکھوں میں شر کو دیکھ لیا تھا اور اپنے اس ساتھی سے کہا جو مجھے ان کے پاس لے گیا تھا کہ مجھے یہاں سے فوراً نکال لے چلو، چنانچہ اس نے مجھے نجات دلائی۔ حالانکہ وہ مجھ سے روا رکھے جانے والے سلوک پر عذر خواہی کر رہا تھا اور اس بات پر افسوس کر رہا تھا اور یہ شخص کہ جو اس ملاقات کے ذریعہ حق کو پہچاننا چاہتا تھا اس سے بری تھا۔ واضح رہے

کہ یہ نوجوان اور مہذب شخص بمبئی کے مکتبہ اور مطبع اسلامیہ کا مالک شرف الدین تھا۔ وہ ہمارے درمیان ہونے والی مذکورہ گفتگو کا گواہ ہے۔ اس کے سامنے ان افراد کی بد اخلاقی کہ جو اپنے کو سب سے بڑا عالم تصور کرتے ہیں پوشیدہ نہ رہی۔

میں نے انھیں چھوڑ دیا حالانکہ مجھے ان لوگوں کے اس اخلاق پر افسوس ہو رہا تھا، خصوصاً ان لوگوں پر جو مرکز صدارت پر بیٹھے ہوئے ہیں اور خود کو علماء کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ پھر میں نے اپنے دل میں کہا جب اندھے تعصب میں علماء کی یہ حالت ہے تو (یہاں کے) عوام الناس اور جاہلوں کی کیا کیفیت ہوگی۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ ایسے معرکے اور جنگیں کیسے وجود میں آتی ہیں۔ جن میں محترم خون بہہ جاتا ہے، عزتیں پامال ہو جاتی ہیں اور ہتک حرمت ہوتی ہے اور یہ سب کچھ اسلام سے دفاع کے نام پر ہوتا ہے۔ میں امت کی اس حالت پر رو دیا کیونکہ اس امت کے پیغمبر خدا نے ہدایت کی ذمہ داری لی تھی، اور رسول نے تاریک قلوب تک نور پہنچانے کی ذمہ داری لی تھی اور امت کو ہدایت کی شدید ضرورت ہے اور اس وقت صرف ہندوستان میں سات سو ملین افراد غیر خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ گائے اور بتوں کی تقدیس کرتے ہیں اور بجائے اس کے مسلمان انھیں موحد بنائیں، ان کی ہدایت کریں، تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائیں تاکہ وہ رب العالمین کو قبول کریں، آج ہم مسلمانوں کو خصوصاً ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ انھیں خود ہدایت کی ضرورت ہے۔

لہٰذا میرے سید و سردار! آپ کو دعوت نامہ ارسال کر رہا ہوں کہ خدائے رحمن و رحیم، اس کے رسول اور عظیم اسلام کے [illegible] پر اللہ کی رحمتی

کو مضبوطی سے پکڑیں اور تفرقہ بازی سے پرہیز کریں۔ میری گزارش ہے کہ آپ ایک شجاع مسلمان کا موقف اختیار کریں کہ جو خدا کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتا اور نہ ہی اس پر شیطان کی دلی خواہش، عصبیت و قبائلیت طاری ہوتی ہے۔

میں آپ کو پرخلوص اور واضح موقف کی دعوت دیتا ہوں۔ آپ لوگوں ہی پر خدا نے اس علاقہ کے لوگوں کی ہدایت کی ذمہ داری اُس وقت تک عاید کی ہے جب تک آپ اسلام کا دم بھرتے رہیں گے۔ خدا آپ کے اس موقف سے ہرگز راضی نہیں کہ آپ یہاں وہاں رونما ہونے والے حالات سے راضی ہوں کہ جس کی قیمت شیعہ، سنّی مسلمانوں کو چکانا پڑتی ہے۔ قیامت کے روز خداوند عالم ہر چھوٹے بڑے کا آپ سے حساب لے گا اور ہر نافرمانی کے متعلق آپ سے پوچھا جائے گا کیونکہ صاحبان علم اور جاہل برابر نہیں ہیں۔ ہر ایک پر اس کے ظرف و دانائی کے مطابق ذمہ داری عاید ہوتی ہے اور شرافت کے لحاظ سے بزرگی و عظمت ملتی ہے۔

لہٰذا جب تک آپ اپنے کو ہندوستان کا عالم سمجھتے رہیں گے اس وقت تک آپ کی ذمہ داری بھی عظیم رہے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے کچھ کہنے میں ہندوستان کے لوگوں کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے اور کبھی اس سے نسلیں ہلاک بھی ہو سکتی ہیں۔ اے صاحبان عقل! اللہ سے ڈرو۔

بے شک خداوند عالم نے ملائکہ کے بعد علماء کو بلند مرتبہ عطا کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا
الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (آل عمران آیت ۱۸)

"اللہ خود گواہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے ملائکہ اور صاحبان علم گواہ ہیں کہ وہ عدل کے ساتھ قائم ہے۔"

اور جب خداوند عالم ہم سب کو یہ حکم دے رہا ہے یہ کہہ کر:

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝

(سورہ رحمٰن آیت ۸)

"اور انصاف کے ساتھ وزن قائم کرو اور تولنے میں کم نہ تولو۔"

اور جب مفسرین نے قیمتی مادی اشیاء میں عدل قائم کرنے کے لیے کہا ہے تو ان عقائدی چیزوں میں عدالت سے کیوں کام نہیں لیتے جو حق و باطل کے درمیان امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں پر بشر کی ہدایت موقوف اور اس میں پوری انسانیت کی نجات کا راز مضمر ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ فَاحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ

"اور جب کوئی فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔"

نیز ارشاد ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ
بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ۝

"اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر اپنا جانشین بنایا ہے لہٰذا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہشات کا اتباع نہ کرو کہ وہ راہِ خدا سے منحرف کر دے۔"

اور رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے:

"حق بات کہو اگرچہ وہ تمھارے خلاف ہی (کیوں) نہ ہو۔"

نیز فرمایا:

"حق بات کہو خواہ وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو۔"

میرے عزیز محترم! میں آپ کو کتاب خدا اور سنت رسولؐ کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ انھیں صاف صاف بیان کیجیے اگرچہ تلخ ہی ہو۔ یہ بات خدا کے نزدیک، آپ کے لیے شاہد ہوگی اور اپنے پروردگار کی قسم کھا کے بتائیے کہ کیا شیعہ آپ کے نزدیک مسلمان نہیں ہیں؟ کیا آپ کا یہ عقیدہ حق ہے کہ وہ کافر ہیں؟ کیا اہل بیتؑ نبوی کے اتباع کرنے والے کہ جنھوں نے خدا کی وحدانیت و عظمت کے سلسلہ میں، تمام فرقوں سے زیادہ کام کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا مشابہت و ہم شکل ہونے اور جسمانیت سے پاک ہے وہ اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں اور دوسرے فرقوں سے زیادہ ان کی عظمت کے قائل ہیں ان کا قول ہے کہ نبی بعثت سے قبل بھی مطلق طور پر معصوم تھے، کیا آپ انھیں کافر کہتے ہیں۔

کیا جو لوگ خدا اور رسول اور مومنوں سے دوستی رکھتے ہیں، جو عترت نبیؐ کو دوست رکھتے ہیں جیسا کہ ابن منظور نے "لسان العرب" میں مادہ شیعہ کے ذیل میں تحریر کیا ہے، کیا آپ ان کو غیر مسلمان کہتے ہیں؟

کیا وہ شیعہ جو بہترین طریقے سے نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں مزید خدا اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں، اپنے اموال سے خمس نکالتے ہیں اور رمضان و دیگر ایام کے روزے رکھتے ہیں، خانۂ خدا کا حج بجا لاتے ہیں اور شعائر اللہ کی تعظیم کرتے ہیں اور اولیائے خدا کا احترام کرتے ہیں دشمنانِ خدا اور اسلام دشمن طاقتوں سے اظہار برأت کرتے ہیں، کیا وہ

آپ کے نزدیک مشرک ہیں؟

کیا وہ لوگ جو اہل بیتؑ میں سے ان بارہ اماموں کی امامت کے قائل ہیں جن سے خدا نے رجس کو دور رکھا ہے اور اس طرح پاک کیا جو کہ حق ہے اور ان کی امامت پر رسولؐ نے نص فرمائی ہے جیسا کہ اہل سنت علماء مثلاً بخاری و مسلم وغیرہ نے اپنی صحاح میں تحریر کیا ہے، وہ آپ کے نظریہ کے مطابق دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے ہیں؟

کیا وہ لوگ مسلمان ہیں جو حیات نبیؐ اور بعد نبیؐ کسی روز بھی امامت سے متعارف نہیں تھے اور اس نظریہ کو فارس (ایران) و مجوس کا نظریہ کہتے ہیں۔

کیا آپ اس وقت اس شخص کو کافر قرار دیتے ہیں جو یزید ابن معاویہ کو امام مانتا ہے کہ جس کے فسق کو ہر خاص و عام مسلمان جانتا ہے؟ اور یزید کی خست و ضلالت کے لیے تو یہی چیز کافی ہے کہ جس پر مسلمانوں کا اجماع بھی ہے کہ یزید نے بیعت لینے کے لیے مدینہ منورہ کو اپنے لشکر کے لیے مباح کر دیا تھا۔ وہ جو چاہے کرے۔ پس اس کے فوجیوں نے ہزاروں بہترین صحابہ اور تابعین کو قتل کیا اور بے شمار عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر کیا جن سے پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد کو خدا ہی جانتا ہے! اس (یزید) کے لیے تو رہتی دنیا تک یہی رسوائی اور ذلت کافی ہے کہ اُس نے جوانان جنت کے سردار کو قتل کیا اور رسولؐ کی بیٹیوں کو بے پردہ کیا۔ امام حسین علیہ السلام کے دندان مبارک کو چھڑی لگائی اور مشہور اشعار میں اس کی مثال دی۔

"اے کاش بدر میں شہید ہونے والے میرے بزرگ ہوتے تو دیکھتے"

یہاں تک کہ اس نے کہا:

"یہ تو بنی ہاشم کا بادشاہ بننے کے لیے ایک ڈھونگ تھا، ورنہ
نہ کوئی فرشتہ آیا اور نہ وحی نازل ہوئی۔"

اس کے ان اشعار سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ کیا یہ حق ہے کہ جو یزید اور اس کے باپ معاویہ پر لعنت کرے آپ اسے کافر قرار دیں؟ جو علی علیہ السلام پر لعنت کرتا تھا اور لعنت کرنے کا حکم دیتا تھا بلکہ صحابہ میں سے جو لعنت کرنے سے انکار کرتا تھا اسے تہ تیغ کر دیتا تھا جیسا کہ حجر ابن عدی کندی اور ان کے ساتھیوں کو قتل کیا۔ اس لعنت کے سلسلہ کو ایک سنت بنا دیا جو ستّر سال تک جاری رہی جبکہ وہ (معاویہ) رسولؐ کے اس قول سے واقف تھا:

"جس نے علی پر لعنت کی اس نے میرے اوپر لعنت کی اور جس نے میرے اوپر لعنت کی اس نے خدا کو برا کہا۔"

جیسا کہ اہل سنت کی صحاح میں یہ چیزیں بیان ہوئی ہیں اس کے علاوہ اس کے بہت سے ایسے افعال ہیں جو اسلام کے منافی ہیں۔ اس نے اپنے بیٹے یزید کی بیعت لینے کے لیے بہت سے نیکوکار لوگوں کو قتل کیا اور جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ حسن بن علی علیہما السلام کو قتل کرایا۔ اس کے علاوہ اس کے اور بہت سے جرائم ہیں جنھیں اہل سنت کی تاریخ نے ذکر کیا ہے جیسا کہ شیعان علی علیہ السلام نے اس کی شہادت دی ہے۔

محترم، میں آپ کے بارے میں یہ خیال نہیں کرتا ہوں کہ آپ ان تمام چیزوں سے متفق ہوں گے ورنہ اسلام پر سلام اور دنیا پر خاک۔ کیوں کہ اس کے بعد نہ دنیا میں کوئی پیمانہ ہے نہ عقل ہے نہ شرع ہے نہ کوئی منطق ہے نہ کوئی دلیل ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔"

قسم خدا کی پاکستان کے عالم ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب خلافت و ملوکیت کے صفحہ ۱۰۶ پر ابو الحسن بصری سے نقل کیا ہے کہ:

"قسم خدا کی، معاویہ میں چار خصلتیں ایسی تھیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی ہوتی تو وہی اس کی ہلاکت کے لیے کافی تھی۔

۱۔ مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر خلیفہ بن بیٹھا جب ان میں صحابہ اور بافضیلت افراد موجود تھے۔

۲۔ اپنے بعد اپنے بیٹے کو خلیفہ بنا دیا جو شراب خوار، حریر پوش اور طنبورہ بجاتا تھا۔

۳۔ زیاد کو اپنا بھائی بنایا جب کہ رسولؐ کا قول ہے کہ بچہ صاحب فراش کا ہے اور زناکار کے لیے پتھر ہے

۴۔ اس کا حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنا پس حجر اور ان کے اصحاب کے سلسلہ میں معاویہ پر ویل ہو۔ (اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا)۔"

خدا ابو الاعلیٰ مودودی پر رحم کرے کہ انھوں نے حق کا اظہار کیا اور اگر وہ چاہتے تو ان خصلتوں سے زیادہ اس کی چالیس خصلتیں گنواتے لیکن مرحوم نے معاویہ کی ہلاکت کے لیے ان چار ہی کو کافی سمجھا۔

شاید مودودی صاحب نے ان لوگوں کے جذبات کا خیال رکھا جو معاویہ کی تقدیس و احترام اور اسے رضی اللہ عنہ کہنا سیکھتے ہیں بلکہ اس کے بیٹے یزید کو بھی اسی زمرہ میں شامل کر لیتے ہیں جیسا کہ خود میں نے علمائے ہند سے سنا ہے۔ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔"

اور انھیں باتوں کے تحت میں نے بھی ان لوگوں کی جذبات کا خیال رکھا تھا جنھوں نے مجھے رسوا کرنے کے لیے دعوت دی تھی ان میں سے میں نے ایک بات بھی بیان نہیں کی تھی کیوں کہ مجھے اپنا ڈر تھا۔

محترم، میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ واضح موقف کو اختیار کریں اور اس سے خدا کی رضا کو حاصل کریں بے شک خدا حق کے بارے میں ذرا بھی شرم نہیں کرتا۔ میں آپ سے یہ نہیں چاہتا کہ آپ ان کی برابری کے قائل ہو جائیں اور نہ ہی ان کی برائیوں سے پردہ ہٹانے کے لیے کہتا ہوں۔ اس سلسلے میں ہمارے اور آپ کے لیے تاریخ کافی ہے۔

لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ خود اعتراف کریں اور اپنے پیروؤں کو یہ بتائیں کہ جو ان (معاویہ و یزید) کی امامت کے قائل نہیں ہیں اور ان سے محبت نہیں رکھتے وہی سچے اور حقیقی مسلمان ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ یہ کہیں کہ شیعہ ہمیشہ مظلوم رہے ہیں کیوں کہ انھوں نے کبھی شجرۂ ملعونہ کی امامت کا اعتراف نہیں کیا ہے جس کی مثال خداوند کریم نے قرآن مجید میں بیان فرمائی ہے۔

آپ قسم کھا کے بتائیں کہ شیعوں کی کیا خطا ہے۔ رسولؐ خود اپنے بعد اہل بیتؑ کے اتباع کا حکم دیتے ہیں یہاں تک کہ انھیں سفینۂ نوح سے تشبیہ دی جو اس پر سوار ہوا وہ نجات پائے گا اور جس نے اس سے روگردانی کی وہ ہلاک ہوگا۔ شیعوں کی کیا خطا ہے جبکہ وہ رسولؐ کے اس حکم کا اتباع کرتے ہیں:

"میں تمھارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں کتابِ خدا اور میری عترت جب تک ان سے وابستہ رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔"

اور اس بات کی گواہیاں تو اہل سنت میں بھی ہیں چہ جائیکہ شیعوں کی کتابیں۔

لیکن رسولؐ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے ان کے شکر گزار ہونے، انھیں دوسروں پر مقدم کرنے اور فضیلت دینے کے بجائے ان پر سب و شتم کرتے ہیں، انھیں کافر کہتے ہیں، ان سے بیزاری اختیار کرتے ہیں۔ یہ تو انصاف نہیں ہے اور نہ ہی یہ بات معقول ہے۔

محترم، ہمیں ان خرافات اور رکیک باتوں کو چھوڑ دینا چاہیے جو کسی دلیل و برہان پر استوار نہیں ہیں اور انھیں اپنی امت کے نوجوانوں پر تحمیل نہ کریں کہ شیعوں کا ایک خاص قرآن ہے یا شیعہ تو علیؑ کو صاحب شریعت کہتے ہیں یا عبداللہ بن سبا مذہب تشیع کا موسس ہے۔ اس کے علاوہ اور واہیات اقوال ہیں کہ جن کے بارے میں خدا گواہ ہے کہ دشمنانِ اسلام اور عدوِ اہلبیتؑ کا پروپیگنڈہ ہے جو انھوں نے اندھے تعصب اور جہالت کی بنا پر گڑھ دیا ہے۔

محترم میں آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ ہندوستان کے علماء کو جامعہ ازہر کے علماء سے کیا نسبت ہے کہ جنھوں نے مذہب شیعہ امامیہ کو قبول کرنے کا تیس سال قبل فتویٰ دیا تھا اور جامعہ ازہر کے علمائے اعلام کا یہ بھی نظریہ ہے کہ فقہ جعفری کہ جس پر شیعہ عمل کرتے ہیں وہ ان تمام مذاہب اسلامی سے زیادہ روحِ اسلام سے قریب ہے کہ جو اس کی فرع ہیں اور ان علماء کے راس و رئیس شیخ محمد شلتوت رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ پس کیا وہ علمائے اسلام اور مسلمانوں کو نہیں پہچانتے تھے؟ یا ہندوستان کے علماء ان سے اعلم و اعرف ہیں؟ میں نہیں سمجھتا کہ آپ بھی اسی کے قائل ہوں گے۔

محترم، آنکھیں آپ پر لگی ہیں، آپ کی محبت و شفقت کے لیے میرا دل کھلا ہوا ہے۔ یقیناً گزشتہ زمانہ میں میں بھی آپ کی طرح حقیقت سے بے خبر

اور اہل بیتؑ اور ان کے شیعوں سے ناواقف تھا بس خدا نے اس حق کی طرف میری راہ نمائی فرمائی کہ جس کے علاوہ گمراہی و ضلالت ہے۔ میں تعصب کی بندشوں اور اندھی تقلید سے آزاد ہو گیا ہوں اور مجھ پر یہ بات آشکار ہو گئی ہے کہ زیادہ تر مسلمان ابھی تک باطل اور پروپیگنڈے کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں ان کو حقیقت تک پہنچنے نہیں دیا جاتا تاکہ کہیں سفینۂ نجات پر سوار نہ ہو جائیں اور خدا کی رسی کو پکڑ نہ لیں جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ شیعہ اور سنی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس اختلاف کے جو خلافت کے سلسلہ میں بعد رسولؐ رونما ہوا۔ اس اختلاف کی بنیاد تمہارا اصحاب پر اعتقاد ہے جب کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں آپس میں اختلاف تھا یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے پر لعنت کرتے تھے، لڑتے تھے اور بعض، بعض کو قتل کرتے تھے۔

پس اگر شیعوں کا اختلاف انھیں دین سے خارج کر دیتا ہے تو العیاذ باللہ صحابہ اس تہمت کے زیادہ مستحق ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ اس کو برداشت کر سکیں گے، انصاف کا تقاضہ یہ ہے آپ اس سلسلہ میں یہ بھی نہ کہیں کہ وہ دین سے خارج ہیں۔ اہل بیتؑ کے تقدس و احترام کے سلسلہ میں جو شیعوں کا نظریہ ہے وہی صحابہ کے تقدس و احترام کے سلسلہ میں اہل سنت کا نظریہ ہے۔ پس دونوں موقفوں میں کتنا بعد ہے۔ اگر اس نظریہ میں شیعہ خطا پر ہیں تو اہل سنت بدرجۂ اولیٰ خطا کار ہیں کیونکہ تمام صحابہ اہل بیت کو اپنے نفسوں پر مقدم کرتے تھے اور ان پر بالکل اسی طرح درود بھیجتے تھے جس طرح نبیؐ پر بھیجتے تھے۔ ہمیں کسی ایک صحابی کے بارے میں بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ اس نے نفس کو اہل بیت مصطفیٰ پر مقدم کیا ہو یا علم و عمل کے لحاظ سے خود کو ان پر فضیلت دی ہو۔

پس اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ شیعان اہل بیتؑ سے تاریخی تاریکی کو ہٹایا جائے، ان سے قربت و بھائی چارگی قائم کی جائے، نیک اور اچھے کاموں میں تعاون کیا جائے۔ اس امت کے لیے ویسے ہی خوں ریزی اور فتنہ انگیزی کیا کم ہے۔

عنقریب خدا آپ کو ایک کلمہ پر جمع کر دے گا اور آپ کے ذریعہ افتراق کو ختم کر دے گا اور آپ کے سبب علاحدگی و سنگدلی کو دور کر دے گا۔ آپ کے باعث اس زخم کا مداوا کرے گا۔ آپ کے توسط سے اس فتنہ کی آگ کو خاموش کرے گا، آپ ہی کے وسیلہ سے شیطان اور اس کے گروہ کو رسوا کرے گا اور آپ خدا کے نزدیک کامیاب ہو جائیں گے۔ خصوصاً آپ تو اہل بیتؑ کی اولاد سے ہیں جیسا کہ میں نے سنا ہے لہٰذا ایسے اعمال بجا لائیے جن کے سبب آپ ان (اہلبیتؑ) کے ساتھ محشور ہو سکیں۔ "اور تمہاری امت ایک ہی ہے میں تمہارا رب ہوں بس میری عبادت کرو"۔ "اور کہہ دیجیے کہ نیک عمل بجا لاؤ کیونکہ خدا، اس کا رسولؐ اور مومنین تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں"۔ اور خدا ہمیں اور آپ کو توفیق عطا فرمائے اسی میں لوگوں اور شہروں کی فلاح ہے۔ خدا ہمیں اور آپ کو اپنے مخلص بندوں میں شمار کرے۔ اس خط کے ہمراہ اپنی کتاب ثم اهتديت کا ایک نسخہ بھی ارسال کر رہا ہوں۔ یہ کتاب میں نے اسی موضوع پر تالیف کی ہے۔ میری طرف سے یہ ہدیہ ہے، امید ہے کہ قبول فرمائیں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مخلص

محمد تیجانی سماوی تیونسی

(ماخوذ از اہل الذکر مرتبہ ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی)

اس (طویل) خط کی بنیاد، اساس اور جنبش قلم کا محور دراصل حق اور حق پرستی، انسانیت اور انسانی قدروں کے خلاف وہ غیر شائستہ اور مذموم گفتگو ہے جو ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی اور جماعت اسلامی کے مفتی شیخ عزیز الرحمٰن نیز ان کے گمراہ حوارئین کے درمیان انھیں کی مسجد بمبئی میں ناخوشگواری کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ اس گفتگو کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ یہ کہ مفتی صاحب نے شیعوں پر لعن طعن کی اور فرمایا کہ شیعہ مسلمان نہیں ہیں۔

۲۔ یہ کہ شیعوں کا قرآن پر ایمان نہیں ہے، وہ منافق ہیں اور تقیہ پر عمل کرتے ہیں۔

۳۔ یہ کہ شیعہ یہودی ہیں کیونکہ اس (شیعیت) کا مؤسس عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔

۴۔ یہ کہ مفتی صاحب کے حوارئین میں سے ایک (جاہل) نے کہا کہ جو شخص خلفائے راشدین کے ساتھ معاویہ اور یزید کی خلافت پر ایمان نہیں رکھتا وہ مسلمان نہیں ہے۔

۵۔ مفتی صاحب اور ان کے حوارئین ڈاکٹر سماوی کو قتل کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے تحقیق و جستجو کے بعد اپنے کو شیعیت سے متمسک کر لیا تھا اور حق کا راستہ اختیار کر لیا تھا، جب کہ اس سے قبل وہ سنی مسلمان تھے اور مالکی مسلک پر گامزن تھے۔

۶۔ موصوف کا قصور یہ بھی تھا کہ شیعیت کا تاج اپنے سر پر رکھنے کے بعد انھوں نے ایک تحقیقی کتاب لکھی جس کا نام ثُمَّ اهْتَدَيْتُ

ہے۔ اس کتاب میں قرآنی آیات، احادیث نبوی اور تاریخی حوالوں کے ذریعہ برادران اہل سنت کو اہل بیتؑ کا مسلک اختیار کرنے اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی مخلصانہ دعوت دی گئی ہے۔

بے شک اخلاقی معیار سے گرا ہوا یہ غیر شائستہ انداز گفتگو نیز مفتی صاحب اور ان کے بدبخت و بدعقیدہ حوارئین کا ارادۂ قتل ایک سنگین اور افسوسناک حادثہ ہے جو ایک غیر ملکی محقق، مؤلف اور تاریخ داں (ڈاکٹر تیجانی سماوی تیونسی) کے ساتھ ہمارے ملک ہندوستان کے شہر بمبئی میں حق کی دفاع کے سلسلے میں پیش آیا۔

ظاہر ہے کہ جس شخص کی نگاہیں قرآنی آیات، احادیث نبویؐ، اقوال ائمہؑ صراط مستقیم اور تاریخی حقائق کی نزاکتوں پر مرکوز ہو چکی ہوں، اس کا حق پرست ضمیر بھلا اس قسم کی لغو، مہمل، بے ہودہ اور بے بنیاد گفتگو کی تلخیوں کو کیسے فراموش کر سکتا ہے جبکہ وہ غیر ملکی بھی ہو۔ چنانچہ محترم ڈاکٹر سماوی نے مولوی سید ابوالحسن علی ندوی ہندی کو ہندوستان کے تمام سنی مسلمانوں کا مرجع سمجھ کر جو احتجاجی خط روانہ کیا اور انھیں تفصیلی گفتگو کے ذریعہ بمبئی میں رونما ہونے والے حادثے کی نزاکت سے آگاہ کیا وہ موصوف کا فطری عمل تھا اور انھیں یہی کرنا بھی چاہیے تھا جو انھوں نے کیا۔ یہ اور بات ہے کہ مولوی ندوی صاحب کی ذہنی عصبیت اس خط کے وزن کی متحمل نہ ہو سکی اور وہ جواب دینے کے بجائے دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنا دامن بچا گئے۔ ندوی صاحب کی اس خاموشی یا چشم پوشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر سماوی کو یہ خط اپنی کتاب "اہل الذکر" میں کھلے طور پر شائع کرنا پڑا۔

کاش ڈاکٹر سماوی اس امر حقیقت سے بھی آگاہ ہوتے کہ مولوی

ندوی کی مرجعیت محض ہندوستان کے ایک خاص فرقہ کے لیے کچھ بھی ہو سکتی لیکن ہندوستان کے حنفی، مالکی یا شافعی مسلمان نہ تو موصوف کی مرجعیت کے قائل ہیں اور نہ ہی انھیں اپنا دینی پیشوا یا مذہبی رہبر تسلیم کرتے ہیں اس لیے کہ دونوں کے عقائد مختلف ہیں اور ان کے اسلامی نظریات میں فرق ہے۔ لہٰذا ندوی صاحب کی ذات سے یہ امید رکھنا کہ وہ کسی گمراہ، پراگندہ اور غلیظ معاشرہ کے لیے کوئی اصلاحی کوشش کریں گے یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کریں گے جس کا مقصد اہل بیتؑ کے مسلک سے وابستگی کی تلقین ہو، میرے خیال میں محض خوش فہمی ہے۔

شیعیت کی مضبوط و مستحکم اساس، اس کی غیرت اور حمیت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے مفتی شیخ عزیزالرحمٰن کو ان کی اس گفتگو کا دنداں شکن جواب دیا جائے اور انھیں یہ باور کرایا جائے کہ شیعوں کے بارے میں جو آپ کا نظریہ ہے وہ مہمل اور غلط ہے۔

حالانکہ یہ مسئلہ میرا ذاتی نہیں ہے لیکن شیعیت کی دفاع کا مسئلہ ضرور ہے۔ اس لیے میرا یہ فرض بھی ہے کہ ایک شیعہ کی حیثیت سے اس مسئلے کو میں اپنا مسئلہ تصور کروں اور اس کا دفاع کروں اور مفتی شیخ عزیزالرحمٰن کو یہ بتاؤں کہ حق کیا ہے، باطل کیا ہے؟ ممکن ہے کہ موصوف میری گفتگو سے مطمئن ہو جائیں اور اگر ایسا ہوا تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری کوشش بارآور ہوئی اور میں نے باطل کے مرحب کو زیر کر کے ایک قلعہ فتح کر لیا۔ اسی امید کے ساتھ مفتی صاحب کے نام مندرجہ ذیل کھلا خط میں اپنی اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ وہ مفتی صاحب کو عقل سلیم عطا کرے اور ان کے دل و دماغ سے باطل کی تاریکی دور کر کے انھیں اہل بیتؑ کی معرفت کا نور عطا فرمائے۔

کھلا خط

بنام شیخ عزیزالرحمٰن صاحب مفتی جماعت اسلامی ہند بمبئی

محترمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی تیونسی کی طرف سے ان کی کتاب "اہل الذکر" میں مولانا سید ابوالحسن علی (علی میاں ندوی) کے نام ایک کھلا خط شائع ہوا ہے جسے میں نے بھی اپنی اس کتاب میں نقل کر دیا ہے تاکہ میرے قارئین بھی اس خط کو ملاحظہ فرما سکیں۔

مذکورہ خط میں منجملہ دیگر باتوں کے آپ نیز آپ کے حواریین اور ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی کے درمیان ہونے والی اس ملاقات کا افسوسناک تذکرہ بھی ہے جو آپ ہی کی مسجد (بمبئی) میں ہوئی۔

ڈاکٹر سماوی نے اس حادثاتی ملاقات کے ذیل میں جن تعجب خیز باتوں کا انکشاف کیا ہے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ آپ نے شیعوں پر لعن طعن کی اور فرمایا کہ شیعہ مسلمان نہیں ہیں۔
۲۔ آپ نے فرمایا کہ شیعوں کا قرآن پر ایمان نہیں ہے، وہ منافق ہیں اور تقیہ پر عمل کرتے ہیں۔
۳۔ آپ نے فرمایا کہ شیعہ یہودی ہیں کیونکہ اس کا مؤسس عبداللہ بن سبا

یہودی تھا۔

۴۔ آپ کے حوارئین میں سے کسی نے فرمایا کہ جو شخص خلفائے راشدین کے ساتھ معاویہ اور یزید کی خلافت پر ایمان نہیں رکھتا وہ مسلمان نہیں ہے۔

۵۔ آپ اور آپ کے حوارئین ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی تیونسی (جو آپ کے مہمان بھی تھے اور غیر ملکی بھی) کو قتل کرنا چاہتے تھے جبکہ اس سے قبل وہ سنی تھے اور مالکی مسلک سے وابستہ تھے، نیز آپ کی نظر میں ان کا قصور یہ بھی تھا کہ انھوں نے شیعیت اختیار کرنے کے بعد ایک کتاب "ثم اہتدیت" کے نام سے لکھی ہے، جس میں برادران اہل سنت کو اہل بیتؑ کا مسلک اختیار کرنے کی مخلصانہ دعوت دی گئی ہے۔

محترم! مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ نمبر (۱) سے (۴) تک شیعوں اور شیعیت کے خلاف جن لغو، مہمل اور مفروضہ باتوں کا اظہار آپ نے اپنی زبان سے کیا ہے وہ ازل ہی سے آپ کے اعتماد میں پیوست ہیں اور ان پر یقین کا باطل عقیدہ آپ کو اپنے اسلاف سے وراثت میں ملا ہے۔ لیکن شاید آپ کو یہ نہیں معلوم کہ وقت کے ساتھ وقت کی رفتار بھی بدلتی ہے، قدریں بھی بدلتی ہیں، تہذیب و تمدن بھی بدلتا ہے، انسانی معاشرہ بھی بدلتا ہے اور انسان کے خیالات و نظریات بھی بدلتے ہیں۔ اور جو شخص اس تغیر و تبدل سے بیگانہ ہے وہ اس گزرتی ہوئی بیسویں صدی کا "ابوجہل" ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا دور تحقیق و جستجو کا دور ہے۔

ترقی و بلندی کا دور ہے، تجلی و روشنی کا دور ہے اور اس دور کا انسان حقائق و معارف تک پہنچنا چاہتا ہے، پستی سے بلندی کی طرف پرواز کرنا چاہتا ہے، اندھیرے سے روشنی کی طرف بھاگنا چاہتا ہے، زمین کی سطح سے اٹھ کر افلاک کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ وہ خوش نصیب ہیں جن کی آنکھوں میں صداقت و معرفت کا نور ہے اور وہ بدبخت ہیں جو باطل کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔

یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم ایک ایسے جمہوری ملک کے باشندے ہیں جہاں دیگر حقوق کے ساتھ ساتھ مذہبی حقوق کا بھی خیال رکھا جاتا ہے اور اس کی اشاعت بھی اس کے بنیادی دستور میں شامل ہے، بشرطیکہ وہ مفاد عامہ اور تہذیب و شائستگی کے دائرے میں ہو۔ یہاں ہر عقیدے اور ہر مکتب فکر کے مفکرین و دانشور اپنے خیالات کا اظہار تحریراً و تقریراً کرتے رہتے ہیں اور سنجیدہ و تعلیم یافتہ طبقہ ان پر غور کر کے اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور عوام ایسی ہی رائے کو قابل اعتنا بھی سمجھتے اور عقل سلیم کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ کسی شاعر، مصنف، مقرر، مفکر یا گفتگو کرنے والے شخص کی ذات یا اس کے مسلک پر غور کیے بغیر یہ دیکھا جائے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس کا دعویٰ مدلل ہے یا غیر مدلل؟ کیونکہ ہر وہ بے دلیل بات جسے عقل قبول کرنے سے قاصر ہو کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ شیعوں اور شیعیت کے بارے میں جو کچھ آپ نے ڈاکٹر سماوی سے فرمایا ہے، اس کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟ کیا آپ کی اس گستاخی اور بے ہودگی سے شیعوں کے جذبات مجروح نہیں ہوئے؟ کیا آپ نے اس تہمت کی حقیقت معلوم کرنے کی کبھی کوئی سعی کی ہے؟

کیا آپ نے اپنی ان کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جن میں اکابر علمائے اہلِ سنت نے اپنے ائمہ اربعہ کی فقہ کی بہ نسبت فقہ جعفری یعنی "شیعہ فقہ" کو زیادہ معتبر اور قدیم ترین تسلیم کیا ہے؟ اگر آپ کو علاوہ اس کے کہ "شیعہ مسلمان نہیں ہیں" کچھ نہیں معلوم تو شیعیت کی سرگزشت اور حقیقت کو ہمارے قلم کی زبان سے سنیے، سمجھیے، غور کیجیے اور پھر بتائیے کہ تردید کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟ مگر شرط یہ ہے کہ میری تحریر کو پڑھنے سے پہلے تعصب کی عینک اتار دیجیے اور اپنے دل و دماغ کو بغض، کینہ اور عداوت کے گرد و غبار سے صاف کر لیجیے۔

(۱) یہ کہ بقول ڈاکٹر سماوی، آپ نے شیعوں پر لعن طعن کی اور فرمایا کہ شیعہ مسلمان نہیں ہیں۔

محترم! اس کا جواب تحریر کرنے سے پہلے میں آپ پر یہ واضح کر دوں کہ خوش قسمتی سے میں بھی شیعہ ہوں اور ایک شیعہ ہونے کی حیثیت سے مجھ پر بھی یہ فرض ہے کہ میں آپ سے سوال کروں کہ آخر کیوں؟ کیا قرآن میں کہیں یہ صراحت ہے کہ شیعہ مسلمان نہیں ہیں؟ کیا اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فرمایا ہے؟ کیا آپ کی اس بات میں کوئی تاریخی وزن ہے؟ اگر یہ کچھ نہیں ہے تو پھر کیا آپ پر الہامی کیفیت طاری ہوئی ہے؟ یا آسمان سے کوئی وحی نازل ہوئی ہے جس میں آپ سے یہ درخواست کی گئی ہو کہ آپ اعلان کر دیجیے کہ شیعہ مسلمان نہیں ہیں۔ اگر یہ بھی نہیں ہے تو کیا آپ شیعوں کو محض اس بنیاد پر دائرہ اسلام سے خارج کرتے ہیں کہ وہ رسول اسلام اور اہل بیتؑ کا اتباع کرتے ہیں اور اہل بیتؑ رسالت سے آپ کی چودہ سو سال پرانی دشمنی ہے بالکل اسی

طرح کہ جس طرح آپ کے خلفاء (ابوبکر، عمر، عثمان، معاویہ اور یزید) کو تھی، جنھوں نے اپنی منافقت، دشمنی، اور ہوسِ اقتدار کی بنا پر خانوادۂ نبوت کو تاراج اور تباہ و برباد کر دیا۔ یقین مانیے کہ یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ قرآن، پیغمبری حدیثیں اور تاریخیں اس امر کی گواہ ہیں۔

جناب والا! میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جو مفروضہ باتیں آپ نے وثوق و اعتماد کے ساتھ شیعیت پر اتہام کی شکل میں ڈاکٹر سماوی کے روبرو پیش کی ہیں وہ نئی نہیں ہیں بلکہ بہت پرانی ہیں اور اس قسم کے الزامات شیعوں پر عائد کیے جاتے رہے ہیں اور اہل حق کی طرف سے ان کے جوابات دیے جاتے رہے ہیں۔

بہرکیف! شیعہ مسلمان ہیں یا نہیں؟ اس کے ذیل میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ شیعیت کو مسلمانوں میں روشناس کرانے کا ذمہ دار کون ہے اور اس کی ابتدا کب سے ہوئی؟

تاریخیں یہ بتاتی ہیں کہ شیعیت کو مسلمانوں میں روشناس کرانے کی ذمہ داری رسول اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر ہے اور اس کی ابتدا آپ ہی کی حیاتِ طاہرہ میں ہوئی۔ جس کی تصدیق مندرجہ ذیل احادیث سے ہوتی ہے اور یہ وہ حدیثیں ہیں جنھیں علمائے اہل سنت نے بھی اپنی معتبر کتابوں میں بیان کیا ہے۔

چنانچہ علامہ سیوطی اپنی تفسیر درمنثور میں رقمطراز ہیں کہ:

"جناب جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں حضرت علیؑ آتے ہوئے دکھائی دیے۔ آنحضرتؐ نے انھیں آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: قسم ہے

اس ذات برحق کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، یقیناً علیؑ اور ان کے شیعہ قیامت میں کامیاب و رستگار ہیں[۱]۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا یقیناً وہی لوگ بہترین خلائق ہیں۔"

علامہ ابن حجر مکی فرماتے ہیں:

"رسولؐ اللہ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ خدا نے تم کو، تمھاری ذریت کو، تمھاری نسل کو اور تمھارے شیعوں کو بخش دیا ہے۔"[۲]

پھر فرماتے ہیں:

"رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اے علیؑ! تم اور تمھارے شیعہ سب بہشت میں جائیں گے۔"[۲]

اسلامی لغت "نہایہ" میں ابن اثیر لفظ "قمح" کی تشریح کے ذیل میں رقمطراز ہیں کہ آنحضرتؐ نے علیؑ سے فرمایا کہ تم اور تمھارے شیعہ خدا کے حضور میں اس طرح آؤ گے کہ تم خدا سے خوش ہوگے اور خدا تم سے راضی ہوگا اور تمھارے دشمن یوں آئیں گے کہ ان کے ہاتھ پسِ گردن بندھے ہوں گے اور خدا ان پر بے حد غضبناک ہوگا۔ اس کے بعد حضورؐ نے اپنے دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے لے جا کر عملی طور پر بتایا کہ یوں ہاتھ پسِ گردن بندھے ہوں گے

صاحب نہایہ لفظ "شیعہ" کی صراحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

---

[۱] تفسیر در منثور ج ۶ ص ۳۷۹ مطبوعہ مصر ۱۳۱۴ھ [۲] صواعق محرقہ ص ۹۶

کہ شیعہ کا لفظ حضرت علی اور ان کی اولادوں کے دوستوں اور پیروی کرنے والوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

علامہ سیوطی، علامہ ابن حجر مکی اور ابن اثیر کی تحریروں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ لفظ شیعہ کو عام مسلمانوں میں متعارف کرانے والی ذاتِ اولین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی۔ اور۔ شیعہ وہ ہیں جو حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولادوں سے محبت رکھتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیعہ حضرات حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولادوں سے کیوں محبت کرتے ہیں؟ ان سے والہانہ وابستگی کے علل و اسباب کیا ہیں؟

اس کے جواب میں یوں تو کئی قرانی آیتیں اور بے شمار حدیثیں موجود ہیں مگر چونکہ اختصار بھی مدنظر ہے اس لیے ہم فی الحال صرف آیۂ مودت اور حدیث ثقلین پر اکتفا کرتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے کہ:

قُلْ لَّاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى

یعنی "اے محمد! تم اپنی امت سے کہہ دو کہ کارِ نبوت (ہدایت) کے بدلے میں تم سے کوئی اجر نہیں طلب کرتا علاوہ اس کے کہ تم میرے قرابت داروں سے محبت کرو (شوریٰ۔ ۲۳)

یہ آیت اہل بیتِ رسولؐ کی شان میں نازل ہوئی ہے جس میں خداوند عالم رسولؐ کی آل سے محبت کو لازمی قرار دیتا ہے[۱]۔ رسولؐ سے کسی شخص نے

---

[۱] ارجح المطالب ص ۶۶، کوکب دری ص ۱۳۳، م ۳۲

پوچھا کہ اے حبیبِ خدا! وہ کون ہیں جن کی محبت خدا نے ہم پر واجب کی ہے؟ فرمایا: علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے فرزندان حسنؑ و حسینؑ۔ پھر فرمایا: جو شخص میرے اہل بیت پر ظلم کرے گا اور انھیں اذیت دے گا اس پر بہشت حرام ہے۔[1]

محترم! جب آپ تاریخ سے پوچھیں گے کہ اہل بیتؑ رسولؐ پر ظلم ڈھانے والے اور انھیں اذیت دینے والے کون کون ہیں؟ جن پر اللہ نے بہشت کو حرام کر دیا ہے تو وہ آپ کو یہ ضرور بتائے گی کہ حیات پیغمبرؐ میں حکم رسالت کی نافرمانیوں کے مرتکب کون لوگ تھے اور بعد وفات رسولؐ کن کن لوگوں نے اہل بیتؑ رسالت پر مظالم کے پہاڑ توڑے انھیں اذیتیں دیں، ان کے حقوق کو غصب کیا۔ اور جب آپ پر ساری حقیقت آشکار ہو جائے گی تو میرا دعویٰ ہے کہ آپ اپنے خلفاء کا نام لیتے ہوئے شرم محسوس کریں گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ۝ (مومنون ۷۴)

"جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ صراط (سیدھی راہ) سے الگ ہیں۔"

صاحب کوکب دری کا کہنا ہے کہ یہاں صراط سے مراد اہل بیتؑ کی محبت اور ولایت ہے۔[2] علامہ فخر الدین رازی نے اس آیت (آیۂ مودت)

---

[1] تفسیر کشاف علامہ زمخشری ج ۳ ص ۶۷ مطبوعہ مصر، صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد، در منثور وغیرہ [2] کوکب دری ص ۱۳۳ (م) ۳۱

کے سلسلے کی تمام روایتوں کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ:

"جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ حضرت رسولؐ خدا کے قرابت دار ان کے اہل بیتؑ علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہی ہیں تو واجب ہے کہ ان کی خاص طور پر تعظیم کی جائے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہی آیۂ المودۃ فی القربیٰ، دوسرے اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت رسولؐ خدا، انھیں (اہل بیتؑ) کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ فاطمہ زہراؑ کے لیے فرمایا کہ فاطمہؑ میرا پارۂ جگر ہے جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔ اور متواتر حدیثوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت رسولؐ خدا، حضرت علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو دوست رکھتے تھے تو پوری امت اسلام پر ان کی محبت واجب ہو گئی کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ لوگو! تم (سب) رسولؐ کی پیروی کرو تاکہ ہدایت پاؤ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ رسول کی مخالفت کرتے ہیں انھیں عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ تیسری بات یہ ہے کہ آل محمدؐ کے لیے دعا کرنا بہت بڑا منصب ہے۔ اسی وجہ سے اس دعا کو یہ درجہ دیا گیا ہے کہ نماز میں تشہد کا خاتمہ اسی پر ہو۔ غرض کہ یہ سب باتیں ثابت کرتی ہیں کہ آل محمدؐ کی محبت ہر مسلمان پر واجب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے کہ اگر آل محمدؐ کی دوستی سے انسان رافضی ہو جاتا ہے تو دنیا بھر کے لوگ گواہ رہیں کہ میں سب سے بڑا رافضی ہوں۔"[1]

عزیز گرامی! غالباً آپ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہوں گے کہ شیعہ اسی قرآنی

---

[1] تفسیر کبیر، علامہ فخر الدین رازی مطبوعہ استنبول ج ۷ ص ۴۰۶، صواعق محرقہ ص ۱۰۱، ارجح المطالب باب ۲ ص

آیت پر عمل پیرا ہو کر اہل بیتؑ سے والہانہ محبت رکھتے ہیں اور اجر رسالت ادا کرتے ہیں۔ اب آپ خود منصفانہ طور پر اپنے دل و دماغ میں یہ فیصلہ کریں کہ کیا آل محمدؐ سے محبت رکھنے والے اور اجر رسالت ادا کرنے والے مسلمان نہیں ہیں؟ کیا آپ انھیں دائرۂ اسلام سے خارج کر سکتے ہیں؟

آئیے اب حدیث ثقلین پر غور کریں جس میں پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے کہ:

"مسلمانو! میں تمھارے درمیان دو گراں بہا چیزیں چھوڑ رہا ہوں، ایک قرآن اور دوسرے میرے اہل بیتؑ ہیں۔ یہ دونوں عظمت میں مساوی ہیں اور اس وقت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر (بروز قیامت) وارد نہ ہوں۔ اگر تم ان (دونوں) سے متمسک رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔"

یہ حدیث مسلسل و متواتر ہے۔ اس کو ساٹھ راویوں نے بیان کیا ہے اور ۱۸۵ علماء نے اس حدیث کی صحت کی تصدیق کی ہے۔ ان تمام راویوں اور علماء کی فہرست کا پیش کیا جانا اس خط میں ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا چند راویوں اور کتابوں کے ناموں پر اکتفا کرتا ہوں جو درج ذیل ہیں تاکہ آپ پر اس حدیث کی صحت، تواتر اور اہل بیت کی عظمت و تقدیس واضح ہو جائے۔

علمائے کرام

(۱) ابو جعفر محمد بن جریر طبری (۲) ابو عوانہ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم اسفرائنی (۳) ابو عمر احمد بن محمد بن عبد ربہ (۴) محمد بن سلیمان بن

داود بغدادی (۵) ابو بکر احمد بن حسین بن علی البیہقی (۶) ابو اسحاق احمد بن محمد بن ابراہیم ثعلبی (۷) ابو عامر عبدالملک العبدری (۸) سبط ابن جوزی (۹) محمد بن سعد ازہری (۱۰) جلال الدین سیوطی (۱۱) شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۲) سلیمان بن ابراہیم مفتیٔ اعظم قسطنطنیہ (۱۳) امام احمد بن حنبل وغیرہ

اسمائے کتب

صحیح مسلم، مسند احمد بن حنبل، سنن ترمذی، خصائص نسائی، مستدرک علی الصحیحین، کتاب المناقب اخطب خوارزم، کتاب المناقب ابن المغازلی، احیاء الملت جلال الدین سیوطی، در منثور سیوطی، خواص الامہ ابن جوزی، مشکوٰۃ المصابیح، ریاض النظرہ، جامع الاصول، اسد الغابہ، تاریخ ابن کثیر، ازالۃ الخفاء، عقد الفرید، حلیۃ الاولیاء، کاشف شرح مشکوٰۃ اور مدارج النبوہ وغیرہ۔

علمائے کرام اور کتابیات کی اس مختصر فہرست میں نہ کوئی شیعہ عالم شامل ہے اور نہ ہی کوئی شیعہ کتاب، بلکہ یہ وہ سنی علماء اور سنی کتابیں ہیں جن کی عظمت سے انکار کرنے والا شیعہ ہو یا سنی جاہل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کتابوں میں بھی آل رسولؐ کی عظمت و فضیلت کے منافی بعض روایتیں شامل ہو گئی ہیں جو اپنی عدم صحت کی بنا پر ناقابل قبول اور قابل اخراج ہیں۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران)

"خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔"

علامہ فخر الدین رازی اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"ابو سعید خدری نے روایت کی ہے کہ حضرت رسول خدا صلعم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں تم لوگوں میں دو بڑے ذریعے چھوڑے جاتا ہوں ایک قرآن مجید جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی رسی ہے، دوسرے میری عترت اور اہل بیتؑ [۱]"

امام ترمذی نے زید بن ارقم سے روایت کی ہے کہ:

"حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم میں وہ چیزیں چھوڑے جاتا ہوں کہ جب تک تم ان کی پیروی کرتے رہو گے میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو سکتے۔ ایک قرآن مجید جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی رسی ہے دوسرے میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی الگ نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچ جائیں۔ دیکھنا ہے کہ تم میرے بعد ان کی پیروی کس طرح کرتے ہو [۲]"

آیۂ مودت، حدیث ثقلین اور تاریخی تجزیہ سے مندرجہ ذیل باتیں منکشف ہوئیں:

(الف) "لفظ شیعہ" اور شیعیت کے مقصد و طرز عمل کو مسلمانوں کے درمیان روشناس کرانے کی ذمہ داری رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے۔

(ب) یہ کہ شیعہ جنتی ہیں اور اہل بیتؑ کے ساتھ جنت میں جائیں گے۔

(ج) اللہ نے (قرآن میں) اہل بیتؑ سے محبت کا حکم دیا ہے جو ہر مسلمان پر فرض ہے۔

---

[۱] تفسیر کبیر ج ۱ ص ۴۴، ترمذی ج ۲ ص ۲۲۱، تفسیر نیشاپوری ج ۱ ص ۳۴۹، شرح مشکوٰۃ ج ۴ ص ۶۷۷ [۲] مشکوٰۃ ج ۸ ص ۱۳۳

(د) یہ کہ رسول اللہ صلعم نے کارِ رسالت، تبلیغ نبوت اور اسلام کی خدمت کا مسلمانوں سے کوئی اجر نہیں مانگا بجز اس کے کہ آپؐ کے اہل بیتؑ سے محبت کی جائے۔

(س) قرآن و اہل بیتؑ کی عظمت مساوی ہے اور وہ ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہیں کہ انھیں قیامت تک جدا نہیں کیا جا سکتا۔

(ف) قرآن و اہل بیتؑ سے تمسک ضروری ہے اور یہی وہ عمل ہے جو رسولؐ اللہ کے ساتھ مسلمانوں کو حوض کوثر پر مجتمع کرے گا۔

(ی) یہ کہ قرآن و اہل بیتؑ سے تمسک رکھنے والا کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔

محترم عزیز الرحمٰن صاحب! میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر پورے وثوق و اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ شیعہ احکامات الٰہی اور ارشادات نبوی کے مکمل طور پر پابند ہیں۔ قرآن و اہل بیتؑ سے متمسک ہیں، آلِ رسولؐ کے شیدا ہیں اور ان سے محبت رکھتے ہیں، خدا کی وحدانیت اور رسولؐ کی رسالت پر ان کا عقیدہ ہے۔ نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، خمس ادا کرتے ہیں، اہل بیتؑ کے دوست ہیں اور دشمنانِ رسول و آلِ رسولؐ و منافقین اسلام پر کھل کر لعنت کرتے ہیں۔

عزیز گرامی! شیعوں کو غیر مسلم قرار دینا یا انھیں دائرۂ اسلام سے خارج کرنا آپ، آپ کے حواریین یا آپ کے مسلک کے افراد کے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ شیعہ جن امور اسلامی پر کاربند ہیں وہی عین اسلام ہے جو اپنے نیک بندوں کو جنت کی بشارت دیتا ہے اور اس سے انحراف کا نظریہ قطعی طور پر غیر اسلامی ہے جو انسان کو عذاب الٰہی اور دوزخ کی

طرف لے جاتا ہے۔ اب آپ خود سوچیں کہ اپنی مسلمانی کے ساتھ آپ جس راستے پر گامزن ہیں وہ کس طرف جاتا ہے؟

(۲) آپ نے یہ فرمایا ہے کہ شیعوں کو قرآن پر ایمان نہیں۔ وہ منافق ہیں اور تقیہ پر عمل کرتے ہیں۔

سبحان اللہ! "نیا جال لائے پرانے شکاری"

حضور! آپ نے یہ کیسے باور کر لیا کہ قرآن پر شیعوں کا ایمان نہیں ہے، کیا اس ضمن میں کوئی ایسا دستاویزی ثبوت آپ کے "کشکول تعصب" میں ہے جو قرآنی، پیغمبری یا تاریخی ہو؟ یا آپ نے محض جماعت اسلامی کے مفتی کی حیثیت سے بہ زعم خود شیعوں کے خلاف یہ تہمتی فتویٰ صادر فرما دیا ہے؟ یا پھر عداوت و نفرت کا یہ ردِّ عمل ہے؟... آخر کیا ہے؟ اگر آپ کا اشارہ اس "روداد مفروضہ" کی طرف ہے کہ شیعہ قرآن میں تحریف کے حامی یا قائل ہیں تو یہ داستان بہت پرانی ہے جسے اکثر و بیشتر دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے آپ حضرات دہرایا کرتے ہیں اور شیعوں کی طرف سے اس کا منہ توڑ جواب دے دیا جاتا ہے لیکن... خدا بھلا کرے ہٹ دھرمی کا کہ وہ آپ حضرات کو چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتی۔

تحریف قرآن کی بحث ایک طولانی بحث ہے جس کا متحمل یہ خط نہیں ہے ورنہ ایک کتاب بن جائے گا۔ فی الحال آپ کی خدمت میں یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہرگز نہیں ہیں بلکہ ان کا تو یہ عقیدہ ہے کہ جو قرآن اس وقت موجود ہے وہ کلام الٰہی ہے اور اس میں

کوئی لفظ ایسا شامل نہیں ہے جو پروردگار عالم کی جانب سے رسولِ اکرمؐ پر وحی کے ذریعہ نازل نہ ہوا ہو۔ اس کے برعکس شیعہ اس امر حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتے کہ قرآن میں تحریف کے ذمہ دار آپ کے اکابرین صحابہ ہیں جن کی اس ناروا کاوش کو آپ ہی کے علماء نے قلم بند کر کے اپنی کتابوں میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطی اور امام راغب اصفہانی ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ:

"ابن عمر نے کہا کہ کوئی تم میں سے یہ کہے کہ میرے پاس مکمل قرآن ہے تو اسے کیا معلوم کہ مکمل قرآن کتنا ہے۔ قرآن کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا ہے۔ ہاں، وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے پاس بس اتنا ہی قرآن ہے جتنا کہ اب ظاہر ہے[۱]۔"

جیسا کہ: "حضرت عمر نے فرمایا کہ قرآن میں دس لاکھ ستائیس ہزار کلمات تھے اور موجودہ قرآن میں ۷۷ ہزار نو سو چونتیس ہیں۔"[۲]

حضرت عمر کے اس قول کا مطلب یہ ہوا کہ ۹ لاکھ ۴۹ ہزار ۶۶ کلمات قرآن سے خارج کر دیے گئے۔

جیسا کہ: "حضرت عمر نے عبد الرحمٰن بن عوف سے فرمایا کہ آیت ان جاھدوا کما جاھدتم اول مرۃ ... مجھے قرآن میں نہیں ملتی، کیا تو بھی اس آیت کو نہیں پاتا۔ عبد الرحمٰن نے کہا یہ آیت بھی انھیں آیات کے ساتھ نکال دی گئی جو قرآن سے نکالی گئی ہیں[۳]۔"

---

[۱] در منثور جزء الخامس ص ۱۶۹ و محاضرات امام راغب [۲] الاتقان ج ۱ ص ۷۲ [۳] تفسیر اتقان ص ۲۱۷

جیساکہ: "حضرت عثمان نے فرمایا کہ مصحف (قرآن) میں بڑی غلطیاں ہیں، جسے عرب کے اہل زبان خود درست کر لیں[1]۔ اس زمانے پر ان سے کسی نے کہا کہ حضور آپ ہی درست کر دیجیے تو انھوں نے کہا: جانے بھی دو...[2]"

حضرت عثمان کا یہ کہنا کہ قرآن میں بڑی غلطیاں ہیں جنھیں عرب کے زبان داں درست کر لیں، انتہائی تعجب خیز و حیرت انگیز ہے۔ معاذاللہ کسی بشر کی کیا مجال کہ وہ کلام الٰہی کی اصلاح کرے۔ شاید یہی وہ تصور رہا ہوگا جس سے حضرت عثمان پر لرزہ طاری ہو گیا ہوگا اسی لیے انھوں نے فرمایا کہ "جانے بھی دو" یعنی غلطی ہے تو رہنے دو۔

جیساکہ: "عروہ سے مروی ہے کہ میں نے آیت ان الذین آمنوا والذین ھادوا والصابئون اور آیت والمقیمین والموتون الزکوٰۃ اور آیت ان ھذٰن الساحران کی غلطی کی طرف حضرت عائشہ کو متوجہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ کاتبوں نے قرآن میں غلط لکھ دیا ہے[3]۔"

جیساکہ: "علامہ سیوطی تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن میں آیت مثل نورہ المومن کمشکوٰۃ کی جگہ مثل نورہ کر دیا گیا ہے[4]۔"

جیساکہ: "حضرت ابوبکر و عمر مالک یوم الدین کے بجائے مَلِكِ

---

[1] تفسیر کبیر ج ۶ ص ۶۹ مطبوعہ مصر [2] تفسیر باب التاویل ج ۱ ص ۵۱، [3] تفسیر درمنثور سیوطی ج ۲ ص ۲۴۶ مطبوعہ مصر، تفسیر معالم التنزیل ص ۵۷۹، مطبوعہ بمبئی۔

[4] تفسیر اتقان ج ۱ ص ۱۸۶

یوم الدین پڑھا کرتے تھے[1]۔"

جیساکہ: "حضرت عمر اھدنا الصراط المستقیم میں 'الصراط' کو سین سے یعنی "السراط" پڑھا کرتے تھے[2]۔"

جیساکہ: "حضرت عمر غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کے بجائے غیر المغضوب علیھم و غیر الضالین پڑھا کرتے تھے[3]۔"

جیساکہ: "ابن مسعود "سورۂ فاتحہ" اور "معوذتین" کے داخل قرآن ہونے سے انکار کرتے ہیں[4]۔"

جیساکہ: "امام بغوی تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن سے بنی امیہ اور قریش کے ستر منافقوں کے نام نکال دیے گئے ہیں[5]۔"

جیساکہ: "عبداللہ ابن عمر سورۂ قل اعوذ برب الناس اور قل اعوذ برب الفلق کو داخل قرآن نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ سورے تعویذ کے لیے نازل ہوئے ہیں[6]۔"

جیساکہ: "سورہ بینہ کا آخری حصہ قرآن میں نہیں ہے[7]۔"

جیساکہ: "اتقان سیوطی میں ہے کہ عثمان نے مصحف کو تغیر دیا[8]۔"

جیساکہ: "عثمان پر صحابہ ناراض ہوئے اور (غصہ میں) کہا کہ تم نے قرآن

---

[1] تفسیر درمنثور ج ۱ ص ۶۔ [2] تفسیر درمنثور ج ۱ ص ۴ [3] بخاری پ ۱۹ ص ۴۳ مطبوعہ احمدی پریس [4] تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۶۹ [5] تفسیر معالم التنزیل۔ تفسیر درمنثور ج ۶ ص ۴۱۶ [6] صحیح بخاری پ ۱ ص ۱۰ [7] تفسیر درمنثور ج ۶ ص ۳۷۸

[8] اتقان سیوطی ج ۲ ص ۲۵

کے "حروف" کو "ایک حرف" کر دیا۔[1]

جیساکہ: "ثوری سے روایت ہے کہ حضرت رسولؐ خدا سے بہت سے صحابی قرآن پڑھا کرتے تھے جو جنگ میسلمہ میں مارے گئے تو بہت سے حروف قرآن ضائع ہو گئے"۔[2]

جیساکہ: "حذیفہ سے مروی ہے کہ میں نے سورۂ "احزاب" کو رسول اکرمؐ سے پڑھا تھا لیکن اس کی ستر آیتیں بھول گیا۔ پھر وہ نہ مل سکیں"۔[3]

جیساکہ: "حذیفہ نے کہا کہ جس کو تم سورۂ توبہ کہتے ہو، دراصل وہ سورۂ عذاب ہے، قسم خدا کی اس سورہ نے تو صحابہ میں سے کسی کو بغیر اس کے معائب بیان کیے چھوڑا ہی نہیں۔ تم اس سورہ کا چوتھائی حصہ بھی نہیں پڑھتے جو ہم پڑھا کرتے تھے"۔[4]

جیساکہ: "عائشہ سے مروی ہے کہ رسولؐ خدا کے زمانہ میں سورۂ احزاب میں دو سو آیتیں تھیں جو پڑھی جاتی تھیں مگر جب عثمان نے قرآن لکھوایا تو ...... اب جتنی ہیں وہی مل سکیں۔ اور آیت رجم قرآن کا حصہ ہے مگر اب موجودہ قرآن میں نہیں ہے"۔[5]

جیساکہ: "عائشہ فرماتی ہیں کہ خدا نے آیۂ کبیر اور آیۂ رجم نازل فرمائیں اور دونوں آیتیں لکھی ہوئی میرے تکیہ کے نیچے رکھی تھیں جنھیں بکری کھا گئی"۔[6]

---

[1] ازالۃ الخفا ج۲ ص ۱۴۳ [2] حد سارق ص ۵۰ [3] تفسیر در منثور ج۵ ص ۱۸ بحوالہ بخاری [4] در منثور ص ۲۰۸ و تفسیر اتقان ج۱ ص ۵۴۔ ۵۵ [5] صحیح بخاری ۴، باب رجم ص ۱۱۹، مسند امام حنبل ج۱ ص ۲۳، ۴۰، ۵۵، در منثور ۵ ص ۱۸۰، تفسیر اتقان ج۲ ص ۸۳، موطا امام مالکؒ محاضرات امام راغب اور فتح الباری وغیرہ [6] تفسیر حقانی ص ۶۳ و محاضرات امام راغب۔

محترم مفتی صاحب! یہ لحاظ اختصار تحریف کے سلسلہ میں جو چند تاریخی نمونے میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیے ہیں وہ آپ ہی کے مورخین، مفسرین، مفکرین اور علماء کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں اور ان تاریخی نمونوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان جو آپ اور آپ کے ہم مسلک افراد کی نظر میں تمام خطاؤں سے مبرا و منزہ ہیں۔ قرآنی آیتوں کے ضائع ہو جانے کلام الٰہی میں تغیر و تبدل اور قرآن میں غلطیوں کے قائل ہیں۔ ازواجِ رسولؐ میں حضرت عائشہ نے تو "چونی بھوسی" کے بجائے دو قرآنی آیتیں بکری کو کھلا دیں۔ ان کے علاوہ آپ جن ہستیوں کو دینی اور دنیوی اعتبار سے قابل عظمت سمجھتے ہیں ان میں عبداللہ بن عمر، ابن مسعود، ابن عباس، زید بن ثابت، امام ابوحنیفہ، امام فخرالدین رازی، ابوموسیٰ اشعری اور عبدالرحمٰن بن عوف وغیرہ سب کے سب تحریف قرآن کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں آپ سے کہوں کہ آپ اپنے خلفاء اور دینی و دنیوی پیشواؤں کی ان غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک مدت سے یہ کہہ کر کہ شیعوں کا قرآن پر ایمان نہیں ہے اس شرمناک الزام کو شیعوں کے سر تھوپنے کے لیے اپنی کوششوں میں مصروف ہیں مگر بس نہیں چلتا۔ خدا کے لیے ہٹ دھرمی چھوڑ کر راہ راست اختیار کیجیے جو دنیا و آخرت دونوں کے لیے آپ کے حق میں باعث شرف ہے۔

(۲) "ب" آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ شیعہ منافق ہیں اور تقیہ پر عمل کرتے ہیں۔

آئیے دیکھیں کہ تقیہ کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے۔

(پہلی آیت) لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من

دون المؤمنین ومن یفعل ذٰلك فلیس من الله فی شیئ الا ان تتقوا منهم تقٰة (آل عمران ۲۸)

"مومنین کو چاہیے کہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا تو اللہ سے کچھ سروکار نہیں مگر اس تدبیر سے کسی طرح ان سے بچنا چاہو تو خیر۔"

اس آیت کی تفسیر میں علامہ بیضاوی رقم طراز ہیں کہ:

"مومنین کو چاہیے کہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ اس آیت میں مومنین کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ وہ اپنی سابق رشتہ داری یا زمانۂ جاہلیت کی محبت والفت وغیرہ کی وجہ سے اب بھی ان کافروں سے دوستی قائم رکھیں تا کہ ان کی دوستی بھی خدا کی راہ میں ہو۔ مگر یہ کہ ان کافروں سے بچنا چاہو۔ یعنی ان سے تمھیں کسی ایسی بات کا خوف ہو جس سے بچنا واجب ہو، تب ان سے دوستی ضرور کر لو) اور یہ فعل حرف مِن کے ساتھ متعدی ہوتا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم لوگ ان (کافروں) سے ڈر یا خوف کرو، اس کے بعد خدا نے فرمایا ہے تقاۃ مگر امام یعقوب کی قرأت میں یہ لفظ تقیۃ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ہر وقت یعنی ظاہر میں اور باطن میں بھی کافروں کی دوستی سے بچیں سوائے خوف کے وقت کے، کیونکہ جب کافروں سے کسی بات کا ڈر ہو تو اس وقت ان سے دوستی کرنا جائز ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ وسط میں رہو اور کنارے ہو کر چلو۔ یعنی ظاہر تو یہ کرو کہ تم ان ہی لوگوں کے درمیان ہو مگر اپنا روش سب سے الگ رکھو، اس طرح وہ لوگ تم کو اپنا سمجھیں گے بھی اور تم ان کے مذہب

میں شامل بھی نہ ہو گے۔"[1]

امام بخاری نے لکھا ہے کہ خدا نے جو فرمایا ہے کہ اگر کافروں سے ڈر ہو تو ان سے بچنے کے لیے دوستی کر لو۔ اس میں تقاۃ کا مطلب تقیہ ہے یعنی تم لوگ تقیہ کر لیا کرو۔[2]

علامہ ابن حجر عسقلانی نے اس جملہ (الا ان تتقوا منهم تقاة وهی تقیة) کی شرح میں لکھا ہے کہ:

"امام بخاری نے جو قرآن مجید کی لفظ تقاۃ کی تفسیر تقیہ کی تو اس کو انھوں نے امام فن ابو عبیدہ کے قول سے اختیار کیا ہے جنھوں نے لکھا ہے کہ تقاۃ اور تقیۃ دونوں ایک ہی ہیں۔ اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مومن کسی کافر کو اپنا دوست نہ بنائے نہ ظاہر میں نہ باطن میں، ہاں بظاہر اگر تقیہ کرنا ہو ---- تو جائز ہے۔ ظاہراً اس کی دوستی کا اقرار کیا جائے اور دل میں اس کی دشمنی رہے۔"[3]

علامہ زمخشری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"خدا نے اس آیت تقیہ سے مومنین کو اجازت دی ہے کہ جب کافروں سے کسی بات کا ڈر ہو تو صرف ظاہری طور پر ان سے اچھا برتاؤ کریں، میل جول رکھیں اور عمدہ اخلاق کا مظاہرہ کریں لیکن دل میں ان سے مکمل عداوت اور نفرت ہو۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا کہ رہو تم دشمنوں ہی کے درمیان مگر اپنی رفتار کو ان سے الگ رکھو۔"[4]

[1] تفسیر بیضاوی ج ۱ ص ۱۱۲ مطبوعہ مصر [2] صحیح بخاری کتاب الاکراہ پ ۲۸ ص ۵۰۴، مطبوعہ دہلی [3] فتح الباری فی شرح بخاری [4] تفسیر کشاف ج ۱ ص ۳۰۔

یہی محمد بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے اور علامہ نیشاپوری کی تفسیر بھی یہی ہے۔ لیکن علامہ فخر الدین رازی نے اس طرح وضاحت کی ہے:

"تقیہ اس وقت جائز ہے جب کسی شخص کو کافروں سے اپنی جان و مال کا خوف ہو کیونکہ حضرت رسول خدا صلعم نے فرمایا ہے کہ مسلمان کے لیے عزت بھی اس کے خون کی عزت کے برابر ہے اور جو شخص تقیہ کی حالت میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔"[1]

علامہ خازن، علامہ نسفی، علامہ سیوطی اور بغوی نے بھی اس تفسیر کو لکھا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں تفسیر خازن ج ۱ ص ۲۲، مطبوعہ مصر، تفسیر درّ منثور ج ۲ ص ۱۶، تفسیر معالم التنزیل ص ۱۵۳۔ ابن کثیر اور مولوی صدیق حسن خاں بھوپالی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ تقیہ قیامت تک جائز ہے۔

(دوسری آیت) صرف اردو ترجمہ:

"دل سے جھوٹ بنانا تو ان لوگوں کا کام ہے جن کو خدا کی آیتوں کا یقین نہیں، اصل میں یہی لوگ جھوٹے ہیں۔ جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے مگر اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو اس سے کچھ مواخذہ نہیں۔ لیکن جو شخص ایمان لائے اور اس کے بعد کفر اختیار کرے تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب اور عذاب عظیم ہے۔" (النحل ۱۰۶)

علامہ قاضی بیضاوی اس آیۂ مبارکہ کی تفسیر کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"کفار قریش نے حضرت عمار، ان کے باپ یاسر اور ماں سمیہ کو

۱؎ تفسیر کبیر ج ۳ ص ۶۴۶

دین اسلام سے پھر جانے پر مجبور کیا اور ان کی ماں سمیہ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر ایک برچھے سے ان کی شرمگاہ پر مارنا شروع کر دیا یہاں تک کہ وہ بے چاری شہید ہو گئیں پھر ان لوگوں نے حضرت عمار کے باپ یاسر کو بھی شہید کر ڈالا۔ اسلام میں یہی دونوں بزرگ سب سے پہلے شہید ہوئے ہیں۔ اور حضرت عمار نے ان لوگوں کے ظلم اور اذیت سے مجبور ہو کر زبان سے کفر کی بات وہ کہہ دی جو کفار ان سے کہلوانا چاہتے تھے۔ یہ خبر حضرت رسول خدا صلعم تک پہنچی اور لوگوں نے کہا کہ عمار تو کافر ہو گئے مگر حضرت نے انھیں جھڑک دیا اور فرمایا کہ عمار سر سے پاؤں تک ایمان میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایمان ان کے گوشت و پوست اور خون کے ایک ایک قطرے میں سرایت کیے ہوئے ہے، وہ کافر کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس کے بعد ہی حضرت عمار بھی (روتے ہوئے) رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آں حضرت نے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے اور فرمایا، تم اس طرح روتے کیوں ہو؟ تمھارا نقصان ہی کیا ہوا؟ اگر کفار تم سے پھر وہی بات کہلوانا چاہیں تو کہہ دینا۔"[1]

آنحضرت کا یہ عمل اور یہ ارشاد اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص مجبور کر دیا جائے تو اس کی زبان پر کلمۂ کفر کا جاری ہو جانا بھی درست اور جائز ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح بخاری پارہ ۲۸ ص ۲۵۰،

۱؎ تفسیر بیضاوی ج ۱ ص ۳۹۶

اور علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف ج۲ ص ۱۷۶ میں اپنے خیالات کے ساتھ اس آیت کو تقیہ کے جواز کی دلیل قرار دیا ہے۔

(تیسری آیت) صرف اردو ترجمہ:

"فرعون بولا (موسیٰ) کیا ہم نے تمھیں یہاں رکھ کر بچپن میں تمھاری پرورش نہیں کی؟ اور تم اپنی عمر برسوں ہمارے درمیان گزار چکے ہو اور تم اپنا وہ کام (خون قبطی) کر گئے، جو کر گئے اور تم (بڑے) ناشکرے ہو۔" (الشعراء ۱۸-۱۹)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ بیضاوی کہتے ہیں کہ:

"فرعون نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم کافروں سے ہو تو اس وجہ سے کہ حضرت موسیٰؑ ان فرعونیوں کے ساتھ تقیہ کی زندگی بسر کرتے تھے۔"[1]

علامہ چلپی اس تفسیر بیضاوی کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ:

"اگر حضرت موسیٰ واقعاً کافروں کی زندگی بسر نہ کرتے اور ان سے الگ رہتے تو فرعون انھیں قید یا قتل کرا دیتا۔

(چوتھی آیت) صرف اردو ترجمہ:

"فرعون کے لوگوں میں ایک ایمان دار شخص (حزقیل) نے جو اپنے ایمان کو چھپائے رہتا تھا (لوگوں سے) کہا کہ کیا تم لوگ ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو، جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے؟"

(المومن ۲۸)

اس آیت کا مفہوم بھی تقیہ کا جواز پیدا کرتا ہے۔

۱ تفسیر بیضاوی ج ۲ ص ۱۰۴

(پانچویں آیت) صرف اردو ترجمہ:

"اپنے ہاتھوں خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کو اپنے عقیدہ کی اظہار کی صورت میں ہلاکت کا اندیشہ ہو تو اپنے عقیدے کو چھپا کر اپنی زندگی کو بچانا اس پر فرض ہے۔ اس سے قطع نظر زندگی کے دوسرے امور میں بھی انسان تقیہ کے ذریعہ اپنی زندگی کا تحفظ کر سکتا ہے۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ تقیہ کی تائید میں پیغمبری ارشادات کیا ہیں؟

(۱) حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی تو رسولؐ نے فرمایا کہ یہ بہت برا اور بدترین شخص ہے اسے آنے دو۔ عائشہ نے کہا: اے رسول اللہ! آپ تو اس کے پس پشت اس کی برائیاں بیان فرمایا کرتے تھے اور جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا تو خوشی کا اظہار فرما رہے ہیں۔

علامہ قرطبی بیان کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے اس قول سے ثابت ہے کہ جو لوگ اعلانیہ فسق کرتے ہیں ان کی غیبت جائز ہے اور ان کی شرارت سے بچنے کے لیے خاطر و مدارات کرنا بھی بطور تقیہ جائز ہے۔[1]

(۲) امام مسلم نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول خدا نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تین باتوں کے سوا کبھی جھوٹ نہیں بولے، ان میں دو جھوٹ تو خدا کی راہ میں تھے اور ایک اپنے بارے میں۔ خدا کی راہ میں ایک تو آپ نے فرمایا کہ اِنِّی سَقِیْمٌ "میں بیمار ہوں" جبکہ آپ

۱ مشکوٰۃ کتاب الادب باب حفظ اللسان والغیبۃ ج ۴ ص ۹۹ و مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۴ ص ۲۲۸ مطبوعہ مصر

بیمار نہیں تھے) دوسرے فرمایا، ان کے بڑے بت نے کیا (حالانکہ اس بڑے بت نے کچھ نہیں کیا)، تیسرا جھوٹ اپنے بارے میں یہ تھا کہ حضرت اپنی زوجہ سارہ کے ساتھ ایک ظالم بادشاہ کے ملک میں پہنچے، جناب سارہ بہت خوب صورت تھیں۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ اگر یہاں کا بادشاہ یہ جان لے گا کہ تم میری بیوی ہو تو وہ مجھ سے تمھیں چھین لے گا اس لیے اگر بادشاہ تم سے پوچھے تو کہہ دینا کہ تم میری بہن ہو[1]۔"

شارح شفا تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زوجہ سارہ کو تقیہ کی تعلیم دی کیونکہ وہ خائف تھے کہ اگر بادشاہ کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ وہ ان کی زوجہ ہیں تو انھیں قتل کر دے گا۔

محترم! تقیہ کے متعلق قرآنی آیات اور آپ کے جید علمار کی مستند تفسیریں میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیں۔ ان آیات قرآنی، تفاسیر اور عمار یاسر کے واقعہ سے یہ واضح اور ثابت ہے کہ جان و مال کے خوف سے حق کو بظاہر چھپانا جائز ہے اور کفر کے کلمات بھی زبان پر جاری کیے جا سکتے ہیں مگر دل انوار ایمانی سے منور ہو۔ اس کے بعد بھی اگر آپ کو تقیہ کے جواز پر شک و شبہ ہے اور منافقت سے تعبیر کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ آپ احکام الٰہی کے منکر ہیں اور ایسا شخص جو احکام الٰہی کا منکر ہو اسلام سے خود بخود خارج ہو جاتا ہے۔ کسی کو کفر کا فتویٰ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات بھی واضح کر دوں کہ شیعہ منافق نہیں ہیں بلکہ منافق وہ لوگ ہیں جن کے لیے اللہ کو رسولؐ پر سورۂ منافقون نازل کرنا پڑا۔ اور وہ

[1] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۶۶

کون کون لوگ ہیں؟ اس کے لیے مجھ ناچیز کی تالیف الخلفار حصہ اولؑ دومؑ کا مطالعہ فرمالیں۔

o

(۳) آپ نے یہ بھی فرمایا کہ شیعہ یہودی ہیں کیونکہ اس کا مؤسس عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔

محترم! میں اتحاد بین المسلمین کا قائل ہوں اور عصبیت کو سخت ناپسند کرتا ہوں، میری فطرت کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کی دل آزاری پسند نہیں کرتی مگر جب شیعوں پر یا ان کے عقائد و مذہب پر کسی جانب سے بے بنیاد اور رکیک حملے کیے جاتے ہیں تو ان کا منہ توڑ جواب دینا میں اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہوں۔ حق اور حقیقت کا اظہار نہ تو عصبیت ہے اور نہ ہی دل آزاری۔ تین سو ساٹھ بتوں کو اپنا خدا ماننے والے درندہ صفت، خونخوار اور جاہل عربوں کے سامنے رسول اقدس (صلعم) نے لاالٰہ الا اللہ کا نعرہ بلند کر کے تمام باطل خداؤں کی نفی فرما دی۔ مشرک عزیزوں، ذی اثر شیوخ اور منافق صحابہ کی مخالفت اور ان کی دل آزاری کا پاس و لحاظ کیے بغیر آپؐ نے اظہار حق فرما دیا۔ کیا رسول اکرمؐ کا یہ عمل امت کے لیے درس اور قابل اتباع نہیں ہے؟ آپ نے یہ فرما کر کہ "شیعہ یہودی ہیں کیونکہ اس کا مؤسس عبداللہ ابن سبا تھا" اپنا مذہبی بھرم، اپنا علمی وقار اور اپنے عقائد کا سرمایہ سب کچھ کھو دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ بن سبا نام کا کوئی شخص اس کرۂ ارض پر نہ کبھی تھا نہ پیدا ہوا اور نہ ہی اسے کسی نے دیکھا۔ حضرت عثمان کے قتل کے ڈیڑھ سو سال بعد پرستان عثمان اور دشمنانِ علیؑ نے عبداللہ بن سبا

نامی ایک فرضی یہودی شخص کا شاخسانہ کھڑا کیا۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ شیعوں کے اصول مذہب میں یہودی عنصر داخل کر کے اسلام کے دیگر فرقوں میں شیعوں کو بدنام، ذلیل اور رسوا کیا جائے۔

اس مفروضہ کردار (شخص) اور اس من گڑھت قصہ کو متقدمین میں کس مؤرخ نے پہلی مرتبہ بیان کیا؟ اس کے راوی کون کون ہیں اور سلسلۂ اسناد کیا ہیں؟ ان تمام باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس واقعہ کی صحت اور عدم صحت کا تصفیہ کیا جا سکے۔

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس مفروضہ شخص (عبداللہ بن سبا) کو منظر عام پر لانے والے اولین مورخ ابو محمد جعفر بن جریر طبری اور تاریخ طبری وہ کتاب ہے کہ جس کے بارے میں خود مصنف کا کہنا ہے کہ:

"ہم اپنی کتاب میں جو واقعات بعض گزرے ہوئے لوگوں کے متعلق درج کر گئے ہیں، انھیں پڑھنے والا ناپسند اور سننے والا ناگوار جانتا ہے لیکن اسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ (ان واقعات کو) ہم نے اپنی طرف سے نہیں لکھا، بلکہ ہم نے کسی دوسرے سے نقل کیا ہے اور جو کچھ لوگوں نے بیان کیا وہ ہم نے درج کر دیا۔"[1]

طبری کی مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہے کہ انھیں خود اپنی کتاب کی روایات پر بھروسہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ واقعات مندرجہ سے مطمئن ہیں اس لیے کہ نہ انھوں نے کسی واقعہ کی تحقیق کی اور نہ ہی اس کے راویوں کے متعلق علمائے حدیث اور فن رجال کے ماہرین کو متوجہ کیا،

۱؎ تاریخ طبری ج ۱ ص ۵

نہ ان کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی بلکہ جس نے جو بیان کر دیا وہی انھوں نے لکھ دیا۔ مختصر یہ کہ طبری کی اس غلطی نے اور اس بد احتیاطی نے مذہبی دنیا میں بعض واقعات کے ذریعہ ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا اور قیامت تک کے لیے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔

غرضکہ اس واقعہ کی ابتدا ابن جریر طبری (المتوفی سنہ ۳۱۰ھ) کی کتاب سے ہوئی جس میں انھوں نے اس فرضی داستان کو سیف بن عمر تمیمی کوفی کے حوالے سے بیان کیا ہے، تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اسی سال سنہ ۳۰ھ میں جناب ابوذر (غفاری) اور معاویہ کے درمیان اختلافات و نزاعات ظہور پذیر ہوئے اور معاویہ نے انھیں شام سے ہٹا دیا۔ جو لوگ اس بارے میں معاویہ کو بے قصور سمجھتے ہیں ان لوگوں نے اس کے متعلق ایک قصہ بیان کیا ہے۔ مجھے سری نے لکھا ہے کہ شعیب سے سیف نے حدیث بیان کی، اس نے عطیہ سے سنا، عطیہ نے یزید فقعسی سے، یزید فقعسی کہتا ہے کہ جب ابن سودا (عبداللہ بن سبا) شام وارد ہوا تو ابوذر سے ملا اور کہا کہ اے ابوذر آپ کو معاویہ پر تعجب نہیں آتا جو یہ کہتا ہے کہ خدا کا مال میرا مال ہے۔"[1]

طبری کی اس عبارت میں یہ جملہ کہ "مجھے سری نے لکھا ہے" اس بات کی بین دلیل ہے کہ یہ روایت طبری کے روبرو نہیں بیان کی گئی بلکہ کسی "سری" یا "سرطی" نے انھیں لکھ کر بھیج دی اور انھوں نے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ لکھنے والا کون ہے، کیا ہے؟ اصلی ہے یا نقلی؟ معتبر ہے یا غیر معتبر؟ اس روایت کو

۱؎ طبری ج ۵ ص ۶۶

آنکھ بند کر کے اپنی کتاب میں شامل کر لیا اور بعد کے علماء و مورخین اسے نقل کرتے چلے گئے۔

مثلاً: ابن عساکر (متوفی ۵۷۱ھ) نے سیف کی روایت سے اس مفروضہ داستان کو بیان کیا ہے۔

مثلاً: ابن اثیر (متوفی ۶۳۰ھ) نے تاریخ کامل میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی کتاب کی ابتدا تاریخ کی بہت بڑی کتاب طبری سے کی ہے۔

مثلاً: ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ جلد ہفتم کے صفحہ ۱۶۷ پر ابن سبا کے اس فرضی قصہ کو نقل کر کے صفحہ ۲۴۶ پر یہ وضاحت کی ہے کہ یہ خلاصہ ہے اس کا جسے طبری نے نقل کیا ہے۔

مثلاً: فرید وجدی نے اپنی کتاب دائرۃ المعارف جلد، میں جنگ جمل کا ذکر کرتے ہوئے اس قصہ کو بیان کیا ہے اور صفحات ۱۶۰۔۱۶۸۔۱۹۹ پر یہ صراحت کی ہے کہ ہم نے اس قصہ کو تاریخ طبری سے نقل کیا ہے۔

متاخرین میں رشید رضا مدیر "المنار" مصر نے اپنی کتاب السنۃ والشیعہ کے صفحات ۴۔۵۔۶ پر عبداللہ بن سبا کے قصہ کو یوں نقل کیا ہے:

"شیعیت کے اصول ایک یہودی نے گھڑے جس کا نام عبداللہ بن سبا تھا۔ اس نے مکر و فریب سے کام لیتے ہوئے اسلام ظاہر کیا اور لوگوں کو حضرت علیؑ کے بارے میں غلو کی دعوت دی۔ غرض یہ تھی کہ اسلام میں پھوٹ پڑ جائے اور مسلمانوں کی دنیا و دین غارت ہو جائے۔ جو شخص جنگ جمل کے واقعات کو تاریخ کامل ابن اثیر ہی میں غور کی نگاہ سے دیکھے تو اسے یہ اندازہ ہو گا کہ سبائیوں کی فتنہ انگیزی کتنی کامیاب ثابت ہوئی۔"

مثلاً: مورخ ابوالفدا (متوفی ۷۳۲ھ) نے بھی اپنی تاریخ میں اس واقعہ کو بیان کیا ہے اور یہ وضاحت بھی کی ہے کہ میں نے اس واقعہ کو ابن اثیر کی تاریخ کامل سے لکھا ہے۔

دور حاضر کے مورخین میں احمد امین نے اپنی کتاب فجر الاسلام ص ۱۳۶ پر اور ڈاکٹر حسن ابراہیم نے اپنی کتاب تاریخ اسلام السیاسی کے ص ۳۴۷ پر اس قصہ کو بیان کیا ہے اور تاریخ طبری کا حوالہ دیا ہے۔

ان تمام علمائے متقدمین اور متاخرین کی تاریخوں، تصانیف اور تالیفات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ عبداللہ بن سبا کے فرضی قصہ کا اصل ماخذ صرف تاریخ طبری ہے اور ابو جعفر محمد بن جریر طبری ہی وہ پہلے مورخ ہیں جنھوں نے بلا تحقیق سری، شعیب، سیف بن عمر، عطیہ اور یزید فقعسی جیسے مجہول، غیر معتبر، کاذب اور متہم بالزندقہ کے حوالوں سے اپنی کتاب میں درج کیا ہے اور اس اندراج کے ذیل میں علامہ امینی کا کہنا ہے کہ:

"طبری نے کذاب و جعلساز سری کی تحریریں درج کر کے اپنی تاریخ کا ستیاناس کر دیا۔ اس جعلساز سری نے گمنام شخص شعیب کے حوالے سے حدیثیں بیان کی ہیں اور شعیب نے سیف سے جو کہ بہت بڑا جعلساز تھا۔ اپنی تاریخ کے صفحات پر انھیں واہیات اسناد سے طبری نے ۷۰۱ حدیثیں نقل کی ہیں جو ۱۱ھ سے ۳۷ھ تک حقائق کو مسخ کرنے کی غرض سے گڑھی گئی ہیں۔"

پھر کہتے ہیں کہ:

"طبری نے سیف کی ان جعلی حدیثوں کا سلسلہ وفات پیغمبرؐ سے

شروع کیا ہے، ور تیسری، چوتھی، پانچویں جلدوں تک یہ حدیثیں پھیلائی ہیں۔ تیسری جلد ۱۱ھ کے واقعات میں، ۶ حدیثیں (فرضی) نقل کی ہیں، چوتھی جلد ۱۲ھ کے واقعات میں ۲۷ حدیثیں اور پانچویں جلد ۲۳ھ سے ۳۷ھ تک کے واقعات میں، ۷۰ حدیثیں (غلط) نقل کی ہیں، اس طرح کل ۱۰۷ حدیثیں ہوئیں[1]

مصر کے نامور سنی ادیب، فلسفی اور مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین رقمطراز ہیں کہ:

"جنگ صفین میں سبائیوں اور ابن سبا کے ذکر سے مورخین نے جو اعراض کیا ہے، اس سے کم سے کم یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ ابن سبا بالکل فرضی اور من گھڑت چیز ہے اور جب فرقۂ شیعہ اور دیگر اسلامی فرقوں میں جھگڑے چل رہے تھے اس وقت اسے جنم دیا گیا۔ شیعوں کے دشمنوں کا منشا یہ تھا کہ شیعوں کے اصل اصول مذہب میں یہودی عنصر داخل کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ بڑی زبردست چالبازی اور مکر و فریب کی صورتیں تھیں۔ محض شیعوں کو زچ کرنے کے لیے ورنہ اگر ابن سبا کا معاملہ کسی صحیح بنیاد پر مبنی ہوتا اور معتبر تاریخ سے اس کا پتہ چلتا تو لازمی طور پر اس فرقہ کا اثر و نشان اور اس کا مکر و فریب جنگ صفین میں ضرور ظاہر ہوتا۔ خصوصاً معاملہ تحکیم کے موقع پر جب اصحاب علیؑ میں اختلاف اس وقت بھی فطری طور پر اس فرقہ کا وجود ہونا چاہیے تھا لیکن ہم خوارج کے معاملہ میں ابن سبا کا کوئی وجود نہیں پاتے، تمام تاریخیں اس موقع پر اس کے ذکر سے خاموش ہیں۔ اس خاموشی کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے

---

[1] الغدیر ج ۸ ص ۲۳۵، ۲۳۶

اور واقعہ صفین اور فرقہ خوارج کے موقع پر ابن سبا کے غائب ہونے کی کیا وجہ بیان کی جاسکتی ہے۔ ہم تو صرف بس ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں اور وہ یہ کہ ابن سبا ایک وہمی چیز ہے۔۔۔۔۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ابن سبا ایک ہوا ہے جسے شیعوں کے دشمنوں نے محض شیعوں کے لیے تلاش کیا ہے"[1]

اس فرضی قصہ کے راویوں یعنی سری، شعیب، سیف بن عمر، عطیہ اور یزید فقعسی کے متعلق علمائے حدیث اور ماہرین فن رجال کے خیالات بھی ہم درج کیے دیتے ہیں تاکہ آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ یہ واقعہ کتنا فرضی اور من گھڑت ہے۔

۱۔ سری۔ طبری نے اپنی تاریخ کی جلد ۳ ص ۲۹۳ پر سری کے باپ کا نام یحییٰ بیان کیا ہے۔ سری نام کے بہت سے لوگ گزرے ہیں جن کے باپ کا نام بھی یحییٰ تھا، اس لیے حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کون سری ہے جس نے عبداللہ بن سبا کے واقعہ کو طبری کے پاس لکھ کر بھیجا۔

۲۔ سری بن یحییٰ بن ایاس۔ اس سری کا انتقال ابوجعفر محمد بن جریر طبری کی پیدائش سے ۷۵ سال قبل ہو چکا تھا اس لیے یہ سری وہ نہیں ہو سکتا جس نے طبری کو ابن سبا کا واقعہ لکھ کر بھیجا۔

۳۔ سری بن اسماعیل ہمدانی کوفی۔ ابن مبارک اور ابو داؤد نے اس سری کو ضعیف اور متروک الحدیث کہا ہے۔ ابن عدی کی رائے میں یہ ثقہ نہ تھے اور ان کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو کوئی نہیں مانتا تھا۔

---

[1] الفتنۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۹۴ تا ۱۰۲

ابن حیان کا بیان ہے کہ یہ اسناد میں الٹ پھیر کر دیا کرتے تھے۔[1]

۴۔ شعیب بن ابراہیم۔ مجہول شخص ہے۔ ذہبی کا کہنا ہے کہ شعیب بن ابراہیم سیف کی کتابوں کا راوی ہے یہ کون شخص ہے اس کا علم نہ ہو سکا۔

۵۔ سیف بن عمر۔ اس کا انتقال سنہ ۱۸۰ھ میں ہوا۔ علمائے حدیث کا کہنا ہے کہ یہ حدیثیں بہت گھڑا کرتا تھا اور بڑا جھوٹا، کاذب، ملحد اور زندیق تھا۔[2]

۶۔ عطیہ۔ یہ عطیہ کون ہے معلوم نہ ہو سکا جس سے سیف بن عمر نے حدیثیں بیان کی ہیں۔ یہ عطیہ عوفی نہیں ہو سکتے اس لیے کہ ان کا انتقال سنہ ۱۱۱ھ میں ہوا اور سیف بن عمر کا سنہ ۱۸۰ھ یا سنہ ۲۰۰ھ میں یعنی سیف بن عمر کے انتقال سے ۷۰ یا ۹۰ سال قبل۔ اور اگر عطیہ سے مراد عطیہ بن قیس کلابی ہیں تو یہ شام کے رہنے والے تھے کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ سیف بن عمر کی ملاقات کبھی عطیہ بن قیس کلابی سے ہوئی ہو۔

۷۔ یزید فقعسی۔ رجال میں اس نام کا کوئی شخص نہیں گزرا جس کا لقب فقعسی رہا ہو۔ یہ کون تھا معلوم نہ ہو سکا۔ سیف بن عمر جس نے ہزاروں قصے گھڑے ہوں وہاں اس کا بھی امکان ہے کہ یزید فقعسی کا وجود اس کی ذہنی تخلیق ہو۔

اب خلاصہ یہ ہے:

(۱) تاریخ طبری میں ۷۰۱ جھوٹی حدیثیں موجود ہیں، ان میں ایک حدیث

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۴۵۹ و ۴۶۰ [2] تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۹۱ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۳۸

عبداللہ ابن سبا کی بھی ہے۔

(۲) تمام مورخین نے تاریخ طبری سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

(۳) ان میں سے کسی نے بھی مصطلحات حدیث کی کتابوں سے اس واقعہ کے راویوں کے حالات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔

(۴) ماہرین فن رجال نے عبداللہ بن سبا کے مفروضہ قصہ کے تمام راویوں کو مجہول، کاذب یا متہم بالزندقہ قرار دیا ہے۔

(۵) ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی رائے میں بھی عبداللہ بن سبا کا قصہ بالکل فرضی، لغو اور من گھڑت ہے۔ وہ ایک ہوّا ہے جسے صرف شیعوں کے لیے جنم دیا گیا ہے۔ اس سے شیعوں کے دشمنوں کا منشا یہ تھا کہ شیعوں کے اصول مذہب میں یہودی عنصر داخل کر کے انھیں بدنام و مطعون کیا جائے۔

نتیجہ:

محترم مفتی صاحب! مندرجہ بالا "پوسٹ مارٹم" کے بعد نتیجہ آپ کے سامنے ہے اور وہ یہ کہ عصبیت کی بنیاد پر آپ نے فتنہ پردازی کی جو عمارت ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی کے عقائد کو قید کر کے پراگندہ کرنے کے لیے تعمیر کی تھی وہ دلائل اسناد اور جرح و تعدیل کی تیز ہواؤں کے اس جھکڑ میں مسمار ہو گئی۔

آپ کی ان تمام مفروضہ باتوں کا (جو آپ نے ڈاکٹر سماوی سے کیں) جواب میں نے آپ کو دے دیا ہے جس کی آپ کو ضرورت تھی۔ اب باقی رہا یہ سوال کہ شیعہ منافق ہیں، معاویہ و یزید لعن اللہ علیہم کی خلافت پر ایمان نہیں رکھتے، اس سلسلہ میں صرف اتنا عرض کر دوں کہ اگر منافقت

کاذکر چھیڑوں گا تو بات آپ کے بزرگوں تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ مناسب سمجھیں تو عصبیت کی عینک اتار کر ٹھنڈے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ میری تالیفات تفسیر کربلا اور الخلفاء کا مطالعہ فرمالیں، انشاء اللہ آپ پر واضح ہو جائے گا کہ "اسلامی منافق" کون ہیں؟

آپ کا ارادہ ڈاکٹر سماوی کو قتل کرنے کا تھا یا نہیں؟ مجھے نہیں معلوم لیکن ہمارے ملک کے قانونی آئین "تعزیرات ہند" میں قتل کی جو سزا معین کی گئی ہے، اس سے آپ واقف ہیں۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو توفیق عطا کرے کہ آئندہ آپ اس طرح کی فتنہ انگیزیوں سے باز رہیں اور ان تمام خرافات سے دامن کش ہو کر سفر آخرت کے زاد راہ کی فراہمی میں مشغول و مصروف ہو جائیں

والسلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مخلص

فروغ کاظمی

کھلا خط

بنام ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی تیونسی

عزیز محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پروردگار عالم آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور بہ فیض محمدؐ و آل محمدؐ مخالفین وحاسدین کے فتنہ و شر سے محفوظ رکھے۔

آپ (تحریراً و عملاً) دین حق (شیعیت) کا جو تبلیغی کارنامہ انجام دے رہے ہیں وہ بے شک لائق تحسین و قابل ستائش ہے۔

"اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"

ابھی حال میں آپ کی کتاب "اہل الذکر" کے مطالعہ کا موقع فراہم ہوا۔ اس کتاب کے اولین صفحات میں آپ نے مولوی سید ابوالحسن علی ندوی کے نام ایک کھلا خط شائع کیا ہے، جس میں آپ نے جماعت اسلامی (ہند) کے مفتی شیخ عزیز الرحمٰن سے ہونے والی اس ناخوشگوار گفتگو کا تذکرہ کیا ہے جو آپ کے اور ان کے درمیان الخمیس کی مسجد بمبئی میں تلخیوں کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی اور جس میں انھوں (مفتی صاحب) نے شیعوں کے متعلق یہ فرمایا کہ شیعہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے، شیعہ کافر ہیں، شیعہ منافق ہیں اس لیے کہ تقیہ پر عمل کرتے ہیں، شیعہ یہودی ہیں اس لیے کہ اس کا

مؤسس عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ یا یہ کہ خلفائے راشدین کی خلافت کے ساتھ جو شخص معاویہ اور یزید لعن اللہ علیہم کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں ہے۔

آپ یقیناً مفتی صاحب کی یہ باتیں سن کر ہکا بکا رہ گئے ہوں گے اور مجھے بھی موصوف کے اس طرز عمل، اس روش اور ایک مہمان کے ساتھ اس ناروا سلوک پر افسوس ہے۔ یہ بھی واضح کر دوں کہ ہندوستان یا پاکستان میں شیعوں کے خلاف کچھ لوگ سرگرم عمل ہیں جو اس قسم کی بہتان طرازی کے تیروں سے شیعوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ شیعوں یا عام مسلمانوں کو حق سے گمراہ کر کے باطل کے راستے پر ڈال دیا جائے اور حقیقی اسلام کا ان کے ذہنوں میں جو تصور ہے اسے ختم کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے اور صبر و ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں تو شیعہ ان سے جم کر مقابلہ کرتے ہیں، مجادلہ کرتے ہیں، مناظرہ کرتے ہیں ۔۔ "کبھی قلم کی زبان سے کبھی قلم کی شمشیر سے۔"

برادر عزیز! شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہو کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اکثر و بیشتر شیعہ حضرات اور برادران اہل سنت کے درمیان معرکۂ کارزار گرم ہوتا رہتا ہے۔ انسانیت اپنا جامہ اتار کر نفرت کے اسٹیج پر ننگا ناچ ناچتی ہے اور عصبیت خون کی ہولی کھیلتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیکڑوں کا سہاگ اجڑ جاتا ہے اور ہزاروں معصوم بچے والدین کی گود سے یتیمی کی گود میں پہنچ جاتے ہیں اور یہ سب کچھ اس اسلام کے نام پہ ہوتا ہے جو امن و سلامتی کی تعلیم دیتا ہے، بھائی چارگی کی تعلیم دیتا ہے، صبر و تحمل کی تعلیم دیتا ہے، نظم و ضبط کی تعلیم دیتا ہے اور اس

بات کی تعلیم دیتا ہے کہ کسی کے مذہب کو برا نہ کہو، کسی کے عقیدے پر کیچڑ نہ اچھالو، کسی کا دل نہ دکھاؤ، کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچاؤ، کسی پر ظلم نہ کرو، کسی کو قتل نہ کرو، کسی کا خون نہ بہاؤ اور کسی کو اذیت نہ دو۔

یقیناً یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم مسلمانوں میں ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو ان تمام تعلیمات اسلامی سے قطع نظر صرف وہابیت کے راستے پر گامزن ہے صرف انھیں خطوط پر چل رہا ہے جو سعودیہ نے مقرر کر دیے ہیں اور اس فرقہ کا عفریت نہ یہ کہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام ممالک میں سرگرم عمل ہے۔ حق اور اسلام کے خلاف اس کی منافقانہ و مخالفانہ سرگرمیاں اور فتنہ پردازیاں "پیٹرو ڈالر" کی بدولت جاری و ساری ہیں۔

یہ بھی واضح کر دوں کہ مولوی سید ابوالحسن علی ندوی ہوں یا منظور نعمانی، عتیق الرحمن سنبھلی ہوں یا مفتی عزیز الرحمن، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور اسلام کے بارے میں ان سب کا نظریہ بھی ایک ہے۔ لہٰذا ان میں سے کسی سے یہ امید رکھنا کہ وہ حق کی موافقت میں باطل کے خلاف زبان کھولے گا، میرے خیال میں محض خوش فہمی ہے۔ ان کی یہ مخالفانہ مہم حق۔ اسلام کے خلاف جاری تھی، جاری ہے اور جاری رہے گی۔ انھیں خاموش رکھنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ قلمی جہاد۔ جس کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ حقیقی اسلام کیا ہے؟ اور اسلام کے خلاف وہابیت کا نظریہ کیا ہے؟ تاکہ وہ لوگ جو باطل کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں اور صراط مستقیم کے متلاشی ہیں، اپنی منزل تلاش کر سکیں میں نے آپ کا مکتوب اپنی اس کتاب الخلفاء حصہ دوم میں شامل کر لیا ہے اور شیخ عزیز الرحمن کو ان کی بے ہودگیوں کا جواب بھی دے دیا ہے، ملاحظہ فرمالیں۔ والسلام

مخلص فروغ کاظمی

دوسرا باب

عاشق آلِ محمدؐ کو نہیں، فکرِ ستم
وہ سرِ دار بھی حق بات کہا کرتا ہے
(ڈاکٹر حضور نواب)

معاویہ بن ابوسفیان کے استبدادی دور سے اب تک حق فروش اہل قلم اور ضمیر فروش علمار کے ذریعہ آل محمدؐ کے فضائل کو مسخ کرنے یا انھیں ختم کرنے کا جو سازشی اور بدعتی سلسلہ جاری ہے اسی کی ایک کڑی مولوی سید ابوالحسن حسنی ندوی کی خرافاتی کتاب "المرتضیٰ" ہے جسے ندوی صاحب نے "مرتضوی" فضیلتوں پر خلفائے ثلاثہ کو فضیلت دینے اور اپنے "سعودی پروردگار" سے خوشنودی کا پروانہ حاصل کرنے کی غرض سے بعض اہم تاریخی حقائق کو یکسر نظر انداز کر کے "وہابی عقیدہ کی بنیاد پر" تالیف کی ہے۔

موصوف کی اس کتاب میں شیعہ عقائد کے خلاف قابل توجہ جو باتیں ہیں ان میں سے بیشتر کے جوابات ہم الخلفار حصہ اول میں تحریر کر چکے ہیں اور اس کے ساتھ ہی حضرت ابوبکر کا غیر اسلامی کردار، ان کے اہم تاریخی حالات (از ابتدا تا وفات) نیز حضرت عمر کے تقریباً

نصف حالات، مثلاً آپ کا عالم وجود میں آنا، عمیر سے حضرت عمر بن جانا، تعجب خیز حلیہ، حیرت انگیز نسب، ماں باپ کی خوش فعلیاں، ابتدائی زندگی، رنگین مزاجی، پہلوانی، بت پرستی وغیرہ کے بارے میں بھی اجمالی روشنی ڈال چکے ہیں۔

اور اب، حضرت عمر کے باقی حالات، عثمانی زندگی کا مکمل عکس اور مولوی ندوی کی معترضہ باتوں کے جواب اس کتاب "الخلفار حصہ دوم" میں ملاحظہ فرمائیں۔

(مولف)

MOWLANA NASIR DEVJANI
MAHUVA. GUJARAT, INDIA
PHONE . 0091 2844 28711

(الخلفاء حصہ اول سے آگے ...)

عمری بسیار خوری

مالک بن انس سے مروی ہے کہ عمر کے سامنے ایک صاع کھجوریں (منہ مارنے کے لیے) رکھ دی جاتی تھیں اور وہ سب کھا جاتے تھے یہاں تک کہ سڑی گلی ایک بھی نہیں چھوڑتے تھے۔[1]

انوار اللغۃ میں ایک صاع کا وزن ساڑھے چار سیر بتایا گیا ہے اور مولوی ندوی نے "المرتضیٰ" میں ۳ کلو ۲۶۵ گرام تحریر کیا ہے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ جب آپ ساڑھے چار سیر یا ۳ کلو ۲۶۵ گرام صرف کھجوریں "زہر مار" کر جاتے تھے تو پر تکلف شاہی دستر خوان پر آپ کے کھانے کا کیا حال ہوتا رہا ہو گا!

پیٹ میں قراقر

حضرت عمر کے دور میں جب قحط پڑا اور عوام معاشی زبوحالی اور عتاب الٰہی میں گرفتار ہوئے تو مصلحتاً آپ نے بھی گھی کا استعمال ترک کر دیا تھا اور روغن زیتون سے اپنا کام نکالنے لگے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیل کی چکناہٹ نے آپ کے پیٹ میں "قراقر" کو منجمد کر دیا۔

کنز العمال میں ہے کہ جب "قراقر" کی تکلیف شروع ہوتی تھی تو آپ اپنے پیٹ میں انگلی چبھو کر فرماتے تھے کہ "اے پیٹ! تجھے جس قد

۱؎ کنز العمال ج ۶ ص ۳۸۳

بھی قراقر کرنا ہے کر لے کیونکہ عمر کے پاس فی الحال زیتون کے تیل کے علاوہ تیرے لیے کچھ نہیں ہے۔"[1]

قراقر کس بیماری کا نام ہے؟ اسے کوئی حکیم یا ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ آپ کا یہ شکمی قراقر آپ کے زہد کی تمام روایتوں کو باطل قرار دیتا ہے کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے گھی کے علاوہ کبھی تیل کا استعمال ہی نہیں کیا تھا، وہ بھی خالص گھی۔

مال کا درد

حضرت عمر کو اپنے مال کا کتنا درد تھا؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک دن کہیں سے کچھ مال آپ کے ہاتھ آگیا جسے بحالت مجبوری آپ کو حاجت مندوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ مال حاصل کرنے والوں میں کچھ موقع پرست اور حاشیہ بردار لوگ بھی تھے جو آپ کی تعریفیں کرنے لگے۔

ظاہر ہے کہ تعریف اور خوشامد انسان کا کمزور پہلو ہے۔ اس لیے یقیناً آپ کے دل میں بھی خوشیوں کا جوالا مکھی کروٹیں لے رہا ہوگا۔ اسی عالم میں آپ کی زبان سے سچائی پر مبنی یہ جملہ نکلا کہ:

"احمقو! خدا کی قسم اگر میرا مال ہوتا تو میں کسی کو ایک درہم بھی نہ دیتا۔"[2]

یہ جملہ آپ کے بخل پر دلالت کرتا ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ اپنے ذاتی مال سے ضرورت مندوں، محتاجوں اور غریبوں کو ایک دمڑی بھی

۱؎ کنز العمال ج ۶ ص ۳۴۳ ۲؎ کنز العمال ج ۶ ص ۳۵۰

نہیں دیتے تھے۔

گھوڑے کی سواری

حضرت عمر کے گھوڑے پر سوار ہونے کا انداز (اسٹائل) عجیب و غریب تھا۔ وہ یہ کہ جب آپ گھوڑے پر سوار ہونے کا قصد کرتے تو ایک ہاتھ سے گھوڑے کا کان پکڑتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے اپنا کان۔ پھر جسم کو سمیٹ کر اس طرح اُچھلتے کہ اس کی پیٹھ پر پہنچ جاتے۔[1]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ بائیں ہاتھ سے گھوڑے کا داہنا کان پکڑتے تھے اور داہنے ہاتھ سے بایاں کان۔ اور جب گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے تو اس طرح اچھلتے کودتے تھے کہ جیسے اسی کی پیٹھ پر ہی پیدا ہوئے ہوں۔[2]

خدا جانے یہ روایت کس خیال کے تحت حضرت عمر کے فضائل میں نقل کی گئی ہے۔ اس سے آپ کی بہادری واضح ہوتی ہے یا گھوڑے سواری کا ہنر نمایاں ہوتا ہے؟ ممکن ہے کہ اس کا مقصد یہ ہو کہ آپ بڑے عادل اور منصف مزاج تھے کہ ایک ہاتھ سے اگر گھوڑے کا کان پکڑتے تو دوسرے ہاتھ سے اپنا بھی کان پکڑ لیتے تھے تاکہ عدل برقرار رہے۔ مگر اس سے تو عدل ثابت نہیں ہوتا، اس لیے کہ جب آپ گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ہانکتے رہے ہوں گے تو اسے ایڑ بھی لگاتے رہے ہوں گے اور اس کے ساتھ آپ کا تازیانہ بھی چلتا رہا ہو گا۔ یہ اصول عدل کے منافی ہے۔ عدل تو

[1] کنز العمال ج ۶ ص ۱۳۳۱ [2] اصابہ ج ۴ ص ۲۷۹

اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب گھوڑے کو بھی یہ اختیار حاصل ہوتا کہ وہ آپ پر سواری کرے، ایڑ لگائے اور آپ پر تازیانہ لگائے۔ اس کے علاوہ دوسری روایت کی بھی تمام باتیں اپنی جگہ ہیں لیکن سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ گھوڑے کا داہنا کان اپنے بائیں ہاتھ سے اور اپنا بایاں کان داہنے ہاتھ سے کیوں پکڑتے تھے؟ آخر اس بازی گری میں کون سی مصلحت کارفرما تھی؟ اس کا جواب صرف مولوی ندوی ہی دے سکتے ہیں کیونکہ معاملہ ان کے دینی رہنما اور روحانی پیشوا کا ہے۔ ہم گستاخی کی جسارت کیوں کریں؟

گھوڑے کی لید

یہ روایت بھی محترم قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ایک دن حضرت عمر کے گھوڑے نے لید کی تو آپ کسی خیال کے تحت اسے اٹھا لائے اور مسل مسل کر اسے دیکھا۔ اتفاق سے اس لید میں آپ کو جَو کا ایک دانہ مل گیا۔ پھر کیا تھا عمری قہر بیدار ہو گیا۔ آپ نے فوراً سائیس کو طلب کیا اور اس سے پوچھا کہ تو گھوڑے کو کیا کھلاتا ہے؟ اس نے سہم کر جواب دیا کہ سرکار! گھاس کے علاوہ ایک صاع جو کھلاتا ہوں اس خیال سے کہ گھوڑا آپ کے استعمال میں دبلا نہ ہو۔" آپ نے اسے ڈانٹا اور فرمایا کہ تجھے نہیں معلوم کہ ایک صاع جَو ایک خاندان کے لیے کافی ہو سکتی ہے اور تو اسے گھوڑے کو کھلاتا ہے۔ آج سے اس گھوڑے کی جَو بند کر دے اور اسے چھوڑ دیا کر تاکہ وہ خود چر کر اپنا پیٹ بھر لیا کرے۔[1]

[1] سوانح عمری عمر حصہ اول ص ۱۴۹

بے چارہ گھوڑا جو آپ کے جسمانی وزن کے ساتھ آپ کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھاتا تھا محض اس پاداش میں اپنی غذا سے محروم کر دیا گیا کہ وہ ایک صاع جَو کھاتا تھا اور وہ جَو حضرت عمر کے نزدیک ایک خاندان کی غذا تھی۔ لیکن یہ بات بھی آپ کے عدل کی نفی کرتی ہے اس لیے کہ آپ حاکم وقت تھے اس کے باوجود ایک صاع کھجوریں ناشتہ میں یا کھانے کے دوران کھا جاتے تھے تو اس وقت آپ کو یہ خیال کیوں نہیں آتا تھا کہ یہی کھجوریں کسی مفلس، نادار اور غریب گھرانے کی غذا بن سکتی ہیں؟

ایستادہ پیشاب

اس خیال کے تحت کہ پیشاب کی نجاست جسموں پر اثر انداز نہ ہو، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو بیٹھ کر پیشاب کرنے کا حکم دیا تھا اور طیب وطاہر ہونے کے باوجود خود بھی اس آداب طہارت پر کاربند تھے لیکن افسوس کہ اکثر وبیشتر صحابہ آپ کے اس عمل کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کنز العمال میں ہے کہ ایک دن رسولؐ اللہ نے بیٹھ کر پیشاب کیا اور جب فارغ ہوئے تو صحابہ نے کہا: یارسولؐ اللہ! آپ تو بالکل عورتوں کی طرح پیشاب کرتے ہیں[1]۔

تاجدار انبیاء کی شان میں اس دریدہ دہنی، گستاخی اور جسارت کی وجہ یہ تھی کہ منافقین صحابہ کا ایک گروہ حضرت عمر کے ساتھ تھا جو ہمیشہ کھڑے کھڑے پیشاب کیا کرتے تھے اور اپنی اس غیر شائستہ حرکت کا

---

[1] کنز العمال ج ۵ ص ۱۲۴

سبب یہ بیان کرتے تھے کہ بیٹھ کر پیشاب کرنے سے دبر ڈھیلی ہو جاتی ہے اور اس کے برعکس جب انسان کھڑے کھڑے پیشاب کرتا ہے تو دُبر اچھی طرح (ٹائیٹ) کسی رہتی ہے[1]۔

عمری استنجاء

حضرت عمر استنجاء میں پانی کا استعمال کبھی نہیں کرتے تھے، بلکہ آپ کا فلسفہ یہ تھا کہ "رگڑو اور صاف کرو" چنانچہ آپ نے اپنے گھر کی دیوار میں ایک پتھر لگوا رکھا تھا اور جب کھڑے کھڑے پیشاب سے فارغ ہوتے تو ..... پکڑ کر اسی پتھر پر رگڑ دیا کرتے تھے[2]۔

یہی وہ عمری سنت ہے جس پر عمل پیرا ہو کر عمر نواز مسلمان پانی پر مٹی کے ڈھیلے یا پتھر کو ترجیح دیتا ہے۔

سٹّیا بازی

اپنی بیوی کی نظر میں حضرت عمر ایک بدکردار اور "سٹّیا باز" انسان تھے چنانچہ اس ضمن میں علامہ سیوطی کا کہنا ہے کہ جابر بن عبداللہ نے کچھ عورتوں کے بارے میں حضرت عمر سے کسی قسم کی بات کی تو آپ نے فرمایا کہ میں بھی اس عورت بازی کی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ جب کسی کام یا رفع حاجت کے لیے گھر سے نکلتا ہوں تو میری گھر والی کہتی ہے کہ تم فلاں قبیلہ کی لڑکیوں کو گھورنے اور ان سے نظر لڑانے جاتے ہو[3]۔

---

[1] [2] کنز العمال ج ۵ ص ۱۲۷ [3] تاریخ الخلفاء ص ۹۷

حالت صوم میں جماع

اس واقعہ کی تفصیل "درمنثور" میں یوں ہے کہ ماہ صیام میں ایک رات عمر جناب رسول خدا (صلعم) کی خدمت میں رہ گئے اور جب گھر واپس پلٹے تو دیکھا کہ آپ کی زوجہ محترمہ بستر استراحت پر محوِ خواب ہیں۔ انھیں دیکھ کر آپ پر نفس کا غلبہ ہوا۔ چنانچہ آپ نے انھیں جگایا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا، کہنے لگیں (اُونہہ!) میں تو سو گئی تھی، اب بھلا.... کیونکر ممکن ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم سو گئیں تو سویا کرو، میں تو نہیں سویا تھا۔ یہ کہہ کر آپ بیوی پر چڑھ بیٹھے اور جب نفس کا بھوت اُتر گیا تو نہا دھو کر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں اپنی اس حرکت سے مطلع کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ:

"اللہ کو معلوم ہے کہ تم لوگ اپنے نفسوں کی خیانت کرتے ہو۔"

بعض روایتوں میں حضرت عمر کے سو کر اٹھنے کے بعد اس واقعہ کا بیان ہے کہ سوتے سوتے حضرت کو ان کے نفس نے ابھارا اور وہ اپنی بیوی کے پاس پہنچ گئے۔ پھر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ میں آپ سے اور خدا سے معذرت چاہتا ہوں کہ میرے خطاکار نفس نے مجھے ابھارا اور جو نہ ہونا چاہیے تھا وہ ہو گیا۔ کیا میرے لیے معافی کی کوئی صورت ہے؟ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔[۱]

---

[۱] تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۱۹۷

(نوٹ) اسلام میں روزہ کے متعلق یہ حکم تھا کہ غروب آفتاب کے بعد تمام مفطرات صوم حلال ہو جایا کرتے تھے یہاں تک کہ نماز عشا ادا کر لی جائے یا انسان سو جائے۔ اس کے بعد تمام چیزیں دوسری شام تک کے لیے حرام ہو جاتی تھیں۔

عمری جوئیں

یہ عجیب و غریب اور حیرت انگیز روایت کنز العمال میں ہے کہ حضرت عمر حالت نماز میں اس کثرت سے جوئیں مارا کرتے تھے کہ ان جوؤں کا خون آپ کی انگلیوں پر منجمد ہو جایا کرتا تھا۔

روایت میں یہ صراحت نہیں ہے کہ آپ اپنے سر کی جوئیں مارتے تھے یا کپڑوں کی؟ لیکن ظاہر ہے کہ دونوں جگہوں کی جوئیں مارتے رہے ہوں گے کیونکہ دس، بیس جوؤں کے قتل عام سے انگلیوں پر خون کا انجماد نہیں ہوتا۔ پھر روایت میں "کثرت" کا لفظ اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ آپ حالت نماز میں ہزاروں جوؤں کے قتل کا ارتکاب کرتے تھے، دوسرے یہ کہ آپ کی اس گھناؤنی حرکت سے ایک مسئلہ اور حل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں میں اس امر کے متعلق سخت اختلاف ہے کہ نماز میں ہاتھ کھول کر کھڑے ہونا چاہیے یا ہاتھ باندھ کر؟ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے۔ اگر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے تو اس کثرت سے سر کے بالوں یا بدن کے کپڑوں سے جوئیں کیوں کر نکالتے؟ کیا کوئی شخص جو ہاتھ باندھ کر نماز ادا کرتا ہو اس کثرت سے جوئیں مار سکتا ہے؟

جوتیوں کا رومال

فرزند عاصم کا بیان ہے کہ حضرت عمر ۔ ۔ ۔ ۔ دھو کر اپنی جوتیوں میں پونچھ لیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ عمر کا رومال صرف جوتیاں ہیں۔ اور صائب بن یزید کا بیان ہے کہ میں نے اکثر رات کا کھانا عمر بن خطاب کے ساتھ کھایا ہے، وہ گوشت اور روٹی کھاتے تھے اور کھانے کے بعد ہاتھوں کو پیروں پر رگڑ کر صاف کر لیا کرتے تھے[۱] اور ثابت سے روایت ہے کہ ایک دن جارود نے حضرت عمر کے ساتھ کھانا کھایا اور کھانے کے بعد ہاتھ پونچھنے کے لیے رومال طلب کیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنے پاخانے کے مقام پر پونچھ لو[۲]

ان تینوں روایتوں کی گہرائیوں میں حیرت و استعجاب کا سفینہ ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر عمر کو رومال میسر نہیں تھا تو آپ بالکل برہنہ بھی نہیں رہتے ہوں گے۔ جسم پر تہ بند، کرتا یا بنیائن وغیرہ تو ضرور ہی رہتا ہوگا، اسی میں پونچھ لیتے۔ آخر یہ جوتیوں میں پونچھنے کی کون سی منطق کارفرما تھی؟ پھر ہاتھوں کو پیروں پر رگڑ کر یا جوتیوں میں پونچھتے تھے تو منہ کو کس چیز سے پونچھتے تھے؟ کیونکہ کھانے کے بعد تو ہاتھ اور منہ دونوں ہی دھوئے اور پونچھے جاتے ہیں۔ پھر پہلی روایت میں اس بات کی بھی صراحت نہیں ہے کہ کس چیز کو اپنی جوتیوں میں پونچھتے تھے۔ رہا ہاتھوں کو پیروں پر رگڑ کر پونچھنا، وہ بھی تعجب خیز

---

۱ کنز العمال ج ۶ ص ۳۴۶ ۲ کنز العمال ج ۶ ص ۳۴۸

ہے۔ کیونکہ عقل تو اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ ہاتھوں کو جوتیوں سے اور منہ کو کسی اور چیز سے پونچھتے رہے ہوں گے۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز و تعجب خیز جارود کو پاخانے کے مقام پر ہاتھ صاف کرنے کا مشورہ ہے۔

اعتراف منافقت

یہ واقعہ شکوک و شبہات سے بالاتر اور تاریخی اعتبار سے مسلسل و متواتر ہے کہ سنہ ۹ھ میں غزوۂ تبوک کی واپسی پر پیغمبر اسلامؐ کو "ذی فتق" نامی ایک خطرناک گھاٹی سے گزرنا تھا، یہ گھاٹی سواری کے لیے انتہائی خطرناک اور ناسازگار تھی۔ چنانچہ رسول اکرمؐ کا ناقہ جس کی مہار حذیفہ یمانی کے ہاتھوں میں تھی، جب اس گھاٹی میں داخل ہوا تو یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ جب تک آنحضرتؐ کا ناقہ اسے عبور نہ کر جائے کوئی شخص اس گھاٹی میں داخل ہونے کی جسارت نہ کرے۔

رات کی تاریکی میں آنحضرت کا ناقہ احتیاط اور خاموشی کے ساتھ اس تنگ و پرخطر گھاٹی سے گزر رہا تھا کہ اچانک بجلی چمکی جس کی روشنی میں رسول اللہ نے کچھ ایسے سواروں کو دیکھا جو آپ کو قتل کرنے کے لیے اپنے چہروں کو نقابوں میں چھپائے پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ خدا کے حکم سے بجلی کی روشنی اتنے وقفہ تک قائم و برقرار رہی کہ نگاہِ رسالت نے سب کو پہچان لیا اور پھر آنحضرتؐ نے حذیفہ سے فرمایا کہ: اے حذیفہ! کیا تم جانتے ہو کہ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ منافق میری جان لینا چاہتے تھے۔ پھر آپ نے حذیفہ کو سب کے ناموں سے آگاہ بھی کر دیا اور یہ تاکید بھی

فرمادی کہ اس امر میں خاموش رہنا ورنہ فساد ہو گا۔

"واقعۂ عقبہ" کے نام سے یہ واقعہ تمام مستند تاریخی کتابوں میں موجود ہے۔ روضۃ الاحباب میں ہے کہ وہ نقاب پوش اکابرین صحابہ تھے۔

شاید اسی سبب سے حضرت عمر کو یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں حذیفہ کی زبان سے ان کے نام کا انکشاف نہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ حذیفہ سے پوچھا کرتے تھے کہ اے حذیفہ! کیا مجھ میں تم نفاق کا کوئی اثر پاتے ہو؟[1] رسول اللہ کی تاکید کے تحت حذیفہ اس سوال پر خاموشی اختیار کر لیا کرتے تھے۔ اور پھر۔ آخر کار۔ ایک دن حضرت عمر نے یہ اعتراف کر ہی لیا کہ:

"اے حذیفہ! خدا کی قسم، میں بھی ان منافقین میں سے ہوں۔"[2]

حضرت عمر کی یہودیت

(پہلی روایت) جابر بن عبداللہ انصاری (صحابی رسولؐ) سے مروی ہے کہ ایک دن عمر بن خطاب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا "یا رسول اللہ! ہم جب یہودیوں سے (ان کی) حدیثیں سنتے ہیں تو وہ ہمیں بڑی اچھی لگتی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ہم انھیں لکھ لیا کریں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کیا تم بھی یہود و نصاریٰ کی طرح حیران و حیرت زدہ ہو۔ جبکہ میں تمھارے درمیان ایک روشن

[1] احیاء العلوم غزالی ص ۴۔ [2] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۶۵

شریعت لایا ہوں۔ (یاد رکھو) کہ اگر حضرت موسیٰؑ (زندہ) ہوتے تو وہ بھی میری ہی پیروی کرتے۔[1]

(دوسری روایت) یہ روایت بھی جناب جابر سے منقول ہے کہ ایک دن حضرت عمر رسول اکرمؐ کی خدمت میں توریت کا ایک نسخہ لے کر حاضر ہوئے اور فرمایا کہ: اے رسولؐ خدا! میں توریت لایا ہوں۔ عمر کے اس کہنے پر رسولؐ اللہ خاموش رہے لیکن جب آپ (عمر) نے اس کی تلاوت شروع کر دی تو رسولؐ کا چہرہ غصہ سے سرخ اور متغیر ہونے لگا۔ یہ کیفیت دیکھ کر ابوبکر نے عمر کو ڈانٹا اور کہا "گم کرنے والی عورتیں تجھے گم کر دیں" رسولؐ کا چہرہ نہیں دیکھتا کہ اس پر غیظ و غضب کے آثار مرتب ہیں۔ اس پر عمر نے کہا کہ میں خدا اور اس کے رسولؐ سے پناہ چاہتا ہوں۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ قسم ہے اس معبود کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے اگر موسیٰؑ اس وقت تمھارے درمیان آجائیں تو تم مجھے چھوڑ کر ان کا دامن تھام لو گے اور صراطِ مستقیم سے ہٹ جاؤ گے۔ حالانکہ اگر موسیٰؑ میری نبوت کا زمانہ پاتے تو وہ بھی میری ہی پیروی کرتے۔[2]

یہ دونوں روایتیں قابل توجہ ہیں۔

۱۔ حضرت عمر جب یہودیوں سے ان کی حدیثوں کو سنتے تھے تو وہ انھیں بڑی اچھی لگتی تھیں یہاں تک کہ آپ انھیں لکھ کر محفوظ بھی کر لینا چاہتے تھے۔

انسانی و ایمانی فطرت کے تحت (خصوصاً مذہبی معاملات میں) انسان کو

[1] مشکوٰۃ ج ۱ ص ۵۱ [2] مشکوٰۃ ج ۱ ص ۵۵

اپنی شریعت کے مقابلے میں کسی (منسوخ شدہ) غیر شریعت کی کوئی شے اس وقت اچھی معلوم ہوتی ہے جب اس میں کوئی خیر و خوبی کی بنا پر واقعی وہ شے اچھی بھی ہو اور اس انسان کا دل اسے قبول بھی کرتا ہو یا پھر وہ انسان اپنی شریعت کے لیے مخالفانہ اور منافقانہ نظریہ رکھتا ہو۔

حضرت عمر کو یہودیوں کی روایتوں کا اچھا لگنا اور انھیں قلم بند کر کے محفوظ کر لینے کی خواہش اس بات کی محکم دلیل ہے کہ حامل وحی کی زبان مبارک سے جو حدیثیں عالم وجود میں آتی تھیں وہ آپ کو اچھی نہیں لگتی تھیں، ورنہ جس پیغمبرؐ کی شریعت پر آپ خود بھی (بظاہر) عمل پیرا تھے اس سے یہ کہنے کی جسارت کہ یہودیوں کی حدیثیں ہمیں بڑی اچھی لگتی ہیں۔ چہ معنی!

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "عمری طینت" میں یہودیت کا عنصر بھی بدرجۂ اتم موجود تھا اور آپ اپنی "برگزیدہ مسلمانی" کے ساتھ یہودیوں کی صحبت بھی اختیار کرتے تھے۔ ان کی محفلوں میں جاتے تھے اور ان کی حدیثوں[1] کو سن کر اپنے آئینۂ ایمان پر یہودیت کی جلا بھی کرتے تھے۔

شاید یہی وجہ رہی ہو کہ ابو بکر کے بعد جب اقتدار کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں آئی اور آپ تخت حکومت پر متمکن ہوئے تو تمام مسلمانوں کو احادیث نبوی کی کتابت، انھیں جمع کرنے یا بیان کرنے سے روک دیا[1] اور صرف یہی نہیں بلکہ جو حدیثیں مسلمانوں نے پیغمبر اسلامؐ سے سن کر ایک عظیم سرمایہ کی شکل میں جمع کی تھیں ان سب کو اکٹھا کر کے نذر آتش کر دیا[2]۔

---

۱ کنز العمال ج ۵ ۲ طبقات ج ۵ ص ۱۴۰

حضرت عمر کو اگر پیغمبرؐ کی پیغمبری، صداقت، سچائی اور حق بیانی پر مکمل اعتماد و بھروسہ ہوتا اور وہ آپ کی حدیثوں کو قابل اعتنا سمجھتے تو ان حدیثوں کے مقابلے میں انھیں یہودیوں کی حدیثیں اچھی ہی کیوں لگتیں یا وہ بزم پیغمبرؐ کے علاوہ یہودیوں کی محفلوں میں جاتے ہی کیوں؟ کہ رسول اللہؐ کو آپ سے اس ظاہر و باطن پر اتمام حجت کے لیے یہ کہنا پڑتا کہ کیا تم بھی یہود و نصاریٰ کی طرح (میری رسالت پر) حیران و حیرت زدہ ہو اور اندھیروں کی طرف جانا چاہتے ہو؟ جبکہ میں تمھارے درمیان ایک روشن شریعت لے کر آیا ہوں، ایسی شریعت کہ اگر حضرت موسیٰؑ ہوتے تو وہ بھی میری ہی پیروی کرتے۔

۲۔ (الف) آنحضرت کی خدمت میں عمر توریت لے کر حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہؐ میں توریت لایا ہوں۔

(ب) آپ (عمر) نے رسولؐ کی خاموشی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور سردار انبیاءؐ کی مرضی کے خلاف توریت کی تلاوت کی۔

(ج) آپ کی اس غیر اسلامی حرکت پر رسول اسلام کا چہرہ غصہ سے سرخ اور متغیر ہوا۔ یہ کیفیت دیکھ کر ابو بکر نے آپ کو پھٹکارا اور کہا: "گم کرنے والی عورتیں تجھے گم کر دیں" رسول اللہ کا چہرہ نہیں دیکھتا۔

(د) آپ نے خدا اور اس کے رسولؐ سے پناہ چاہی۔ مگر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر اس وقت موسیٰؑ تمھارے درمیان آجائیں تو تم مجھے چھوڑ کر ان کا دامن تھام لوگے اور گمراہ ہو جاؤ گے حالانکہ موسیٰؑ بھی اگر میری نبوت کا زمانہ پاتے تو وہ بھی میری ہی پیروی کرتے۔

یہ دوسری روایت پہلی روایت پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے اور

یہ ظاہر کرتی ہے کہ ارشاد پیغمبرؐ کو ہذیان[1] سے تعبیر کرنے والی اور "قرآن کافی ہے[2]"، کا نعرہ بلند کرنے والی عمری فطرت کی نظر میں نہ تو قرآن کی کوئی اہمیت تھی اور نہ رسولؐ کا کوئی ادب و لحاظ تھا ورنہ لب کشائی کی یہ جسارت کہ میں توریت لایا ہوں یا اس کی تلاوت کی ہمت، چہ معنی! جبکہ پیغمبرؐ خود بھی حامل قرآن، حامل شریعت اور تمام انبیاء کی سابقہ شریعتوں کو منسوخ کرنے والے تھے۔

میرے خیال میں توریت سے آپ کی والہانہ دلچسپی اور یہودیت کی طرف آپ کا رجحان تعجب خیز اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کو ابتدا ہی سے محمدؐ کی نبوت میں شک تھا جیسا کہ مختلف مواقع پر ظاہر ہوا اور حدیبیہ[3] میں کھل کر سامنے آیا۔

رسول اکرمؐ کی حق شناس نظریں یقیناً اس امر حقیقت کو تاڑ گئی ہوں گی کہ عمر کی منافقانہ طینت اسلام کے بجائے یہودیت کی طرف زیادہ مائل ہے، اسی لیے آپ نے فرمایا کہ اگر اس وقت حضرت موسیٰ تمہارے درمیان آجائیں تو تم مجھے چھوڑ دو گے اور ان کا دامن تھام لوگے۔ یعنی گمراہ ہو جاؤ گے۔

لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ وہ عمر نواز حضرات جو شیعوں کے بارے میں یہ غلط نظریہ رکھتے ہیں کہ شیعہ مسلمان نہیں ہیں، شیعہ کافر ہیں اور شیعہ یہودی ہیں کیونکہ شیعیت کا مؤسس عبداللہ بن سبا تھا[4]

---

[1] بخاری پ ۳۰ ص ۲۴۲ [2] سرالعالمین ص ۹، بخاری ۱۰، ص ۱۲۲، ۱۳۵ [3] ج ۲ پ ۱ ص ۶۹۶، مسلم ج ۵ ص ۶۷ و شرح بخاری (عسقلانی) ج ۱۷ ص ۱۲۹ وغیرہ [5] تاریخ ابن خلدون ص ۲۶۱

اپنے اس دینی و روحانی پیشوا (عمر) کی یہودیت سے دانستہ یا نادانستہ طور پر بیگانہ ہیں۔

اسلامی غزوات سے حضرت عمر کا فرار اور شجاعت

قرآن کہتا ہے کہ:

"اے ایمان والو! جب تم کفار سے میدان جنگ میں لڑنا تو ان کی طرف (ہرگز ہرگز) پیٹھ نہ کرنا اور جو شخص ان کی طرف پیٹھ پھیرے گا وہ یقینی خدا کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔" (انفال ۱۲،۱۶)

لیکن اس صریحی حکم کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر کی وہ تلوار جو حالت کفر میں پیغمبر اسلامؐ کے خون کی پیاسی تھی اور حصار اسلام میں داخل ہونے کے بعد جس کا لوہا مسلمانوں کے لیے ہر وقت گرم رہتا تھا، تمام اسلامی معرکوں سے راہ فرار اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تاریخیں شاہد ہیں کہ جہاں زندگی اور موت کے درمیان ٹکر کا مرحلہ درپیش ہوتا تھا، حضرت عمر وہاں سے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتے تھے اور اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے کبھی جنگ کے میدان میں اپنے جسم پر زخم تو کیا، پھول کی ایک چھڑی تک نہیں کھائی۔

الخلفاء حصہ اول میں واقعات ابوبکر کے ساتھ ہم اسلامی معرکوں سے آپ کے فرار کے واقعات قلم بند کر چکے ہیں لیکن ضروری ہے کہ یہاں بھی اجمالی تفصیل تحریر کر دی جائے تاکہ تسلسل برقرار رہے۔

۱۔ جنگ بدر میں آپ کا کوئی جنگی کارنامہ نہیں ملتا بجز اس کے کہ آپ

اس جنگ کے سخت مخالف تھے اور آپ کو رسول اللہ کی رائے سے قطعی اتفاق نہیں تھا۔ تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ جنگ اللہ کی مدد اور علیؑ کی شجاعت سے فتح ہوئی۔

۲۔ جنگ احد ایک ایسی ہولناک جنگ تھی کہ جس میں آنحضرتؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے، پیشانیٔ اطہر زخمی ہوئی، اگر تائید الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو شاید شمع رسالت ہی گل ہوگئی ہوتی۔

اس جنگ میں تمام صحابہ رسول اکرمؐ کو دشمنوں کے درمیان چھوڑ کر فرار ہو لیے تھے۔ بخاری کا کہنا ہے کہ ابو بکر، عمر اور عثمان میں سے کسی کا کوئی پتہ نہ تھا۔ حضرت عمر بھاگ کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تھے۔ چنانچہ خود ان کا بیان ہے کہ میں پہاڑ کی چوٹی پر اس طرح اچک رہا تھا جیسے کوئی پہاڑی بکری اچکتی ہے[1] حضرت عمر بھی ابو بکر کے ساتھ سرپٹ بھاگے اور کوہ احد پر دم لیا[2]۔ طبری ج ۲ ص ۱۹۴ اور کامل ج ۲ ص ۱۱۰ میں ہے کہ عثمان بھی بھاگے اور تیسرے دن واپس پلٹے۔

اس جنگ میں ستر مسلمانوں کے ساتھ حضرت حمزہؓ بھی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور ذلیل وکمینہ خصلت معاویہ کی ماں ہندہ جگر خوارہ نے آپ کا کلیجہ نکال کر چبایا نیز آپ کی انگلیوں کا ہار اپنے گلے میں پہنا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ اس جنگ میں سولہ زخم کاری حضرت علیؑ کے جسم پر لگے اور یہ جنگ بھی حضرت علیؑ کی جانبازی، قوت اور تلوار کے بل بوتے پر فتح ہوئی۔

۱۔ در منثور ج ۲ ص ۸۸، کنز العمال ج ۱ ص ۲۳۸ ۲۔ تفسیر کبیر (رازی) ج ۳ ص ۱۰۸ مطبوعہ مصر

۳۔ جنگ خندق میں جب عمرو بن عبدود فرزندان توحید کو للکار رہا تھا تو ڈر کے مارے آپ کا برا حال تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے سر پر طائر بیٹھ گیا ہو۔ رسول اللہ نے خصوصی طور پر عمر کو عمرو کے مقابلے کے لیے آمادہ کرنا چاہا لیکن آپ نے حکم رسولؐ کو ٹھکراتے ہوئے صاف انکار[1] کر دیا کہ عمرو ایسے دیو پیکر سے مقابلہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔

۴۔ جنگ خیبر میں آپ کی عمری غیرت قدرے مردانگی کی طرف مائل ہوئی اور آپ ہمت کر کے دشمنوں سے مقابلہ کے لیے میدان میں نکلے۔ لیکن مرحب نے جب ریلا دیا تو سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ علامہ شبلی نے بھی آپ کی اس بزدلی اور نامردی کا اعتراف کرتے ہوئے "سیرۃ النبی" میں تحریر کیا ہے کہ، حضرت عمر کے پاؤں میدان میں نہ جم سکے اور واپس آکر انھوں نے رسول اللہ سے یہ شکایت کی کہ فوج والوں نے نامردی دکھائی اس کے برعکس فوج والوں نے بھی کہا کہ وہ (عمر) خود نامرد ہیں[2]۔

مورخین کا کہنا ہے کہ اس جنگ میں جب صحابہ منہ کی کھا چکے تو رسولؐ نے فرمایا کہ کل علم اس کو دوں گا جو کرار وغیر فرار ہو گا۔ خدا و رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہوں گے اور وہ خدا و رسولؐ کو دوست رکھتا ہو گا، وہ دشمنوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والا ہو گا اور میدان سے اس وقت تک نہ ہٹے گا جب تک فتح وظفر سے ہمکنار نہ ہو جائے۔ اس اعلان کے بعد حضرت رسولؐ خدا نے دوسرے دن علم حضرت علیؑ کو دیا اور قلعۂ قموص فتح ہو گیا۔

۱۔ در منثور ج ۵ ص ۸۵، روضۃ الصفا ص ۹۶ ۲۔ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۶۵

۵۔ جنگ حنین سے بھی آپ (عمر) کا فرار حتمی طور پر ثابت ہے۔ اس جنگ میں آپ کو اپنی اکثریت پر بڑا ناز تھا لیکن دشمنوں نے جب حملہ کیا تو اس طرح بھاگے کہ رسولؐ اللہ کو مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ سب سے پہلے سیف اللہ خالد بن ولید بھاگے، ان کے پیچھے نو مسلم[1] بھاگے، ان کے پیچھے آپ (عمر) بھاگے اور آپ کے پیچھے انصار و مہاجر بھاگے۔

غرض کہ پیغمبر اسلامؐ کے پاس حضرت علیؑ، عباس، ابن مسعود اور ابن حارث کے علاوہ کوئی نہ ٹھہرا اور یہ بے چارے بزدلوں کی اس میل ٹرین کو بھلا کس طرح روکتے جو بغیر سگنل کے اسٹیشن چھوڑ چکی تھی اور ڈیزل انجن (خالد) کی بدولت برقی رفتار سے بزدلی کی پٹری پر دوڑ رہی تھی البتہ جو مسلمان آخری بوگی کے پیچھے لٹکے ہوئے تھے ان میں سے کچھ رسولؐ کی آواز پر کود کر واپس آگئے اور انھوں نے حضرت علیؑ کے ساتھ مل کر اس ہارتی ہوئی جنگ کو فتح و کامرانی سے ہمکنار کرنے میں نمایاں کردار بھی ادا کیا۔

یہ مشہور و معروف اسلامی معرکے ہیں جن کا مفصل تذکرہ تاریخوں میں موجود ہے اور ان معرکوں میں پیغمبر اسلامؐ خود بہ نفس نفیس شریک رہے۔ پہلی جنگ بدر کی ہے، جس سے حضرت عمر کا فرار ثابت نہیں ہے صرف رسول اکرمؐ کی رائے سے اختلاف اور عدم کارگزاری کی وجہ یہ ہے کہ اس جنگ میں آپ کے ماموں ابوجہل صاحب کفار مکہ کے ساتھ آنحضرتؐ سے لڑنے آئے تھے اور آپ (عمر) ماموں کے خلاف میدان میں نکل کر

---

[1] بیعت رضوان والوں سے مراد ہے۔

محسن کشی کا الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتے تھے اس لیے کنارہ کش رہے۔ احد میں مجاہدین اسلام پر برا وقت پڑا، آنحضرتؐ بھی سخت زخمی ہوئے، بہت سے مسلمان میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے آپ نے بھی راہِ فرار اختیار کی۔ بخاری نے آپ کے فرار کا واقعہ واضح طور پر تحریر کیا ہے۔ امام فخر الدین رازی اور علامہ نیشاپوری کی تحریروں سے بھی آپ کا فرار ثابت ہے، ان دونوں علماء کی تحریروں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ میدان سے شیخین کے ساتھ فرار ہونے والوں میں حضرت عثمان بھی تھے۔ علامہ سیوطی نے اپنی تفسیر در منثور میں حضرت عمر کے فرار کو خود موصوف کی زبانی نقل کیا ہے۔

ابوبکر کا فرار عمر کے قول سے ثابت ہے، وہ یہ کہ جب حضرت رسولؐ خدا کو میدان میں چھوڑ کر تمام صحابی بھاگ نکلے اور آنحضرتؐ زخمی ہو کر بیٹھ گئے تو کسی بدبخت نے یہ اعلان کر دیا کہ محمدؐ مارے گئے تم لوگ اپنے اپنے قدیم مذہب کی طرف پلٹ جاؤ۔ چنانچہ جنگ کے خاتمہ پر حضرت علیؑ نے عمر سے پوچھا کہ کیا تم نے یہ اعلان کیا تھا کہ محمدؐ مارے گئے؟ عمر نے جواب دیا کہ یہ اعلان ابوبکر نے کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرار کے وقت حضرت عمر اور ابوبکر دونوں ایک دوسرے سے قریب تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں نے مل کر یہ اعلان کیا ہو کہ محمد مارے گئے تم لوگ اپنے اپنے پرانے عقیدوں کی طرف پلٹ جاؤ، یعنی کفر اور بت پرستی پھر اختیار کر لو۔

خندق کی جنگ میں حضرت عمر نے عمرو بن عبدود سے لڑنے کے لیے صریحی طور پر انکار کر دیا۔ یہ عذر بھی آپ کا بے سبب نہ تھا۔ کیونکہ عمرو بن عبدود غیر معمولی خلقت کا انسان تھا اور حضرت عمر کے نزدیک اس دیو پیکر سے مقابلہ کرنا خلاف عقل تھا۔

خیبر کی جنگ میں بھی نامردی کا تاج فوج والوں نے آپ کے سر رکھا اور حنین میں بھی آپ کا فرار ثابت ہے جو آپ کی بزدلی اور نامردی کی کھلی ہوئی دلیل ہے لیکن افسوس اور تعجب تو اس بات کا ہے کہ عمر نواز مورخین نے تاریخ کے دامن کو حضرت عمر کے جنگی کارناموں سے بھر دیا ہے جبکہ عہدِ رسالت کے دامن پر آپ کی جنگی کارگزاری کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے برعکس آپ ہر میدان سے بھاگتے نظر آتے ہیں۔

آپ کے پر تشدد اور استبدادی دورِ حکومت میں اسلام کے نام پر ملک گیری کی ہوس نے جن فتوحات کا سہرا آپ کے سر باندھا ہے، اس میں بھی آپ کی سیاسی بازی گری اور شاطرانہ چالوں کے علاوہ ذاتی شجاعت کا کہیں سے کوئی دخل نہیں ہے اور نہ سیرت رسولؐ پر عمل پیرا ہو کر آپ کسی جنگی محاذ پر گئے۔ حقیقتاً یہ کارنامہ ان نمک خوار، وفادار اور آزمودہ کار کمانڈروں اور جرنیلوں کا ہے جو جاہل، فاقہ کش اور ننگے بھوکے عربوں کو لے کر مالِ غنیمت کے لیے کسریٰ و روم کی حکومتوں پر ٹوٹ پڑے اور انھوں نے ایرانیوں و رومیوں سے (بزورِ شمشیر) بہت سے ملک چھین کر آپ کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا۔ حکومت کے استحکام اور سازگار حالات کو دیکھتے ہوئے ابوبکر کے بعد آپ کی جگہ اگر مٹی کا خلیفہ بھی ہوتا تو یہی سہرا اس کے سر جاتا۔

ان تمام حقائق و شواہد کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی یا ناواقفیت کی بنا پر موضوعہ روایات کے تحت مسلمانوں کا ایک فرقہ حضرت عمر کو تمام صحابہ بلکہ بعض امور میں رسولؐ سے افضل سمجھتا ہے اور تمام شجاعانِ عرب کی شجاعتوں پر آپ کی شجاعت کو فوقیت دیتا ہے جبکہ حقیقت

یہ ہے کہ نہ آپ افضل تھے نہ شجاع تھے نہ بہادر تھے اور نہ دلیر تھے۔ البتہ آپ کی کسی اہم اور ممتاز شجاعانہ کارگزاری پر اگر کسی محقق کی نظر مرکوز ہوتی ہے تو وہ یہ ہے کہ جب محمد بن عبداللہ (رسول اکرمؐ) نے خدائی دین (اسلام) کی تبلیغی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اسے عوام میں روشناس کرانا چاہا اور آپ کو اس امر کا پتہ چلا تو غیظ و غضب کے بخار نے آپ کو اس طرح جکڑا کہ آپ ہوش و حواس سے محروم ہو کر مسلسل چھ برس تک اس بیماری میں مبتلا رہے اور آخر کار ایک دن آپ پر کچھ ایسی جنونی کیفیت طاری ہوئی کہ رسول اللہ کا قصہ تمام کرنے شمشیر بدست گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن چونکہ خدا، رسولؐ کے تحفظ کا ضامن تھا، اس لیے آپ کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

دوسری شجاعانہ کارگزاری یہ بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے طوافِ خانہ کعبہ کے بعد ہزاروں کفار و مشرکین کی موجودگی میں علانیہ طور پر مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی جبکہ کفار قریش کی عداوت و ریشہ دوانیوں نے رسولؐ کو خفیہ طور پر مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا[1]۔

یقیناً اسلام دشمن، جاہل اور خونخوار عربوں کی موجودگی میں کسی ایسے شخص کا جو (بظاہر) مسلمان ہو، علانیہ سفر ہجرت اختیار کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا جبکہ رسولؐ اللہ کی ہجرت کا محتاط طور و طریقہ بھی اس کے سامنے تھا۔

میرے خیال میں آپ کا یہ اقدام ایک نادر اور مثالی شجاعت کا

---

[1] رسولؐ اللہ نے کفار قریش سے خوفزدہ ہو کر ہجرت نہیں فرمائی بلکہ آپ کے لیے خدا کا حکم تھا۔

نمونہ اس وقت تصور کیا جاتا جب آپ کے ماموں ابوجہل صاحب آپ کو امان و پناہ نہ دے چکے ہوتے، بھلا ماموں جان کی اس امن و پناہ کے سامنے کس کی مجال تھی جو آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا۔ لہٰذا ماموں کی دھاک کی بدولت آپ نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور وہاں سے فرار ہو لیے۔ چنانچہ آپ کی یہ علانیہ ہجرت ابوجہل کے رحم و کرم کا نتیجہ تھی، جس کی واضح دلیل یہ پیش کی جاسکتی ہے کہ جب پیغمبر اسلامؐ نے آپ کو صلح حدیبیہ سے قبل کفار قریش سے باہمی گفتگو کے لیے مکہ بھیجنا چاہا تو آپ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ کفار مجھے اب زندہ نہ چھوڑیں گے یقیناً یہ جملہ آپ کا اس مجبوری کے تحت تھا اس لیے کہ بدر کی لڑائی میں آپ کے ماموں جان (ابوجہل) فی النار ہو چکے تھے لہٰذا آپ کو کون بچاتا؟

مختصر یہ کہ آپ (عمر) آنحضرت کی زندگی میں ان کے قتل پر آمادہ رہے، اسلامی جنگوں سے فرار اختیار کرتے رہے، احکام رسالت کی نافرمانیوں کے مرتکب ہوتے رہے اور خدا کے رسولؐ کو اس کی زندگی کے آخری لمحات میں (معاذ اللہ) ہذیان گو قرار دے کر ایک ایسا نوشتہ لکھنے سے باز رکھا جو قیامت تک مسلمانوں کو گمراہی سے محفوظ رکھتا۔ اور پھر بعد وفات پیغمبرؐ آپ نے اپنے ہی نبیؐ کی بیٹی (فاطمہؑ) کے گھر میں آگ لگا کر شجاعت کا وہ کارنامہ انجام دے دیا جس سے تمام عالم انسانیت لرز اٹھا۔ اب اس کے بعد بھی اگر مسلمان آپ کی افضلیت و شجاعت کا معترف ہے تو ہوا کرے، حشر میں انجام خود سامنے آجائے گا۔ ہم کسی کو منع کیوں کریں؟ بہرحال ہمارا سر تو ان عمری کارناموں پر ندامت و شرمندگی سے جھک جاتا ہے۔

عمری تشدد

تشدد چونکہ حضرت عمر کی فطرت میں داخل تھا، اس لیے آپ نے اپنے پُر تشدد طرزِ عمل کو کفار کے علاوہ دوست، احباب، بہن، بیٹے، اہل خاندان نیز دیگر مسلمانوں اور خصوصی طور پر اہل بیت اطہارؑ پر مرتے دم تک جاری رکھا۔ آپ کے تشدد کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

ابوہریرہ پر تشدد

۱۔ سنہ ۲۱ھ میں عمر نے ابوہریرہ کو بحرین کا گورنر مقرر کیا، پھر ان پر چوری کا الزام عائد کر کے سنہ ۲۳ھ میں معزول کر دیا اور ان سے دس ہزار کا مطالبہ اس بنیاد پر کیا کہ انھوں نے یہ رقم بیت المال سے اڑائی ہے۔

عقد الفرید میں ہے کہ آپ نے ابوہریرہ کو طلب کیا اور ان سے فرمایا کہ میں نے تمھیں اس وقت بحرین کا حاکم مقرر کیا تھا جب تمھارے پیروں میں جوتیاں بھی نہیں تھیں اور اب معلوم ہوا ہے کہ تم نے سولہ سو دینار کے گھوڑے خریدے ہیں۔ بتاؤ یہ رقم کہاں سے آئی؟

ابوہریرہ نے جواب دیا کہ کچھ رقم مجھے اپنے جانوروں کی فروخت سے دستیاب ہوئی اور کچھ مسلمانوں کا عطیہ تھی جس سے میں نے گھوڑے خرید لیے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ رقم استعمال کرنے کا حق تمھیں نہیں تھا لہٰذا واپس کرو۔ ابوہریرہ نے کہا کہ میری ذاتی رقم سے آپ کا کیا

تعلق ہے اور آپ اسے مانگنے والے کون ہوتے ہیں؟

یہ سن کر آپ (غصہ سے) بے قابو ہو گئے اور ابو ہریرہ پر وہ تازیانہ رسید کیا کہ کھال تک ادھڑ گئی اور صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے انھیں ماں کی گالی سے بھی سرفراز کیا۔[1]

۲۔ پیغمبر اسلامؐ نے ابو ہریرہ کو اس اعلان کے لیے مامور فرمایا کہ "اللہ کی بارگاہ میں جو شخص باایمان جائے گا اسے جنت عطا کی جائے گی"۔ ابو ہریرہ رسولؐ کے حکم پر اس بشارتی اعلان کے لیے نکلے۔ راستہ میں عمر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ آپ نے پوچھا، ابو ہریرہ کہاں چلے؟ ابو ہریرہ نے مقصد بتایا۔ سنتے ہی آپ پر جنون طاری ہوا اور آپ نے ابو ہریرہ کے ساتھ وہ کیا کہ آپ زمین پر الٹ گئے اور روتے پیٹتے رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مرمت کی روداد بیان کی۔ اتنے میں عمر بھی وہاں پہنچ گئے پیغمبرؐ نے مواخذہ کیا تو تڑپ کر بولے کہ ایسے اعلان سے کیا فائدہ کہ امت عمل کو ترک کر کے صرف عقیدہ اور ایمان پر جنت وصول کرنے لگے چنانچہ رسول اکرمؐ نے اس مشورہ کی صحت کا اعتراف کرتے ہوئے اعلان کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔[2]

پہلی روایت عمری دور حکومت کی ہے اور دوسری روایت کا تعلق دور رسالت سے ہے۔ لیکن ان دونوں روایتوں میں بے چارہ جھوٹی حدیثیں گھڑنے والا ابو ہریرہ، حضرت عمر کے جارحانہ اقدام کا شکار نظر آتا ہے۔ پہلی روایت میں اس کا جرم یہ ہے کہ اس نے اپنے جانوروں کی

---

[1] عقدالفرید ج۱ ص ۴۳ [2] شرح مسلم (نووی) ج۱ ص ۲۳۷

فروخت اور عطیہ کی رقم سے کچھ گھوڑے خرید لیے تھے جسے عمری فطرت برداشت نہیں کر سکی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے اندر سرزنش کا یہی جذبہ اس وقت کیوں نہ بیدار ہوا جب آپ شام تشریف لے گئے تو وہاں معاویہ کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور طور طریقوں کے بارے میں سوال کیوں نہیں کیا؟ اسے سزا کا مستحق کیوں نہیں قرار دیا؟ صرف اس طنز پر کیوں اکتفا کی کہ ھٰذا کسری العرب یعنی "یہ تو عرب کا بادشاہ ہے"[1] آخر وہ بھی تو حکومت کی طرف سے گورنر کے عہدے پر مامور تھا؟

شاید اس لیے کہ شام میں معاویہ بحیثیت گورنر، مستقل، مضبوط اور مستحکم ہو چکا تھا، لہذا آپ کی زبان نہ کھل سکی کیونکہ وہ آپ کے وجود پر بھاری پڑ جاتا۔ اس کے برعکس ابو ہریرہ کی کھال آپ نے اس لیے ادھیڑ دی کہ وہ ایک کمزور شخص تھا۔

دوسری روایت یہ بتاتی ہے کہ آپ نے ابو ہریرہ کی پٹائی بھی کی اور رسول اکرمؐ کو اس امر کی تنبیہ بھی کی کہ آپ کا یہ اعلان کہ "جو شخص اللہ کی بارگاہ میں باایمان جائے گا اسے جنت عطا کی جائے گی" خلاف مصلحت ہے۔ اس سے واضح ہے کہ آپ اپنی رائے کو رسول اکرمؐ کی رائے پر مسلط کر دیا کرتے تھے۔ لیکن رسولؐ چونکہ خلق عظیم کے مالک تھے اس لیے اس بے ادبی اور تحقیر کو نظر انداز کر گئے جس کا فطری اثر یہ ہوا کہ یہ واقعہ عام یہ ہو کر عتبہ بن مالک، معاذ، عبادہ اور عثمان وغیرہم تک پہنچا اور تمام مسلمانوں نے اس اعلان کو جو پیغمبر چاہتے تھے قبول کر لیا اور آج بھی۔۔ اس پر عمل پیرا ہیں۔

---

[1] استیعاب ج۱ ص ۲۵۳، البدایہ والنہایہ ج۸ ص ۱۲۵

سعد بن ابی وقاص پر تشدد

سعد کو عمر نے شام کا حاکم مقرر کیا۔ پھر ایک دن نہ جانے کون سی رگ پھڑکی کہ آپ نے محمد بن مسلمہ کو یہ حکم جاری کیا کہ سعد کو گرفتار کر کے اس کے گھر میں آگ لگا دو۔ ابن مسلمہ نے اس قہری حکم پر عملدرآمد کرنا چاہا تو سعد نے پوچھا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ یہ حضرت عمر کی احتیاط و دانشمندی کا نتیجہ ہے۔

معلوم ہوا کہ عمری احتیاط و دانش مندی کا ماحصل آگ زنی ہے۔ اس کے سیاق و سباق پر قارئین کرام خود غور فرمائیں۔

خالد بن ولید پر تشدد

اس واقعہ کو علامہ عبدالحسین شرف الدین نے اپنی کتاب نص و اجتہاد (مترجمہ علامہ ذیشان حیدر جوادی) کے صفحہ ۱۹۴ و ۱۹۵ پر عبقریۃ عمر عقاد صفحہ ۲۴۵ کے حوالے سے یوں تحریر فرمایا ہے:

"جس زمانہ میں خالد قنسرین کا حاکم تھا۔ اشعث بن قیس نے اس سے کچھ رقم کا مطالبہ کیا۔ اس نے دس ہزار کی اجازت دے دی۔ عمر کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے ابو عبیدہ حاکم حمص کو لکھا کہ خالد کو معزول کر دو اور اسے ایک پیر پر کھڑا کر کے مجمع عام میں اس رقم کے بارے میں سوال کرو۔ اگر یہ رقم اس نے اپنے پاس سے دی ہے تو اسراف کیا ہے اور اگر بیت المال سے دی ہے تو خیانت کا مجرم ہے اور دونوں ہی صورتوں میں مستحق عتاب ہے۔ ابو عبیدہ نے خالد کو بلا کر مسجد میں یہ عمل انجام

دیا۔ خالد نے جواب میں بتایا کہ یہ سب اس کا ذاتی مال ہے۔ یہ سن کر ابو عبیدہ نے اس کی ٹوپی واپس کر دی، پیر کھول دیے اور اس کا احترام بھی کیا لیکن اس کی معزولی کا حکم نہیں سنایا۔ وہ چند روز تک اپنے بارے میں متحیر رہا، یہاں تک کہ حضرت عمر کا یہ حکم پہنچا کہ تم معزول کر دیے گئے ہو، لہٰذا وہاں سے ہٹ جاؤ۔"

قانون کی اصطلاحی زبان میں دو مختلف شکلوں کا نام "مجرم" اور "ملزم" ہے۔ مجرم اسے کہتے ہیں جو حقیقتاً کسی جرم کا مرتکب ہوا ہو اور وہ جرم اس کے بیان یا مستند گواہوں کی گواہی سے ثابت بھی ہو جائے۔ بصورت دیگر ملزم وہ ہوتا ہے جس پر محض الزام عائد کیا گیا ہو۔

ملزم اس وقت تک سزا کا مستحق نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس پر عاید شدہ الزام اپنے محکم اور ٹھوس ثبوت کی بنیاد پر اسے مجرم تسلیم کرنے پر مجبور نہ کر دے۔

اصولی حیثیت سے عمری تشدد کا یہ واقعہ عمر کے عادلانہ طور طریقوں کی نفی کرتا ہے اور موصوف کے منصفانہ فقدان کا مظہر ہے۔ کیونکہ آپ نے کسی ثبوت یا تفتیش کے بغیر محض خبر کی بنیاد پر خالد کو اپنے غیر آئینی تشدد کا نشانہ بنایا ہے کہ اس نے دس ہزار کی رقم اشعث کو دے دی، جبکہ خالد کا کہنا ہے کہ وہ اس کا ذاتی مال تھا۔ اور خالد کے اس بیان پر ابو عبیدہ نے اسے آزاد بھی کر دیا اور معزولی کا حکم بھی سنانے سے گریز کیا کیونکہ ان کی نظر میں خالد مجرم نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ اپنے ذاتی مال میں سے کوئی شخص کسی شخص کی ضرورت کے تحت کسی شکل میں اگر کوئی رقم اسے دے دے تو اس کا شمار نہ اسراف

میں ہوگا اور نہ دینے والا شخص قانون کی نگاہ میں کسی سزا کا مستحق قرار پائے گا۔

عمر نے خالد پر جھوٹا الزام عائد کر کے اسے معزول، ذلیل اور رسوا کرنے کا جو بہانہ تلاش کیا ہے اس کی تہ میں ایک بہت بڑا راز مضمر ہے اور وہ یہ کہ خالد نے بچپن میں عمر کی ایک ٹانگ توڑ ڈالی تھی۔

یہ دلچسپ واقعہ تاریخ میں یوں مرقوم ہے کہ خالد اور عمر جو آپس میں خالہ زاد بھائی تھے، بچپن میں ایک دن کسی بات پر لڑ پڑے۔ خالد نے عمر کو پٹک کر نہ جانے کون سا داؤں استعمال کیا کہ موصوف کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بعد میں وہ جڑ تو گئی مگر زندگی بھر کے لیے آپ کو عیبی بنا گئی۔ یہی وجہ ہے کہ عمری سیرت نگاروں نے آپ کو معقل تحریر کیا ہے یعنی جب آپ چلتے تھے تو دونوں ایڑیاں باہم مل جاتی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے دونوں پیر بندھے ہوں۔ چنانچہ آپ کو اپنے اس عیبی پن کا احساس اس قدر شدید تھا کہ جب آپ خلیفہ بن گئے تو سب سے پہلے خالد کو یہ کہہ کر معزول کر دیا کہ: "خالد میری زندگی میں کسی عہدہ پر نہیں رہ سکتے۔"[1] اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر کی یہ کارروائی انتقامی جذبے کے تحت تھی۔

نصر بن حجاج پر تشدد

عبداللہ بریدہ سے مروی ہے کہ حسب عادت ایک رات عمر مدینہ

[1] سیرت حلبیہ ج ۳ ص ۱۹۸

کی گلیوں اور کوچوں میں گشت فرما رہے تھے کہ ایک گھر سے کسی مغنیہ کی آواز سنائی دی جو اضطراب و بے چینی کے ساز پر، پُر درد لہجہ میں اس مفہوم کا ایک شعر گنگنا رہی تھی کہ "کاش اس وقت نصر بن حجاج مجھے مل جاتا یا پھر تھوڑی سی شراب مل جاتی"!

آپ نے فرمایا کہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ پھر صبح ہوتے ہی نصر کو طلب کیا۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ فرمایا اس کے بال اس کے سر پر الٹ دیئے جائیں۔ اس عمل سے پیشانی کھلی تو چہرہ اور بھی نکھر گیا۔ پھر فرمایا کہ اس کے سر پر عمامہ رکھا جائے۔ عمامہ رکھا گیا تو وجاہت اور بڑھ گئی۔

نصر کا یہ حسن و جمال دیکھ کر آپ آگ بگولا ہو گئے۔ غیظ و غضب کی سرخی نے آنکھوں کو انگارہ بنا دیا۔ فرمایا کہ اسی حسن پر تو عورتیں جان دیتی ہیں، میں تجھے اس شہر میں رہنے ہی نہ دوں گا۔ چنانچہ اسی فیصلہ کے تحت آپ نے نصر کو جلاوطن کر کے بصرہ بھیج دیا اور پھر اس وقت تک مدینہ کی سکونت سے محروم رہا جب تک کہ آپ اس دنیا سے کوچ نہیں کر گئے۔[1]

حضرت عمر کا اس مغنیہ سے کیا تعلق تھا، نہیں معلوم۔ لیکن آپ کا یہ رقیبانہ اقدام غور و فکر کی دعوت ضرور دیتا ہے۔

ابو شحمہ پر تشدد

عرب کے مشہور و معروف طوائف نابغہ کے حرامی بیٹے عمرو بن العاص

[1] شرح ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۹۹

کے حلقۂ اقتدار میں حضرت عمر کے صاحبزادے ابو شحمہ نے ایک دن شراب پی۔ عمرو عاص نے اس کا سر منڈوا کر عبداللہ بن عمر کے سامنے اس پر شرعی حد جاری کرائی اور تازیانوں سے جسم کی کھال ادھیڑ کر اسے عمر کی خدمت میں اس خط کے ساتھ روانہ کیا کہ "میں نے ابو شحمہ پر تمام شرائط اسلامی کے ساتھ بلا رعایت حد جاری کر دی ہے اور اب حسب الحکم آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔"

عبداللہ بن عمر بھائی کو زخمی حالت میں لے کر باپ کے پاس پہنچے۔ شفقت پدری کا تقاضہ تھا کہ آپ ابو شحمہ کو سمجھاتے بجھاتے، تسلی دیتے اور غیر شرعی اقدام سے آئندہ باز رہنے کی نصیحت فرماتے، حد جاری کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اس لیے کہ وہ پہلے ہی عمرو عاص کے ہاتھوں جاری ہو چکی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا بلکہ آپ ابو شحمہ کو دیکھتے ہی جنون میں مبتلا ہو گئے، تازیانہ اٹھایا اور تیزی سے شروع ہو گئے۔ ابو شحمہ نے فریاد بھی کی کہ ابا جان! میں بیمار ہوں، مر جاؤں گا۔ لیکن آپ نے ایک نہ سنی اور از سر نو دوبارہ حد جاری کر کے قید خانہ میں ڈال دیا جہاں ابو شحمہ نے دم توڑ دیا۔[1]

یہ واقعہ اس وقت اور زیادہ عبرت انگیز اور افسوس ناک ہو جاتا ہے جب تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضرت عمر خود بھی شراب کے بے حد شوقین تھے۔ مسلمان خود انصاف کریں کہ ایک شرابی باپ کا اپنے شرابی بیٹے پر شراب نوشی کے الزام میں حد جاری کرنا کہاں تک ... ست ہے جبکہ عمرو عاص اس

---

[1] استیعاب ج ۲ ص ۳۹۵، حیوٰۃ الحیوان ج ۱ ص ۳۴۶

شرعی حد کا خاتمہ کر چکا تھا۔ پھر ابو شحمہ نے اپنے باپ سے بیماری کا عذر بھی کیا تھا تو کیا اسلامی شریعت کے تحت کسی بیمار پر حد جاری ہو سکتی ہے؟ کیا حد کے بعد انسان پر قید کی سختیاں مسلط کی جا سکتی ہیں؟ اگر نہیں۔ تو کیا عمر کا یہ جارحانہ اقدام قابل ستائش ہے؟

احکامات الٰہیہ کے بارے میں اگر عمرو عاص قابل اعتماد تھا تو دوبارہ آپ نے حد جاری کرنے کی زحمت کیوں فرمائی؟ اور اگر عمرو عاص کا یہ اقدام شرعی اعتبار سے درست نہیں تھا تو ایسے شخص کو آپ نے مسلمانوں پر حاکم کیوں بنایا؟

یہ وہ واقعات ہیں جو اہل سنت کی مستند کتابوں میں مرقوم ہیں اور جنھیں پڑھنے کے بعد غیرت کی پیشانی پر ندامت کا پسینہ آجاتا ہے۔

جبلہ بن ایہم پر تشدد

جبلہ بن ایہم کی قیادت میں قبیلۂ "عک" و "جفنہ" کے ۵۰۰ افراد سبک رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر حضرت عمر کے پاس اس شان سے آئے کہ ان کے گھوڑوں پر زربفت کے زین کسے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے خلوص دل سے اسلام قبول کیا اور اسی سال حج بیت اللہ کے لیے بھی گئے۔ طواف کے دوران کسی دوسرے قبیلہ کے کسی شخص کا پیر جبلہ کی زمین بوس چادر یا تہ بند پر پڑ گیا اور وہ کھل گئی۔ جبلہ نے برہنہ حالت میں ایک طمانچہ اس شخص کے منہ پر مار دیا۔ اس نے حضرت عمر سے جو وہاں موجود تھے شکایت کی۔ آپ نے وجہ دریافت کیے بغیر جبلہ کے خلاف تشدد سے کام لیا اور یہ فیصلہ بھی صادر فرما دیا کہ جبلہ یا تو اس شخص کو

رضامند کرلے یا پھر قصاص کے معاملے میں آپ نے وہ شدت اختیار کی کہ جبلہ اور اس کے تمام ساتھی راتوں رات وہاں سے فرار ہو لیے اور بھاگ کر قسطنطنیہ "ہرقل" کی پناہ میں چلے گئے اور اسلام سے دست بردار ہو کر مرتد ہو گئے۔[1]

ظاہر ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اسلام کی تبلیغ، اشاعت اور دعوت کے سلسلے میں جس حُسنِ اخلاق کا مظاہرہ کیا یا جو صعوبتیں برداشت کیں وہ دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اب مسلمان خود فیصلہ کرے کہ کیا نومسلموں پر حضرت عمر کا یہ تشدد مناسب تھا کہ جس کے سبب سے ایک کثیر تعداد اسلام سے مشرف ہونے کے بعد پھر مرتد ہو جائے اور آپ کے کان پر جوں تک نہ رینگے؟ مگر عمر کو اسلام کی پروا کب تھی؟ اور اگر اسلام کی وسعت کی فکر ہوتی تو وہ ایسا اقدام ہی کیوں کرتے؟ ایسے اسلام دشمن خلیفہ کی قربت سے دوری اور برأت کہیں بہتر ہے۔

عمری جھوٹ

حضرت عمر کی فطرت میں جھوٹ بھی داخل تھا اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سقیفہ کے دوسرے دن جب مسلمانوں کا اجماع مسجدِ نبوی میں ہوا اور بحیثیت خلیفہ ابوبکر نے مجمع کو خطاب کرنا چاہا تو ان سے پہلے آپ نے کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ:

"ایہا الناس! میں نے ابوبکر کی بیعت کے بارے میں

---

[1] طریق الحکمت ص ۱۶

کل (بہ ہنگام سقیفہ) جو کچھ تم لوگوں سے کہا تھا وہ نہ تو کتابِ خدا میں ہے اور نہ ہی رسول اللہؐ نے اس کے متعلق کوئی وصیت کی تھی نہ کوئی خاص حکم تھا لہٰذا اب اگر کوئی ایسا کرے تو اسے قتل کر دو۔"

یہ وہ تقریر ہے جو کتابی حوالوں کی محتاج نہیں ہے، اسے تمام مورخین نے نقل کیا ہے۔ اس تقریر سے نہ صرف حضرت عمر کا جھوٹ ثابت ہے بلکہ یہ صراحت بھی ہوتی ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر کا انتخاب نہ تو قرآن کے مطابق تھا اور نہ ہی اس کے لیے رسول اکرمؐ کی کوئی وصیت تھی کہ جس کے تحت ابوبکر خلافت کے حقدار قرار پاتے۔

حضرت عمر کی نظر میں یہ معاملہ انتہائی سنگین اور واجب القتل تھا لیکن چونکہ اس سے ابوبکر کی ذات وابستہ تھی اور انھیں خلیفہ بنانے والے آپ ہی تھے اس لیے بربنائے مصلحت آپ اسے ٹال گئے اور آئندہ کے لیے سقیفہ کے طریقۂ انتخاب پر یہ کہہ کر پابندی عاید کر دی کہ اب اگر کوئی ایسا کرے تو اسے قتل کر دو۔ کیونکہ باہمی معاہدے کے تحت آپ کو یہ معلوم تھا کہ ابوبکر اپنے بعد خلافت کو نامزدگی کے ذریعہ [illegible] طرف منتقل کر دیں گے۔ اور یہی ہوا۔

عمری تجسس

ایک رات حضرت عمر شب گشت پر نکلے اور دیکھا کہ ایک گھر سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی ہیں۔ آپ دیوار پھاند کر اندر گھس گئے۔ وہاں ایک عورت، کچھ لوگ اور شراب کا چلتا ہوا دور آپ کو نظر آیا۔ آپ نے اپنی کرخت آواز میں تنبیہ شروع کر دی اور فرمایا کہ کیا تم

لوگوں کو نہیں معلوم کہ یہ کام شریعت کے خلاف ہے؟ عورت نے بڑھ کر جواب دیا کہ ہم جاہل عوام کچھ کریں۔ لیکن خلیفہ ہوتے ہوئے بھی آپ نے اس وقت تین گناہ ایک ساتھ کیے ہیں۔ اول یہ کہ دروازے سے آنے کے بجائے دیوار پھاند کر آئے، دوسرے یہ کہ بغیر اجازت مکان میں داخل ہوئے، تیسرے یہ کہ آپ نے تجسس فرمایا[1]۔ یہ سننا تھا کہ آپ اپنے ماتھے سے ندامت کا پسینہ پونچھتے ہوئے واپس آگئے[2]۔ مصری مورخ محمد حسین ہیکل کا کہنا ہے کہ آپ خود بھی غنا اور سماع کے بڑے شوقین تھے[3]۔ علامہ شبلی نے بھی اس بات کی تائید کی ہے۔ (الفاروق ج۲ ص ۲۹۶)

سدی سے روایت ہے کہ آپ ابن مسعود کے ساتھ رات میں گشت پر نکلے تو ایک جگہ سے روشنی نظر آئی آپ کچھ دور چل کر ایک مکان میں گھس گئے۔ معلوم ہوا کہ ایک چراغ کے زیر سایہ ایک بوڑھا شخص اور ایک عورت ہے اور شراب کا دور چل رہا ہے۔ ابھی وہ شخص آپ کی طرف متوجہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ آپ نے ڈانٹ پھٹکار شروع کر دی۔ اس نے کہا کہ آپ کے لیے تجسس کب جائز تھا؟ کہ بغیر اجازت گھر کے اندر گھس آئے۔ یہ سننا تھا کہ آپ شرمندہ ہوکر روتے پیٹتے گھر سے نکل آئے[4]۔

شعبی کا بیان ہے کہ ایک دن عمر نے اپنے ایک صحابی کو اپنی محفل میں نہیں دیکھا تو ابن عوف سے کہا کہ چلو اس کے گھر چلیں اور وجہ معلوم کریں کہ وہ کیوں نہیں آیا؟ عمر اور ابن عوف جب وہاں پہنچے تو کیا دیکھا

---

[1] الفاروق ص ۲۰۷، [2] کنز العمال ج۲ ص ۱۶۷، ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۹۶ [3] فاروق اعظم ص ۶۵۶، ۶۵۷ [4] کنز العمال ج۲ ص ۱۴۱

دیکھا کہ دروازہ کھلا ہے اور اس صحابی کی عورت کسی برتن میں کچھ انڈیل رہی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ انھیں چیزوں نے تو اسے حاضری سے غافل کر دیا ہے۔ ابن عوف نے کہا کہ آپ کو کیا معلوم کہ کیا شے ہے؟ آپ نے فرمایا تو کیا میں نے تجسس کیا ہے؟ ابن عوف نے کہا۔ جی ہاں۔ فرمایا تو پھر واپس چلو اور اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا[1]۔

مسور بن مخرمہ۔ ابن عوف سے مروی ہیں کہ ایک رات عمر شب گردی پر نکلے تو ایک گھر سے کچھ آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ ربیعہ بن امیہ کا مکان ہے اور یہ سب شراب نوشی میں مصروف ہیں۔ ابن عوف نے کہا یہ عمل بھی آپ کا تجسس ہے۔ فرمایا تو پھر واپس چلو۔

ابو قلابہ کا بیان ہے کہ حضرت عمر کو یہ اطلاع ملی کہ ابو محجن اپنے گھر میں شراب پی رہا ہے۔ آپ وہاں پہنچے۔ قبل اس کے کہ آپ کچھ کہیں اس نے اعتراض کیا کہ جناب کا یہ تجسس کیسا؟ آپ نے زید بن ثابت اور عبدالرحمٰن بن ارقم سے اس واقعہ کی صحت کی تصدیق بھی کر لی۔ لیکن اس کے باوجود پلٹ آئے[2]۔

مذکورہ روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ عورت، شراب اور شرابیوں کے لیے آپ اپنے دل میں انتہائی نرم گوشہ رکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ آپ کی نظر میں حاکم کا قصور، مجرم کو اس کے جرم سے بری کر دیتا تھا۔

---

[1] کنز العمال ج ۲ حدیث نمبر ۳۶۹۴ [2] کنز العمال ج ۲ ص ۱۴۱

سرمہ دانی میں سلائی

عمری عدالت میں مغیرہ بن شعبہ پر قبیلۂ عامر بن صعصعیہ کی ایک بدکردار عورت ام جمیل بنت ارقم کے ساتھ زناکاری کے جرم میں مقدمہ دائر ہوا۔ اور ابو بکرہ، مشعل بن بجلی، نافع بن کلدہ نیز زیاد نے اس امر کی چشم دید گواہیاں دیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس فعل کو سرزد ہوتے دیکھا ہے۔ زیاد نے تو یہاں تک کہا کہ میں نے مغیرہ کو ام جمیل کی ٹانگوں کے درمیان دیکھا ہے جس کے پاؤں حنا آلود تھے اور سرین کھلے تھے۔ مغیرہ تیزی سے حرکت میں تھے اور سانسوں کی آواز زور زور سے آرہی تھیں۔ لیکن حضرت عمر نے یہ کہہ کر ان گواہاں کے بیانات کو مسترد کر دیا کہ "خدا کی قسم میں اس وقت تک نہ مانوں گا جب تک تم لوگ یہ نہ کہو گے کہ ہم نے ..... کو ..... میں جاتے اس طرح دیکھا ہے جس طرح سرمہ دانی میں سلائی جاتی ہے۔"

قرآن میں زناکار مرد اور عورت دونوں کی "حد" معین ہے اور اس کے ساتھ ہی چار عادل گواہوں کی شرط بھی ہے۔ مگر یہ شرط کہیں نہیں ہے کہ گواہ اس طرح گواہی دے جس طرح حضرت عمر نے فرمایا ہے۔ جبکہ دور رسالت میں بھی کچھ صحابہ زنا کے مرتکب ہوئے اور ان پر حد جاری کرنے کے لیے گواہ بھی طلب کیے مگر آپ نے "سرمہ دانی اور سلائی والی شرط نہیں رکھی، صرف معتبر اور عادل گواہوں کے چشم دید بیانات پر اعتماد و اکتفا کر کے حد جاری کر دی۔

حضرت عمر کے تجویز کردہ اس تعجب خیز نصاب شہادت کو

آپ کے اولیات میں شامل کیا جانا چاہیے کہ آپ نے نہ صرف سرمہ دانی اور سلائی کی شرط رکھ کر مغیرہ کو اس کے جرم سے بری کر دیا بلکہ اس کے ہاتھ سے گواہوں کی پٹائی بھی کرائی جس میں تازیانوں کی ضرب سے ابو بکرہ سب سے زیادہ زخمی ہوئے۔

جو چاہے کرے

ایک عورت نے عمر سے شکایت کی کہ اس کا شوہر رات بھر عبادت کرتا ہے اور دن بھر روزہ رکھتا ہے۔ میری طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس پر عمر نے کہا کہ یہ تو بڑی ہی اچھی بات ہے۔ اتفاق سے کعب بن سوار بھی وہاں موجود تھے انھوں نے کہا: یہ عورت اپنے شوہر کی تعریف کرنے نہیں آئی بلکہ شکایت کرنے آئی ہے کہ وہ اس کے ساتھ مجامعت نہیں کرتا۔ آپ نے کعب سے فرمایا کہ اچھا! تم خوب سمجھے، بات یہی معلوم ہوتی ہے، اب تم ہی اس کا فیصلہ بھی کر دو۔ کعب نے کہا: اس عورت کے شوہر کو چار عورتوں سے نکاح کرنا چاہیے، اس طرح ہر چوتھا دن اور ہر چوتھی رات اس عورت کو ملے گی باقی دنوں اور راتوں میں اس کا شوہر جو چاہے کرے۔[1]

کعب کے اس انوکھے فیصلے سے عمری قوت فیصلہ کا پتہ چلتا ہے۔

حفصہ کی پیش کش

شرفاء کا دستور ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کی شادیوں کے پیغامات خود

[1] تاریخ الخلفاء ص ۹۳

نہیں دیا کرتے بلکہ کوئی درمیانی شخص اس کام کو انجام دیتا ہے یا پھر لڑکی والے، لڑکے والوں کی طرف سے پیغام کا انتظار کرتے ہیں۔ عرب کے قدیمی معاشرے میں بھی یہی دستور تھا لیکن حضرت عمر نے اس دستور کو توڑا اور اپنی عربی غیرت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی بیٹی حفصہ کو مختلف لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

آپ کی صاحبزادی حفصہ کا پہلا عقد خنیس بن حذافہ سے ہوا تھا، لیکن موصوفہ کی نحوست نے اسے زندہ نہ رکھا۔ انتقال کے بعد عدہ کے دن پورے کیے اور جب عربی آب و ہوا نے چین نہ لینے دیا تو حضرت عمر کو بیٹی کی دوسری شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ ابن حجر کا کہنا ہے کہ حضرت حفصہ کے بیوہ ہو جانے کے بعد جب عدہ کا زمانہ پورا ہو گیا تو حضرت عمر نے اپنی پارۂ جگر کو حضرت ابوبکر کے سامنے پیش کیا مگر انھوں نے سکوت اختیار کیا، پھر رقیہ کے انتقال کے بعد عثمان کے سامنے پیش کیا، انھوں نے انکار کیا تو حضرت عمر نے اس کا ذکر حضرت رسول خدا صلعم سے کیا۔[1]

علامہ ابن حجر کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ (صلعم) نے بذات خود، حضرت عمر سے حفصہ کی خواستگاری نہیں کی بلکہ عمر نے اپنی طرف سے تجویز پیش کر کے اپنی صاحبزادی کو رسول کریم (صلعم) کے سر زبردستی منڈھ دیا۔

علامہ دیار بکری کا کہنا ہے کہ جب رسولؐ اللہ غزوۂ بدر سے فارغ

۱؎ اصابہ ج ۸ ص ۵۱

ہو کر مدینہ میں آئے تو حضرت عمر نے حفصہ کو ابوبکر کے سامنے پیش کیا مگر انھوں نے کسی بات کا جواب نہیں دیا، پھر آپ نے موصوفہ کو عثمان کے سامنے پیش کیا مگر انھوں نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا تو حضرت عمر نے حضرت رسولؐ خدا سے اس کی شکایت کی اور کہا: یا رسول اللہ! میں نے حفصہ کو پیش کیا تو انھوں نے میری طرف سے منھ پھیر لیا۔[1]

حضرت رسول خدا صلعم چونکہ کریم النفس تھے اس لیے آپ سے عمر کی یہ بے بسی اور بے چارگی نہیں دیکھی گئی اور آپ نے حفصہ کو بحالت مجبوری اپنے لیے قبول کر لیا۔

تین چار ماہ میں

علامہ سیوطی رقمطراز ہیں کہ حسب دستور ایک رات حضرت عمر مدینہ کی گلیوں کا گشت کر رہے تھے۔ اسی دوران آپ نے سنا کہ کوئی عورت گھر کا دروازہ بند کیے ہوئے بڑے پر درد لہجہ میں چند اشعار پڑھ رہی ہے جن کا ترجمہ یہ ہے کہ میں بھی جوان ہوں، رات بھی جوان ہے اور آسمان پر ستارے بھی چمک رہے ہیں، مگر کوئی ایسا نہیں ہے جو میری پیاس بجھاتا۔ واللہ اگر میرے دل میں خدا کا خوف نہ ہوتا تو (اس وقت) میرے پلنگ کی چولیں ہل رہی ہوتیں۔ میرا شوہر بڑا کریم النفس شریف اور برتر ہے۔ کوئی دوسرا اس کی سواری پر سوار ہونے کی ہمت نہیں کر سکتا۔

۱؎ تاریخ خمیس ج ۲ ص ۴۶۹

اشعار سن کر عمر بہت متاثر ہوئے اور گھر آکر اپنی بیٹی حفصہ کو طلب کیا۔ فرمایا کہ اے بیٹی! ایک سخت مشکل کا سامنا ہے، جسے تم آسان کرسکتی ہو۔ بیٹی نے باپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ آپ نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ عورت کو مرد کی خواہش کتنی مدت میں بے چین اور پریشان کرتی ہے؟ حفصہ نے شرم سے اپنا منھ پھیر لیا، لیکن عمر نہ مانے اور وہ جواب کے لیے مسلسل اصرار کرتے رہے۔ بالآخر مجبوراً حفصہ نے ہاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ تین چار ماہ میں۔[1]

دوسرے ہی دن آپ نے یہ شاہی حکم جاری کر دیا کہ کوئی بھی شخص خواہ وہ میدان جنگ ہی میں کیوں نہ ہو چار ماہ سے زیادہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر غائب نہیں رہ سکتا۔

اس روایت کا مقصد اپنی جگہ کچھ سہی۔ لیکن کیا حضرت عمر کے علاوہ دنیا کا کوئی غیرت مند باپ اپنی بیٹی سے اس قسم کے بے ہودہ سوالات کرسکتا ہے؟ جبکہ یہ بات دیگر ذرائع سے بھی معلوم کی جاسکتی تھی۔

اسلام کے والدین

علامہ سیوطی نے تحریر کیا ہے کہ: ابو اسامہ کہتے ہیں کہ کیا تم لوگ جانتے ہو کہ ابو بکر و عمر کون تھے۔ یہ دونوں اسلام کے ماں باپ تھے۔[2]

اس عجیب و غریب اور حیرت انگیز روایت کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر قارئین کرام میں سے کوئی صاحب اس کی تہ تک پہنچیں

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۹۷ [2] تاریخ الخلفاء ص ۸۳

تو مجھے بھی مطلع فرمائیں، یہ زحمت میرے علم میں اضافہ کا سبب ہوگی۔

ابو بکر اور عمر میں کون اسلام کا باپ تھا اور کون ماں؟ روایت میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں اسلام کے باپ بھی ہوں اور ماں بھی۔ دوسرا مطلب "اوّل" اور "دوم" کے اعتبار سے یہ ہوسکتا ہے کہ ابو بکر باپ تھے اور عمر ماں۔ مگر کسی طرح نہ مقصود واضح ہوتا ہے اور نہ ہی تشبیہ سمجھ میں آتی ہے۔ اگر یہ دونوں باپ اور ماں تھے تو کیا اسلام ان کے باہمی اختلاط سے پیدا ہوا تھا جبکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ اسلام کا پیدا کرنے والا خدا اور اس کی تبلیغ کرنے والے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اور بالفرض محال یہ باور کر لیا جائے کہ ابو بکر اسلام کے باپ اور عمر اسلام کی ماں ہیں تو بھی دل مطمئن نہیں ہوتا کہ کس حیثیت سے ابو بکر اسلام کے باپ بن جائیں گے اور کس مناسبت سے عمر کو اسلام کی ماں سمجھا جائے گا؟ اس طرح تو حضرت عمر کی بڑی توہین ہوتی ہے۔ مگر یہ باور کیے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔

اولاد ایک فتنہ ہے

مولوی وحید الزماں رقم طراز ہیں کہ حضرت عمر نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ فتنہ و فساد سے خدا کی پناہ مانگ رہا ہے۔ آپ اس سے فرمانے لگے کہ اے شخص! کیا تو اپنے پروردگار سے چاہتا ہے کہ وہ تجھ کو مال اور اولاد عطا کر دے، جبکہ مال اور اولاد کو بھی فتنہ کہتے ہیں۔[1]

---

[1] انوار اللغۃ پارہ ۲۰ ص ۱۳

ظاہر ہے کہ کوئی شخص مال اور اولاد سے پناہ نہیں مانگ سکتا بلکہ فتنہ اور فساد سے پناہ مانگنا ہر امن پسند آدمی کا معمول ہے۔ قرآن مجید بھی کہتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا فرمایا کرتے تھے کہ: پالنے والے تو ہمیں فتنہ نہ قرار دے (پارہ ۲۸، آیت ۷) اس کے علاوہ فتنہ و فساد سے محفوظ رہنے کے بارے میں حدیثیں کثرت سے ہیں۔ مگر حضرت عمر کا یہ عقلی اجتہاد سب سے الگ اور اپنی مثال آپ ہے۔

ایسی عورت ملتی؟

حضرت عمر کے دور حکومت میں ان کے پاس بحرین سے کچھ مشک و عنبر آیا تو آپ نے فرمایا کاش کوئی ایسی عورت ملتی جو اس خوشبو کو تول دیتی تاکہ میں اسے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیتا۔ یہ سن کر آپ کی اہلیہ عاتکہ نے فرمایا کہ: میں بہت اچھا تولنا جانتی ہوں، کہو تو تم کو بھی تول دوں۔ آپ نے فرمایا، یہ نہیں ہو سکتا۔ بیوی نے پوچھا، کیوں؟ فرمایا، تم چوری سے ڈال لوگی۔ بیوی نے کہا، کس طرح ڈال لوں گی؟ آپ نے اپنی انگلیوں کو اپنے دونوں کانوں میں ڈال کر فرمایا، اس طرح۔ بیوی نے کہا، اچھا میں اس طرح نہیں ڈالوں گی۔ فرمایا، تو پھر مل لوگی۔ بیوی نے کہا، وہ کس طرح؟ تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن مروڑتے ہوئے فرمایا، اس طرح۔ اور اس طرح ملنے پر تمھیں دیگر مسلمانوں سے زیادہ حصہ مل جائے گا[1]

---

[1] کنز العمال ج ۶ ص ۳۵۰

اس روایت سے یہ بتانا مقصود تھا کہ حضرت عمر کا عدل اتنا ہمہ گیر تھا کہ آپ اپنی بیوی پر بھی بھروسا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے انھیں عملی طور پر آگاہ کر دیا کہ تم خوشبو تولتے وقت اس طرح چرا لوگی اور آگاہی کا یہ انداز بھی عجیب و غریب تھا، لیکن تعجب تو یہ ہے کہ آپ کی سمجھ میں یہ کیوں نہیں آیا کہ خوشبو جب تولنے والی کے ہاتھوں سے مس ہوگی تو اپنا اثر ضرور چھوڑے گی۔ پھر آپ نے دوسرے کو تولنے کے لیے سوچا ہی کیوں؟ دوسری بات یہ ہے کہ اس کو تولنے کے لیے آپ نے عورت ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ کیا یہ کام کوئی مرد نہیں کر سکتا تھا؟ تیسرا امر یہ ہے کہ آپ اپنی بیوی ہی سے اگر اپنی نگرانی میں تولوا لیتے تو پھر چوری کا کیا سوال؟ جب وہ کھجلانے یا کسی اور بہانے سے اپنی کوئی انگلی جسم کے کسی مقام پر لے جاتیں تو ان کا ہاتھ پکڑ لیتے، کہ یہ کیا کر رہی ہو؟ تم اسے تولو، اور لاؤ میں کھجلائے دیتا ہوں۔

بیت المال کا مال

حضرت عمر کی فضیلت میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ آپ جب حاکم وقت تھے، اس وقت بھی اپنی گزر بسر کے لیے تجارت کرتے تھے اور اکثر و بیشتر لوگوں سے قرض بھی لیتے رہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے دور حکومت میں ایک تجارتی قافلہ شام کی طرف روانہ کرنا چاہا تو آپ کو مال کی ضرورت پڑی۔ آپ نے عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس اپنا آدمی بھیجا کہ مجھے چار ہزار درہم قرض دے دو۔ عبدالرحمٰن نے کہا

کہ عمر بیت المال سے یہ رقم کیوں نہیں لیتے، جب قافلہ واپس آئے گا تو اس میں واپس کر دیں گے۔ یہ بات آپ کو سخت ناگوار گزری۔ آپ خود عبدالرحمٰن کے پاس گئے اور ان سے فرمایا کہ تم نے یہ کیوں کہا کہ بیت المال سے لے لو۔ اور اگر بیت المال سے میں یہ رقم لے بھی لوں تو کیا خبر کہ قافلہ واپس آنے سے پہلے ہی مر جاؤں۔ اور جب بیت المال کا مقروض ہو کر مروں گا تو تم ہی لوگ یہ کہو گے کہ بیت المال کا مال ڈکار کر خلیفہ مر گئے۔ اس لیے بیت المال سے میں یہ رقم نہیں لینا چاہتا بلکہ تمھارے ایسے بیمار اور کنجوس سے لینا چاہتا ہوں تاکہ اگر میں مر جاؤں تو وہ میری میراث سے وصول کر لے[1]

یہ روایت حضرت عمر کی فضیلت میں بیان کی گئی ہے اور اس سے یہ مقصود ہے کہ آپ بیت المال کے بارے میں اتنے محتاط تھے کہ بے ایمانی تو درکنار اس سے قرض بھی نہیں لیتے تھے۔ لیکن تاریخی شواہد اس کے برعکس ہیں اور وہ یہ ہیں کہ جب آپ پر موت کا غلبہ ہوا اور آپ اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو بیت المال کے خزانے میں ۸۶ ہزار کا گڑھ بڑ گھٹالا تھا اور یہ رقم آپ کے ذمہ واجب الادا پائی گئی۔[2]

کبشہ کا بیٹا[3]

حرمت شراب سے متعلق قرآن مجید نے مسلمانوں پر تین احکامات

[1] کنز العمال ج ۶ ص ۳۵۴ [2] تاریخ الخلفاء ص ۹۲ [3] ابو کبشہ ایک شخص تھا جس نے بتوں کی پرستش میں قریش کے طرز عمل کی مخالفت کی تھی۔ انحضرتؐ بھی چونکہ دین کے معاملہ میں قریش کے مخالف تھے، اس لیے بغرض تحقیر حضرت عمر نے حضورؐ کو کبشہ کا بیٹا کہا اور توہین رسالتؐ کے مرتکب ہوئے (انوار اللغۃ پارہ ۲ ص ۹)

نافذ کیے۔ دوسرے حکم میں ارشاد ہوا کہ:

"اے ایمان والو! ہم نے شراب کو تم پر حرام قرار دے دیا ہے۔
اب نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جانا!"

لیکن اس تاکید کے باوجود مسلمانوں کے پیشوا حضرت عمر نے احکامات الٰہیہ کو نظر انداز کر کے خوب شراب پی اور استخوان شتر (اونٹ کی ہڈی) سے عبدالرحمٰن بن عوف کو اتنا مارا کہ وہ بے چارے بری طرح زخمی ہوئے۔ اس حرکت کے بعد آپ نے مقتولین بدر کا نوحہ پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ، ہائے افسوس! کہ بدر کے کنویں میں عرب کے جوانوں کی کتنی لاشیں ڈال دی گئیں۔ یہ کبشہ کا بیٹا (محمدؐ) ہم کو اس بات سے ڈراتا ہے کہ ہم دوبارہ زندہ کیے جائیں گے بھلا سڑے ہوئے جسموں اور خاک پر بکھرے ہوئے دماغوں کی زندگی کیوں کر ممکن ہے؟ خدا، ہماری بوسیدہ ہڈیوں کو قبروں سے کیسے اٹھا سکتا ہے؟ جب وہ ہماری موت کو ٹال نہیں سکتا تو قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیسے کر دے گا؟ کوئی ہے؟ — جو خدا تک ہمارا یہ پیغام پہنچا دے کہ ہم نے روزہ رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اگر اس میں طاقت ہو تو مجھے روک لے اور میرا کھانا پینا بند کر دے۔

حضرت عمر کے یہ کلمات کفر جب پیغمبر اسلامؐ تک پہنچے تو جلال پیغمبری حرکت میں آیا اور سرور کائناتؐ غیظ و غضب کے عالم میں اس طرح برآمد ہوئے کہ آپ کی ردا زمین پر خط دے رہی تھی۔ آپ نے عمر کی پٹائی جب شروع کی تو سارا نشہ اتر گیا اور کہنے لگے کہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔ اسی وقت یہ آیت

بھی نازل ہوئی کہ:

"شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ تمھیں شراب اور جوئے میں
بتلا کر کے تمھارے درمیان دشمنی پیدا کرے اور تم لوگوں کو اللہ کے
ذکر اور نماز سے دور رکھے۔"[1]

اس واقعہ کے بعد حضرت عمر کی شرابی طینت نے شراب کا متبادل ایک دوسرا مشروب تلاش کیا جسے "نبیذ" کہا جاتا ہے۔ علامہ شبلی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ شراب کی جگہ لوگ نبیذ استعمال کرتے تھے جس کو عموماً عراق کے مذہبی پیشواؤں سے حلّت کی سند مل چکی تھی۔[2]

حضرت عمر آخری وقت تک نبیذ پیتے رہے۔ چنانچہ جب آپ حضرت ابولولو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خنجر سے زخمی ہوئے اور طبیب کو بلایا گیا تو اس نے آپ سے پوچھا کہ مشروب میں آپ کو کیا پسند ہے؟ فرمایا۔ "نبیذ"۔ چنانچہ آپ کو نبیذ پلائی گئی جو آپ کے زخموں کی راہ سے باہر نکل گئی۔[3]

نبیذ کے بارے میں ارشاد پیغمبر ہے کہ:

"بہت جلد میرے بعد مسلمانوں پر ایسے لوگ حکومت کریں گے
جو نبیذ کے بہانے سے شراب کو، صدقہ کے بہانے سے ناجائز مال کو
ہدیہ و تحفہ کے بہانے سے رشوت کو اور پند و نصیحت کے بہانے سے
قتل کو حلال سمجھیں گے۔"[4]

---

[1] مستطرف ج۲ ص ۲۱۸ [2] المامون ص ۲۲۲ [3] ریاض النظرۃ ج۲ ص ۷۰ [4] درمنثور ج۶ ص ۲۸۴

ضبیع تمیمی کی پٹائی

حضرت عمر کو کسی نے بتایا کہ "ضبیع تمیمی" لوگوں سے آیات قرآنی کی تفسیریں پوچھتا ہے۔ آپ نے فرمایا، خدا کرے مجھ سے ملاقات ہو جائے۔

اتفاق سے وہ ایک دن آ گیا اور اس نے حضرت عمر سے بھی وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا کی تفسیر دریافت کر لی۔ پھر کیا تھا، آپ کا تازیانہ اٹھ گیا اور آپ نے ایسی پٹائی کی کہ اس کا عمامہ گر گیا اور وہ لہولہان ہو گیا۔ اس کے بعد اس کو گرفتار کر لیا اور روزانہ سو تازیانوں کی سزا مقرر کر دی۔ پھر ایک دن اسے اونٹ پر بٹھا کر بصرہ کی طرف روانہ کر دیا۔[1]

جہل جب علم سے ٹکراتا ہے تو اکثر اسی قسم کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

ASSOCIATION KHOJA
SHIA ITHNA ASHERI
JAMATE
MAYOTTE

[1] شرح ابن ابی الحدید ج۳ ص ۱۲۲

تیسرا باب

واقعۂ حدیبیہ

ذیقعدہ سنہ ۶ ھ (۶۲۸ء) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج بیت اللہ کا قصد کیا اور اس اندیشہ کے تحت آپ نے اپنے اصحاب کو بھی ساتھ چلنے کا حکم دیا کہ کفار مکہ کہیں مزاحمت نہ کریں، چنانچہ چودہ سو افراد پر مشتمل ایک قافلہ مدینہ سے دوشنبہ کے دن آنحضرت کی قیادت میں مکہ کی طرف روانہ ہوا۔

"ذوالحلیفہ" کے مقام پر پہنچ کر آنحضرتؐ نے عمل تقلید[1] کے ذریعہ احرام باندھا تاکہ کفار مکہ یہ نہ سمجھیں کہ آپ حرب وضرب یا پیکار کے ارادے سے آ رہے ہیں۔

ابھی کچھ راستہ طے ہوا تھا کہ آپ کو یہ خبر موصول ہوئی کہ عکرمہ بن ابوجہل اور خالد بن ولید کی قیادت میں ۵۰۰ کا ایک لشکر جنگ کے لیے آپ کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ اس ٹکراؤ سے بچنے کے لیے ایک طرف

---

[1] حج کی بعض اقسام میں یہ عمل بھی شامل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ان جوتیوں کا جن میں نماز ادا کر چکا ہے، ہار بنا کر اپنے اونٹ کی گردن میں ڈال دے اور پھر اسی صورت سے حج کے لیے روانہ ہو۔

آپ نے اپنے اصحاب کو راستہ تبدیل کرنے کا حکم دیا اور دوسری طرف عبادہ بن بشر کو ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ خالد و عکرمہ کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے آگے روانہ کر دیا تاکہ دفاعی صورت ممکن ہو سکے۔ آپ بہ ذات خود تھوڑی دور چل کر حدیبیہ نامی ایک کنویں کے قریب ایک درخت کے سائے میں فروکش ہوئے جہاں آپ نے اپنے اصحاب سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ یہی وہ بیعت ہے جو بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے اور بیعت کرنے والوں کو اصحاب شجرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کفار قریش کو جب اس بیعت کا حال معلوم ہوا تو وہ مرعوب اور خوفزدہ ہو گئے۔ چنانچہ اِدھر دبدبۂ رسالت نے ان کے نخوت، غرور اور جنگی ارادوں کو توڑا اور اُدھر عبادہ اور ان کی جماعت نے خالد و عکرمہ کے لشکر کو اس طرح پسپا کیا کہ انھیں ان کے گھروں تک دوڑا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کفار نے گھبرا کر سہیل بن عمرو کے ذریعہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں صلح کا پیغام بھیجا جسے آپ کی کریم النفسی، دوربینی، مصلحت شناسی اور بلند مرتبت اخلاقی قدروں نے منظور کر لیا۔ صلح کی شرطیں حسب ذیل تھیں۔

(الف) محمد بن عبداللہ اس سال مع اصحاب کے واپس جائیں اور آئندہ سال حج کی غرض سے آئیں۔ اس وقت قریش تین دن کے لیے مکہ خالی کر دیں گے۔

(ب) دس سال تک جنگ ملتوی رکھی جائے اور ہر شخص کو یہ آزادی دی جائے کہ وہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے۔

(ج) اگر کوئی شخص قریش سے نکل کر محمدؐ کی طرف چلا جائے تو اسے

قریش کے حوالے کر دیا جائے اور اگر کوئی اسلام سے مرتد ہو کر قریش کی پناہ میں آجائے تو اس کی واپسی کا مطالبہ نہ ہو۔

یقیناً صلح کی یہ آخری شرط ایسی تھی جس نے فطری طور پر مسلمانوں کے ضبط و تحمل کو چیلنج کیا لیکن حامل وحی نے یہ کہہ کر قابو حاصل کر لیا کہ جو شخص اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہو جائے گا اسے رحمت الٰہی کا سایہ تک نصیب نہ ہوگا اور جو کفر سے علیحدہ ہو کر اسلام قبول کرے گا اس کی نجات کا ضامن اللہ ہے۔

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صلح کی تجویز سے قبل قریش کے خصوصی ایلچی عروہ نے پیغمبر اسلامؐ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اس سال آپ حج کا ارادہ ترک کر دیں کیونکہ میں آپ کے ساتھ ان منافق چہروں اور اوباش لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جو جنگ کی حالت میں آپ کو چھوڑ کر بھاگ جانے والے ہیں تو ابو بکر نے پیغمبری ادب و احترام کو بالائے طاق رکھ کر پیغمبرؐ کے سامنے عروہ کو "بظر اللات" چوسنے کی فحش گالی سے نوازا۔[1] اور فرمایا کہ کیا ہم ایسے ہیں جو رسولؐ اللہ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ جبکہ موصوف کے بارے میں تاریخ بالاعلان یہ کہتی ہے کہ آپ ہمیشہ ہر جنگ سے فرار اختیار کرتے رہے۔

عروہ کی سچائی کا ثبوت اس عمری انکار سے بھی فراہم ہوتا ہے جب رسول اکرمؐ نے آپ سے فرمایا کہ تم قریش کے درمیان جا کر انھیں

---

[1] طبری ج ۳ ص ۷۵۔ قسطلانی شارح بخاری نے "بظر اللات" کے بارے میں یہ حاشیہ تحریر کیا ہے کہ حشفہ (عضو تناسل) کا چوسنا عربوں میں غلیظ ترین گالی ہے۔

اس بات سے مطمئن کرو کہ ہم جنگ کی غرض سے نہیں آئے بلکہ حج کے ارادے سے آئے ہیں تو آپ نے اس حکم رسالت کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ میری جگہ ابو سفیان کے بھتیجے عثمان کو کیوں نہیں بھیج دیتے؟

بہرحال۔ منافقانہ اور ناسازگار حالات میں صلح کی تجویز منظور ہوئی اور محمدی املا پر علوی قلم جنبش میں آیا اور صلحنامہ کے تحریری خدو خال قرطاس پر ابھرنے لگے۔ رسول کریمؐ نے صلح نامہ کا ابتدائی کلمہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوانا چاہا تو سہیل بن عمرو معترض ہوا اور اس نے کہا کہ ہم اس کلمۂ تحریر سے ناآشنا ہیں۔ لہٰذا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ "باسمک اللّٰھم" لکھا جائے۔ خلق عظیم نے سہیل کی دل آزاری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے باسمک اللّٰھم لکھوا دیا۔ پھر آپ نے امیر المومنین حضرت علیؑ سے فرمایا کہ لکھو یہ صلحنامہ منجانب محمد الرسول اللہ ہے؛ تو سہیل نے کہا اگر ہم آپ کی رسالت کے قائل ہوتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا لہٰذا رسول اللہ کا لفظ ہٹا کر محمد بن عبداللہ لکھا جائے۔

سہیل کی اس بات سے صحابہ کے جذبات پھر مشتعل ہو گئے قریب تھا کہ ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا مگر رسولؐ اللہ نے انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ اس انکار سے نہ تو میری رسالت پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی حرف آسکتا ہے؟

حضرت علی علیہ السلام نے بھی یہ جملہ بڑے ہی صابرانہ اور تحملانہ انداز میں تحریر کیا حالانکہ آپ کے چہرے سے اضطرابی کیفیت نمایاں تھی جسے رسول اکرمؐ نے بھی محسوس کیا اور فرمایا کہ اے علی! ایک دن تمھارے ساتھ بھی یہی مرحلہ درپیش ہوگا اور تم بھی اسی

قسم کی بلاؤں میں گرفتار ہو گئے[1]

مختصر یہ کہ صلح نامہ کی تحریر مکمل ہوئی اور اس کی تکمیل کے ساتھ ہی حضرت عمر کی عمری رگ بھی بھڑکی یہاں تک کہ وہ رسول اللہ سے بدتمیزی اور تند گفتاری پر اتر آئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ یہ صلح نہ ہو اور جنگ کی حالت میں آنحضرت کو جانی و مالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑے۔ چنانچہ آپ نے تڑپ کر رسول اللہ سے یہ سوال کیا کہ کیا آپ خدا کے رسول نہیں ہیں؟ آنحضرت نے فرمایا کہ بے شک میں خدا کا رسول ہوں۔ پھر پوچھا۔ کیا ہم حق پر اور ہمارے مخالفین باطل پر نہیں ہیں؟ آنحضرت نے جواب دیا کہ یقیناً ہم حق پر اور ہمارے مخالفین باطل پر ہیں۔

افسوس ہے کہ رسول اکرمؐ کے جوابات سے عمر کی جسارت مطمئن نہ ہوئی اور آخر کار عمر نے پیغمبر اسلامؐ سے کرخت لہجے میں یہ فرمایا کہ جب ہم حق پر ہیں تو پھر یہ ذلت آمیز صلح کیوں کی گئی؟ حضرت عمر کی اس جسارت سے پیغمبری پیشانی پہ ناگواری کے اثرات مرتب ہوئے اور خدا کے حبیبؐ نے انھیں یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ اے خطاب کے بیٹے! بس خاموش ہو جا۔ میں خدا کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا اور وہی میرا معین و مددگار ہے[2]

حضرت عمر کا یہ مکالمہ تقریباً تمام تاریخی کتابوں میں نقل ہوا ہے

---

[1] تاریخ کامل ج ۲ ص ۷۷، روضۃ الاحباب ج ۱ ص ۳۵۶، خصائص نسائی ص ۳۶

[2] مدارج النبوۃ ج ۲ ص ۳۶۴

بعض کتابوں میں اس کا لہجہ زیادہ سخت ہے۔ شاید بخاری ہی میں ہے کہ آپ رسول اللہ پر سخت معترض ہوئے اور جاہلانہ تکرار کے بعد اس دریدہ دہنی پر کمر بستہ ہو گئے کہ آپ نے تو ہم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہمیں حج کرائیں گے۔ اب اپنی بات سے پلٹنا کیسا؟ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں نے اس سال کا وعدہ نہیں کیا تھا۔

اللہ کے رسولؐ سے تکرار اور گستاخیوں کے بعد عمر پیر پٹکتے ہوئے ابوبکر کے پاس پہنچے اور ان سے بھی پوچھا کہ کیا محمدؐ خدا کے رسول نہیں ہیں؟ ابوبکر نے کہا ہیں۔ پھر پوچھا کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ کہا ہیں۔ پھر پوچھا، کیا ہمارے مخالفین مشرک نہیں ہیں؟ کہا ہیں۔

بس یہ سننا تھا کہ آپ قابو سے باہر ہو گئے اور بولے کہ پھر یہ صلح کیوں کی گئی؟ اس پر ابوبکر نے جواب دیا کہ رسول اللہ حکم الٰہی کے پابند ہیں، وہ تمھاری باتوں پر کوئی توجہ نہیں دے سکتے، تم یوں ہی بکتے رہو۔

پیغمبر اسلامؐ سے اس ناروا گفتگو کے بعد حضرت عمر کا حضرت ابوبکر کے پاس آنا اور اطمینان قلب کے لیے ان سے بھی وہی الٹے سیدھے سوالات کرنا اس بات کی محکم دلیل ہے کہ آپ رسولؐ سے مطمئن نہیں تھے اور پھر ابوبکر سے یہ پوچھنا کہ کیا ہم مسلمان نہیں ہیں، اس امر کی دلیل ہے کہ آپ اپنی مسلمانی کے بارے میں بھی مشکوک تھے۔

یہ درست ہے کہ ابوبکر کی طرف سے عمر کو وہی جواب ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس عمری تکرار نے اپنی منافقت کی کمان سے دو تیر ایک ساتھ رہا کیے۔ پہلا تیر رسول اللہ کے دل پر

لگا جس نے آپ کو رنجیدہ و ملول کیا۔[1] دوسرے تیر نے اصحاب کو نافرمانی پر اکسایا جس کی کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ جب صلح نامہ مکمل ہو چکا اور آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب سے یہ فرمایا کہ تم لوگ اٹھو اور اپنے سروں کے بالوں کو ترشوا کر قربانی کے اونٹ نحر کر دو تو کسی نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی یہاں تک حضور سرورِ کائناتؐ نے تین بار یہی حکم دیا مگر کسی نے توجہ نہ دی تو آپ نے خود حجام کو بلوا کر اپنے سر کے بالوں کو ترشوا دیا اور اپنے ہاتھوں سے قربانی کا اونٹ نحر کر کے اپنے خیمہ میں چلے گئے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ رسول کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر مجبوراً دیگر اصحاب نے بھی اس کا اتباع کیا۔

رسول اللہ صلعم سے تکرار کے بعد حضرت عمر کا یہ اعتراف بھی کتابوں میں موجود ہے کہ محمدؐ کی نبوت میں جیسا شک مجھے آج ہوا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔[2]

حضرت عمر کی رسول اکرم سے تکرار اور غیر شائستہ گفتگو کے بعد جب ہم آپ کے اس حیرت انگیز و تعجب خیز اعتراف پر غور و فکر کی نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ آپ کو اس سے پہلے بھی رسول کی رسالت میں شک و شبہ تھا مگر حدیبیہ کے موقع پر یہ شک آپ کو اس راستہ پر لے گیا جو یقین کی سرحد سے متصل ہو کر انسان کو خود بخود دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس فطری اخراج

---

[1] تاریخ ابن خلدون ص ۳۶۱ [2] تاریخ خمیس ج ۲ ص ۱۵، درمنثور ج ۶ ص ۷۷، معالم التنزیل ج ۷ ص ۲۳۸، الفاروق ص ۴۵، سیرت خلفائے راشدین، عبدالشکور ص ۸۹

کے بعد عمر نے تلافی کے خیال سے بظاہر نمازیں پڑھی ہوں، روزے رکھے ہوں، صدقات دیے ہوں، غلام آزاد کیے ہوں یا اپنی غیر اسلامی "مسلمانی" کو برقرار رکھنے کے لیے توبہ و استغفار کیا ہو، اس وقت سب بیکار ہوگا جب بروزِ حشر آپ منافقین، مشرکین اور مرتدین کے ساتھ محشور کیے جائیں گے اور رسالت آپ کی اس تباہی و بربادی کا تماشہ دیکھے گی۔

جیش اسامہ سے تخلّف

جیش اسامہ کا واقعہ یہ ہے کہ ۱۱ھ میں اپنی علالت کے دوران پیغمبر اسلامؐ نے رومیوں کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر مرتب کیا اور زید بن حارثہ کے سترہ؁ سالہ نوجوان و کم سن فرزند اسامہ کو اس کا امیر مقرر فرمایا۔

یہ وہ اہم لشکر تھا جس میں رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے علاوہ تمام اعیان مہاجرین و انصار مثلاً ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص، ابو عبیدہ بن جراح، سعید بن زید اور قتادہ بن نعمان وغیرہ سب کو شامل ہونے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی اس بات کی سخت تاکید بھی فرما دی کہ اس موقع پر کوئی بھی مدینہ میں نہ ٹھہرے۔

اسامہ بن زید کو لشکر کا علم سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ روم کی طرف اس برق رفتاری سے کوچ کرو کہ تمھارے وہاں پہنچنے کی دشمن کو خبر تک نہ ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پیغمبری حکم کی تعمیل میں اسامہ

بن زید نے انتہائی تعجیلانہ انداز اختیار کیا اور سرعت کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے مگر کچھ دور چل کر تقریباً ۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر جرف نامی ایک مقام پر مجبوراً انھیں مع لشکر کے ٹھہر جانا پڑا کیونکہ رسول اللہ صلعم کے صریحی اور ختمی ارشاد کے باوجود اکابرین صحابہ یعنی ابوبکر و عمر وغیرہ لشکر سے غیر حاضر تھے یہاں تک کہ اسامہ تین دن تک جرف میں قیام پذیر رہ کر ان کے آنے کا انتظار کرتے رہے مگر یہ لوگ نہیں آئے[1]

تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اسامہ بن زید چونکہ کمسن تھے لہٰذا سن و شعور کے لحاظ سے صحابہ کو ان کی ماتحتی گوارہ نہ تھی کیونکہ اس سے ان کی بڑھاپے کی انانیت پر حرف آتا تھا۔ دوسرے یہ بات بھی ان کے ذہنوں میں راسخ ہو چلی تھی کہ اگر اس علالت کے دوران رسولؐ دنیا سے رخصت ہو گئے تو خلافت کا کیا ہو گا؟ جس کے لیے ہم عمر بھر تانے بانے درست کرتے رہے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ آنحضرتؐ کی علالت شدت اختیار کر گئی اور آپ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔

اسی جان لیوا بیماری کی حالت میں جب آنحضرتؐ کو صحابہ کی ریشہ دوانیوں، منافقانہ طرز عمل اور جیش اسامہ سے بائیکاٹ کے بارے میں مطلع کیا گیا تو آپ غیظ و غضب کے عالم میں اپنے حجرہ سے اس طرح برآمد ہوئے کہ سر اقدس پر پٹی بندھی تھی، زلفِ مبارک منتشر

---

[1] طبری ج ۳ ص ۱۸۵، تاریخ ابوالفدا ج ۱ ص ۱۵۲ مطبوعہ مصر، تہذیب التہذیب علامہ حجر عسقلانی جز اول ص ۲۰۸

تھی اور آپ کے دوشِ طاہرہ پر پڑی ہوئی ردا زمین پر خط دے رہی تھی۔ چنانچہ آپ مسجد میں تشریف لائے اور جو صحابہ وہاں موجود تھے انھیں اسامہ کے لشکر میں شرکت کی مکرر ہدایت کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ اسامہ کی سرداری پر معترض ہیں ان لوگوں نے غزوۂ موتہ میں اس کے باپ زید کی سرداری پر بھی اعتراض کیا تھا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ خدا کی قسم اسامہ سرداری کا سزاوار ہے اور اس کا باپ بھی امارت کا اہل تھا۔ اور وہ بھی مجھے عزیز تھا۔ یہ بھی مجھے عزیز ہے[1] پھر آپ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اسامہ کے لشکر سے پہلوتہی کریں ان پر خدا کی لعنت ہے[2] لیکن اس کے بعد بھی عمر اور ابوبکر نہیں گئے اور انھوں نے اپنے لیے اللہ کی دائمی لعنت قبول کر لی۔

شاید یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ:

"جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے حکم کی نافرمانی کی اور اپنی حدوں سے گزر گئے، خدا انھیں جہنم میں داخل کرے گا اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یقیناً اس میں رسوائی کا عذاب ہے۔" (النساء - ۱۴)

واقعۂ قلم و قرطاس

اختصار کے پیش نظر الخلفاء حصہ اول میں اس واقعہ کو ہم اجمالی طور پر تحریر کر چکے ہیں۔ لیکن اس کربناک و دردانگیز واقعہ کی اہمیت،

---

[1] بخاری ج ۵ ص ۸۴ [2] ملل و نحل ج ۱ ص ۲۰

انفرادیت اور سنگینیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اس پر از سر نو غور کیا جائے تاکہ ہر پہلو پر تفصیلی گفتگو بھی ممکن ہو سکے اور مولوی سید ابو الحسن ندوی اور ان کے پیش رو علمار کی تاویلات و توجیہات کے جوابات بھی دیئے جا سکیں۔

سلاھ جمعرات کے دن رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی شدید علالت کے دوران جب کہ آپ کا بستر مرگ اکابرین صحابہ اور "جمل کی لیڈی کمانڈر" عائشہ کے حصار میں تھا۔ نبوت کے ہوش مندانہ اقدام اور منشائے ایزدی کے تحت یہ فرمایا کہ مجھے قلم، دوات اور کاغذ دے دو تاکہ میں تحریری دستاویز کے ذریعہ خلافت کے اشکال کو دور کر دوں اور تمھارے لیے ایک ایسا نوشتہ لکھ دوں جو میرے بعد تمھیں گمراہی سے بچائے رکھے۔

پیغمبر اسلامؐ کے دہن اقدس سے یہ کلمات سن کر حضرت عمر کی عمری رگ بھڑک اٹھی اور انھوں نے جسارت آمیز لہجہ میں فرمایا کہ اس شخص کو (اس کے حال پر) چھوڑ دو، کیونکہ یہ ہذیان بک رہا ہے[1] ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے[2]

علامہ شبلی کا کہنا ہے کہ حضرت عمر کے اس قول میں لفظ "ہجر" استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہذیان کے ہیں... حضرت عمر نے ارشاد پیغمبری کو ہذیان سے تعبیر کیا تھا[3]

بہر حال یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس عمری جسارت

---

[1] سر العالمین ص ۹ طبع بمبئی [2] بخاری ج۱ ص ۲۲ [3] الفاروق ص ۶۱

نے رسول اکرمؐ کی سعیٔ مواخاۃ اور درس اخوت کو آن واحد میں پامال کر کے موجودہ صحابہ کے درمیان ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور انھیں آنحضرتؐ کی نظروں کے سامنے ہی دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ جو ارشاد نبوی کے مطابق اہل بیتؑ سے اپنے کو متمسک کیے ہوئے تھا یہ کہہ رہا تھا کہ آنحضرتؐ کو قلم و دوات مہیا کر دو تاکہ آپ ہمارے لیے گمراہی سے بچنے کا نوشتہ لکھ دیں۔ دوسرا گروہ جو عمر کا ہمنوا تھا، آنحضرتؐ پر عمری ہذیان کی تہمت کو درست تسلیم کر رہا تھا اور حسبنا کتاب اللہ کی تائید کر رہا تھا۔

تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس ہنگامہ آرائی میں گالم گلوج اور ہاتھا پائی کی نوبت بھی آئی یا نہیں لیکن اس کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ چیخ و پکار اور شور و غل کا یہ عالم تھا کہ پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی مستورات بھی اس نزاع میں شریک ہو گئی تھیں اور وہ بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ آنحضرتؐ کو قلم دوات دے دو تاکہ وہ نوشتہ لکھ دیں۔ عمر نے انھیں بھی ڈانٹا اور کہا کہ تمھاری جیسی عورتیں تو یوسف کے ساتھ بھی تھیں جو اُن کی بیماری پر (مگر مچھ کے) آنسو بہایا کرتی تھیں اور جب وہ صحت یاب ہو جاتے تھے تو ان کو رات دن پریشان کیا کرتی تھیں۔ عمر کی اس بات پر رسولؐ نے بھی یہ فرمایا کہ تم ان عورتوں کے بارے میں کچھ نہ کہو کیونکہ وہ تم لوگوں سے کہیں بہتر ہیں[1] لیکن جب عمر پر اس ارشاد نبوی کا کوئی اثر نہ ہوا اور مسلسل شور و غل اور ہنگامہ آرائی کے ساتھ صورت حال قابو

---

[1] کنز العمال ج۳ ص ۱۳۸

سے باہر ہونے لگی تو آنحضرتؐ نے قوموا عنی کہہ کر انھیں اپنے گھر سے باہر نکال دیا۔

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عمر نے رسولؐ کے احترام و ادب کو بالائے طاق رکھ کر ارشاد نبوی کو ہذیان سے تعبیر کرنے اور حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ بلند کرنے کی جسارت اور گستاخی کیوں کی؟ اور اس قولِ ربانی کی اطاعت کیوں نہیں کی جس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ:

"اے ایمان والو! خدا اور رسولؐ کی باتوں پر اپنی بات کو مقدم نہ کرو اور نبی کی آواز پر اپنی آوازوں کو بلند مت کرو۔"

اس سوال کے پس منظر میں ایک سیاسی، سازشی اور تاریخی تسلسل پنہاں ہے اور وہ یہ ہے کہ رسولؐ کی حیات طاہرہ کے آخری دور میں منافقین صحابہ نے باضابطہ سازشوں کا آغاز کر دیا تھا جس کی محکم دلیل سورۂ منافقون کا نزول ہے۔

یہ ابتدائی سازشیں اہل مدینہ اور مفاد پرست حلقہ بگوشانِ رسالت کے درمیان پل اور بڑھ رہی تھیں اور ان کا محور یا مرکزی نقطہ رسولؐ کی جانشینی اور مسلمانوں کی قیادت وخلافت کا مسئلہ تھا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد ۸ھ میں ان سازشوں کے تانے بانے درست کیے جانے لگے تھے اور ان میں تیزی اس وقت پیدا ہوئی جب رسول اکرمؐ نے ۹ھ میں تیس ہزار کا لشکر لے کر ہرقل بادشاہ روم سے مقابلہ کے لیے مدینہ سے شام کی طرف کوچ فرمایا اور تبوک نامی بستی میں مسلسل بیس ر[illegible] تک قیام فرما رہے لیکن جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ یہ واضح رہے کہ [illegible] جنگی مہم میں آنحضرتؐ نے ہر

جنگ کے فاتح حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کو اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے جب رسول اکرمؐ سے شکوہ کیا اور اس مہم کی عدم شرکت پر اپنے دلی کرب کا اظہار فرمایا تو پیغمبرؐ نے کہا: اے علیؑ! کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی[1]۔ کنز العمال میں ہے کہ رسولؐ نے فرمایا کہ اے علیؑ! میں تم کو اس لیے چھوڑے جاتا ہوں تاکہ تم ہی میرے بعد میرے خلیفہ رہو کیونکہ مدینہ کی حالت صرف میرے رہنے یا تمھارے رہنے سے ہی درست رہ سکتی ہے۔[2]

یقیناً اس قول پیغمبرؐ کے بعد سازشی بھی یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ آنحضرتؐ نے علیؑ کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا طے کر لیا ہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ ان منافق سازشیوں نے تبوک کی واپسی پر پیغمبر اسلامؐ کی شمع حیات گل کر دینے کی ناکام و ناپاک کوششیں بھی کیں جو تاریخ میں واقعہ عقبہ کے نام سے محفوظ ہے۔ اور یہی وہ واقعہ ہے جس کے ذیل میں عمر بار بار حذیفہ سے پوچھا کرتے تھے کہ کیا سازشی منافقین میں میرا نام بھی شامل ہے؟[3] اور پھر آخر کار ایک دن دماغی کچوکوں اور قلبی ٹھوکوں سے مجبور ہو کر حضرت عمر کی زبان پر یہ سچائی آ ہی گئی کہ اے حذیفہ! خدا کی قسم ان منافقین میں میں بھی شامل تھا۔[4] اس واقعہ کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] تذکرہ خواص الامہ ص ۱۲ [2] کنز العمال ج ۶ ص ۴۰۴ [3] مدارج النبوہ ج ۴ ص ۲۰۲
[4] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۳۶

اس واقعہ عقبہ کے بعد اسی ۹ھ میں ایک واقعہ اور رونما ہوا جس نے منافقین کی سازشی مصروفیات میں مزید سرعت اور تیزی پیدا کردی۔ اس واقعہ کا اجمال یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے تبوک سے واپسی پر تین سو مسلمانوں پر مشتمل ایک قافلہ حج کے لیے روانہ کیا اور ابوبکر کو سورۂ برأت کے ساتھ اس قافلے کا سردار مقرر کیا تاکہ وہ حج کے موقع پر اس سورہ کی تبلیغ فرمائیں۔ عمر بھی اس قافلے میں شامل تھے، ابھی قافلہ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ جبرئیلؑ نازل ہوئے اور انھوں نے رسولؐ کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! خدا کا حکم ہے کہ آپ یا آپ کے قرابت دار کے علاوہ کوئی دوسرا شخص سورۂ برأت کے تبلیغی کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ اس حکم پر رسول اللہؐ صلعم نے حضرت علی علیہ السلام کو تیزی کے ساتھ قافلے کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ ابوبکر سے سورۂ برأت لے کر اس کی تبلیغ خود کریں اور انھیں واپس مدینہ بھیج دیں۔ حضرت علیؑ نے خدا اور رسولؐ کے حکم پر برق رفتاری سے عمل کیا۔ چنانچہ ابوبکر جب پلٹ کر مدینہ آئے تو اپنی معزولی پر آنحضرتؐ کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور عرض کی کہ کیا میرے متعلق کوئی امر حادث ہوگیا ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ اس کی تبلیغ خود کروں یا وہ شخص کرے جو مجھ سے ہو۔[1]

اس ذیل میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحقیق یہ ہے کہ آنحضرتؐ

---

[1] بخاری پ۵ ص ۲۳۸، فتح الباری پ۱۹ ص ۱۹۴، کنز العمال ج۱ ص ۱۴۶، در منثور ج۳ ص ۲۱۰، تاریخ خمیس ج۲ ص ۱۵۶ وغیرہ

نے ابوبکر اور عمر دونوں کو سورۂ برأت کی تبلیغ پر مامور فرمایا تھا پھر دونوں ہی کو معزول کر کے یہ کام علیؑ کے سپرد کیا۔[1]

اس عبرت ناک انجام کے بعد سنہ ۱۰ھ میں ان صحابہ کے سازشی منصوبوں پر ایک ضرب کاری اور پڑی، جب حجۃ الوداع کی واپسی پر پیغمبرؐ نے "غدیر خم" میں سورۂ انشراح کی آیت (جب تم فارغ ہو چکو تو اپنا جانشین مقرر کردو) اور سورۂ مائدہ آیت یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ ۔۔۔ الخ (یعنی اے رسول! جو تم پر نازل کیا گیا ہے اسے فوری طور پر پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو کار رسالت انجام ہی نہیں دیا۔ اللہ تم کو لوگوں (منافقین) کے شر سے محفوظ رکھے گا)، کے تحت ابن عم، داماد اور انت منی وانا منک کے مصداق حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام کو دعوت ذوالعشیرہ میں کیے گئے وعدہ کے مطابق اپنا جیسا حاکم بنا دیا۔ زبان رسالت سے لفظیں یوں ادا ہوئیں من کنت مولاہ فھٰذا علی مولاہ۔[2]

امام المحدثین حافظ ابن عبدہ نے غدیر خم کے سلسلہ میں ۱۰۰ صحابہ کرام سے حدیثیں نقل کی ہیں۔ امام جزری اور امام شافعی نے اسّی صحابیوں سے، امام احمد بن حنبل نے تیس صحابہ سے اور طبری نے پچھتر صحابیوں سے روایتیں نقل کی ہیں۔ ان کے علاوہ ذہبی اور صنعانی وغیرہ نے اسے متواتر مانا ہے۔[3] لہٰذا انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

---

[1] قرۃ العینین ص ۲۳۴ [2] تفسیر در منثور ج۲ ص ۲۹۸، سر العالمین ص۹ مطبوعہ بمبئی

[3] نہج الوصول ص ۱۳، فتح البیان ج۱ ص ۴۸

اسی سنہ ھ میں رسول اللہ صلعم نے حکم خالق کے تحت میدان مباہلہ میں "ابنائنا، نساءنا، انفسنا" کی عملی تفسیر کے ذریعہ اپنے اہل بیتؑ کا اظہار بھی فرمادیا۔

ان تمام واقعات کا تسلسل اور رسول اکرمؐ کے عملی اقدامات کا تواتر یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضور سرور کائناتؐ بھی منافقین کی سیاسی اور سازشی ریشہ دوانیوں سے بے خبر نہیں تھے۔ اگر آپ بے خبر ہوتے تو اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ احکامات وارشادات صادر نہ فرماتے جن سے صحابہ نے ذاتی طور پر اختلاف کیا اور بات صرف اختلاف تک ہی محدود نہ رہی بلکہ کہیں پر کھل کر حکم پیغمبرؐ کی نافرمانی عمل میں لائی گئی کہیں رسالت کے تقدس کو پامال کیا گیا، کہیں احکامات پر عمل سے گریز کیا گیا۔ کہیں رسولؐ کے مقابلے میں جسارت کا مظاہرہ کیا گیا اور کہیں پر آپ کی شان میں ایسی گستاخیاں کی گئیں کہ حضورؐ کو ان صحابہ کے خلاف لعنت جیسے ابدی حربہ کا استعمال کرنا پڑا۔ غرض کے رسولؐ کے خلاف سازشوں کا ایک سلسلہ بھی جاری رہا اور سازشیوں پر پیغمبری لعنت بھی برستی رہی۔ خدا حق پسند مسلمانوں کو اس لعنت سے محفوظ رکھے۔

اپنی رحلت سے قبل ۱۱ھ میں پیغمبر اسلامؐ نے ملت اسلامیہ کو افتراق وانتشار اور ابدی فرقہ بندی سے بچانے کے لیے بڑے ہی حکیمانہ انداز میں ایک اہم فیصلہ اور کیا۔ چنانچہ اس فیصلہ کے تحت آپ نے حکومت روم کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر تیار کیا اور اس کا امیر اسامہ بن زید کو بنایا اور تمام اعیان مدینہ، مہاجرین اور انصار کے ساتھ آپ نے ابوبکر، عمر، عثمان، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ بن جراح، سعید بن زید

اور قتادہ وغیرہ کو بھی اس لشکر میں شامل کر کے انھیں فی الفور مدینہ سے روانہ ہو جانے کا حکم دیا۔ آنحضرتؐ کا یہ حکم تاکیدی حکم تھا اور اس حکم کے تحت ابوبکر و عمر وغیرہ کو فوراً اسامہ کے لشکر کے ساتھ چلے جانا چاہیے تھا مگر اسے مسلمانوں کی بدقسمتی کہیے، ملت اسلامیہ کے انتشار کا عملی آغاز کہیے یا پھر اسلام کو تباہی و بربادی کے راستہ پر ڈالنے کا سازشیوں کی طرف سے تباہ کن منصوبہ کہیے کہ یہ لوگ اسامہ کے ساتھ نہیں گئے اور انھوں نے فرمان رسالت کو سختی سے ٹھکرا دیا۔

آنحضرتؐ کا سخت تاکیدی حکم سترہ سالہ نوجوان اسامہ بن زید کی قیادت سرلی روانگی میں عجلت کی تہدید، منافق صحابہ کا تخلف، حضرت علی علیہ السلام کو رسول اللہ صلعم کا اپنے پاس روکنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جانشینی اور خلافت کے معاملات میں پیغمبر اسلام کو جن لوگوں سے خطرہ تھا انھیں مدینہ سے باہر روانہ کر دینا چاہتے تھے تاکہ ان کی سیاسی چالیں اور سازشیں کامیاب نہ ہو سکیں ورنہ اسلام تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اکابرین صحابہ کو اسامہ کی ماتحتی میں اس لیے رکھا تھا کہ اگر لشکر کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں ہوتی تو اس کا امکان تھا کہ یہی لوگ پلٹ کر حملہ کر دیتے اور اقتدار، حکومت نیز خلافت پر قبضہ کر لیتے جیسا کہ آنحضرتؐ کی آنکھیں بند ہوتے ہی سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا۔ لہٰذا جن لوگوں سے خطرہ تھا انھیں رسولؐ نے عام لشکری کی حیثیت دی اور جس پر اعتماد تھا اسے امیر مقرر کیا تاکہ یہ منافقین سرتابی اور روگردانی نہ کر سکیں مگر حصول اقتدار کی سازشوں نے انھیں اتنا جسور بنا دیا تھا کہ ان لوگوں نے اسامہ بن زید کے لشکر سے علیحدگی اختیار کر کے رسولؐ کی دی ہوئی اللہ

کی ابدی لعنت قبول کر لی۔ اس کی تفصیل ہم گزشتہ اوراق میں تحریر کر چکے ہیں۔

حضرت عمر کی غیر اسلامی فطرت میں یہی وہ سازشی جسارتیں اور گستاخیاں تھیں جو رسولؐ کی زندگی کے آخری ایام میں اپنے حدود سے تجاوز کر گئیں جس کے تحت عمر نے رسولؐ پر ہذیان کی تہمت عائد کر کے انھیں نوشتہ لکھنے سے باز رکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس معاملہ میں صحابہ کی اکثریت عمر کے ساتھ تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام کا سفینہ اسی منزل میں چکنا چور ہو گیا، ملّت اسلامیہ کا مستقبل اندھیروں میں ڈوب گیا اور یہیں سے فتنوں کے دروازے کھل گئے۔ اس واقعہ کو یاد کر کے ابن عباس اس قدر رویا کرتے تھے کہ سنگ ریزے آنسوؤں سے تر ہو جایا کرتے تھے۔ ابن عباس کا کہنا تھا کہ لوگوں نے رسول اکرمؐ کو نوشتہ لکھنے سے باز رکھا، یہی قیامت ہے اور یہی اسلام و اہل بیت پر تمام مصائب کی جڑ ہے[۱]۔

یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر کے اس جاہلانہ اور منافقانہ اقدام اور چیخ پکار پر آنحضرتؐ نے نوشتہ لکھنے کا ارادہ کیوں ترک کر دیا جب کہ فعل واجب کسی کی مخالفت سے ترک نہیں کیا جا سکتا؟

اس کا جواب ایک حق پسند اور منصف مزاج سنی عالم شیخ سلیم (جامعہ ازہر) کی زبان سے سنیے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

"قلم و دوات لانا اصحاب پر فرض تھا نہ کہ آنحضرتؐ پر۔ حضرتؐ

---

[۱] بخاری پ۱ ص ۱۰۶، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۵۳، طبری ج ۳ ص ۱۹۳ وغیرہ

کا فریضہ تو اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد شروع ہوتا تھا، جب اصحاب ہی نے انکار کر دیا تو آپ کا فریضہ بھی ساقط ہو گیا اور حجت تمام ہو گئی۔ اب تحریر کا کوئی اثر بھی غیر از فتنہ نہیں ہو سکتا تھا[۱]۔"

علامہ عبدالحسین شرف الدین طاب ثراہ کا کہنا ہے کہ:

"اولاً تو اب اس تحریر کا پیش کرنا اس فتنہ کا ابھارنا تھا جس کا اندازہ صرف اعلان سے کر لیا گیا تھا۔ یعنی مقابل طاقتیں اپنے مفاد کو پامال ہوتا ہوا دیکھ کر باقاعدہ مقابلہ پر آمادہ ہو جاتیں اور اس طرح حضورؐ کی تمام زندگی کی محنت خاک میں ملتی ہوئی نظر آتی، دوسرے یہ کہ اس تحریر سے فوری طور پر دو جماعتیں پیدا ہو جاتیں۔ ایک اسے بھی ہذیان کا نتیجہ قرار دیتی اور ایک اس پر بلاچون وچرا ایمان لے آتی اور یہ تحریر دونوں کے لیے بیکار ہوتی۔ ایمان لانے والی جماعت پر یہ مقصد واضح ہو گیا تھا اسے ضرورت نہ پڑتی، انکار کرنے والی پارٹی انکار ہی کرتی اور نتیجہ میں اچھی خاصی حدیث کی مزید توہین ہوتی۔ اتمام حجت ہو ہی چکا تھا، پہلی جماعت اپنی بات پر اٹل تھی، دوسری جماعت اپنی جگہ غائبانہ ایمان لائے ہوئے تھی اور حدیث ثقلین سے متمسک تھی[۲]۔"

مندرجہ بالا امور کے پیش نظر حضور اکرمؐ نے اگر نوشتہ تحریر کرنے کا خیال ترک فرما دیا ہو تو اس میں حیرت و تعجب کی گنجائش نہیں ہے۔

توجیہات و تاویلات

حضرت عمر کی اس طوفان بدتمیزی پر پردہ پوشی کے لیے عمر نواز

---

[۱] نص و اجتہاد ص ۹۶ [۲] نص و اجتہاد ص ۹۴، ۹۵

علماء کی طرف سے جن توجیہات وتاویلات کا سلسلہ صدیوں سے اب تک جاری ہے وہ زیادہ تر حسب ذیل نکات پر مبنی ہیں۔

۱. کہاجاتا ہے کہ آنحضرتؐ اپنی بیماری کی وجہ سے سخت تکلیف میں مبتلا تھے، اس لیے قلم ودوات نہ دے کر عمر نے سردار انبیاء کو مزید تکلیف سے بچالیا۔

۲. کہاجاتا ہے کہ عمر کو یہ معلوم تھا کہ شریعت کے متعلق کوئی نکتہ باقی نہیں رہ گیا کیونکہ قرآن میں آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل ہو چکی تھی، اس لیے کسی نوشتہ کی ضرورت نہیں تھی۔

۳. کہاجاتا ہے کہ اگر کوئی ضروری حکم ہوتا تو آنحضرتؐ عمر کے روکنے سے کیوں رکتے؟ اس واقعہ کے بعد آپ تین دن تک بقید حیات رہے اس وقت نہ سہی بعد کو لکھوا دیا ہوتا

۴. کہاجاتا ہے کہ عبداللہ بن ابوبکر کو بلوا کر آنحضرتؐ، ابوبکر کے بارے میں خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے، پھر آپ نے ضروری نہیں سمجھا اور فرمایا کہ اہل اسلام خود ابوبکر کے علاوہ کسی اور کو پسند نہ کریں گے۔

۵. کہاجاتا ہے کہ عمر کے اس اختلاف کے بعد آنحضرتؐ نے لوگوں کو زبانی وصیتیں بھی فرمائیں، اسی میں اپنے مقصد کی صراحت فرما دیتے۔

مولوی سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی انھیں فرسودہ توجیہات وتاویلات کے خدوخال کو اپنی کتاب "المرتضیٰ" میں اجاگر کرنے کی سعی کی ہے، جس کے اقتباسات ہم الخلفاء حصہ اول میں پیش کر چکے ہیں۔ مزید

اطمینان کے لیے قارئین کرام ندوی کی کتاب المرتضیٰ کے صفحات ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴ کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

پہلے یہ واضح کردوں کہ مذکورہ توجیہات وتاویلات کے جوابات شیعہ علماء کی طرف سے ہر صدی، ہر دور، ہر زمانے میں تفصیلاً وتحریراً دیے جا چکے ہیں، اجمالاً میں بھی تحریر کیے دیتا ہوں۔ مگر برا ہو عصبیت کا کہ اس نے عمر نواز علماء کے ذہنوں پر باطل اور ہٹ دھرمی کے وہ سیاہ پردے ڈال رکھے ہیں جو حق کی طرف انھیں مائل ہی نہیں ہونے دیتے۔ نہ یہ حق بات سنتے ہیں اور نہ ہی حق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہے۔ عبادت الگ ہے، شریعت الگ ہے، نظریہ الگ ہے۔ کاش اللہ انھیں حق کی روشنی کے ساتھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی عطا کرتا تو یہ اختلافی مسئلہ جو اب تک مسلمانوں کو فرقوں میں تقسیم کیے ہوئے ہے، وہابیت کے عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا ہوتا۔ نہ توجیہہ ہوتی نہ تاویل، مسلمان اپنی جگہ متحد ہوتا اور جس شے کے حضرت عمر مستحق تھے اس سے انھیں نوازتا رہتا۔ بہرکیف ـــ

(۱) پہلی توجیہہ یہ ہے کہ آنحضرت اپنی بیماری کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا تھے۔

ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضور سرور کائنات تکلیف میں مبتلا تھے اور آپ کی تکلیف ایسی تھی کہ پورا خانوادۂ رسالت اس سے متاثر، مضطرب بے چین اور پریشان تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو اپنے اس ذاتی مرض کی عارضی تکلیف کا احساس زیادہ تھا یا جملہ امت

کے ہادی، رہبر، مقتدا اور پیشوا کی حیثیت سے آپ منصب نبوت پر فائز تھے، اس امت کی گمراہی کا خیال آپ کے لیے کرب و اذیت کا باعث بنا ہوا تھا؟ درست تو یہ ہے کہ آپؐ کو تکلیفوں کا سامنا اسی وقت سے تھا جب سے آپ مبعوث بہ رسالت ہوئے تھے۔ آپ کا خود ارشاد ہے کہ جتنی تکلیفیں اور اذیتیں مجھے پہنچائی گئیں کسی نبی کو نہیں پہنچیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ اشارہ ان تکلیفوں کی طرف تھا جو کافروں اور منافقوں کی طرف سے آپ پر مسلط کی گئیں۔ مگر کیا ان تکلیفوں کی وجہ سے آپؐ کافروں، مشرکوں اور منافقوں کی ہدایت سے کنارہ کش ہو گئے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ نے لوگوں کی ہدایت اور بہتری کو اپنی ذاتی تکلیف پر ہمیشہ ترجیح دی اور اپنے فرائض منصبی کو عزم و ارادہ اور صبر تحمل کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ انھیں فرائض منصبی کے تحت آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھی اپنی عزیز ترین امت کو اپنے بعد بھی گمراہی سے بچانے کا خیال رکھا، اسی کے تحت آپ نے قلم اور دوات طلب کیا اور اسی کے تحت نوشتہ لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تاکہ مسلمانوں کا مستقبل گمراہی سے محفوظ رہ سکے۔ لیکن اسے امت مسلمہ کی بدنصیبی کہیے یا امت کا انتشار کہ حضرت عمر نے اپنے اور اپنے چند ساتھیوں کے ذاتی مفاد کی خاطر پیغمبر اسلام کے اس حکیمانہ منصوبے کو چٹکیوں میں اڑا دیا اور مسلمانوں کی گمراہی کے امکانات ہمیشہ کے لیے باقی رہ گئے۔

توجیہہ اور تاویل کے علاوہ اس سوال کا کیا جواب ہے کہ جب رسولؐ بھی سمجھ رہے تھے اور صحابہ بھی جان رہے تھے کہ یہ آنحضرتؐ کی

زندگی کے آخری ایام ہیں تو آپ اس ضروری کار ہدایت سے کیوں روک دیے گئے؟ اور کیوں آپ کو آخری وصیت سے باز رکھا گیا؟ جبکہ ہر مرنے والے کو اپنی آخری خواہشیں بیان کرنے کا فطری اور آئینی حق حاصل ہے۔ تو پھر پیغمبر اسلامؐ سے یہ حق کیوں چھین لیا گیا؟ اس کا جواب صرف اقتدار کی ہوس، سیاسی بازی گری اور سازشی اقدام ہے۔

یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ حضورؐ اُمّی تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب آنحضرتؐ پر وحی نازل ہوتی تھی تو اس کی کتابت حضرت عمر کے ہاتھوں عمل میں آتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ (معاذ اللہ) رسولؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور جب ایسا تھا تو پھر حضرت عمر کو خطرہ کس بات کا تھا۔ بے دھڑک قلم اور دوات دے دیتے اور پھر یہ دیکھتے کہ حضورؐ کیا کرتے ہیں؟ بہر حال کائنات کی تاریخ ایسی دوسری مثال پیش کرنے سے قطعی قاصر ہے کہ حضورؐ کے علاوہ کسی اور نبیؑ کو اس کے کسی صحابی کے جارحانہ اقدام نے وقت آخر وصیت سے روک دیا ہو۔

یہ توجیہہ کہ حضرت عمر نے آنحضرتؐ کو مزید تکلیف سے بچایا، اس وقت خود بخود ہوا میں اڑ جاتی ہے جب تاریخ یہ بیان کرتی ہے کہ عمر کی فتنہ پردازیوں اور ریشہ دوانیوں نے قدم قدم پر آنحضرتؐ کو اذیتوں اور تکلیفوں میں مبتلا رکھا۔

(۲) دوسری توجیہہ یہ ہے کہ شریعت سے متعلق کوئی نکتہ باقی نہیں رہ گیا تھا کیونکہ قرآن میں آیت الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہو چکی تھی۔

حضرت عمرؓ کو یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ شریعت سے متعلق کوئی نکتہ باقی نہیں رہ گیا؟ کیا شریعت کے مالک و مختار آپ ہی تھے؟ کیا آپ کا علم رسولؐ کے علم سے زیادہ تھا؟ کیا رسولؐ کی زندگی کے آخری ایام میں رسالت آپ کی طرف منتقل ہو گئی تھی؟ کیا آپ پر جبریل کا نزول ہو گیا تھا؟ کیا آپ پر الہام ہوا تھا؟ کیا آپ کے جسم میں اس وقت کسی کاہن کی روح حلول کر گئی تھی کہ جس نے آپ کو بتا دیا کہ اب شریعت کے متعلق کوئی نکتہ باقی نہیں رہ گیا۔

اگر پیغمبر اسلامؐ، عمر اور ان کے ساتھیوں کے لیے دین کو مکمل سمجھتے تو پھر کاغذ قلم اور دوات طلب کرنے کی ضرورت ہی کیوں در پیش آتی؟

آیت الیوم اکملت لکم..... کا محل نزول یہ بتاتا ہے کہ تمام غدیری کارروائیوں کے بعد یہ آیت نازل ہوئی اور اس کا اجمال یہ ہے کہ رسول اکرمؐ آخری حج سے فارغ ہو کر مدینہ واپس پلٹ رہے تھے کہ آیۂ بلّغ نازل ہوئی جس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ:

"اے رسول! جو حکم تم پر تمھارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھ لو کہ) تم نے اللہ کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا اور تم ڈرو نہیں، خدا تمھیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا"

(مائدہ - ۶۷)

اس منزل میں یہ وضاحت انتہائی اہم ہے کہ مذکورہ آیت کے بارے میں ابن حاتم نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ یہ آیت غدیر خم میں حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی۔ اسی وجہ سے ابن معترد سے ابن مردیہ نے روایت کی ہے کہ ہم لوگ رسولؐ اللہ کے زمانہ

میں اس آیت کو یوں پڑھتے تھے:

يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اِنَّ عَلِيًّا مَوْلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط

"اے رسول! جو حکم اس بات کا کہ علیؑ تمام مومنین کے مولیٰ اور حاکم ہیں، تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو سمجھ لو کہ تم نے کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا۔"

آیت مذکورہ میں پروردگار کا لہجہ اس قدر سخت تھا کہ آنحضرتؐ کو اپنی تیئیس ۲۳ سالہ تبلیغی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی اس لیے آپ جہاں تھے وہیں رک گئے اور ستر ہزار حاجیوں پر مشتمل وہ قافلہ بھی ٹھہر گیا جو آپ کے ہمراہ تھا۔ ان میں سے جو لوگ آگے جا چکے تھے وہ واپس پلٹائے گئے اور جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے ان کا انتظار کیا گیا۔ جلتا ہوا ریگستان آگ اگلتی ہوئی زمین، تپتا ہوا سورج، دوپہر کی دھوپ، لو کے تیز جھکڑ حاجیوں کی یہ حالت کہ اپنی اپنی عباؤں اور رداؤں پر کھڑے تھے۔ جب سارا مجمع ایک مرکز پر سمٹ کر اکٹھا ہو گیا تو امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر آنحضرتؐ پالان شتر کے منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور فرمایا کہ: کیا میں تمھارا حاکم اور تمھارے نفسوں کا والی نہیں ہوں؟ تمام حاضرین نے ایک آواز ہو کر جواب دیا کہ بیشک آپ ہمارے حاکم اور ہمارے نفسوں کے والی ہیں۔ پھر فرمایا: کیا تمھاری جان اور تمھارے مال پر میرا حق نہیں ہے؟ سبھوں نے کہا، ہماری جانیں آپ پر قربان، بے شک ہماری جان اور ہمارے مال پر آپ کا حق ہے۔

اس کے بعد آپ نے تمام مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ:- میری طلبی خدا کی بارگاہ میں ہو چکی ہے اور میں لبیک کہہ چکا ہوں اور دیکھو میں تمھارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک قرآن ہے اور دوسرے میرے اہل بیتؑ، اور یہ دونوں عظمت میں ایک دوسرے کے مساوی ہیں اور ایک دوسرے سے اس وقت تک جدا نہ ہوں گے حتّٰی کہ روزِ قیامت حوضِ کوثر پر میرے پاس وارد ہو جائیں۔ اگر تم ان سے متمسک رہو گے تو قیامت تک گمراہ نہ ہو گے اور میں دیکھوں گا کہ تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔

اور جب یہ تمام مراحل طے ہو گئے تو آپؐ نے علیؑ کو اپنے دستِ بازو کی قوت سے بلند کرتے ہوئے فرمایا کہ اے مسلمانو! خداوندِ عالم میرا مولا، میرا آقا، میرا مالک اور میرا حاکم ہے جیسے کہ میں تمھارا مولا، آقا، مالک اور حاکم ہوں۔ لہٰذا جس کا مولا میں ہوں آج سے علیؑ بھی اس کے مولا ہیں اور میرے جانشین ہیں۔

پھر فرمایا: پروردگار! دوست رکھ اس کو کہ جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمن رکھ اسے کہ جو علیؑ کو دشمن رکھے اور ذلیل و رسوا کر اس کو جو علیؑ کو رسوا کرے۔

اس کارروائی کے بعد جب سارا مجمع علیؑ بن ابی طالب کو مبارکباد پیش کر چکا اور حضرت عمر بھی بخٍ بخٍ کہہ کر اپنے دلی کرب کا اظہار فرما چکے تو آیت الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہوئی جس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ:

"آج میں نے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔"[لہ]

ظاہر ہے کہ اگر رسول اکرمؐ حضرت علیؑ کو حکمِ تبلیغ کے مطابق اپنا خلیفہ، جانشین اور تمام مسلمانوں کا مولا اور حاکم مقرر نہ کرتے اور آپ کی ولی عہدی کا اعلان نہ فرماتے تو مذکورہ آیت کے نزول کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا۔

جب یہ نتیجہ سامنے ہے کہ ولایتِ علیؑ کا اعلان ہی تکملۂ دین، قبولیتِ اسلام اور اتمامِ نعمت کی سند ہے تو علیؑ کی ذاتِ گرامی کو اس سند کا مجموعہ کیوں نہ تسلیم کیا جائے کیونکہ نعمتِ الٰہی کا اتمام علیؑ کی شکل میں ہوا اور اس نعمت میں کوئی دوسری نعمت شریک نہیں ہے۔

نعمت عطیہ الٰہی ہے وہ جسے چاہتا ہے اس سے نواز دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے محروم رکھتا ہے۔ نعمت شکر کی متقاضی ہے اور کفرانِ نعمت کفر ہے۔ اور کفر، کفر ہی ہے خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو مجسم نعمت قرار دے کر علیؑ کے مدارج و مناصب کو علیؑ کے پروردگار نے عرش تک پہنچا دیا اور زمین پر بسنے والوں کے لیے علیؑ کو مرجعِ ہدایت بنا کر تمام مسلمانوں پر آپ کی محبت و اطاعت فرض کر دی۔

لہٰذا دین صرف انھیں لوگوں کے لیے کامل قرار پایا جن لوگوں نے علیؑ کی محبت اور اطاعت کو اپنا شعار بنایا اور خلوصِ دل کے ساتھ اہلِ بیتؑ سے متمسک ہو گئے۔

لہ تفسیر درمنثور سیوطی ج ۲ ص ۳۰۹ سطر ۴-۵ مطبوعہ مصر

رضی اللہ عنہ کا مصداق وہی ہے جو اللہ کی مرضی پر راضی برضا ہے، اہل بیتؑ سے تمسک رکھے اور علیؑ کی محبت واطاعت کے قلعے میں خود کو محصور کرلے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمر ان تمام امور سے کوسوں دور رہے اس لیے رحمۃ للعالمین نے وقت آخر انھیں راہ راست پر لانے کی ایک کوشش اور کی۔ مگر ان کی اس بدنصیبی کو کیا کیا جائے کہ انھوں نے اسے بھی ٹھکرا دیا اور گمراہی کے اندھیرے میں ہمیشہ کے لیے بھٹک گئے۔

(۳) تیسری توجیہہ یہ کہ اگر کوئی ضروری حکم ہوتا تو آنحضرتؐ عمر کے روکنے سے کیوں کر رک سکتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد آپ تین چار دن تک زندہ رہے اس وقت نہ سہی، بعد کو لکھوا دیا ہوتا۔

ظاہر ہے کہ ضروری حکم نہ ہوتا تو آنحضرتؐ نوشتہ کے ذریعہ اپنی امت کو گمراہی سے بچانے کی خواہش کا اظہار ہی کیوں فرماتے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس خواہش کے اظہار میں پیغمبرؐ میں اپنی ذاتی رائے کا دخل نہیں ہوسکتا، کیوں کہ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ رسولؐ اپنی خواہش پر (ضروری یا غیر ضروری) کوئی کلام نہیں کرتا جب تک وحی کا نزول نہ ہو جائے[1]

اب مسلمان خود یہ فیصلہ کرے کہ کیا پیغمبرؐ کی کسی ایسی تحریر کو جو تمام مسلمانوں کو گمراہی سے محفوظ رکھنے کی حتمی ضمانت پیش کرتی ہو غیر ضروری قرار دیا جاسکتا ہے یا اس کے ضروری ہونے میں کسی شک وشبہ کا تصور

---

[1] سورۂ النجم آیت ۳، ۴

کیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ جو تحریر رسولؐ کے بعد بھی مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کا وسیلہ بن سکتی تھی وہ انتہائی اہم اور ضروری تھی۔ کیونکہ قرآن کا نزول بھی اسی لیے عمل میں آیا کہ لوگ گمراہ نہ ہوں۔ اسلام بھی اسی لیے آیا کہ لوگ حق کے راستے پر گامزن ہوں۔ رسول بھی اسی لیے بھیجے گئے کہ لوگ گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر حق کی روشنی کی طرف آئیں، شریعت کا نفاذ اسی لیے ہوا کہ لوگوں کی زندگیاں گمراہیوں سے محفوظ رہ سکیں۔

غرض کہ یہ بات مکمل یقین واعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ملت مسلمہ کو اس نوشتہ کی اتنی ہی سخت ضرورت تھی جتنی نزول قرآن کی۔ اس تحریر کا فائدہ لوگوں کو اتنا ہی پہنچتا جتنا کہ اسلام سے پہنچا۔ اس سے وہی فیض حاصل ہوتا جو رسولؐ کے مبعوث بہ رسالت ہونے سے ہوا۔ جس طرح آنحضرتؐ نے تمام عمر اپنی امت کو گمراہی سے بچایا اسی طرح آپ کے بعد آپ کی یہ تحریر بھی مسلمانوں کو قیامت تک گمراہی سے بچاتی رہتی اور حضورؐ کی طرف سے تحریری طور پر ہدایت کا سلسلہ جاری رہتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلام فرقوں میں تقسیم ہونے سے بچ جاتا اور ساری دنیا کے مسلمان بلاتفریق ملت ایک اسلامی پلیٹ فارم پر نظر آتے۔ مگر افسوس کہ عمری ہذیان اور حسبنا کتاب اللّٰہ کی آواز نے مسلمانوں پر ہمیشہ کے لیے فتنوں اور گمراہی کے دروازے کھول دیے۔

یہ کہنا کہ "آنحضرتؐ عمر کے روکنے سے کیوں کر رک سکتے تھے" بیوقوفی اور جہالت کی دلیل ہے، صاف ظاہر ہے کہ جب طرح حضور اکرمؐ

روزاول عمر کے روکنے سے رک گئے اسی طرح باقی تین دن بھی رکے رہے، کیونکہ آپ بالکل ہی مجبور تھے اور آپ کا بستر مرگ عائشہ جیسی چالاک و مکار عورت کے حجرے میں تھا جہاں صرف ابو بکر و عمر اور عائشہ و حفصہ وغیرہ کی حکومت تھی کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ ان کے خلاف زبان کھول سکے۔ لہٰذا ان لوگوں نے جیسا چاہا ویسا کیا۔

بعد میں کچھ کہنے سننے یا لکھنے لکھوانے کا سوال اس وقت پیدا ہوتا تھا جب آپ عائشہ کے گھر سے منتقل ہو جاتے اور حضرت علیؑ و ابن عباس وغیرہ کو پیغمبرؐ سے آزادانہ گفتگو کا موقع فراہم ہو جاتا مگر یہ اس لیے ممکن نہیں تھا کہ علالت کی شدت نے آنحضرتؐ کو اس قدر کمزور و ناتواں کر دیا تھا کہ آپ بے بس ہو گئے تھے۔ اور اگر بفرض محال کسی صورت سے عائشہ کے حجرے ہی میں اس نوشتہ کی تکمیل کر دیتے تو کیا عائشہ، حفصہ، ابو بکر اور عمر کی موجودگی میں وہ نوشتہ وہاں سے عام مسلمانوں تک پہنچ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اس بات کا قطعی احتمال تھا کہ عمر کی عمری فطرت اسے چاک کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی جیسا کہ وفات پیغمبرؐ کے بعد فدک کے پروانۂ واگزاری کے معاملے میں یہ فعل آپ سے سرزد ہوا۔

(۴) یہ توجیہہ اور زیادہ حیرت انگیز و تعجب خیز ہے کہ عبداللہ بن ابو بکر کو بلا کر آنحضرتؐ ابو بکر کے بارے میں خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے، پھر آپ نے ضروری نہیں سمجھا اور فرمایا کہ اہل اسلام خود ابو بکر کے علاوہ کسی کو پسند نہ کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ آنحضرتؐ اگر ابو بکر کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے

تو کیا حضرت عمر اس سے اختلاف کر سکتے تھے جبکہ رحلت رسولؐ کے فوراً بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں ابو بکر کو منصب خلافت پر فائز کرنے والے آپ ہی تھے۔

مجھے یقین ہے کہ عمر کو اگر رسولؐ کے اس ارادہ کی ذرا بھی بھنک مل جاتی کہ آپ ابو بکر کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے ہیں تو ایک قلم دوات کیا ہزاروں قلم اور سینکڑوں دواتیں آنحضرتؐ کے سامنے ڈھیر کر دیتے اور کیا عجب تھا کہ دو چار رم کا غذ لے کر خود ہی بیٹھ جاتے اور کہتے کہ حضورؐ کو کتابت میں زحمت ہو گی، لہٰذا آپ صرف بولتے جائیں اور میں لکھتا جاؤں۔ تحریر مکمل ہونے کے بعد اگر گواہی کی ضرورت پڑتی تو آپ صحابہ ہی نہیں کفار مکہ کو بھی طلب کر لیتے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ابو بکر کی خلافت کے متعلق آنحضرتؐ کے لیے نوشتہ لکھنے کا ارادہ ممکن بھی تھا؟ قطعی نہیں۔ کیونکہ ابو بکر خلافت کے اہل تھے ہی نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر آپ خلافت کے اہل ہوتے تو سورۂ برأت کی تبلیغ سے معزول نہ کر دیے جاتے۔ یہ معزولی ظاہر کرتی ہے کہ آپ میں دینی خدمات کی سرداری یا احکام الٰہیہ کی تبلیغ و حفاظت کی صلاحیت نہیں تھی۔

جب اللہ اور اس کے حبیبؐ نے ایک معینہ امر کے لیے سورۂ برأت کے تبلیغی منصب کے لیے آپ کو پسند نہیں کیا تو اسلام کی ہدایت و قیادت کی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ آپ کے نا اہل کاندھوں پر کیسے رکھ دیتے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر ابو بکر میں سرداری اور قیادت کی صلاحیت

ہوتی تو آنحضرت آپ کو اسامہ ایسے کمسن صحابی کا ماتحت کیوں بناتے؟ اسامہ کا ماتحت ہو کر مدینہ سے باہر چلے جانے کا پیغمبری حکم یہ واضح کرتا ہے کہ نہ ہی آنحضرتؐ کے دل میں آپ کی خلافت کے متعلق کوئی خیال تھا اور نہ ہی امور مملکت میں آپ سرداری کے اہل تھے۔ ورنہ رسول اکرمؐ اسامہ کے بجائے آپ ہی کو لشکر کا امیر بناتے اور دوسرے صحابہ کو آپ کی اطاعت کا حکم دیتے۔

(۵) یہ توجیہہ بھی عجیب و غریب ہے کہ حضرت عمر کے اس اختلاف کے بعد آپ نے جو زبانی وصیتیں فرمائیں اسی میں اپنے مقصد کی وضاحت کر دیتے۔

سوال تو یہ ہے کہ آنحضرت نے جب پہلی وصیت کے لیے قلم و دوات کی خواہش ظاہر کی تو کہا گیا کہ یہ شخص ہذیان بک رہا ہے، ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ لیکن اس کے بعد آپ نے جو وصیتیں کیں ان پر نہ ہذیان کی تہمت عائد کی گئی اور نہ ہی حسبنا کتاب اللہ کا شور بلند کیا گیا۔ آخر کیوں؟ کیا آنحضرتؐ کے مرض کی شدت میں تخفیف ہو گئی تھی یا ان زبانی وصیتوں کے وقت آپ کی ہذیانی کیفیت ختم ہو گئی تھی؟

عقل تو یہ کہتی ہے کہ آنحضرتؐ کے مرض میں تخفیف کے بجائے اور اضافہ ہو گیا ہو گا اور حضرت عمر کے لیے اضافہ کی صورت میں ہذیان گوئی یا بدحواسی کی تہمت زیادہ آسان تھی۔ پھر یہ کیوں نہیں کہا گیا کہ آپ پر مرض کا غلبہ ہے، آپ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں، اسلام کامل ہو چکا ہے، کتاب اللہ کافی ہے، اب کسی زبانی وصیت کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر بعد میں کی جانے والی وصیتیں قابل توجہ سمجھی گئیں تو پہلی وصیت کی خواہش کیوں رد کر دی گئی؟ جو جھگڑا، جو نزاع اور جو اختلاف قلم و دوات کے مسئلے میں ہوا وہ ان زبانی وصیتوں کے بارے میں کیوں نہیں ہوا؟ عمر نواز علماء کے پاس آخر اس کا کیا جواب ہے؟ بجز اس جواب کے کہ نوشتہ لکھنے کا ارادہ حضرت علیؑ کی خلافت کی تصریح پر مبنی تھا اس لیے نزاعی صورت حال پیدا کر دی گئی اور زبانی وصیتیں چونکہ خلافت سے متعلق نہیں تھیں اور نہ ہی ان وصیتوں سے حضرت عمر یا مخالف پارٹی کا کوئی نقصان تھا اس لیے ان پر نہ حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ بلند کیا گیا اور نہ ہی ہذیان کی تہمت عائد کی گئی۔ پھر اگر آنحضورؐ اپنی ان زبانی وصیتوں میں اپنے مقصد کی وضاحت فرما بھی دیتے تو وہ کب قابل قبول ہوتی جب پہلی ہی مرتبہ یہ کوشش رد کر دی گئی۔

ان مذکورہ توجیہات و تاویلات کے علاوہ شیخ ازہر (شیخ سلیم) نے جن توجیہات کا ذکر کیا ہے اور ان کے جوابات دیے ہیں، پھر اپنا عذر بھی پیش کیا ہے، انھیں ہم علامہ عبدالحسن شرف الدین کی کتاب نص و اجتہاد سے (جس کے مترجم علامہ ذیشان حیدر صاحب جوادی ہیں) نقل کیے دیتے ہیں تاکہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"بعض علماء نے توجیہہ کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قصد واقعاً تحریر کرنے کا نہیں تھا بلکہ آپ اصحاب کا امتحان کرنا چاہتے تھے، حضرت عمر چونکہ اس نکتہ سے واقف تھے اس لیے انھوں نے منع کر دیا اور یہ ان کی الہامی صلاحیت کی واضح دلیل ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول کہ "تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے" امتحان پر حمل نہیں کیا جا سکتا ورنہ آنحضرتؐ کے لیے کذب صریح کا الزام لازم آئے گا۔"

پھر فرماتے ہیں کہ:

"بعض حضرات نے یہ عذر کیا ہے کہ یہ حکم واجبی نہ تھا بلکہ اصحاب سے ایک مشورہ تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے یہ سوچ کر روک دیا کہ ایسے وقت میں آپ کو زحمت ہوگی اس لیے کہ یہ عالم مرض الموت کا ہے یا یہ خیال کیا ہو کہ ممکن ہے کہ عالم مرض میں ایسی باتیں لکھ جائیں جن پر امت عمل نہ کر سکے اور اس طرح بلاوجہ ساری امت جہنم کی مستحق بن جائے، پھر منافقین بھی اس تحریر کو دیکھ کر قرآن کریم کی جامعیت میں اشکال کر سکتے تھے۔

لیکن ظاہر ہے کہ عدم گمرہی کا ذکر ان تمام توجیہوں کو باطل کر دیتا ہے اور "قوموا عنی" کہنا یہ بتاتا ہے کہ یہ رائے حضرت رسولؐ کی نظر میں نہایت درجہ غلط اور مذموم تھی۔"

پھر فرماتے ہیں کہ:

"بعض لوگوں نے یہ عذر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس عبارت پیغمبرؐ سے یہ استنباط ہی نہیں کیا کہ اس میں ہر شخص کو گمراہی سے بچانے کی ذمہ داری ہوگی بلکہ وہ یہی سمجھتے تھے کہ اکٹھا تمام امت گمراہ نہ ہوگی اور ظاہر ہے کہ قرآن کے ہوتے ہوئے یہ بات یوں بھی غیر معقول تھی اس لیے انھوں نے یہ اعلان کر دیا کہ اب ایسی تحریر کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی رسول اللہ کا یہ ارشاد کمال احتیاط اور شدت لطف و کرم کی بنا

پر تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ لن تضلوا کے ہوتے ہوئے یہ عذر انتہائی مہمل ہے۔ اس فقرہ کا ظاہر ہی یہ ہے کہ ہر ہر فرد کی ہدایت کی ضمانت ہے اور پھر قوموا عنی خود ہی تمام توجیہات کو باطل کرنے کے لیے موجود ہے۔ لہٰذا ہماری نظر میں بہترین عذر یہ ہے کہ اس ایک واقعہ میں اصحاب سے غلطی کا اعتراف کر لیا جائے اس لیے کہ انسان سے غلطی ہوتی ہی رہتی ہے۔ رہ گیا یہ سوال کہ اس غلطی کی وجہ صحت کیا ہے؟ اس کا علم صرف اللہ کو ہے ہمیں زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

شیخ ازہر کی ان توجیہات اور ان کے جوابات کی روشنی میں علامہ عبدالحسن شرف الدین طاب ثراہ نے اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ موصوف رقم طراز ہیں کہ:

"کہا جاتا ہے کہ حضرت کا مقصود امتحان تھا۔ شیخ ازہر کے جواب کے علاوہ ہمیں یہ کہنا ہے کہ وقت آخر وصیت و تبلیغ کا وقت ہوتا ہے نہ کہ امتحان و مزاح کا۔ اگر حضرت کی پوری مدت حیات امتحان کے لیے کافی نہ ہوئی تو حالت مرض الموت کا زمانہ کس طرح کافی ہوگا؟ پھر اگر واقعاً امتحان ہوتا تو قوموا عنی سے خطاب نہ کیا جاتا۔ امتحان میں کامیاب ہونے پر قوموا عنی کی سند نہیں ملتی۔ ممتحن کو ہذیان گو نہیں کہا جاتا اور صحابی رسولؐ اس حادثہ پر تاثر گریہ نہیں کرتا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت کا مقصود مشورہ تھا اور حضرت عمرؓ اپنی نظر میں زیادہ صاحب الرائے تھے۔

سوال یہ ہے کہ کیا رسالت ان کی طرف منتقل ہوگئی تھی یا مرکز وحی

سے بھی غلطی کے امکانات پیدا ہو گئے تھے جن کی اصلاح کے لیے ان کے مشوروں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کتابت کی زحمت سے بچالیا۔

سوال یہ ہے کہ اگر اس میں حضورؐ کی کوئی زحمت تھی تو ارادہ ہی کیوں فرمایا تھا؟ پھر آپ کے ارادہ کے مقابلہ میں حضرت عمرؓ کے ارادہ کی قیمت ہی کیا ہے؟ جب کہ قرآن نے عمومی ممانعت کر دی ہے کہ رسولؐ کے مقابلہ میں اپنی بات زندہ کرنے کی کوشش نہ کرو اور ان کی آواز پر اپنی آواز کو بلند نہ کرو۔ پھر کیا ہذیان ولغو کے الفاظ سے بھی آپ کی زحمتوں میں تخفیف ہو سکتی تھی؟

کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی نظر میں قلم ودوات کا نہ دینا ہی اولیٰ تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف یہ اندیشہ تھا کہ کوئی ناممکن حکم نہ تحریر کر دیں، دوسری طرف منافقین کے اعتراض کا بھی خیال تھا۔

سوال یہ ہے کہ کیا حضرت عمرؓ آنحضرتؐ کی نسبت زیادہ صاحب الرائے تھے؟ کیا رسول اسلامؐ ناممکن امر کا حکم دے سکتے تھے؟ کیا امت پر آپ کی مہربانیاں زائل ہو گئی تھیں؟ کیا لن تضلوا میں منافقین کے فتنوں سے بچنے کی ضمانت نہ تھی؟ اور اگر منافقین ہی سے خطرہ تھا تو حضورؐ نے ایسا سوال ہی کیوں اٹھایا تھا جس پر غیر منافق حضرات کو بھی ہذیان کہنا پڑا؟

کہا جاتا ہے کہ حسبنا کتاب اللہ کی ضرورت ان آیات کے پیش نظر پڑی جن میں کتاب کی جامعیت کا ذکر ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ تاویل غلط ہے اس لیے کہ کتاب میں ہدایت کا ذکر ہے، ضلالت سے حفاظت کی ضمانت نہیں ہے اور آج کی تحریر میں یہ ضمانت بھی تھی لہٰذا کتاب کے بعد بھی اس کی ضرورت تھی بلکہ اگر یہ تحریر سامنے آگئی ہوتی تو اصحاب کو ہذیان گو کہنے تک کی نوبت نہ آتی یعنی امت اس ضلالت سے بھی محفوظ ہو جاتی۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کلام سے یہ استفادہ نہیں کیا تھا کہ اس میں ہر ہر فرد کی ہدایت کی ضمانت ہے۔

سوال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اس قدر کمزور دماغ کے آدمی تو نہ تھے کہ ان کی سمجھ میں وہ بات بھی نہ آسکے جو ایک بدو عرب بھی سمجھ سکتا تھا۔

پھر اگر سوء فہم ہی کی بات ہوتی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بتا دیتے کہ وہ مفہوم نہیں ہے جو تم لوگوں نے خیال کیا ہے، ایسے آدمی کو نکال دینا تو کسی طرح مناسب نہ تھا۔ ابن عباس کا گریہ بے وجہ تو نہ تھا۔

انصاف یہی ہے کہ بقول شما، یہ ایک واقعہ تھا جو ہو گیا یہ اور بات ہے کہ اسی ایک واقعہ نے اسلام کو تباہی کی منزلوں تک پہنچا دیا اور مسلمانوں میں ایک دائمی افتراق پیدا کر دیا یا بقول شیعہ، یہ صحابہ کرام کا ایک اجتہاد تھا جو نص رسول کے مقابلہ میں پیش کیا گیا اور اس میں ہمیں کوئی ..... اعتراض بھی نہیں ہے۔ ایک مسئلہ ہے، ایک طرف اللہ کی رائے ہے اور ایک طرف حضرت عمرؓ کی۔ امت کو اختیار ہے جس رائے کو چاہے پسند کرے اور جسے چاہے رد کر دے۔"[1]

[1] نص واجتہاد ص ۹۵ تا ۹۹

چوتھا باب

ڈنڈے کے زور پر اعلانِ خلافت

سنہ ۱۳ھ میں مرض الموت نے جب ابوبکر کو اپنے شکنجہ میں جکڑا اور انھیں یہ یقین ہوگیا کہ اب بچنا محال ہے تو آپ کسی خیال کے تحت رفع حاجت کے بہانے سے پاخانے میں جلوہ افروز ہوئے اور کھڈیوں پر کھڑے ہو کر روشن دان سے باہر جھانکا، نہ جانے آپ کو کیا کرشمہ دکھائی دیا کہ لڑکھڑاتے ہوئے فوراً پلٹ آئے اور عجلت میں عثمان کو طلب کیا۔ جب وہ آگئے تو تنہائی میں وصیت نامہ لکھوانے لگے۔ ابھی "امابعد" کا فقرہ زبان سے نکلا ہی تھا کہ بیہوش ہوگئے۔ عثمان سمجھے کہ شاید روح جسم سے پرواز کرگئی۔ انھوں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی مرضی سے وصیت نامہ میں یہ تحریر کر دیا کہ " میں نے تمام مسلمانوں پر عمر کو خلیفہ مقرر کیا"۔

ابوبکر کو ہوش آیا تو انھوں نے پوچھا کیا لکھا ہے؟ عثمان نے پڑھ کر سنایا تو آپ اپنی دلی آرزو کی اس تکمیل پر خوش ہوگئے اور فرمایا کہ شاید تمھیں یہ خوف پیدا ہوا کہ میں ختم ہوگیا۔ عثمان نے کہا یہی خوف اس وصیت نامہ کی تکمیل کا باعث بنا۔ (طبری ج ۴ ص ۵۲)

پھر ابوبکر نے وہ وصیت نامہ اپنے ایک غلام کو دے کر عمر کو اس کے ساتھ کیا تاکہ وہ اس کا اعلان مسلمانوں میں کرا دیں۔

یہ اعلان اس انداز سے ہوا کہ عمر کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا اور وہ اسے ہلا ہلا کر کہتے جاتے تھے کہ مسلمانو! جو کچھ یہ غلام کہتا ہے اسے سنو، اس پر عمل کرو اور خلیفۂ رسولؐ کا حکم مانو۔[1]

کسی نے پوچھا کہ اے ابو حفصہ! اس وصیت نامہ میں کیا لکھا ہے؟ جواب ملا کہ مجھے نہیں معلوم مگر میں اس حکم کا ماننے والا سب سے پہلا شخص ہوں۔ اس نے کہا کہ تمھیں معلوم ہو یا نہ ہو مگر خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ اس میں کیا لکھا ہے؟ عمر نے کہا کیا؟ اس نے کہا سنو! کل تم نے ابوبکر کو خلیفہ بنایا تھا، اسی احسان کے بدلے میں آج انھوں نے تمھیں خلیفہ بنا دیا ہے۔[2]

اس اعلان کے بعد ابوبکر کے اس غیر جمہوری، خود ساختہ اور ناروا اقدام کی خبر جب عام ہوئی تو اہل اسلام تڑپ اٹھے اور مسلمانوں میں کرب و اضطراب اور غم و غصہ کی وہ لہر پیدا ہوئی جس کی مثال خلفائے راشدین، خلفائے بنی امیہ یا خلفائے بنی عباس میں سے کسی خلیفہ کے بارے میں نہیں ملتی۔ لوگوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا، فریادیں کیں اور استغاثے بلند کیے۔

انصار و مہاجرین پر مشتمل ایک بڑی جماعت نے اپنی ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے ابوبکر سے کہا کہ تم نے عمر کو ہم پر خلیفہ کی حیثیت سے

۱؎ کامل ج ۲ ص ۱۶۲ ۲؎ الامامت والسیاست ج ۱ ص ۲۳

مسلط کر کے اچھا نہیں کیا جب کہ تمھیں معلوم تھا کہ وہ ایک تند خو اور درشت مزاج انسان ہیں اور تم ان کی مکاریوں، عیاریوں اور فتنہ پردازیوں سے بھی واقف تھے اور تمھیں یہ بھی معلوم تھا کہ جب وہ تمھارے دور خلافت میں قابو سے باہر تھے تو تمھارے بعد خدا جانے کیا کر گزریں جس سے اسلام کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔ تم دنیا سے جا رہے ہو روز قیامت آخر خدا اور رسولؐ کو کیا جواب دوگے۔[1]

طلحہ کا شمار عشرۂ مبشرہ میں کیا جاتا ہے، انھوں نے کہا کہ تم نے (اپنی مرضی سے) عمر کو لوگوں کا حاکم اور خلیفہ بنا دیا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ سخت مزاج، اکھڑ اور غلیظ طبیعت کے آدمی ہیں، جب تمھارے عہد میں وہ مسلمانوں پر سختی اور مظالم سے باز نہ آئے تو تمھارے بعد نہ جانے کیا کریں۔ آخر یہ مظلمہ کس کی گردن پر جائے گا اور پھر جب خدا اس بارے میں تم سے سوال کرے گا تو کیا جواب دوگے؟[2]

اور جب زبیر نے بھی طلحہ کی طرح احتجاجی گفتگو کی تو ابو بکر بستر علالت سے اٹھ کر تکیہ کے سہارے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ تم مجھے خدا سے ڈراتے ہو، جاؤ میں اس سے کہہ دوں گا کہ میں نے عمر کو خلیفہ اور حاکم بنایا تھا۔[3]

ابو بکر کے اس غیر اسلامی اقدام اور مسلمانوں کے احتجاج سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی نظر میں حصول اقتدار کے سامنے شرعی و اسلامی قوانین، احادیث نبوی اور نص قرآنی کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور یہی سبب ہے کہ خلافت اولیٰ یا خلافت ثانیہ سے متعلق اجماع کا

---

[1] امامت وسیاست ص۲۳ [2] طبری ج۴ ص۵۴ [3] تاریخ خمیس ج۲ ص۲۶۹

دعویٰ آج تک شرمندۂ دلیل نہ ہو سکا۔ پہلی خلافت صرف عمر کی بیعت سے مسلم ہوئی اور اس کے معاوضہ میں دوسری خلافت ابو بکر کی ذاتی خواہش کی بنا پر مسلمانوں پر مسلط ہو گئی۔

ابو بکر پر عمر کا غلبہ

حضرت ابو بکر منصب خلافت پر فائز ہونے کے باوجود، عمر کی مرضی کے بغیر اپنی مرضی سے امور خلافت کی آزادانہ و غیر جانبدارانہ انجام دہی میں مجبور، بے بس اور قاصر تھے۔ آپ کسی معاملے میں نہ تو عمر کی مخالفت کر سکتے تھے اور نہ ہی ان کے حکم کی نافرمانی۔[4] مثال کے طور پر چند واقعات ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) اقرع اور زبرقان نامی دو اشخاص ابو بکر کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوئے کہ ان کے لیے بحرین کا خراج معین کر دیا جائے۔ انھوں نے یہ ذمہ داری بھی قبول کی کہ ان کی قوم کا کوئی بھی شخص اس سے منحرف نہ ہوگا۔ چنانچہ ابو بکر نے ان کی خواہش پر خراج کا فرمان جاری کر دیا۔ حضرت عمر چونکہ فرمان کے اجرا سے متفق نہیں تھے اس لیے انھوں نے اس کے ٹکڑے کر کے پیروں سے مسل دیا۔ عمر کی یہ حرکت طلحہ کو ناگوار گزری اور وہ غصہ کی حالت میں ابو بکر کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ ابو بکر نے جواب دیا کہ صرف اطاعت میری ہے ورنہ خلیفہ تو عمر ہی ہیں۔[5]

---

[4] تاریخ خمیس ج۲ ص۲۴۷ [5] طبری ج۳ ص۲۴۰

(۲) شہزادیٔ کونین جناب فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا اور حضرت علی علیہ السلام کے استدلال سے لاجواب ہوکر ابوبکر نے فدک کی واگزاری کا پروانہ تحریر کر دیا تھا جسے عمر نے معصومہؑ کے ہاتھ سے چھین کر پاش پاش کر دیا اور ابوبکر دیکھتے رہے[۱]

(۳) ابوبکر نے شام کی طرف ایک لشکر بھیجنے کا قصد کیا اور اس کے ۱/۲ حصہ کا سردار خالد بن سعید کو بنایا لیکن چونکہ عمر کی مرضی نہیں تھی اس لیے ابوبکر کی ایک نہ چلی اور خالد کو اسی وقت معزول کرنا پڑا۔[۲]

(۴) عروہ سے مروی ہے کہ میں ایک مرتبہ معاویہ سے ملنے گیا تو اس نے پوچھا کہ مسلول نامی آراضی کس کے پاس ہے؟ میں نے کہا آپ کا مقصد کیا ہے؟ معاویہ نے کہا کہ اس زمین کو ابوبکر اپنے داماد زبیر کو دینے کے لیے ایک دن مجھ سے دستاویز لکھوا رہے تھے کہ اتنے میں عمر آدھمکے۔ عمر کو دیکھتے ہی ابوبکر نے اس تحریر کو میرے ہاتھ سے لے کر اپنے فرش کے نیچے دبا لیا اور جب عمر چلے گئے تو وہ تحریر نکالی اور میں نے اسے تمام کیا[۳]

مذکورہ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ خلافت اولیٰ ابوبکر و عمر کے درمیان مشترکہ تھی اور حضرت عمر ابوبکر پر چڑھے رہتے تھے۔

عہد عمری کے اہم واقعات

ابوبکر کے انتقال کے بعد ۲۳ جمادی الاُخریٰ ۱۳ھ کو حکومت کی

[۱] سیرت حلبیہ ج ۳ ص ۳۹۱ [۲] طبری ج ۴ ص ۲۸ [۳] کنز العمال ج ۲ ص ۱۸۹

باگ ڈور جب حضرت عمر کے ہاتھوں میں آئی تو سب سے پہلا کام انھوں نے یہ کام کیا کہ خالد بن ولید کو فوج کی افسری کے عہدہ سے معزول کر کے ان کی جگہ ابو عبیدہ کو سردار مقرر کیا۔ اور اسی سال ابو عبیدہ نے خالد بن ولید اور عمرو عاص کے ساتھ دمشق کا محاصرہ کر کے اسے فتح کیا۔ اسی سال عراق فتح ہوا اور اسی سال عمر نے اپنے کو لوگوں سے امیر المومنین کہلوایا۔

۱۴ھ میں بصرہ کی آبادکاری کا حکم ہوا اور اس کی حد بندی عمل میں آئی۔ اسی سال ابوبکر کے والد قحافہ، ۹۷ برس کی عمر میں اپنے شرک کے ہمراہ دنیا سے رخصت ہوئے۔

۱۵ھ میں حمص فتح ہوا اور رومیوں سے اہل دمشق کی شرائط صلح کے مطابق مصالحت ہوئی۔ اسی سال حماۃ[۱] فتح ہوا اور وہاں کے رومیوں سے اس شرط پر صلح ہوئی کہ ہر زمین کا خراج اور ہر شخص کا جزیہ لازمی ہوگا۔ اسی سال حماۃ کے بڑے گرجا کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا جو بڑے بازار کی جامع مسجد کہلائی۔ یہ کارنامہ انجام دینے کے بعد ابو عبیدہ شیراز گئے وہاں کے باشندوں نے بھی صلح کر لی۔ پھر معرہ[۲] گئے، معرہ والوں نے

[۱] قاضی جمال الدین بن واصل نے اپنی تاریخ میں تحریر کیا ہے کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے عہد میں حماۃ ایک عظیم شہر تھا جو یہودیوں کے قبضہ میں تھا اور جس کی حیثیت زمانۂ فتوحات میں محض ایک قصبہ کی رہ گئی تھی۔

[۲] معرہ کا پہلا نام معرۃ الحمص تھا، پھر معرہ نعمان بن بشیر انصاری کہا جانے لگا کیوں کہ معاویہ کے زمانہ میں یہ حمص کے ساتھ اس شخص کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

بھی دیگر شہروں کے لوگوں کی شرائط پر صلح کی۔ اسی سال ظلم و تشدد اور قتل و غارت گری کے بعد لاذقیہ فتح ہوا۔ اسی سال خالد بن ولید اور ابو عبیدہ نے قنسرین جو حلب کا پایۂ تخت تھا، کو فتح کیا۔ وہاں رومیوں سے سخت جنگ ہوئی اور مسلمانوں نے اس شہر کو تباہ و برباد اور تاراج و مسمار کر دیا۔ اس کے بعد انطاکیہ، سرمین اور تسترین وغیرہ فتح کر لیے گئے اور اسی جانب سے شام پر پورا تسلط ہو گیا۔ یہاں سے خالد مرعش کی طرف بڑھے اور اسے فتح کر کے وہاں کے باشندوں کو جلاوطن کر دیا اور اس شہر کا نام و نشان مٹا دیا۔ پھر مختلف شہروں کی فتحیابی کے بعد بیت المقدس فتح ہوا اور دفتروں کی داغ بیل پڑی۔ مسلمانوں کے سیاسی وظائف مقرر ہوئے۔ اسی سال سعد بن ابی وقاص کی سربراہی میں جنگ قادسیہ ہوئی اور رستم جو عجمیوں کا سپہ سالار تھا، مارا گیا۔

سنہ ۱۶ھ میں سعد اپنی فوج کے ساتھ دجلہ کو عبور کر کے مدائن میں داخل ہوا، تلواروں سے خون کی بارش ہوئی اور لاکھوں بے گناہ انسان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ قصر کسریٰ تاراج ہو گیا اور وہاں سے بے شمار دولت اور مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اسی سال موصل فتح ہوا اور اسی سال جبلہ بن ایہم کا واقعہ پیش آیا جو اپنے پانچ سو ساتھیوں کے ساتھ مسلمان ہو کر عمری تشدد کے باعث مرتد ہو گیا تھا۔

سنہ ۱۷ھ میں کوفہ آباد ہوا اور مسجد الحرام کی توسیع عمل میں آئی۔ مسجد کے آس پاس مسلمانوں کے جو مکانات تھے، مسمار کر دیے گئے۔ اسی سال معاویہ کے معتمد خاص اور رسولؐ کے ایک بدکردار صحابی مغیرہ بن شعبہ کی زناکاری کا واقعہ پیش آیا، جسے ہم اپنی کتاب "تفسیر کربلا" میں بصراحت

تحریر کر چکے ہیں۔ اسی سال اہواز فتح ہوا جس پر "ہرمزان" قابض تھے۔

سنہ ۱۸ھ میں حجاز اور مدینہ قحط کا شکار ہوئے۔ عمر نے قحط زدہ افراد کے لیے مختلف شہروں کے حاکموں سے مدد کی اپیل کی۔ ابو عبیدہ شام سے چار ہزار اونٹوں پر غلہ لائے۔ قحط سے نجات حاصل کرنے کے لیے پیغمبرِ اسلام کے چچا جناب عباس نے نماز استسقاء پڑھ کر دعا کی اور بارش ہوئی۔ اسی سال شام میں طاعون کی وبا پھیلی جس کی شدت نے پچیس ہزار مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ابو عبیدہ اور معاذ بن جبل بھی دنیا سے چل بسے اور عمرو عاص عمر کی طرف سے شام کا گورنر مقرر ہوا۔

سنہ ۱۹ و ۲۰ھ میں عمرو بن عاص اور زبیر بن عوام نے مصر اور اسکندریہ کو فتح کیا، مصر کی حد بندی کی گئی۔ اسی سال آنحضرتؐ کے موذن بلال نے انتقال کیا۔

سنہ ۲۱ھ میں نہاوند کی مشہور جنگ ہوئی جس میں ایرانیوں کو شکست ہوئی۔ اسی سال ہمدان و اصفہان فتح ہوئے اور اسی سال خالد بن ولید نے دنیا سے کوچ کیا۔

سنہ ۲۲ھ میں آذربائیجان، رے اور جرجان وغیرہ فتح ہوئے۔ اسی سال عمرو عاص نے طرابلس اور احنف بن قیس نے خراسان کو فتح کیا۔

سنہ ۲۳ھ میں مغیرہ بن شعبہ کے غلام ابو لولو کا خنجر عمر کے ناف کے نیچے اتر گیا اور آپ دس سال چھ ماہ آٹھ دن مسلمانوں پر مسلط رہ کر یکم محرم سنہ ۲۴ھ کو اپنے سیاہ اعمال کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے۔[1]

---

[1] مذکورہ واقعات تاریخ ابو الفداء سے ماخوذ ہیں

فتوحاتِ عمری پر ایک تنقیدی نظر

اس میں شک نہیں کہ عمر کے عہد خلافت میں اسلامی فتوحات کے نام پر ملک گیری اور مالِ غنیمت کی ہوس نے مسلمانوں کو خالد بن ولید، ابو عبیدہ، سعد ابن ابی وقاص، عمرو عاص، زبیر بن عوام اور احنف بن قیس ایسے فوجی جرنیلوں، کمانڈروں اور حاکموں کی قیادت میں بڑی بڑی کامیابیوں سے ہمکنار کیا اور انھوں نے جبر و استبداد، ظلم و تشدد، لوٹ مار، آتش زنی، خونریزی اور قتل و غارت گری کو اپنا شعار بنا کر غیر ممالک پر حملہ کیا، وہاں کے باشندوں کو قتل کیا، ان کے گھروں کو تباہ و برباد کیا، انھیں اپنا غلام بنایا اور ان کی جائدادوں پر قابض ہو کر عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگے۔

عظیم فاتحینِ عالم کی فہرست میں حضرت عمر کا نام بڑے کر و فر سے لیا جاتا ہے اور فخریہ انداز میں یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کے دور میں مفتوحہ و مقبوضہ ممالک کے حدود اربعہ کا رقبہ تقریباً دو لاکھ پچیس ہزار ایک سو تین مربع میل پر محیط تھا اور آپ کی بساطِ حکومت مکہ معظمہ سے شمال کی طرف ۱۰۳۶ میل، جنوب کی طرف ۴۸۳ میل، مشرق کی طرف ۱۰۸۷ میل اور مغرب کی طرف شام، مصر، عراق، آرمینیہ، آذربائجان، فارس، روم، خراسان، کرمان اور بلوچستان کے کچھ حصوں تک پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس مفتوحہ وسعت پر نہ تو کوئی عقلی دلیل قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی اسے اسلامی و شرعی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ جب کوئی حق پسند اور نکتہ سنج

واقعہ نگار ان فتوحات پر غور کرے گا تو یہ سوال اس کے ذہن میں ضرور ابھرے گا کہ ابو بکر کے بعد پہلی صدی کے ابتدائی دور میں حضرت عمر اپنے وقت کے ہلاکو، نادر شاہ اور محمود غزنوی تھے یا خلیفۂ رسولؐ؟

اگر موصوف اول الذکر حیثیت کے حامل تھے تو سوال یہ ہے کہ آپ کے پاس وہ کون سا جادو تھا جس نے چند صحرا نشینوں کو ابھار کر طوفان کی طرح فارس و روم کا دفتر الٹنے پر مجبور کر دیا؟ آخر اس کے علل و اسباب کیا تھے جب کہ دورِ رسالت کے تمام اسلامی غزوات سے آپ کی کنارہ کشی اور فرار ثابت ہے۔

اور اگر آپ کو خلیفۂ رسولؐ مان لیا جائے تو بھی سوال یہ ہے کہ آپ کی یہ فتوحات کن اصولوں کے تحت جائز قرار پائیں گی؟ کیا فتنہ و فساد، قتل و غارت گری اور تباہی و بربادی کے المناک واقعات کسی دینی رہبر، روحانی پیشوا اور مذہبی رہنما کے شایانِ شان ہو سکتے ہیں؟ کیا رسول اکرمؐ نے ان ظالمانہ اقدامات کی حمایت و ہمنوائی کی ہے؟ یا کسی ملک پر فوج کشی کر کے اسے تباہ و برباد کیا اور وہاں کے عوام کو بے سبب قتل کیا؟ کیا رسول اکرمؐ کے علاوہ کسی اور پیغمبر، نبی اور ہادی نے تبلیغ و ہدایت کی منزلوں میں ملک گیری کے نام پر بے گناہوں کے خون سے اپنے دامن کو داغدار بنایا ہے؟ کیا اللہ کی طرف سے انبیاء و مرسلین اس لیے بھیجے گئے تھے کہ وہ زمین پر فتنہ و فساد برپا کریں اور خون کی ندیاں بہائیں؟ کیا انبیاء و مرسلین کا طرزِ عمل اور طریقۂ کار یہ تھا کہ جس ملک کے لوگ خدا کو نہ مانیں، اس کی وحدانیت کا اقرار نہ کریں اور اس کے دین کو قبول نہ کریں تو وہ اس پر حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر دیں اور وہاں کے عوام کو موت

کے گھاٹ اتار دیں۔ ان کی عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کر دیں۔

اگر ان تمام باتوں کا جواب نفی میں ہے تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ عمری عہد کی فتوحات غیر اسلامی اور غیر شرعی تھیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

پھر حضرت عمر کی ان فتوحات کو موصوف کا ذاتی کارنامہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ آپ فرمانروا ضرور تھے لیکن آپ کی بزدلی و نامردی کا یہ عالم تھا کہ کسی معرکے میں نہ شریک ہوئے نہ تلوار اٹھائی۔ آپ نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے اکثر و بیشتر جنگی مشورے ضرور کیے مگر چونکہ حضرت علیؑ آپ کی شجاعت سے واقف تھے اس لیے آپ نے ہمیشہ جنگ کے میدان میں انھیں جانے سے روکا تاکہ رسولؐ کے بعد اسلام کے ماتھے پر شکست کا ٹیکہ نہ لگنے پائے۔

عمری عہد کے جنگی کارنامے دورِ رسالت کے ان نبرد آزما اور آزمودہ کار جرنیلوں کے تھے جنھیں تقدیر کے چکر نے عمر کے دورِ حکومت سے متصل کر دیا تھا اور جنھوں نے ان فتوحات کا سہرا حضرت عمر کے سر باندھ کر حکومت کی نمک خواری کا حق ادا کر دیا۔

تاریخ کے ایوان میں متعصب مورخین کی یہ آواز بھی سنائی دیتی ہے کہ حضرت ابوبکر اور عمر نے بڑے بڑے ممالک فتح کر کے اسلام کو وسعت دی، اسے بامِ ترقی تک پہنچایا مگر حضرت علیؑ نے نہ تو کوئی ملک فتح کیا، نہ اسلامی ممالک میں کسی اہم جزو کا اضافہ کیا اور نہ ہی مسلمانوں کے عیش و عشرت کا کوئی سامان مہیا کیا۔

اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت

ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سب کچھ کرتے تو حضرت علیؑ بھی یقیناً اس کی پیروی کرتے۔ مگر چونکہ ان ہادیوں اور رہبروں نے ایسا نہیں کیا اس لیے حضرت علیؑ نے بھی خاموشی اختیار کی کیونکہ آپ کا شمار بھی انھیں ہادیوں کی صف میں ہے جیسا کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

"جو شخص آدمؑ کو ان کے علم میں، نوحؑ کو ان کے فہم میں، ابراہیمؑ کو ان کے حلم میں، یحییٰؑ کو ان کے زہد میں اور موسیٰؑ کو ان کی ہیبت میں دیکھنا چاہے اسے لازم ہے کہ علیؑ کو دیکھے۔"[1]

اس حدیث مذکورہ کے ذیل میں علامہ فخر الدین رازی کا کہنا ہے کہ:

"یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ ان صفات (علم، فہم، زہد اور ہیبت) میں حضرت علی علیہ السلام مذکورہ انبیاء کے برابر تھے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام انبیاء صحابہ سے افضل تھے اور یہ کلیہ ہے کہ جو شخص افضل کے برابر ہوگا وہ بھی افضل ہوگا۔"[2]

آنحضرتؐ نے بھی حضرت علی علیہ السلام کو اپنی ذات کے مثل قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ:

"ہر نبی کی کوئی مثال اس کی امت میں ضرور ہوتی ہے اور میری امت میں میری مثال علیؑ ہیں۔"[3]

واضح ہو گیا کہ حضرت علی علیہ السلام کا درجہ و مرتبہ چونکہ انبیاء و مرسلین

---

[1] ریاض النضرہ جلد دوم ص ۲۱۸ [2] ارجح المطالب ص ۴۵۵
[3] ارجح المطالب ص ۴۵۴

کے مساوی تھا اس لیے آپ کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ احکام الٰہیہ کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے۔ اس کے برعکس ابوبکر و عمر نے ملک گیری کی ہوس میں جو اقدام کیے یا ان کے عہد میں مسلمانوں سے جو اقدامات ہوئے وہ انھیں سکندر، بخت نصر، چنگیز خاں، نپولین، محمود غزنوی، بابر اور اکبر وغیرہ کی صف میں شامل کرنے کے لیے کافی ہے۔

عمری دور میں چند صحرا نشینوں نے فارس و روم کا دفتر کیونکر الٹ دیا؟ اور یہ فتوحات انھیں کیونکر نصیب ہوئیں؟ اس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت کے بدو اور جاہل عربوں کو جہاد کا غلط مفہوم بتایا گیا اور یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ خلیفۂ وقت جس مذہب کو فنا کر دینے کا حکم صادر کرے اور جس قوم کو تباہ و برباد کر دینے کا اشارہ کرے وہی در اصل جہاد ہے جس کو خدا اور رسولؐ نے ہر مسلمان پر واجب کیا ہے، اور جو شخص اس پر عمل کرے گا وہ بہشت کا حقدار ہوگا ورنہ جہنم کا مستحق قرار پائے گا۔ انھیں یہ بھی باور کرایا گیا کہ اگر کوئی کافر شخص اسلام قبول کرنے سے انحراف کرے تو تلوار کے زور سے اس پر قابو حاصل کرو اور اس پر بھی کامیابی نہ ہو تو اسے قتل کردو، اس کا مال و اسباب لوٹ لو۔

جاہل اور سادہ لوح عربوں کو مالِ غنیمت کے دام میں بھی گرفتار کیا گیا اور ان کے ذہنوں پر یہ عقیدہ مسلط کر دیا گیا کہ جنگ و جدال اور فتح و کامرانی کے بعد لوٹ مار بھی ضروری ہے۔ یہ ایسا دامِ فریب تھا جس نے تمام مفلوک الحال اور عسرت زدہ عربوں کو جکڑ لیا اور وہ عیش و عشرت کی زندگی کا خواب دیکھنے لگے۔ اس کی دلیل ایران

پر حملہ کے دوران رستم اور مغیرہ کے مابین ہونے والی وہ گفتگو ہے جسے تاریخ نے ضبط کر لیا ہے۔ چنانچہ رستم نے مغیرہ سے جب پوچھا کہ تم لوگ ہمارے ملک میں کیوں آئے ہو؟ تو مغیرہ نے جواب دیا کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ ہمیں بڑی بڑی نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے اور ان نعمتوں میں سے ایک نعمت تمھارے ملک میں پیدا ہونے والا وہ غلہ بھی ہے جس کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ رستم نے کہا کہ اس خواہش میں تم قتل ہو جاؤ گے۔ اس پر مغیرہ بولا کہ ہمیں کوئی فکر نہیں ہے کیونکہ ہم قتل ہو کر بہشت میں جائیں گے اور وہاں کی لذات سے لطف اندوز اور اگر بچ گئے تو تم ہمیں جزیہ دو گے[1]

مغیرہ کی گفتگو سے صاف ظاہر ہے کہ ان فتوحات کی غرض صرف یہ تھی کہ عمدہ غذائیں حاصل کی جائیں، اچھے لباس پہنے جائیں اور دنیا کی تمام لذتوں کے ساتھ عیش و آرام کی زندگی بسر کی جائے۔

مغیرہ کے ان خیالات میں اتنی پختگی تھی کہ اس نے ایرانی بادشاہ یزدجرد کو بھی وہی جواب دیا جو اس کے سپہ سالار رستم کو دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خدا کے بارے میں یہ بھی کہا کہ:

"ہمارے خدا نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ ہم لوگوں کو حکم دیا ہے کہ جو لوگ مذہبِ اسلام قبول نہ کریں ان سے جزیہ لو اور اگر وہ جزیہ دینے سے انکار کریں تو ان سے قتال کرو"[2]

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ کے مفہوم و مقصد سے بے نیاز و بیگانہ

---

[1] طبری ج ۴ ص ۹۳ مطبوعہ مصر [2] طبری ج ۴ ص ۹۵

مغیرہ کی یہ گفتگو خدا پر افترا و بہتان کے مترادف نہیں تو پھر کیا ہے؟

اس جنگی مہم کے دوران عرب کے مشہور خطیبوں نے میدانِ کارزار میں جو خطبے دیے ان سے بھی صاف ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کو یہ لالچ دیتے تھے کہ اگر تم فتحیاب و کامیاب ہوئے تو تمھارے لیے مالِ غنیمت کی انتہا نہیں ہے اور اگر قتل ہو گئے تو جنت کی لذتیں تمھاری منتظر ہیں. جیسا کہ قیس نے اپنی تقریر کے دوران یہ کہا کہ:

"لوگو! گھمسان کی جنگ کرو کیونکہ تمھارے سامنے مالِ غنیمت ہے اور پشت پر جنت[1]"

یا پھر ربیع بن بلاد نے کہا:

"اے عرب والو! اپنے مذہب اور مالِ دنیا کے لیے جی کھول کر لڑو[2]"

شعرا بھی اپنی نظموں میں انھیں خیالات کو پرو کر مسلمانوں کے جذبات کو برانگیختہ کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے قسمیں کھالیں اور مرنے مارنے پر تل گئے۔

یہی وہ کامیابی تھی جو فتوحات میں ڈھلتی گئی اور فتوحات کا سیلاب تمام اسلامی اصولوں کو کچلتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔

فارس و روم کی شکست اور تباہی و بربادی کے علل و اسباب یہ تھے کہ عمری عہد میں ان ملکوں کا ستارۂ اقبال غروب ہو چکا تھا۔ فارس میں خسرو پرویز کے بعد نظام حکومت درہم برہم ہو چکا تھا

---

[1] طبری ج ۴ ص ۱۹۵ [2] طبری ج ۴ ص ۱۱۶

اور کوئی دوسرا فرمانروا ایسا نہیں تھا جو اس دم توڑتی ہوئی حکومت کے پیکر میں توانائیاں بھر سکے۔ دربار کے عمائدین و اراکین سازشوں میں منہمک تھے اور ان سازشوں کی بدولت تخت نشینوں میں متواتر تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ تین ہی چار سال کے اندر چھ یا سات فرمانرواؤں کے ہاتھوں میں زمامِ حکومت آئی اور نکل گئی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نوشیرواں سے کچھ پہلے مزدکیہ فرقہ کافی طاقتور تھا جو کفر و الحاد کی طرف مائل تھا حالانکہ نوشیرواں نے تلوار کے زور سے انھیں پسپا بھی کیا لیکن ان کی قوت میں کمی نہیں آئی۔ مسلمانوں نے جب فارس کی زمین پر قدم رکھا تو یہ فرقہ بھی انھیں اپنا پشت پناہ سمجھ کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ عیسائیوں میں نسطورین فرقہ جسے کسی حکومت میں پناہ نہیں ملتی تھی، وہ بھی مسلمانوں کے سائے میں آکر مخالفین کے مظالم سے محفوظ ہو گیا۔ اس طرح مسلمانوں کو دو بڑے فرقوں کی کمک، اور ہمدردی مفت میں حاصل ہو گئی۔ روم کی حکومت کے ساتھ عیسائیوں کے باہمی اختلافات دشمنی کی حد تک پہنچ گئے تھے اس لیے مسلمان اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور فتوحات کے دروازے ان پر کھل گئے۔

فتوحات سے رسول اکرمؐ کی پریشانی

سیرت، احادیث اور تفاسیر کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد مسلمانوں کی اس عیش طلبی، دنیا پرستی اور ملک گیری کے تصور سے خوفزدہ اور پریشان تھے۔ چونکہ

آپ ان فتوحات کے انجام اور بیخ وخم سے بخوبی واقف اور باخبر تھے اس لیے آپ نے بار بار اپنے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم لوگ میرے بعد میری تعلیمات کو فراموش نہ کر دینا، اسلام کے مقصد کو پامال نہ کرنا اور ملک گیری کی ہوس میں شریعت کی روح کو مجروح نہ کرنا۔

کبھی آپؐ نے فرمایا کہ:

"مجھے اس بات کا خوف نہیں کہ میرے بعد تم مشرک ہو جاؤ گے، بلکہ مجھے خوف اس بات کا ہے کہ تم لوگ دنیا پرستی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔"[1]

کبھی منبر سے یہ آگاہی دی کہ:

"تمھارے مستقبل کے بارے میں مجھے یہ خوف ہے کہ دنیا کی چمک دمک تم پر اپنے دروازے کھول دے گی۔"[2]

کبھی مطلع کیا کہ:

"مجھے یہ ڈر ہے کہ میرے بعد تم لوگوں پر زمین کی برکتیں اور آرائش و زیبائش کی راہیں کشادہ ہو جائیں گی۔"[3]

کبھی ارشاد ہوا کہ:

"مجھے اس کا ڈر نہیں کہ تم فقر میں مبتلا ہو گے بلکہ مجھے یہ ڈر ہے کہ تم پر دنیا اس طرح کشادہ ہو جائے گی جیسے کہ تمھارے قبل والوں پر تھی اور تم لوگ اس دنیا کی پرستش اس طرح کرو گے جیسے تمھارے قبل والے کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا تمھیں بھی اسی

---

[1] بخاری پ۵ ص ۶۹۳ [2] بخاری پ۶ ص ۴۱ [3] بخاری پ۱۱ ص ۶۶

طرح ہلاک (گمراہ) کر دے گی جس طرح تمھارے قبل کے لوگوں کو ہلاک کر چکی ہے۔"[1]

کبھی زبان رسالت سے یہ جملے بھی ادا ہوئے:

"یقیناً تم لوگ وہ طریقہ اختیار کرو گے جو تم سے قبل والوں کا تھا اور تمھارا قدم انھیں کے نقش قدم پر ہوگا، یہاں تک کہ اگر وہ سوسمار کے سوراخوں میں (پوشیدہ) ہوں گے تو تم بھی وہاں داخل ہو جاؤ گے، یعنی گمراہ ہو جاؤ گے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا ہم لوگ یہود و نصاریٰ کی پیروی کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں!"[2]

مولوی وحید الزماں خاں صاحب اس حدیث کی صراحت میں فرماتے ہیں کہ:

"مجمع البحار میں ہے کہ یہودیوں نے اپنے پیغمبروں کو قتل کیا تھا، اس کی پیروی مسلمانوں نے اس طرح کی کہ رسولؐ اللہ کے نواسوں حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ کو قتل کر دیا۔ اسی طرح عبداللہ بن حسن نفس ذکیہ اور زید بن علی اور یحییٰ و ابراہیم فرزندانِ زید اور امام موسیٰ کاظمؑ اور امام علی رضاؑ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ غرض ان مسلمانوں نے ہر لحاظ سے یہودیوں کی پیروی کی اور مخبر صادقؐ نے جو فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔"[3]

کبھی آنحضرتؐ نے اپنے کسی معتبر صحابی سے فرمایا کہ:

"اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ کسریٰ کے خزانے

---

[1] بخاری پ۱۲ ص ۱۰۱ [2] بخاری پ۱۳ ص ۲۸۳ [3] انوار اللغۃ پ۷ ص ۱۴۴

مسلمانوں کے تصرف میں ہوں گے اور ان کے پاس اتنی دولت ہوگی کہ لوگ اپنی مٹھیوں میں سونا اور چاندی لے کر نکلیں گے اور وہ چاہیں گے کہ کوئی ان سے اس سونا اور چاندی کو لے لے مگر مسلمان اس کی طرف توجہ نہیں کریں گے، پھر وہ اپنے پروردگار سے اس طرح ملیں گے کہ ان کے اور خدا کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا اور جب ان سے دولت اور مال دنیا کے بارے میں سوال ہوگا تو وہ گھبرا کر اپنی داہنی طرف دیکھیں گے تو صرف انھیں جہنم دکھائی دے گا اسی طرح جب بائیں طرف نظر کریں گے تو ادھر بھی دوزخ کی آگ کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔"[1]

ظاہر ہے کہ کسریٰ کے خزانے مسلمانوں کے عظیم ہیرو عمر بن خطاب، کے عہد میں فتح ہوئے اور اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہے کہ خزانوں کے فاتح کا انجام کیا ہوگا۔

علامہ شبلی کا کہنا ہے کہ کسریٰ کے خزانوں میں (سونا، چاندی اور ہیرے جواہرات کے علاوہ) کیانی سلسلہ سے نوشیرواں کے عہد تک کے بے شمار نوادرات تھے۔ خاقان چین، راجہ داہر، قیصر روم، نعمان بن منذر، سیاؤش اور بہرام چوبیں کی زرہیں اور تلواریں تھیں۔ کسریٰ، ہرمز اور قباد کے خنجر تھے۔ نوشیرواں کا تاج زرنگار اور ملبوسات شاہی تھے[2]

سرور کائنات نے اپنے صحابہ کو اس اندیشہ سے بھی متنبہ کیا کہ "دیکھو! میرے بعد تم لوگ کافر نہ ہو جانا کہ لوگوں کی گردنیں اڑانے لگو۔"[3]

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ بے وجہ دوسروں کی گردنیں اڑانے

---

[1] بخاری ج۱ ص ۳۴۰ [2] الفاروق ج ۱ ص ۱۲۰ [3] بخاری ج۱ ص ۸۷

والا شخص، پیغمبرؐ کی نظر میں، کافر کا درجہ رکھتا تھا۔

یہ تمام حدیثیں اس بات کی بین دلیل ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ بے جا مفتوحات، حملہ آوری، ملک گیری، دنیا پرستی اور سرمایہ داری کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور مسلمانوں کو ان سے دور رہنے کی ہدایت بھی فرماتے رہتے تھے لیکن افسوس کہ آپ کے انتقال کے بعد خلافت اولیٰ اور خلافت ثانیہ میں وہی ہوا جو نہ ہونا چاہیے تھا۔

اسلامی اور غیر اسلامی فتوحات

اسلامی تاریخ کا یہ پہلو انتہائی اجاگر ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کو جب اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی اعانت و کفالت کے لیے سرمایے کی ضرورت درپیش ہوئی تو آپؐ نے نہ تو کافروں کے یہاں ڈاکہ ڈالا، نہ ان کا مال و اسباب لوٹا، نہ ان پر مظالم کیے، نہ انھیں شہر بدر کیا، نہ ان کی جائدادیں ہڑپ کیں نہ ان کے گھروں کو تباہ و برباد کیا نہ ان کے ملکوں پر حملہ آور ہو کر انھیں تلوار یا طاقت کے بل پر اپنی غلامی کے لیے مجبور کیا بلکہ اس کے برعکس ان کے ذہنوں میں وحدانیت کا تصور راسخ کرنے اللہ کے دین (اسلام) کو ان تک پہنچانے اور امن و اتحاد نیز انسانیت کا درس دینے میں حسن اخلاق کے ساتھ ہمہ تن مصروف رہے۔

آپ کا بنیادی نظریہ اور مشن صرف یہ تھا کہ رنگ و نسل کی تفریق کو ختم کیا جائے، انسان کو انسانی حقوق سے آگاہ کیا جائے، لوگ زیور اخلاق آراستہ اور صفات حسنہ سے متصف ہوں، توحید پر ایمان لائیں، خدا کی وحدانیت کا کلمہ پڑھیں، اس کی بزرگی اور برتری کو تسلیم کریں اور اس کی

بارگاہ میں سرِ نیاز خم کرکے اس کی معرفت حاصل کریں۔ چنانچہ اسی نظریے اور مشن کے تحت آپ نے تبلیغِ اسلام کے ابتدائی دور میں کفار مکہ کو اسلام کی دعوت بھی دی اور انھیں خدا کی وحدانیت، عبادت اور اطاعت کی طرف متوجہ بھی کیا۔

یہ تاریخی حقیقت دنیا کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے کہ آنحضرتؐ نے جب بت پرستی کرنے کی اعلانیہ مخالفت اور مذمت شروع کی تو آپ کا یہ طرزِ عمل کفار مکہ کی کافرانہ فطرت پر سخت ناگوار گزرا، چنانچہ قریش کی چند سر برآوردہ شخصیتیں محسنِ اسلام حضرت ابو طالبؑ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ان سے ترش لہجہ میں اس امر کی شکایت کی کہ تمھارا بھتیجا (محمدؐ) ہمارے خداؤں کی توہین کرتا ہے، اسے سمجھالو ورنہ ہم اسے برداشت نہ کریں گے۔ اس موقع پر جناب ابو طالبؑ نے انھیں نرمی سے سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا۔ لیکن چونکہ بنائے مخاصمت برقرار تھی اور آنحضرتؐ اپنے فرضِ منصبی سے دست کش نہ ہونے پر مجبور تھے اس لیے اہل مکہ کو دوبارہ پھر حضرت ابو طالبؑ کے پاس آنا پڑا۔ اس وفد میں قریش کے تمام رؤسا مثلاً عتبہ بن ربیعہ، شیبہ اور ابو سفیان وغیرہ شامل تھے۔ انھوں نے پھر کہا کہ تمھارا بھتیجا اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا اور تم اس کے خلاف کوئی قدم اٹھا نہیں سکتے لہٰذا تم درمیان سے ہٹ جاؤ اور اگر یہ بھی ممکن نہیں تو میدان میں اتر آؤ تاکہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ تلوار کے ذریعہ ہو جائے۔

حضرت ابو طالبؑ کے لیے یہ مرحلہ یقیناً سخت تھا۔ ایک طرف نبوت کے تحفظ کا احساس اور دوسری طرف کفار مکہ کی دھمکیاں

اور بدلے ہوئے تیور۔ آپ کی دور رس نگاہوں نے اس نزاکت کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ کافروں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے، یہ معاملہ کسی وقت بھی کوئی خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اگر یہ لوگ آمادۂ پیکار ہوئے تو ان سے تنہا مقابلہ آسان نہ ہوگا۔

انھیں خیالات و احساسات کے ردِّ عمل میں جناب ابو طالبؑ کے چہرے پر تردد کے آثار نمایاں ہوئے۔ پیغمبر اسلام نے دیکھا کہ شفیق و مہربان چچا کے پائے ثبات میں لغزش کے امکانات ہیں تو آپ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا:

"خدا کی قسم اگر یہ لوگ (کفار مکہ) میرے ایک ہاتھ پر آفتاب اور دوسرے پر ماہتاب لاکر رکھ دیں تو بھی میں اپنے فرضِ منصبی سے منھ نہیں موڑ سکتا۔"

اس پیغمبری آواز اور صداقت آمیز لہجہ نے جناب ابو طالبؑ کے دل میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا چنانچہ آپ نے فرمایا:

"اگر تمھارا موقف اور فیصلہ اٹل ہے تو تم اپنا کام انجام دیتے رہو، میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک میرے تن میں جان باقی ہے، کفار مکہ تمھارا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔"[1]

اگر رسول اکرم صلعم یا آپ کے چچا حضرت ابو طالبؑ کے دل میں حصولِ زر، جہاں بانی، حکمرانی یا ملکی فتوحات کا کوئی جذبہ کارفرما ہوتا تو وہ اس موقع پر کفار مکہ کو آسانی سے اپنا ہمنوا بنا سکتے تھے۔ ان سے

---

[1] سیرۃ النبی ابن ہشام ج ۱ ص ۸۹

کہتے کہ میری مخالفت پر کیوں کمر بستہ ہو، اسلام قبول کر لو تاکہ دنیا کی دولت پر قابض ہو سکو، مسلمان ہو جاؤ تاکہ دوسرے ملکوں کے خزانے لوٹ کر اپنا گھر بھر سکو، میرے قوت بازو بن جاؤ تاکہ عراق، ایران، شام اور مصر وغیرہ پر حملہ کر کے انھیں تاراج کیا جا سکے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اور ان کے اس احتجاج کو سختی سے ٹھکرا دیا۔

حضرت ابوطالبؑ کے اس وعدے اور یقین دہانی سے یہ ظاہر ہے کہ آپ کے دل میں حق کے لیے قربانی کا جذبہ تھا اور رسالت کے ساتھ ساتھ اسلام بھی آپ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتا رہا۔

غرض کہ حالات جب سازگار ہوئے اور اسلام کی قوت عہدِ طفولیت سے گزر کر جوانی کی سرحد کی طرف بڑھنے لگی تو کفارِ مکہ کے دلوں میں عداوت، نفرت، بغض اور حسد کے شعلے پوری شدت سے بھڑک اٹھے، جس کے نتیجہ میں رسول اکرم صلعم کو متعدد جنگوں اور غزوات کا سامنا کرنا پڑا۔

پیغمبرِ اسلامؐ کے دور میں جو غزوات رونما ہوئے یا جو جنگیں لڑی گئیں وہ صرف دفاعی اور اسلام کے مفاد میں تھیں۔ رسولؐ کی طرف سے کسی جنگ میں ابتدا نہیں کی گئی نہ کسی قسم کا جارحانہ اقدام عمل میں لایا گیا نہ بربریت اور تشدد کا مظاہرہ کیا گیا۔

اس کے برخلاف حضرت عمر یا ان سے پہلے ابوبکر اور ان کے بعد عثمان کے دور میں عراق، ایران، شام اور مصر کے ساتھ دیگر دور دراز کے ممالک پر ملک گیری کے لیے حملے کیے گئے، انھیں دل کھول کر لوٹا گیا، وہاں کے عوام کو بربریت اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا، ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے، انھیں شہر بدر کیا گیا اور ان کے گھروں کو ویران

تاراج اور تباہ و برباد کیا گیا۔

ان خلفاء کی فتوحات کا اصول یہ نظر آتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دنیا کی دولت حاصل کی جائے، ملکوں کو فتح کیا جائے اور وہاں کے عوام کو بربریت، تشدد اور مظالم کے ذریعہ اس امر پر مجبور کیا جائے کہ وہ اہلِ اسلام کی غلامی کا کلمہ پڑھیں۔ مسلمان ہوں یا جزیہ دیں اور اگر یہ دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں تو تلوار کے پانی سے سیراب ہوں۔

کیا ان فتوحات کو اصولی اور اسلامی کہا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! خلفاء کے ان غیر اصولی اور غیر اسلامی جنگی کارناموں سے اگر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے جہاد کا تقابل کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علیؑ کا جہاد حضرت رسولِ خداؐ کے جہاد سے صد فیصد مشابہت اور مماثلت رکھتا ہے۔ جس طرح آنحضرتؐ نے صرف اسلام کے مفاد میں دفاعی لڑائیاں لڑیں اسی طرح بعد پیغمبرؐ حضرت علی علیہ السلام نے بھی اپنے عہد میں صرف دفاع کو ملحوظ خاطر رکھا۔ جس طرح رسول اکرمؐ نے اپنے مخالفین کا اس وقت مقابلہ کیا جب وہ لوگ حملہ آور ہوئے۔ بالکل اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے بھی جنگ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں معرکہ آرائی کی جب آپ کے مخالفین کسی طرح حق کی طرف نہیں پلٹے۔ جس طرح رسولِ اکرم صلعم نے مخالفین کے شر سے مسلمانوں اور اپنے اصحاب کو محفوظ رکھا اسی طرح حضرت علیؑ نے بھی اپنے ماننے والوں اور کلمہ گویوں کی حفاظت کی۔ جس طرح پیغمبرؐ جنگ کے دوران اہلِ اسلام کو تاکید فرماتے تھے کہ خبردار! انسانی اخلاق و آداب سے کنارہ کش

نہ ہونا اسی طرح حضرت علیؑ بھی اپنی فوج کو حکم دیتے تھے کہ جنگ کے میدان سے بھاگنے والوں، شکست کھانے والوں، زخمیوں اور کمزوروں پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ اپنی طرف سے ابتدا نہ کرنا، پہلے دشمنوں کو سمجھانے بجھانے اور راہ راست پہ لانے کی کوشش کرنا۔ جب اتمام حجت کے بعد بھی وہ نہ مانیں اور تمھارے قتل پر تیار ہی ہوں تو تم بھی اپنے دفاع اور بچاؤ کے لیے مناسب اقدام کرنا۔

مالک ابن جون سے روایت ہے کہ جنگ جمل میں جب دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں تو حضرت علیؑ نے اپنی فوج میں یہ اعلان کرا دیا تھا کہ ہماری طرف سے جنگ کی ابتدا نہ کی جائے، کوئی دشمن پر تیر نہ چلائے نہ کسی شخص پر نیزے یا تلوار کا وار کرے۔

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ نے اس وقت تک حضرت عائشہ کے لشکر سے جنگ نہیں کی جب تک آپ نے ہر طرح کی حجت تمام نہیں کرلی۔ جب تین دن گزر گئے اور حضرت عائشہ کی طرف سے متواتر حملے ہوتے رہے تو حضرت امام حسنؑ، امام حسینؑ اور عبداللہ بن جعفر نے عرض کی کہ ہمارے لشکری کثرت سے زخمی ہو رہے ہیں، ہم کب تک تحمل سے کام لیں؟ تو اس موقع پر بھی آپ نے فرمایا کہ اگر تم دشمنوں پر غالب آنا تو کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کرنا، جو شخص زخمی ہو کر گر جائے اس پر وار نہ کرنا، جو اشیاء ہنگام جنگ مقتولین کے جسم پر ہوں وہی لوٹی جائیں ان کے علاوہ قتل ہونے والوں کا تمام اثاثہ ان کے وارثوں تک پہنچا دی جائیں۔

بہرحال تیسرے دن فوجیں ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئیں

میدانِ کارزار گرم ہوا، گھمسان کی جنگ ہوئی اور جب حضرت علیؑ کو فتح ہوئی تو آپ نے دشمنوں کے لشکر کی ہر چیز ان لوگوں کو واپس کر دی۔[1]

حضرت علی علیہ السلام نے تختِ خلافت پر قدم رکھتے ہی جو خطبہ دیا اس کی بھی دو باتیں قابلِ غور ہیں۔

(۱) سچا مسلمان وہی ہے جس کی زبان یا ہاتھ سے دوسروں کو تکلیف نہ پہنچے۔

(۲) خدا کے شہروں اور خدا کے بندوں سے ڈرو، یقیناً تم سے زمین کے ٹکڑوں اور مویشیوں کا بھی حساب لیا جائے گا۔[2]

مذکورہ دونوں باتوں سے واضح ہے کہ خلیفۂ رسول کے فرائض کیا ہیں؟ آپ نے تمام مسلمانوں سے اس امر کی تاکید فرما دی کہ غیر ملکوں، شہروں اور قصبوں کے باشندوں (خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم) کا بھی خیال رکھو اور ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

مطلب صاف ہے کہ کسی مسلم یا غیر مسلم کو بے جرم سزا نہ دو، کسی کو پریشان نہ کرو، کسی ملک پر فوج کشی یا حملہ نہ کرو، کسی شہر پر اپنا تسلطنہ جماؤ کیوں کہ تم زمین کے ٹکڑوں اور اس پر چرنے والے مویشیوں کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا اور اس کا حساب لیا جائے گا۔

یہ تھی حضرت علیؑ کی شان خلافت اور فتوحات و غزوات سے متعلق آپ کا نظریہ۔ اب قارئین کرام کا ذہن آسانی سے اس فیصلے پر پہنچ سکتا ہے کہ حضرت عمر وغیرہ کی فتوحات اسلامی اور اصولی تھیں یا غیر اسلامی اور غیر اصولی۔

---

[1] روضۃ الندیہ ص ۳۲ [2] طبری ج ۵ ص ۱۵۷، کامل ج ۳ ص ۷۶

عمری نکتہ چینیاں اور منصب نبوت

کسی کے کام میں بے سبب نکتہ چینیاں یا کسی کے کلام میں بے وجہ تاویلیں جن کو وہ شخص پسند نہیں کرتا نہ تو شرعی اعتبار سے جائز ہیں اور نہ ہی اصولی لحاظ سے درست ہیں۔ مگر حضرت عمر کی ذات سے یہ تمام وابستہ ہیں۔ آپ پیغمبرؐ اسلام کے ہر اس فعل، ہر اس کام، ہر اس حکم کے بارے میں نکتہ چینیاں اور تبدیلیاں فرما دیا کرتے تھے جو آپ کی سمجھ، عقل اور فہم و ادراک سے باہر ہوتا۔ آپ کی گناہ آلود زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے حضرت رسول خدا صلعم کے جس حکم یا فعل کو خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی شرعی ہو یا امور دنیا سے متعلق ہو، نامناسب سمجھا اس میں ترمیم کر دینا ضروری خیال کیا اور آنحضرتؐ کے اقوال و افعال کو منصب نبوت کے تحت تسلیم کرتے ہوئے اگر خلاف مصلحت سمجھا تو اپنی ذاتی رائے کو ان پر مسلط کرنے میں کسی طرح کا کوئی تامل نہیں کیا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) حضرت رسول خدا صلعم جب عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھنے کھڑے ہوئے تو حضرت عمر مزاحمت پر کمربستہ ہو گئے اور اچھل کر آپؐ کا دامن پکڑ کر کھینچ لیا اور فرمایا کہ آپ منافق کی نماز جنازہ پڑھ رہے ہیں اور خدا کا حکم ہے منافقین کے لیے استغفار مفید نہیں ہے خواہ وہ ستر مرتبہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن آنحضرتؐ نے حضرت عمر کی اس بے ادبی اور جسارت پر تحمل سے کام لیا اور نماز جنازہ ادا کی اور عبداللہ کی قبر تک تشریف لے گئے۔[۱]

[۱] بخاری و مسلم ج ۲ ص ۳۵۷ طبع مکہ

ظاہر ہے کہ نماز جنازہ ایک دینی خدمت ہے اور مرنے والا کافر بھی نہیں تھا کہ اس کے جنازے پر نماز حرام ہوتی بلکہ بظاہر مسلمان تھا لہٰذا آنحضرتؐ کا یہ اقدام آئین شریعت کے عین مطابق تھا اور اس اقدام سے ایسی فتح حاصل ہوئی کہ قبیلۂ خزرج کے ایک ہزار افراد دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ لیکن افسوس ہے کہ حضرت عمر کی جنگجو طبیعت پر رسول اکرمؐ کی یہ بات ناگوار گزری۔ جب کہ حضرت عمر یہ جانتے تھے کہ آنحضرتؐ کا یہ طرزِ عمل منصب نبوت کے تحت ہے۔ اس اصلاحی کوشش اور گستاخی کے بعد عمر کو یہ احساس بھی ہوا کہ اس موقع پر میری سرکشی غلط تھی، چنانچہ آپ خود ہی فرمایا بھی کرتے تھے کہ مجھے تعجب ہے کہ میں رسولؐ کی شان میں ایسی گستاخی اور جسارت کر بیٹھا۔[۱]

(۲) مندرجہ بالا واقعہ کے ذیل میں حضرت عمر کی یہ حرکت تاریخ سے واقفیت رکھنے والوں کے لیے نئی نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے اور بعد میں بھی وہ ایسی حرکتیں کرتے رہے۔ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ میں ابوعطیہ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا تو کچھ لوگوں نے آنحضرتؐ سے اس کی نمازِ جنازہ کے لیے درخواست کی۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ آپ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھیں۔ عمر کے اس کہنے پر آنحضرتؐ نے صحابہ سے دریافت کیا کہ کیا تم میں سے کسی نے اس شخص کو کوئی کار خیر کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ ایک شخص نے جواب دیا کہ وہ فلاں شب ہمارے ساتھ سرحدی محافظین میں تھا۔ یہ سن کر آپؐ نے اس کی نماز میت پڑھی، قبر تک تشریف لے گئے

[۱] صحیح بخاری پ ۵ ص ۱۰۷

اور مٹی دینے کے بعد فرمایا کہ لوگ تجھے جہنمی خیال کرتے ہیں اور میں تیرے جنتی ہونے کی گواہی دیتا ہوں۔ پھر آپ نے عمر کو آڑے ہاتھوں لیا اور ڈانٹا[1]

اس واقعہ کو مصنف نے ابو منذر کے حالات میں بھی نقل کیا ہے اور طبرانی نے بھی ہشام بن سعد سے تقریباً یہی روایت نقل کی ہے ــ اور پھر آخر میں آنحضرتؐ کا یہ قول بھی تحریر کیا ہے کہ جو شخص راہ خدا میں جہاد کرے اس پر جنت واجب ہے۔

آنحضرتؐ کا یہ اقدام بھی بشری حیثیت سے نہیں بلکہ منصب نبوت کے تحت تھا لیکن حضرت عمر اپنی نکتہ چینیوں سے بھلا کس طرح باز رہ سکتے تھے؟

(۳) پیغمبر اسلامؐ، بدر میں مقتولینِ کفار کو آواز دے کر کچھ فرمانے لگے تو حضرت عمر کو ناگوار گزرا اور آپ نے رسولِ اکرمؐ سے استفسار کیا کہ آپؐ مردوں سے کیا باتیں کر رہے ہیں؟ اس پر رسولؐ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! تم لوگ تو میری باتیں اتنی بھی نہیں سنتے جتنی یہ کفار کے مردے سنتے ہیں[2]

حضرت رسول خدا صلعم نے اس وقت بدر کے کافر مقتولوں سے جو کچھ فرمایا وہ منصبِ نبوت کی حیثیت سے اور عمر بھی اس حقیقت سے خوب واقف تھے لیکن آپ نے رسولؐ اللہ پر اعتراض کیا کہ مردوں سے باتیں کرنا خلافِ عقل ہے۔

(۴) غزوۂ خندق کے موقع پر ایک شب حضرت رسول خدا صلعم نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایسا وفادار ہے جو اس وقت جا کر دشمنوں کی خبر لائے۔ جب سب خاموش رہے اور پہلو تہی کرنے لگے تو

---

[1] اصابہ ج۴ ص ۱۸۵ و ص ۱۳۵ [2] بخاری پ۱۴ ص ۲

آنحضرتؐ نے ابوبکر کو اس کام پر مامور کرنا چاہا، انھوں نے جواب دیا استغفر اللہ۔ پھر حضرت عمر سے فرمایا کہ تم جاؤ انھوں نے بھی کہا استغفر اللہ و رسولہ۔ میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے استغفار کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں[1]

حضرت ابوبکر اور عمر کا استغفر اللہ و رسولہ کہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ نے آنحضرتؐ کے اس حکم کو منصبِ نبوت ہی کے تحت سمجھا۔ اگر شریعت کے اقتضا یا دنیاوی اعتبار سے سمجھتے تو استغفار کی کیا ضرورت تھی؟

(۵) صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمر کا یہ قابلِ مذمت طرزِ عمل تاریخ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے کہ محمدؐ کی نبوت میں جیسا شک مجھے آج ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔

اگر حضرت عمر رسول اکرمؐ کے اقوال و افعال کو دو حصوں پر تقسیم کرتے، ایک وہ جس میں منصبِ نبوت کارفرما ہوتا اور دوسرا وہ کہ جو دنیاوی حیثیت یا البشری اعتبار سے ہوتا تو اس موقع پر یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ رسولؐ کی یہ بات منصب نبوت کے تحت نہیں ہے اس لیے میں نہیں مانوں گا لیکن آپ کا یہ کہنا کہ "رسولؐ کی نبوت میں آج سے پہلے ایسا شک نہیں ہوا" یہ ثابت کرتا ہے کہ آپ آنحضرتؐ کے ہر قول و فعل کو منصبِ نبوت ہی کے تحت سمجھتے تھے اور اسی اعتبار سے اس میں شک یا اعتراض کرنے اور اصلاحی مشورہ دینے کی گستاخی و جسارت کرتے تھے۔

(۶) غزوۂ خیبر میں اصحابِ ثلاثہ کی نامردی و ناکامی کے بعد حضرت رسولِ خدا صلعم نے یہ فرمایا کہ کل میں ایسے شخص کو علم دوں گا جو کرار و غیر فرار

---

[1] تفسیر در منثور ج۵ ص ۳۵۔ سیرت حلبیہ ج۲ ص ۲۳۷، کنز العمال ج۵ ص ۲۷۹

ہوگا، خدا اور رسولؐ اسے دوست رکھتے ہوں گے اور وہ خدا اور رسول کو دوست رکھتا ہوگا۔

رسولؐ کے اس فرمان کے بعد اکابرین صحابہ نے تمام رات اس بیقراری میں گزاری کہ دیکھیے یہ تاج کس کے سر پر رکھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ بھی اس آرزو میں بے چین رہے اور رسالت مآبؐ کے اس قول میں کسی شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ اگر ان کے دل میں یہ وہم ہوتا کہ رسولؐ یہ اعلان بشری حیثیت سے کر رہے ہیں تو شاید توجہ بھی نہ دیتے بلکہ (معاذاللہ) رسولؐ پر ہذیان کی تہمت قبل از وقت عائد کر دیتے اور کہتے کہ جب ہم لوگ اتنے دنوں کی کوشش کے باوجود قلعۂ خیبر کو فتح نہ کر سکے تو کل کسی شخص میں اتنی قوت اور ایسی شجاعت کہاں سے آجائے گی کہ وہ فتح کر کے ہی لوٹے گا۔ مگر چونکہ آپ کو اس ارشادِ رسالتؐ پر یقین و اعتماد تھا کہ وہ ہرگز غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ قول منصبِ نبوت کے تحت ہے اس لیے دیگر صحابہ کی طرح آپ نے بھی وہ رات کرب، بے چینی، تمنا اور آرزو میں گزاری۔

(۷) غزوۂ تبوک کی واپسی پر یہ منادی کرادی گئی تھی کہ جس وقت تک رسولِ اکرمؐ کی سواری کا ناقہ "عقبہ ذی فتق" سے گزر نہ جائے کوئی شخص ادھر جانے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن وہ منافقین جو رسولؐ کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا منصوبہ تیار کر چکے تھے اس حتمی اعلان کے باوجود اس گھاٹی میں داخل ہو گئے جدھر سے رسول اکرمؐ کو گزرنا تھا۔ رات کی تاریکی میں آپ کی سواری محتاط انداز میں آہستہ آہستہ گزر رہی تھی کہ اچانک بجلی چمکی جس کی روشنی میں پیغمبرؐ نے کچھ شناسا چہروں کو دیکھا اور ان کے نام حذیفہ سے جن کے ہاتھوں میں ناقہ کی مہار تھی، بتا دیے اور یہ

فرمایا کہ یہ سب منافق ہیں اور میری جان لینا چاہتے ہیں۔

اس واقعہ کے بعد حضرت عمر دل کے ٹھوکوں سے مجبور ہو کر اکثر و بیشتر حذیفہ سے یہ پوچھا کرتے تھے کہ: "اے حذیفہ! کیا عقبہ ذی فتق کے منافقین میں میرا نام بھی ہے؟"

حضرت عمر کے اس استفسار پر حذیفہ خاموش ہو جاتے۔ آخر کار عمر نے خود ہی یہ راز اگل دیا کہ اے حذیفہ! خدا کی قسم میں بھی ان منافقین میں سے ہوں۔[1]

یہ وہ مشہور واقعہ ہے جو تاریخی حوالوں کا محتاج نہیں ہے۔ حضرت عمر کا اپنے بارے میں حذیفہ سے بار بار پوچھنا آپ کی پریشانی اور آپ کا تردد یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کا یہ اقدام رسولؐ کے خلاف غلط تھا، جس کی سزا صرف جہنم ہے۔

(۸) سورۂ برأت کی تبلیغ سے جب حضرت ابوبکر و عمر کو رسولِ اکرمؐ نے معزول کیا تو ان دونوں کو سخت صدمہ ہوا اور ابوبکر کے بارے میں تاریخ تو یہ کہتی ہے کہ وہ رسولؐ کی خدمت میں جب واپس آئے تو بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

اگر رسولؐ کا یہ عمل بشری تصور کیا جاتا تو رونے دھونے اور گریہ زاری کی کیا ضرورت تھی؛ کہتے کہ اس معزولی کا تعلق منصبِ نبوت سے نہیں ہے یہ تو محض رسولؐ کا ذاتی فعل ہے۔ لیکن اس معزولی کو اپنے لیے ایک عظیم مصیبت تصور کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ لوگ ہر فعلِ رسالتؐ کو

---

[1] تاریخ خمیس ج ۲ ص ۱۴۴

خدا کی مرضی اور وحی کے مطابق سمجھتے تھے۔

(۹) ۱۸ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کو غدیر خم میں پیغمبرؐ اسلام نے جب حضرت علیؑ کی خلافت کا آخری اعلان فرما کر آپ کی مولائیت پر اپنی مہر ثبت کر دی تو حضرت عمر نے بھی مبارک باد دی اور کہا کہ اے علیؑ! آج سے آپ جملہ مومنین و مومنات کے مولا ہو گئے۔

اگر رسولؐ کے اس اعلان کو حضرت عمر منصبِ نبوت کے تحت نہ سمجھتے تو مبارکباد کیوں دیتے؟ کہہ سکتے تھے کہ رسولؐ کا یہ اعلان بشری حیثیت سے ہے لہٰذا ہم اس کے پابند نہیں ہیں۔

(۱۰) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات طاہرہ کے آخری لمحات میں بغرض نوشتہ قلم و قرطاس کی جو خواہش کی اور اس خواہش پر عمر کی طرف سے جو جواب ملا وہ تمام عالم اسلام پر آشکارا ہے۔

اگر آپ آنحضرتؐ کی اس خواہش کو منصبِ نبوت کے تحت نہ تصور کرتے تو اس سخت کلامی سے نہ پیش آتے کہ رسولؐ نے قُومُوا عَنِّیْ کہہ کر انھیں گھر سے باہر نکال دیا۔ آپ (عمر) صحابہ سے نرمی کے ساتھ کہہ سکتے تھے کہ رسول اللہ کی یہ خواہش منصبِ نبوت کے تحت نہیں ہے اس لیے ناقابلِ توجہ ہے لیکن آپ نے یہ خاص تدبیر اختیار کی کہ قولِ پیغمبرؐ کو ہذیان سے تعبیر کر دیا۔ یعنی آپ کا مقصد یہ تھا کہ رسولؐ ہر حال رسولؐ ہیں اور یہ خواہش بھی منصبِ نبوت کے تحت ہے مگر اس وقت چوں کہ مرض کا غلبہ ہے اس لیے بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں جو قابلِ اعتنا نہیں ہیں۔

یہی وہ نکتہ چینیاں، دخل اندازیاں اور گستاخیاں ہیں جو رسولؐ کو منصبِ نبوت پر فائز سمجھتے ہوئے حضرت عمر سے سرزد ہوتی رہیں۔ کیا حضرت عمر کا یہ طرزِ عمل حقیقی مسلمانوں کے لیے قابلِ برداشت ہو سکتا ہے؟

دینی و مذہبی اصلاحیں

متعۃ الحج و متعۃ النساء

اسلام کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک عظیم ٹھوس، فعال اور تخلیقی قوت رکھنے والا عقیدہ ہے، جو انسان کی عملی و داخلی زندگی پر پوری طرح چھا جاتا ہے اور اس کی تمام عملی و جذباتی قوتوں کو اپنا لیتا ہے۔ اسلام میں نمایاں چیز اس کی ہمہ گیر عملی حقیقت پسندی ہے جو غور و فکر اور میلانات پر حاوی رہتی ہے۔

اسلام کے احکام فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہیں۔ اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس میں انسان کے فطری تقاضوں کو ملحوظ خاطر نہ رکھا گیا ہو۔ فروعِ دین میں اسلام کے استثنائی احکام اور مراعات خود اس بات کی دلیل ہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے اس کے احکام ناقابلِ عمل نہیں ہیں۔ خاص صورتوں، مثلاً دکھ، درد اور بیماری وغیرہ کی حالت میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے کے عام احکام میں تبدیلی بھی ہو جاتی ہے۔ جیسے بیٹھ کر یا لیٹ کر اشاروں سے نماز پڑھنا اور رمضان کے روزے دوسرے دنوں میں قضا رکھنا وغیرہ۔ اسی طرح کوئی شخص خاص وجوہات کی بنا پر ایک مدت تک اپنی زوجہ سے الگ رہے اور اس کی قوتِ برداشت، شہوانی خواہشات و جذبات کی فراوانی کے

آگے دم توڑتی نظر آنے لگے، تو کیا وہ اپنی اس جنسی ہوس کی تکمیل کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرے جو اسلامی احکام کے منافی ہو، یا پھر اپنے فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اسلام نے چند قیود، پابندیوں اور شرائط کے ساتھ جو مراعاتی احکام دیے ہیں ان پر عمل پیرا ہو کر زنا کے ارتکاب سے محفوظ رہے؟

انھیں خاص مراعاتی احکام میں ایک حکم کا نام "متعہ" ہے، جس کی تقسیم دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک متعۃ الحج اور دوسرے متعۃ النساء۔

"متعۃ الحج" کو "تمتع بالحج" بھی کہتے ہیں۔ تمتع کے معنی لطف اندوزی کے ہیں۔ اس میں عمرہ اور حج کے درمیان انسان اپنی عورتوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اور یہ فریضہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو حدود مکہ سے تقریباً اسّی کیلومیٹر یا اس سے زیادہ فاصلہ پر آباد ہوں۔

متعۃ النساء کی تعریف یہ ہے کہ کسی عورت سے، کسی مقررہ مدت کے لیے کسی معینہ مہر کے عوض عقد کیا جائے اور جب وہ مدت تمام ہو جائے تو وہ عورت بغیر طلاق کے علیحدہ ہو جائے اور اتنی مدت تک عدہ کی حالت میں رہے کہ حمل کا شبہ جاتا رہے۔

"متعہ" کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے کہ:

"جن عورتوں سے تم نے متعہ کیا ہو تو انھیں جو مہر معین کیا ہے دے دو اور مہر کے مقرر ہونے کے بعد اگر آپس میں (کم و بیش پر) راضی ہو جاؤ تو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ بے شک خدا ہر چیز سے واقف اور مصلحتوں کا پہچاننے والا ہے[1]۔"

---

[1] النساء۔ ۲۴

ایک مقام پر ارشاد ہوا،

"لوگو! جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو[1]۔"

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا:

"جو شخص، خدا کی کتاب کے مطابق حکم نہ دے وہ کافر ہے[2]۔"

اور سورۂ کہف میں ارشاد ہوا:

"خدا اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں بناتا[3]۔"

معلوم ہوا کہ متعہ کا حکم صرف خدا کی طرف تھا اور اس حکم میں ترمیم و تنسیخ کا حق خدا کے علاوہ رسول اکرمؐ کو بھی نہیں تھا۔ آپ کا فرضِ منصبی یہ تھا کہ آپ اس حکم الٰہی کو مسلمانوں پر نافذ کریں۔ چنانچہ اسی حکم سے متعلق عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ "ہم حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگوں میں جایا کرتے تھے اور ہمارے پاس کوئی سامان مقتضائے فطرت کے پورا کرنے کا نہیں ہوتا تھا تو ہم نے (رسولؐ اللہ سے) کہا کہ ہم کیوں نہ اپنے اعضائے شہوانی کو قطع کرا دیں، آنحضرتؐ نے اس کی ممانعت فرمائی اور ہمیں اس امر کی اجازت دی کہ ہم عورتوں سے مناسب مہر پر عقدِ متعہ کر لیا کریں[4]۔"

صحیح مسلم میں یہ روایت یوں منقول ہے:

"عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ ہم لوگ جوان تھے، ہم نے رسول اللہ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم اپنے اعضائے شہوانی کو قطع کیوں نہ کرا دیں[5]۔"

---

[1] الاعراف۔ ۲ [2] المائدہ۔ ۴۴ [3] الکہف۔ ۲۶ [4] بخاری ج ۲ ص ۷۵۹، مطبوعہ کرزن پریس دہلی [5] صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۵۰ مطبوعہ مجتبائی دہلی

صحیح مسلم میں غزوات کا تذکرہ نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ امن میں بھی اگر زوجہ نہ رہے تو نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے اسلام عقد متعہ کی اجازت دیتا ہے۔ اور ابتدائے اسلام میں متعہ کے جواز کو علماء و مفسرین اہل سنت نے تسلیم کیا ہے۔ علامہ فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں رقم طراز ہیں کہ:

"یہ امر متفق علیہ ہے کہ متعہ ابتدائے اسلام میں جائز تھا اس پر تمام امت کا اجماع ہے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔[1]"

علاؤالدین علی بن محمد بن ابراہیم المعروف بہ خازن بغدادی کا کہنا ہے کہ "یہ طریقہ نکاح (متعہ) ابتدائے اسلام میں موجود تھا۔[2]" علامہ حسن بن محمد نیشاپوری کا کہنا ہے کہ "اس امر پر تمام کا اتفاق ہے کہ متعہ ابتدائے اسلام میں مباح و جائز تھا۔[3]" ان کے علاوہ محی الدین ابو زکریا یحیٰ بن شرف نووی، نواب صدیق حسن قنوجی اور سر سید احمد خاں نے بھی یہی کچھ تحریر کیا ہے۔[4]

مگر افسوس کہ حضرت عمر نے اپنی جہالت و سرکشی کی بنا پر اپنے ذاتی اجتہاد کے ذریعہ خدا اور رسولؐ کے اس حکم کو پامال کر دیا اور سورہ مائدہ کی ۴۴ ویں آیت کے تحت کافر قرار پاگئے۔ جیسا کہ صحابیِ رسولؐ حضرت جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ:

---

۱ تفسیر کبیر ج ۳ ص ۱۹۵ و ۱۹۶ مطبوعہ مصر ۲ معانی التنزیل ج ۱ ص ۳۲۴ مطبوعہ مصر
۳ تفسیر غرائب القرآن ج ۱ ص ۱۲۱ مطبوعہ ایران، تفسیر طبری ج ۵ ص ۱۶ مطبوعہ مصر
۴ دیکھیے شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۵۰، تفسیر آیات الاحکام ص ۵۷ مطبوعہ لکھنؤ اور تفسیر قرآن ج ۲ ص ۳۱۶ مطبوعہ علی گڑھ۔

"ہم لوگ رسالت مآبؐ کے پورے زمانہ میں اور حضرت ابوبکر کے پورے دورِ خلافت میں نیز حضرت عمر کے نصف زمانۂ خلافت تک برابر متعہ کرتے تھے مگر حضرت عمر نے اپنے نصف زمانۂ خلافت کے بعد یہ کہہ کر متعہ کی ممانعت کر دی کہ دو متعہ رسالت مآبؐ کے زمانہ میں حلال تھے، متعۃ الحج اور متعۃ النساء۔ میں ان دونوں کو حرام قرار دیتا ہوں اور ان کے کرنے والوں کو سزا بھی دوں گا۔[1]"

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ:

"ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ اور ان کے زمانے میں متعہ کیا کرتے تھے اور آنحضرتؐ نے کبھی منع نہیں کیا اور نہ اس کے بعد خداوند تعالیٰ نے کوئی آیت اس کی ناسخ اتاری۔[2]"

ابی نضرہ سے روایت ہے:

"میں نے جابر بن عبداللہ انصاری سے کہا کہ ابن زبیر لوگوں کو متعہ سے روکتا ہے اور ابن عباس اس کی اجازت دیتے ہیں۔ پس جابر بن عبداللہ نے مجھ سے کہا کہ زمانۂ رسولؐ اور زمانۂ ابوبکر میں ہم متعہ کیا کرتے تھے، پس جب عمر حاکم ہوئے تو انھوں نے یہ خطبہ دیا کہ قرآن ہے تو ہوا کرے، رسولؐ ہے تو ہوا کرے، متعۃ الحج اور متعۃ النساء دونوں زمانۂ رسولؐ میں جاری تھے لیکن میں تم کو ان دونوں سے منع کرتا ہوں۔[3]"

---

۱ تفسیر درمنثور ج ۲ ص ۱۴۰، تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۰۰، تفسیر کشاف ج ۱ ص ۳۵۰، معالم التنزیل و مستدرک، طبری و صحیح مسلم وغیرہ ۲ مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۴۲۹ تا ۴۵۱ ۳ مسند احمد بن حنبل جز اول ص ۵۲

صحیح مسلم میں تو یہاں تک ہے کہ۔ عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کے لیے جو چاہا مباح کر دیا۔ اب اگر کوئی شخص عورتوں سے تعلق پیدا کرے گا تو میں اسے سنگسار کر دوں گا۔[2]

یہ بات انتہائی حیرت انگیز و تعجب خیز ہے کہ رسول اکرم صلعم کی زندگی کے آخری لمحات میں "قلم و قرطاس" کی خواہش پر "حسبنا کتاب اللہ" کا نعرہ بلند کرنے والا شخص صحیح مسلم کی مذکورہ روایت میں قرآن سے منحرف نظر آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ "قرآن ہے تو ہوا کرے"۔ اس انحراف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر متضاد کردار کے مالک بھی تھے اور مصلحت پروری و فتنہ سازی آپ کی فطرت میں داخل تھی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حضرت عمر کی نظر میں نہ قرآن کی کوئی اہمیت تھی نہ حکم الٰہی کا کوئی پاس و لحاظ تھا اور اللہ کے رسولؐ کا کوئی مرتبہ تھا۔ ایسی صورت میں کیا ایسے شخص کو مسلمان کہا جا سکتا ہے؟

اس موقع پر قارئین کے لیے حضرت عائشہ کی یہ روایت بھی دلچسپی سے خالی نہیں جس میں آپ فرماتی ہیں کہ:

> "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ جو شخص ہمارے دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کرے یا کوئی ایسا عمل کرے جس کے متعلق ہمارا حکم نہ ہو تو وہ شخص مردود ہے۔"[1]

---

[1] صحیح مسلم ج ۸ ص ۱۶۸

[2] صحیح مسلم حصہ دوم (اردو ترجمہ) ص ۸۱۸ و ۸۱۹ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳ء

تراویح کی بدعت

تراویح درحقیقت حضرت عمر کی ذہنی اختراع کا نام ہے۔[1] عہد رسالت یا اس کے بعد حضرت ابوبکر کے دور خلافت میں اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ بات تاریخی اعتبار سے مستحکم، مسلّم اور یقینی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز استسقاء (وہ نماز جو بارش نہ ہونے کی صورت میں مخصوص ترکیب کے ساتھ پڑھی جاتی ہے) کے علاوہ تمام سنتی نمازوں میں جماعت کو ناجائز قرار دے دیا تھا۔ اسی پر حضرت ابوبکر کے زمانہ میں بھی عمل ہوتا رہا لیکن ماہ رمضان ۱۴ھ میں حضرت عمر نے مسلمانوں پر یہ حکم نافذ کیا کہ ہر مسلمان ہر رات تراویح میں گزارے اور مسجد میں کھڑا رہے۔

اس اذیت رساں حکم میں کیا عمر کی مصلحت کارفرما تھی؟ اسے حضرت عمر یا ان کا اللہ جانے! لیکن یہ فرمان دوسرے شہروں کے لیے بھی روانہ کر دیا گیا اور اس پر عمل کی سخت تاکید کر دی گئی۔[2] مدینہ میں عورتوں اور مردوں کے لیے دو قاری مقرر کر دیے تاکہ وہ تمام رات تراویح پڑھائیں۔

بعض مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت عمر نے ایک رات مساجد کا معائنہ کیا اور نمازیوں کو مختلف انداز میں مصروف عبادت پاکر اسی شب تراویح کا فرمان جاری کیا۔[3]

بخاری نے اپنی کتاب تراویح میں عبد قاری سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

> "میں عمر کے ساتھ تھا، جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو انھوں نے

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۱۳۶ [2] موطا ج ۱ ص ۱۱۴ [3] حیوٰۃ الحیوان ج ص ۲۴۶

نمازیوں کو متفرق حالت میں دیکھ کر کہا کہ میں انھیں مجتمع دیکھنا چاہتا ہوں
اور پھر آپ نے تراویح کا حکم جاری کر کے ابیؑ بن کعب کو امام مقرر کر دیا۔
جب دوسری رات آئی تو وہ پھر گئے تو اجتماعی منظر دیکھا اور فرمایا کہ کیا
اچھی بدعت ہے۔"

علامہ قسطلانی نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عمر نے اس کو بدعت سے اس لیے تعبیر کیا کہ رسولؐ اللہ یا ابو بکر کے زمانہ میں اس قسم کا کوئی اجتماع نہ تھا۔[1]

علامہ سیوطی رقمطراز ہیں کہ حضرت عمر نے تراویح کی ایجاد کی، اُمّ ولد کی بیع سے منع کیا اور نماز میت میں چار تکبیریں کر دیں۔ اس کے علاوہ پہلے پہل امیر المومنین کا لقب اختیار کیا اور متعہ کو حرام قرار دیا۔[2]

علامہ عبد ربہ نے استیعاب میں، ابن سعد نے طبقات ج ۳ میں اور ابنِ شحنہ نے روضۃ المناظر ۲۳ھ کے واقعات میں حضرت عمر کی ان خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

مولوی وحید الزماں خاں حیدر آبادی اس عمری بدعت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ بدعت لغوی کی دو قسمیں ہیں، حسنہ اور سیئہ۔ لیکن بدعتِ شرعی ہمیشہ سیئہ ہوتی ہے جیسے کہ حدیث میں ہے كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ بدعت شرعی کی تعریف علماء نے یہ کی ہے کہ کوئی نئی بات ایسی نکالی جائے جس کی دلیل کتاب وسنت سے نہ ہو۔[3]

تراویح سے متعلق اس عمری بدعت پر علمائے اہلِ سنت شاید اس لیے مطمئن اور عمل پیرا ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ حضرت عمر نے اپنی تدبیر اور

---

[1] شرح بخاری ج ۳ ص ۲۴۲ [2] تاریخ الخلفاء ص ۵۳ [3] انوار اللغۃ پ ۲ ص ۱۹

حکمتِ عملی سے ایک ایسی چیز ایجاد کی جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود نا فل تھے۔ یہ محض ایک خوش فہمی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ عمر خود احکامِ رسالت کی حکمت سے بے بہرہ تھے۔ پیغمبرؐ اسلام نے نماز مستحبات کو اس لیے غیر مشروع قرار دیا تھا کہ نماز مستحب کو انسان اپنے معبود سے مناجات کے لیے اختیاری طور پر ادا کرتا ہے۔ اسے ایسی تنہائی چاہیے جہاں وہ باقاعدہ گریہ وزاری، رغبت وخوف اور انابت وتوبہ کے ساتھ مناجات کر سکے اور اس کے ساتھ ہی اجتماعی فائدہ یہ ہو کہ گھر کے بچے بھی نماز کے عادی بنیں۔ غالباً یہی سبب تھا کہ جب عبد اللہ بن مسعود نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ نماز گھر میں افضل ہے یا مسجد میں؟ تو آپ نے فرمایا کہ میرا گھر مسجد سے ملحق ہے لیکن میں غیر واجب نمازیں گھر میں زیادہ پسند کرتا ہوں۔[1]

ابن ماجہ وابن خزیمہ وغیرہ نے زید بن ثابت کے ذریعہ آنحضرتؐ سے روایت کی ہے کہ بعض نمازوں کے توسل سے اپنے گھروں کو بزرگ بناؤ اور بخاری ومسلم نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرتؐ نے نماز والے گھر کو زندہ اور اس گھر کو جو نماز سے محروم ہے مردہ قرار دیا ہے۔[2] جابر بن عبد اللہ انصاری سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کچھ نمازیں گھر میں پڑھ لیا کرو اس لیے کہ اس میں خیر وبرکت ہے۔[3]

افسوس ہے کہ ان تمام احکام کے باوجود اپنی بدعت سے مسلمانوں کو ان تمام اجتماعی، مذہبی اور تربیتی فوائد سے محروم کر دیا جن کے لیے سرکار رسالتؐ نے نماز مستحب کو فرادیٰ قرار دیا تھا۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۱۴ [2] بخاری ج ۱ ص ۹۰ و مسلم ج ۱ ص ۳۱۲ [3] موطا، شرح سیوطی ج ۱ ص ۱۴۰

چار تکبیریں

پیغمبر اسلام پانچ تکبیروں کے ساتھ نماز جنازہ پڑھا کرتے تھے لیکن حضرت نے اس نماز کو چار تکبیروں میں منحصر کر کے چار یاری بنا دیا۔ جیسا کہ علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء[۱] اور ابن شحنہ نے روضۃ المناظر میں تحریر کیا ہے۔ امام احمد نے عبدالاعلیٰ سے روایت کی ہے کہ "زید بن ارقم نے ایک جنازے پر پانچ تکبیروں کے ساتھ نماز پڑھی تو ایک شخص نے اعتراض کیا کہ یہ حضرت عمر کے حکم کے خلاف ہے، انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسولؐ کے ساتھ یوں ہی پڑھی ہے لہٰذا میں اسے قیامت تک ترک نہیں کر سکتا[۲]۔ امام احمد نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ یحییٰ نے حذیفہ کے غلام عیسیٰ کے ساتھ نماز پڑھی اور انھوں نے پانچ تکبیریں کہہ کر یہ اعلان کیا کہ میں نے سنتِ رسولؐ پر عمل کیا ہے[۳]۔
اس سے پتہ چلتا ہے کہ سنت رسولؐ میں تبدیلی حضرت عمر کا بنیادی مقصد تھا۔

عمری جہالت اور علوی فراست

نمبر (۱) حضرت عمر نے ایک مجنون اور زانیہ عورت کو سنگساری کا حکم دیا لیکن امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اس عورت کو لوگوں سے چھڑا کر اس کی جان بچالی۔ حضرت کے اس فعل کی شکایت پر عمر نے آپ کو طلب کیا۔ آپ غصہ میں تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا تجھے نہیں معلوم کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجنون، نابالغ اور سوتا ہوا

۱؎ تاریخ الخلفاء ص ۵ ۲؎ مسند احمد ج ۴ ص ۳۷۰ ۳؎ مسند احمد ج ۵ ص ۴۰۶

شخص احکام سے مستثنیٰ ہے۔ عمر نے کہا ہاں یہ درست ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس عورت کا جنون ایک مشہور بات ہے اس لیے ممکن ہے کہ وہ وقت عمل بھی رہا ہو پھر یہ حد کس طرح جاری ہو سکتی ہے؟ عمر سخت شرمندہ ہوئے اور اپنی غلطی و جہالت کا اعتراف کیا۔ اس واقعہ کو امام احمد نے اپنی مسند میں درج کیا ہے۔

نمبر (۲) حضرت عمر کے پاس ایک زناکار عورت لائی گئی اور بلا تحقیق آپ نے سنگسار کیے جانے کا حکم جاری کر دیا۔ اس فیصلہ پر حضرت علی علیہ السلام نے عمر کو ٹوکا کہ تجھے تحقیق کرنا چاہیے تھا، شاید اس کے پاس [illegible] عذر رہا ہو۔ حضرت علیؑ کے اس مشورہ پہ عمل کرتے ہوئے عمر نے اس کا بیان لیا تو اس نے بتایا کہ مجھ پر پیاس کا غلبہ تھا، میں نے ایک شخص سے پانی طلب کیا، اس نے بدنیتی کا مظاہرہ کیا، میں نے حتی الامکان صبر کیا، لیکن جب بالکل مجبور ہوگئی اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگا تو اس برے فعل پر تیار ہوگئی۔ یہ بیان سن کر عمر نے فرمایا کہ اللہ اکبر تو تو بہ نص قرآن حد سے مستثنیٰ ہے۔

اس واقعہ کو بیہقی نے سنن میں اور ابن قیم نے "الطریق حکمت فی السیاست الشرعیہ" میں نقل کیا ہے۔

نمبر (۳) ایک زناکار عورت، حضرت عمر کے پاس لائی گئی اور وہ حاملہ تھی لیکن حضرت عمر نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دے دیا تو معاذ نے توجہ دلائی کہ اگر عورت خطاکار ہے تو اس کے شکم میں جو بچہ ہے اس نے کیا خطا کی ہے؟ آپ نے فوراً اپنے حکم کو باطل قرار دیا اور فرمایا کہ عورتیں معاذ کا مثل پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس واقعہ کو محمد بن مخلد عطار نے فوائد میں نقل کیا ہے۔

نمبر(۴) ایک عورت نے حضرت عمر سے زنا کا اقرار کیا، اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام موجود تھے، آپ نے فرمایا کہ اس کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عورت حرمت زنا سے ناواقف تھی لہٰذا اس پر حد جاری نہیں ہو سکتی، چنانچہ حضرت علیؑ کے اس کہنے پر حد منسوخ کر دی گئی۔ اس واقعہ کو ابنِ قیم نے لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ "یہ حضرت علیؑ کی کمال فراست و دانش مندی کی دلیل ہے۔

نمبر(۵) حضرت عمر کی عدالت میں ایک شخص کے قتل کا معاملہ پیش ہوا جس میں ایک مرد اور ایک عورت کا ہاتھ تھا۔ عمر نے تشویش کا اظہار کیا تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اگر ایک سرقہ میں دو شریک ہوں تو کیا دونوں کے ہاتھ قطع نہ ہوں گے؟ عمر بولے ضرور ہوں گے۔ آپ نے فرمایا بس یہی حکم یہاں بھی جاری ہوگا۔ عمر نے تسلیم کیا۔ اس واقعہ کو احمد امین نے فجر الاسلام کے صفحہ ۲۳۷ پر رقم کیا ہے۔

نمبر(۶) حضرت عمر نے ایک عورت کو کچھ پوچھنے کے لیے طلب فرمایا تو خوف و دہشت سے اس کا حمل ساقط ہو گیا۔ حضرت عمر گھبرائے اور علماء و فقہاء سے مسئلہ دریافت کیا۔ سب نے کہا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر یہ حکم رعایتاً صادر ہوا ہے تو دھوکا اور اجتہاد ہے تو غلط ہے لہٰذا آپ پر شرعی فرض ہے کہ آپ ایک غلام آزاد کریں چنانچہ آپ نے اس مشورہ پر عمل کیا۔ اس واقعہ کو ابن ابی الحدید نے نقل کیا ہے۔ عمر کی خوف و دہشت کی ایسی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

نمبر(۷) قدامہ بن مظعون نے شراب پی تو انھیں پکڑ کر حضرت عمر کے پاس لایا گیا، انھوں نے اس پر حد جاری کرنے کا قصد کیا۔ قدامہ نے کہا کہ

یہ قرآن کے حکم کے خلاف ہے کیونکہ اس میں ہے کہ ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے کھانے پینے پر کوئی بندش نہیں، میں مومن، متقی اور مجاہد ہوں۔ یہ سن کر حضرت عمر خاموش ہو گئے اور لوگوں سے مشورہ کرنے لگے۔ ابن عباس نے حرمت شراب کی آیت سے استدلال کیا اور کہا کہ کیا حرام کام کا انجام دینے والا شخص بھی متقی و پرہیزگار ہو سکتا ہے؟ اس پر حضرت عمر نے استفسار کیا اور انسی کوڑوں کی سزا دی۔ اس واقعہ کو حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے۔

نمبر(۸) ایک عورت کو انصار کے ایک نوجوان سے عشق ہو گیا۔ اس نے اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے اس نوجوان کو اپنی گرفت میں لینا چاہا لیکن وہ کسی طرح رضامند نہ ہوا تو وہ عورت انتقام پر اتر آئی اور اس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ انڈے کی سفیدی نکال کر اپنی شرمگاہ اور اس سے ملحق لباس پر مل لی اور اسی حالت میں عمر کے پاس جا کر یہ فریاد کی کہ فلاں شخص نے میری آبرو ریزی کی ہے۔ حضرت عمر نے اس نوجوان کو فوراً طلب کیا اور اس پر حد جاری کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ مجھے سزا دینے سے پہلے تفتیش کیوں نہیں کرتے کہ اس عورت کے بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ اس معاملے کے پیچ و خم کو سمجھنا حضرت عمر کے فہم و ادراک سے باہر تھا اس لیے یہ مسئلہ حضرت علیؑ کے سامنے رکھا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس عورت کے لباس کو گرم پانی میں ڈال دیا جائے، چنانچہ اس کا لباس گرم پانی میں ڈالا گیا اور انڈے کی سفیدی اس کے لباس پر منجمد ہو گئی اور اس کی بدبو سے یہ آشکار ہو گیا کہ یہ انڈا ہے۔ تنبیہ پر اس عورت نے خود بھی اپنی اس حرکت کا اعتراف کر لیا اور وہ نوجوان عمر کی تازیانوں سے بچ گیا۔ اس واقعہ کو بھی ابن قیم نے الطرق الحکمیہ کے صفحہ ۴۸ پر مرقوم کیا ہے۔

نمبر (۹) ابن قیم نے اپنی کتاب میں یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ دو آدمیوں نے سو دینار ایک عورت کے پاس بطور امانت اس شرط کے ساتھ رکھے کہ وہ کسی ایک شخص کو تنہا واپس نہ کرے جب تک دوسرا شخص بھی موجود نہ ہو۔ ایک سال کے بعد ان میں سے ایک شخص آیا اور دوسرے شخص کی موت کا بہانہ کر کے وہ رقم اس عورت سے طلب کی۔ عورت نے شرط کی بنا پر انکار کیا لیکن اس شخص نے مختلف وسائل و ذرائع استعمال کر کے وہ رقم حاصل کر لی۔ دوسرے سال اس کا دوسرا ساتھی آیا اور اس نے بھی اپنی رقم کا مطالبہ کیا، عورت نے اس سے گزشتہ سال کا سارا واقعہ بیان کر دیا۔ اس شخص نے حضرت عمر کے روبرو فیصلہ کے لیے اس معاملہ کو رکھا، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ عورت نے کہا کہ مجھے حضرت علیؑ کے پاس جانے دو اس کا فیصلہ وہی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مسئلہ وہاں پہنچا، حضرتؑ نے فرمایا کہ تیری یہی تو شرط تھی کہ مال تنہا واپس نہیں لے گا۔ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اپنے ساتھی کو لے آ اور اپنا مال واپس لے لے۔ وہ شخص اپنا سا منھ لے کر رہ گیا۔

تاریخ کے دامن میں اس قسم کے بے شمار واقعات موجود ہیں جن سے عمری جہالت اور علوی فراست کا پتہ چلتا ہے۔

(پانچواں باب)

شوریٰ، وفات، ازواج اور اولادیں

مجلسِ شوریٰ کی تشکیل اور اس کا لائحہ عمل

مغیرہ بن شعبہ کے پارسی غلام حضرت فیروز (ابولولو) کے آبدار اور تیز و تند خنجر نے جب حضرت عمر کے شکمی نہاں خانے کی تلاشی لی اور اس نتیجہ میں رونما ہونے والے کاری زخموں کی گہرائی نے آپ کو یقین دلایا کہ اب زندگی کا چراغ گل ہونے والا ہے تو آپ نے اپنے بعد کے خلیفہ کے لیے ایک مجلس شوریٰ تشکیل دی اور اس میں حضرت علیؑ ابن ابی طالب، حضرت عثمان بن عفان، عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن عوام، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبیداللہ کو نامزد کر کے ان پر یہ پابندی عائد کر دی کہ میرے مرنے کے بعد یہ لوگ تین دن کے اندر اپنے میں سے ایک کو خلیفہ چن لیں اور ان تین دنوں میں امامِ جماعت کا منصب صہیب کے سپرد رہے گا۔

اس کے بعد ارکانِ شوریٰ کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کیے۔ فرمایا کہ طلحہ زن مرید اور غرور کا پتلا ہے، اگر وہ خلیفہ ہوا تو خلافت کی انگوٹھی اپنی بیوی کو پہنا دے گا۔ سعد ایک درشت خو اور تند مزاج انسان ہے۔ زبیر غصہ کی حالت میں ہو تو کافر ہے۔ عبدالرحمٰن امت کا فرعون ہے۔ عثمان قبیلہ پرست اور کنبہ پرور ہیں انھیں اپنے قبیلے والوں کے علاوہ دوسرا

کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ اب باقی رہے علیؑ، وہ اگر خلیفہ ہوئے تو خلافت کو صحیح راستے پر لے جائیں گے جو ہمیں منظور نہیں۔

اس اعتراف کا تقاضہ تو یہ تھا کہ آپ مجلس شوریٰ کی تشکیل کے بجائے اپنے اختیارات خصوصی سے کسی ایک شخص کو اپنی مرضی کے مطابق خلیفہ نامزد کر دیتے جیسا کہ حضرت ابوبکر نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن اعتراف کے باوجود آپ نے شوریٰ کی تشکیل اس لیے ضروری سمجھی کہ اس تشکیل میں بھی آپ کے مقصد کی تکمیل مضمر تھی اور اس کے ارکان، طریقۂ انتخاب، طریقۂ کار اور لائحہ عمل میں وہ تمام اسباب پنہاں تھے جن کے ذریعہ خلافت کا رُخ اسی طرف مڑ رہا تھا جدھر آپ موڑنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اس مجلس شوریٰ کی تشکیل اور حکمت عملی میں حضرت عثمان کی کامیابی کے تمام اسباب فراہم تھے کیونکہ عبدالرحمٰن بن عوف عثمان کا بہنوئی[1] تھا اور سعد بن ابی وقاص عبدالرحمٰن کا عزیز وہم قبیلہ تھا لہٰذا ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی عثمان کے خلاف تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تیسرے طلحہ تھے جو عبدالرحمٰن اور عثمان کی طرف اس لیے مائل تھے کہ وہ حضرت علیؑ سے منحرف تھے کیونکہ یہ تیمی تھے اور ابوبکر کے خلیفہ ہو جانے کی وجہ سے بنی تیم اور بنی ہاشم میں نزاع کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ باقی رہے زبیر، وہ بفرض محال حضرت علیؑ کا ساتھ بھی دیتے تو ان کی تنہا رائے کی اہمیت ہی کیا تھی؟

---

۱ حضرت عثمان کی والدہ اروی بنت کریز پہلے عقبہ بن ابی معیط کی زوجیت میں تھیں جن سے ایک لڑکی ام کلثوم ہوئی اور وہ عبدالرحمٰن کو بیاہی گئی۔

حضرت عمر کی حکمت عملی نے انتخاب کا جو طریقہ تجویز کیا تھا وہ یہ تھا کہ اگر فریقین میں رائے دہندگان کی تعداد نصف نصف ہو یعنی تین ایک طرف اور تین دوسری طرف ہوں تو ایسی صورت میں عبداللہ بن عمر کو ثالث بنایا جائے اور جس فریق کے متعلق وہ حکم دیں وہی فریق اپنے میں خلیفہ کا انتخاب کرے اور اگر لوگ اس پر رضامند نہ ہوں تو عبداللہ بن عمر اس فریق کا ساتھ دیں جس کی طرف عبدالرحمٰن ہوں۔ اور اگر دوسرے لوگ اس کی مخالفت کریں تو انھیں اس متفقہ فیصلہ کی خلاف ورزی کے جرم میں قتل کر دیا جائے[1]۔

آپ (عمر) نے ایک طرف تو یہ کیا اور دوسری طرف یہ کیا کہ عبداللہ کو اس امر کی تاکید کر دی کہ اختلاف کی صورت میں تم عبدالرحمٰن کا ساتھ دینا[2]۔

اس کے بعد آپ نے ابوطلحہ انصاری کو حکم دیا کہ وہ پچاس شمشیر زن سپاہیوں کو لے کر ان چھ افراد کے سروں پر مسلط ہو جائیں اور انھیں کسی دوسرے کام میں مشغول نہ ہونے دیں۔ صہیب کو حکم دیا کہ خود نماز جماعت پڑھائیں اور جماعت کو ایک گھر میں بند کر دیں اور تلواریں ان کے سروں پر لٹکا دیں۔ اور اگر تین دن میں فیصلہ نہ ہو سکے تو سب کی گردنیں اڑا دی جائیں اور معاملہ عام مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ جسے مناسب سمجھیں اپنا خلیفہ بنا لیں[3]۔

حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی دوررس نگاہوں نے حضرت

---

۱ طبری ج ۳ ص ۲۹۴ ۲ طبری ج ۳ ص ۲۶۵ ۳ طبری ج ۳ ص ۲۹۲، کامل ج ۳ ص ۳۴، شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۶۱

عمر کی اس حکمتِ عملی اور طریقۂ انتخاب کو قبل از وقت بھانپ لیا تھا کہ خلافت عثمان کی ہو گئی جیسا کہ آپ نے ابن عباس سے فرمایا:

"خلافت کا رخ ہم سے موڑ دیا گیا ہے۔ ابن عباس نے کہا یہ کیسے معلوم ہوا؟ فرمایا: میرے ساتھ عثمان کو بھی لگا دیا گیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اکثریت کا ساتھ دو اور اگر دو ایک پر اور دو ایک پر رضامند ہوں تو تم ان لوگوں کا ساتھ دو جن میں عبدالرحمٰن بن عوف ہیں چنانچہ سعد اپنے چچیرے بھائی عبدالرحمٰن کا ساتھ دے گا اور عبدالرحمٰن تو عثمان کا بہنوئی ہوتا ہی ہے۔"[1]

بہرکیف حضرت عمر کی وفات کے بعد حضرت عائشہ کے حجرہ میں یہ اجتماع ہوا اور دروازہ پر ابوطلحہ انصاری پچاس شمشیر بکف آدمیوں کے ساتھ آکر کھڑا ہو گیا۔ کارروائی کی ابتدا طلحہ نے کی اور اس نے کہا کہ گواہ رہنا، میں اپنا حق رائے دہندگی عثمان کے حوالے کرتا ہوں، اس پر زبیر نے اپنا حق رائے دہندگی حضرت علیؑ کو سونپ دیا۔ پھر سعد نے اپنی رائے عبدالرحمٰن کے حوالے کر دی، اب ارکانِ شوریٰ میں صرف حضرت علیؑ، عثمان اور عبدالرحمٰن رہ گئے۔ عبدالرحمٰن نے کہا کہ میں اس شرط پر اپنے حق سے دست بردار ہونے کو تیار ہوں کہ آپ دونوں (حضرت علیؑ اور عثمان) اپنے میں سے ایک کے انتخاب کا حق مجھے سونپ دیں یا آپ دونوں میں سے کوئی ایک دست بردار ہو کر یہ حق مجھ سے لے لے۔ یہ ایک ایسا جال تھا جس میں حضرت علیؑ بن ابی طالب کو ہر طرف سے جکڑ لیا گیا تھا۔ آپ یا تو دستبردار

[1] طبری ج ۳ ص ۲۹۴

ہو جاتے یا پھر عبدالرحمٰن کو اپنی من مانی کرنے دیتے۔ پہلی صورت آپ کے لیے ممکن ہی نہ تھی کہ حق سے دست بردار ہو کر آپ خود عثمان یا عبدالرحمٰن کو منتخب کرتے اس لیے آپ جمے رہے اور عبدالرحمٰن نے اپنے کو اس سے علیحدہ کر کے یہ اختیار سنبھال لیا اور حضرت علیؑ سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں اس شرط پر آپ کی بیعت کرتا ہوں کہ آپ کتابِ خدا، سنت رسولؐ اور سیرتِ شیخین پر عمل پیرا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں سیرت شیخین (ابوبکر اور عمر کی سیرت) پر عمل نہیں کروں گا بلکہ کتابِ خدا اور سنت رسولؐ کے ساتھ اپنے مسلک پر چلوں گا۔ تین مرتبہ دریافت کرنے کے بعد جب امیرالمومنین حضرت علیؑ کی طرف سے یہی جواب ملا تو حضرت عثمان کے سامنے بھی یہی شرطیں رکھی گئیں، ان کے لیے انکار کی کوئی وجہ نہ تھی۔ انھوں نے عبدالرحمٰن کی شرطوں کو مان لیا اور ان کی بیعت ہو گئی۔

اس طرح حضرت عمر کی سیاسی حکمتِ عملی اور غلط طریقۂ کار نے خلافت کی باگ ڈور بنی امیہ کی ایک ایسی فرد کے ہاتھوں میں سونپ دی جس کی کنبہ پروری نے اسلام کا بیڑا ہی غرق کر دیا۔

حضرت عمر کی وفات

مغیرہ بن شعبہ[1] کے پارسی غلام فیروز (ابولولو) نے مدینہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس کا پیشہ نجاری، نقاشی اور آہن گری تھا۔ ایک دن وہ

[1] مغیرہ بن شعبہ معاویہ کی طرف سے کوفہ کا گورنر اور ایک بدکردار صحابی تھا اور اسی نے معاویہ کو یزید کی ولی عہدی کا مشورہ دیا تھا۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اس امر کی شکایت کی کہ میرے آقا نے مجھ پر زیادہ ٹیکس لگا رکھا ہے، آپ اسے کم کرا دیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا ٹیکس کتنا ہے؟ کہا دو درہم روزانہ۔ پوچھا تیرا پیشہ کیا ہے؟ کہا، نجاری، نقاشی اور آہن گری۔ فرمایا: ان صنعتوں کے مقابلہ میں یہ ٹیکس زیادہ نہیں ہے۔ اس پر فیروز دل ہی دل میں سخت ناراض ہوا اور چلا آیا۔ اس کے بعد ایک دن حضرت عمرؓ نے اسے پھر طلب کیا اور اس سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم ہوائی چکی بھی بنا لیتے ہو؟ اس نے کہا ہاں! بولے، پھر مجھے بھی ایک ایسی چکی بنا دو جو ہوا سے چلتی رہے۔ اس نے کہا میں آپ کے لیے ایسی چکی بناؤں گا جس کا چرچا مغرب تا مشرق ہر جگہ ہوتا رہے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا تو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ یہ نوجوان مجھے دھمکی دے کر گیا ہے۔[1]

دوسرے دن صبح کی نماز کے وقت مسجد میں ابو لولو نے اپنے تیز و تند دو دھاری خنجر سے حضرت عمرؓ پر چھ وار کیے جن میں سے ایک کاری وار زیر ناف لگا جس نے گردوں اور آنتوں کا پوسٹ مارٹم کر کے رکھ دیا۔ فوراً طبیب کو بلایا گیا اس نے آپ کو نبیذ[2] پلائی جو زخم کے راستے سے باہر نکل پڑی اور لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب جانبر نہیں ہو سکتے۔ یہ واقعہ ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ ہجری مطابق ۶۴۴ء کا ہے۔ تین دن بعد یکم محرم ۲۴ھ کو حضرت عمرؓ دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپ کی مدت خلافت دس برس چھ ماہ اور چار دن بتائی جاتی ہے۔

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۱۳۲۔۱۴۰ [2] نبیذ وہ شراب ہے جو خرما اور جو سے تیار کی جاتی ہے۔ (لغات کشوری ص ۷۶۹)

ازواج

سات عورتوں کا حضرت عمرؓ کی زوجیت میں آنا تاریخی اعتبار سے ثابت ہے۔ آپ کی پہلی بیوی کا نام زینب بنت مظعون تھا، دوسری بیوی قریبہ بنت ابی امیۃ المخزومی اور تیسری بیوی ملیکہ بنت جرول خزاعی تھیں جن کی کنیت ام کلثوم تھی۔ قریبہ کا تعلق قبیلۂ قریش اور ملیکہ کا تعلق قبیلۂ خزاعہ سے تھا لیکن ان دونوں بیویوں کو حضرت عمرؓ نے ۶ھ میں طلاق دے دی تھی۔ ۷ھ میں مدینہ آ کر حضرت عمرؓ نے عاصم بن ثابت کی صاحبزادی جمیلہ سے (جن کا اصل نام عاصیہ تھا) عقد کیا لیکن بد قسمتی سے وہ بھی طلاق کی زد میں آ گئیں۔ معلوم نہیں آپ بیویوں کو اس کثرت سے طلاق کیوں دیتے تھے؟ جب کہ مخصوص حالات کے بغیر نہ تو اسلام طلاق کا ہمنوا ہے اور نہ خدا و رسولؐ کی اس کو حمایت حاصل ہے۔

۱۲ھ میں آپ نے اپنی چچیری بہن عاتکہ بنت زید سے عقد کیا۔ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی ام حکیم تھیں جو حارث بن ہشام کی بیٹی تھیں اور ایک زوجہ کا نام فکیہہ یمنیہ تھا جن کے والدین اور نسب کے بارے میں پتہ نہیں چلتا۔

(ماخوذ از انسائیکلو پیڈیا آف اسلام)

اولادیں

آپ کی لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن ان میں حفصہ زیادہ مشہور و ممتاز ہیں جو اپنے سابق شوہر خنیس کے انتقال کے بعد رسولؐ کے عقد میں آئیں لیکن کچھ خاص وجوہات کی بنا پر حضرت رسولِ خداؐ نے انھیں طلاق

دے کر اپنے سے علٰحدہ کر دیا تھا۔ حفصہ اور عبداللہ دونوں حقیقی بھائی بہن اور زینب بنت مظعون کے بطن سے تھے باقی مختلف بیویوں سے چھ اولادیں اور بھی تھیں جن کے نام بالترتیب عبیداللہ، عاصم، ابو شحمہ، عبدالرحمٰن، زید اور مجیر کتابوں میں مرقوم ملتے ہیں۔

عبداللہ فقہ اور حدیث کے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ عبیداللہ اپنے باپ کی طرح پہلوانی کی طرف رجوع تھے، ابو شحمہ کو شراب پینے کی لت تھی جس کی پاداش میں حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں اپنے ہاتھ سے اسّی کوڑے بھی لگائے تھے، باقی اولادوں کا مشغلہ کیا تھا؟ اللہ جانے!

چھٹا باب

حضرت عثمان بن عفان

نام و نسب

آپ کا نام عثمان اور کنیت ابو عبداللہ و ابو عمر تھی، القاب میں غنی اور ذوالنورین بنی امیہ کا عطیہ ہیں۔ نعثل کا خطاب ام المومنین عائشہ نے مرحمت فرمایا۔

آپ کے والد کا نام عفان بن ابو العاص بن امیہ اور والدہ کا نام اروٰی بنت کریز بن ربیعہ بن حبیب بن عبدالشمس تھا۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کا نسبی سلسلہ پانچویں پشت میں حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسلک ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بات اس لیے قرینِ قیاس نہیں ہے کہ آپ کا خاندانی تعلق براہِ راست بنی امیہ سے ہے اور اموی خاندان کا بانی امیہ عبدالشمس کا بیٹا نہیں بلکہ ایک رومی غلام تھا اور اس کا اصل نام ذکوان تھا۔ ولدیت نامعلوم ہونے اور پست، حقیر و کمتر ہونے کی وجہ سے لوگ اسے امیہ[1] کہہ کر پکارتے تھے چنانچہ وہ اسی نام سے مشہور ہو گیا اور اسی نام کی نسبت سے اس کی اولاد بنی امیہ کہلائی۔ جیسا کہ

---

[1] امیہ کے معنی چھوٹی لونڈی کے ہیں۔

علامہ ابن حجر عسقلانی نے تحریر فرمایا ہے:

"جب ثعلب معاویہ کے دربار میں پہنچے تو انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ تم لوگ جھوٹا دعوٰی کرتے ہو کہ امیہ عبدالشمس کا بیٹا تھا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ذکوان نامی عبدالشمس کا غلام تھا، جسے پست اور حقیر سمجھ کر لوگ امیہ کہتے تھے۔"[1]

ثعلب کے اس قول کی تصدیق شریک بن عوز اور معاویہ کے مابین ہونے والے مناظرہ سے بھی ہوتی ہے۔[2] اور یہی حضرت دغفل (صحابئ رسولؐ) اور معاویہ کے مکالمہ میں بھی ہے، جسے یہاں نقل کر دینا مناسب ہے۔

معاویہ: کیا آپ نے عبدالمطلب کو دیکھا ہے؟

دغفل: ہاں! وہ بہت لحیم شحیم اور بہادر تھے اور انھیں ان کے فرزندان ستاروں کے مانند گھیرے رہتے تھے۔

معاویہ: کیا آپ نے امیہ کو بھی دیکھا ہے؟

دغفل: ہاں! وہ پستہ قد، کرنجا، چندھا اور انتہائی بدشکل ہونے کے ساتھ ساتھ عبدالشمس کا غلام بھی تھا۔

معاویہ: نہیں، وہ عبدالشمس کا بیٹا تھا۔

دغفل: تم لوگ یہی کہتے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ عبدالشمس کا غلام تھا، اس کا اصل نام ذکوان تھا اور اسی کو امیہ کہتے ہیں۔[3]

حسان بن ثابت نے بھی امیہ کو عبدالشمس کی اولاد تسلیم نہیں کیا۔ اور بنی امیہ

---

[1] اصابہ ج ا ص ۵:۶ [2] ثمرۃ الاوراق ص ۴۵ [3] روضۃ الانف سہیلی ص ۴۵ [4] دیوان حسان ص ۹۱

کے بارے میں روضۃ المناظر میں ہے کہ شجرۂ ملعونہ فی القرآن سے مراد بنی امیہ ہیں۔[1] فتح الباری میں ہے کہ بنی امیہ کی زناکار عورتیں اپنے گھروں پر "رایتِ زنا" لہراتی تھیں۔[2]

بہرحال ان تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ امیہ عبدالشمس کا بیٹا نہیں تھا بلکہ وہ ایک مجہول النسب غلام تھا۔ ایسی صورت میں حضرت عثمان رسول اکرمؐ کے سلسلۂ نسب میں کیونکر شمار کیے جا سکتے ہیں؛ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک پست، حقیر اور ذلیل خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔

عثمانی خانوادہ

حضرت عثمان کے باپ عفان بن العاص سے اپنا دل بہلانے کے لیے لوگ مخنث کا کام لیا کرتے تھے۔[3] سوتیلا باپ عقبہ ابن معیط[4] شراب خانہ چلاتا تھا۔ آپ کی بہن آمنہ مشاطہ گری کرتی تھی، بہنوئی حکم بن کنان قبیلۂ بنی مخزوم کا حجام تھا، چچا حکم بن العاص جانوروں کو بدھیا (خصی) کیا کرتا تھا اور نانا عامر بن کریز قصائی تھا۔[5]

---

[1] روضۃ المناظر برحاشیہ کامل ج ۱ ص ۸۵ [2] فتح الباری ج ۵ ص ۶۵

[3] خلفائے ثلاثہ حصہ سوم ص ۱۰ بحوالہ مثالب بنی امیہ [4] امیہ نے اپنی بیوی اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے عمر کو بیاہ دی تھی جس سے ابومعیط پیدا ہوا۔

[5] اصابہ فی معرفت الصحابہ ج ۱ ص ۱۴، ۷ حیواۃ الحیوان دمیری از کمال الدین حصہ اوّل ص ۱۹۶ مطبوعہ مصر ۱۳۵۳ھ

اروٰی بنت کریز

اروٰی بنت کریز آپ کی والدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ولید بن عقبہ کی والدہ بھی تھیں اور یہ ولید وہی ہے جسے فاسق و فاجر قرار دیا گیا تھا لیکن آپ نے اسے کوفہ کی گورنری کا عہدہ عطا کیا۔ اسی ولید کی پستی کے بارے میں مسعودی کا بیان ہے کہ ولید دوسروں پر الزام تراشی کیا کرتا تھا چنانچہ ایک بار اس سے جناب عقیل ابن ابوطالب نے فرمایا کہ تو دوسروں پر الزام تراشی کے بجائے اپنے کو کیوں نہیں دیکھتا کہ تو خود کیا ہے؟ تو اہلِ صفوریہ کا لدّو گدھا ہے[1]۔ اسی طرح حضرت امام حسن علیہ السلام نے ایک موقع پر فرمایا، تو ایک صفوریہ والے کا نطفہ ہے[2]۔

معلوم ہوا کہ ولید صفوریہ کے کسی یہودی کا نطفہ تھا اور چونکہ عثمان کی ماں اروٰی اس زمانے میں عقبہ بن ابی معیط کی بیوی تھیں اس لیے ولید عقبہ کی طرف منسوب ہو گیا۔ یہ بات قرین قیاس اس لیے ہے کہ دورِ جاہلیت میں زنا کاری کا مشغلہ عام تھا اور خصوصی طور پر بنی امیہ کا یہ طرۂ امتیاز تھا لہٰذا حضرت عثمان کی والدہ کا عقبہ کی زوجیت میں رہ کر زنا کاری کے ذریعہ حرامی اولاد پیدا کرنا تعجب خیز نہیں ہے۔

حضرت عثمان کا خاندانی پس منظر یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ بدری اور

عہ صفوریہ ایک گاؤں کا نام ہے جو طبریہ میں اردن کا علاقہ ہے جہاں ولید کے یہودی آباء و اجداد آباد تھے۔

[1] مروج الذہب حصہ دوم اردو ص ۲۷۲ [2] مقتل حسین خوارزمی ج۱ ص ۱۱۹

مادری دونوں سلسلوں سے مجہول النسب ہیں۔ دوسرے ان کے نام عثمان سے بھی نسب کی خرابی کا پتہ چلتا ہے۔ اس لیے کہ "عثمان" کا مادہ "عثم" ہے اور تاج العروس شرح قاموس ج۸ ص ۳۱۸ کے مطابق ٹوٹی ہوئی ہڈی کا جوڑ صحیح نہ بیٹھ کر ٹیڑھے رہنے کو عثم کہتے ہیں اور "الف و نون" اس میں نسبت کا ہے۔ چونکہ باپ مخنث (نامرد) تھا اور ماں فاحشہ، اس لیے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ حضرت عثمان اروٰی بنت کریز کی گود میں کیونکر پہنچے اور ابن عفان کیونکر بن گئے؟ شاید اسی لیے والدین نے نام بھی ایسا چھانٹ کر رکھا کہ نام عثمان سنتے ہی انسان ان کا بے جوڑ نسب سمجھ لے۔ اور اگر لفظ "عثم" سے قطع نظر کی جائے تو لفظ عثمان کے چند معانی اور بھی ہیں (۱) سانپ کا بچہ (۲) اژدہے کا بچہ (۳) سرخاب کا پٹھا۔ ان تینوں معانی سے بھی آدمیت نہیں پائی جاتی۔ اور چوں کہ قاتلانِ مومنین اور موذیانِ بانیٔ اسلام کی سفارشیں کر کر کے ان کی جانیں بچانا ان کا شعارِ خاص تھا اس لیے معانی اول و دوم پورے منطبق ہو گئے۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو ان کے سلسلۂ نسب مشہورہ کے دو، چار پشت کے نام ذلت و رسوائی کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً باپ کا نام عفان یعنی عفونت سے بھرا ہوا، دادا کا نام عاص یعنی گنہگار، پردادا کا نام امیہ یعنی ذلیل و کمینی کنیز اور سکڑ دادا کا نام عبد الشمس یعنی سورج کا بندہ یا سورج کا غلام۔

غرض کہ جیسے کہ حضرت ابوبکر و عمر شریف تھے کہ پہلے صاحب چڑیمار زادے اور دوسرے صاحب چرواہے زادے یا لکڑہارے زادے ویسے ہی آپ کے والد ماجد ڈفالی اور مخنث پیشہ شریف تھے اور جملہ مجہول و معیوب الانساب میں آپ کو یہ شرف حاصل ہے کہ باپ کے مجہول ہونے کے

علاوہ آپ کی ماں بھی مجہول الاسم تھیں۔

پیدائش

حضرت ابوبکر اور عمر کی طرح حضرت عثمان کی تاریخ پیدائش پر بھی پردے پڑے ہوئے ہیں اور یہ کوئی نہیں جانتا کہ آپ کس تاریخ کو اس دنیا میں وارد ہوئے۔ مورخین کا صرف یہ کہنا ہے کہ آپ واقعۂ فیل کے چھ برس بعد اور ہجرت نبوی سے ستائیس برس قبل پیدا ہوئے۔ یہ مسئلہ بھی اختلافی ہے کہ کہاں پیدا ہوئے؟ بعض کا خیال ہے کہ آپ کی جائے پیدائش طائف ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ ۵۷۶ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش اور سن پر تبصرہ کرتے ہوئے مصری مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے کیا ہی اچھی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"کوئی صاحب آپ کو ۶۳ برس ہی کا بتاتے ہیں محض اس خیال سے کہ حضرت عثمان کا شمار بھی ۶۳ برس کی عمر میں مرنے والوں میں ہو جائے اور ان کو رسول ﷺ کا ہم عمر بنا دیا جائے۔"[1]

حُلیہ

خوب صورت چہرہ پر چیچک کے بدنما داغ، بل کھائے ہوئے خمدار ابرو، ضرورت سے زیادہ اونچی اور ناموزوں ناک، عقابی آنکھیں، میانہ قد،

[1] "عثمان" ترجمہ الفتنۃ الکبریٰ ص ۶۸ مطبوعہ بمبئی

زردی لیے ہوئے گورا رنگ، نعثل[*] کی طرح گھنی اور لمبی داڑھی، دوش پر لہراتی ہوئی دراز زلفیں، سونے کے تاروں سے بندھے ہوئے بے ترتیب دانت، نرم و نازک جلد پر بالوں کی کثرت اور کمر کا نچلا حصہ بھاری۔[1]

یہ ہے عثمانی حلیہ جو مورخین کے قلم کا مرہون منت ہے۔

ابتدائی حالات

تاریخ ہمیشہ ان لوگوں کے ابتدائی حالات قلمبند کرتی ہے جنھوں نے ابتدا ہی میں اپنے صفات و کمالات کی بنا پر وقت اور تاریخ کے دھارے کو اپنی طرف موڑ لیا ہو یا کوئی شخص ملک و قوم کے لیے ایسی قربانیاں پیش کرے جو تاریخ کا جز بن جائیں، یا پھر کوئی شخص کسی اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ کر خود اپنے ابتدائی حالات کا تذکرہ کرے اور وہ اتنی ہمہ گیری و اہمیت کا حامل ہو کہ تاریخ خود بڑھ کر اس تذکرے کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے لیے مجبور ہو جائے مگر یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جب تذکرہ کرنے والا شخص خود اپنے ابتدائی حالات سے شرمندہ نہ ہو۔ اور شاید یہی وجہ ہے تاریخ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی طرح حضرت عثمان کے ابتدائی حالات کو مثبت انداز میں بیان کرنے سے قاصر ہے جیسا کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے تحریر کیا ہے کہ "حضرت عثمان کے ابتدائی حالات بعض دوسرے

[*] نعثل۔ قاموس میں نعثل کے معنی نر بجو اور بوڑھے احمق کے ہیں اور مدینہ میں ایک یہودی کا نام بھی نعثل تھا جس کی داڑھی بہت گھنی اور لمبی تھی۔

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷، طبری ج ۳ اور طبقات ابن سعد ج ۳

صحابہ کی طرح تاریخ کی گرفت سے باہر اور عہدِ جاہلیت کی تاریکی میں ہیں۔[۱] یا جیساکہ معین الدین ندوی نے تحریر فرمایا ہے کہ "بچپن اور سن رشد کے حالات پردۂ خفا میں ہیں"۔[۲] تاریخ کامل ابن اثیر میں خود حضرت عثمان کا یہ قول ہے کہ میں ایسے خاندان سے ہوں جو قلیل المعاش اور فقر و فاقہ کا گہوارہ تھا۔

تعلیم و تربیت اور پیشہ

حضرت عثمان کی تعلیم کیا تھی اور آپ کا معلم کون تھا؟ اس کے جواب میں تاریخ خاموش ہے۔ جیساکہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بھی لکھا ہے کہ حضرت عثمان کی تعلیم پر عہدِ جاہلیت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود بعض عثمان پرست سنی علماء کے قلم نے محض قیاس و قرائن کی بنیاد پر آپ کو پڑھا لکھا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جیساکہ معین الدین ندوی نے اپنی کتاب خلفائے راشدین میں تحریر فرمایا ہے کہ:

> "قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں (عثمان) نے عام عربوں کے خلاف اسی زمانہ میں کچھ پڑھنا لکھنا سیکھ لیا تھا"۔[۳]

آپ کی ابتدائی تربیت کن حالات میں ہوئی؟ اس سلسلہ میں بھی تاریخیں خاموش ہیں لیکن اس کا اندازہ اس لیے محال نہیں ہے کہ بقول عثمان ان کا خاندان ایک قلیل المعاش اور فاقہ کش خاندان تھا

---

[۱] عثمان ص ۶۷ مطبوعہ بمبئی [۲] و [۳] خلفائے راشدین ص ۱۸۴ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ

لہٰذا ایسے خاندان میں عمومی طور پر بچوں کی جو تربیت ہوتی ہے وہ ظاہر ہے یا پھر "عثمانی خانوادہ" کے عنوان سے آپ کے خاندانی افراد کے مشاغل کی جو تفصیل ہم اوپر تحریر کر چکے ہیں، اس سے ہر ذی فہم انسان اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتا ہے کہ آپ کی تربیت کیسی ہوگی؟

پیشہ کے بارے میں صرف اتنا ہی کافی ہوگا کہ آپ کی ذہنیت ابتدا ہی سے تاجرانہ تھی اور جب سن شعور کی منزل میں قدم رکھا تو تجارت کی طرف مائل ہوئے اور اپنی منافع خوری کی بدولت خوب دولت حاصل کی طبقات ابن سعد حصہ سوم میں ہے کہ آپ اپنا تجارتی مال نفع کی شرکت (مضاربت) پر لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ مسند احمد بن حنبل ج اول میں ہے کہ جب آپ مدینہ میں آئے تو وہاں کھجوریں بیچا کرتے تھے۔

پوشاک و خوراک

آپ کو شاید "زردی" زیادہ پسند تھی اس لیے آپ ہمیشہ گہرے زرد رنگ کی پوشاک اپنے لیے منتخب کیا کرتے تھے۔ تہ بند، کرتا، پگڑی اور موزہ سب زرد۔ کبھی کبھی آپ کے جسم پر شوخ و سرخ لباس بھی نظر آتا تھا اور کبھی کبھی اپنی بیوی (نائلہ) کی یمنی چادر اوڑھ کر برآمد ہوتے تھے جس کی قیمت تقریباً دو سو درہم بتائی جاتی ہے

کھانے اور "پینے" کے بھی بے حد شوقین تھے۔ گھی، دودھ، انڈا، اور طیور و دنبوں کا گوشت آپ کی مرغوب غذا تھی۔

عثمانی اسلام | حضرت ابو بکر اور عمر کے مشرف بہ اسلام ہونے کی

جو وجوہات تھیں انھیں تفصیل کے ساتھ ہم الخلفاء حصہ اول میں تحریر کر چکے ہیں، تقریباً یہی صورت عثمانی اسلام کی بھی ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اقتدار کی ہمہ گیری نے آپ کو اپنی طرف متوجہ کیا اور آپ کے اس اقدام میں ابو بکر کا مشورہ بھی شامل ہے جیسا کہ عبدالحئی فاروقی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ آپ کے تعلقات ایام جاہلیت میں حضرت ابوبکر سے دوستانہ تھے، ایک روز (آپ) حضرت ابوبکر سے ملنے آئے تو اسلام کی بابت گفتگو ہوئی اور آپ نے قبول اسلام کی آمادگی ظاہر کی۔ اور خلفائے راشدین میں یہ عبارت مرقوم ہے کہ:

"ایام جاہلیت میں ابوبکر وعمر سے آپ کا ارتباط تھا اور آپس میں اکثر مخلصانہ صحبت رہتی تھی۔ ایک روز جب آپ ابوبکر کے پاس آئے اور اسلام کے متعلق گفتگو شروع ہوئی تو آپ اسلام قبول کرنے پر رضامند ہو گئے۔"[1]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب الفتنۃ الکبریٰ کے اردو ترجمہ "عثمان" سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ آپ کی خالہ سعدی نے نبی کریم صلعم سے متعلق آپ سے کچھ باتیں کیں اور آپ کو (اسلام کی) رغبت دلائی۔ یہ کاہنہ تھیں اور غیب کی باتیں بتاتی تھیں۔[2]

معلوم ہوا کہ حضرت عثمان برضا و رغبت اپنی خوشی سے اسلام کی طرف مائل نہیں ہوئے بلکہ آپ کی کاہنہ خالہ سعدی کی پیشین گوئی نے آپ کی ہوس آمیز فطرت کو ابھارا۔ دولت و اقتدار کی خواہش نے مستقبل کا

۱ خلفائے راشدین ص ۱۸۴ ۲ عثمان ص ۶۹

آئینہ دکھایا اور ابوبکر و عمر کے سفاکانہ مشوروں نے مجبور کیا تو آپ نے اسلامی قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیا تاکہ ثلاثہ پلان کے تحت ایک دوسرے کے مفاد کی تکمیل ممکن ہو سکے۔

کفار مکہ کا ریلا اور آپ کی ہجرت

دائرۂ اسلام میں قدم رکھتے ہی کفار مکہ نے آپ کو ایسا ریلا دیا کہ آپ کے حواس باختہ ہو گئے۔ اسلام لانے کی پاداش میں آپ کے چچا حکم بن ابی العاص نے آپ کو ایک مکان میں قید کر دیا تھا لیکن آپ کسی طرح نکل بھاگے۔

کفار کی بڑھتی ہوئی یورش اور مسلمانوں کے درمیان سر اٹھاتی ہوئی سراسیمگی کو دیکھ کر پیغمبر اسلامؐ نے کچھ لوگوں کے ساتھ آپ کو بھی حبشہ کی طرف مہاجرت کا حکم دیا اور اسی حکم کے تحت آپ کفار مکہ سے بچ کر بعثت نبوی کے پانچویں سال ماہ رجب میں حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ اس وقت حبشہ پر عیسائیوں کا تصرف تھا اور اس کا بادشاہ نجاشی تھا جس کا اصل نام اصحمہ بن بحری تھا۔

آپ کا قافلہ ۱۱ مردوں اور ۴ عورتوں پر مشتمل تھا۔ مردوں میں آپ کے علاوہ زبیر بن عوام، عبداللہ بن مسعود، عبدالرحمٰن بن عوف، مصعب بن عمیر، ابوسلمہ بن عبدالاسد، عثمان بن مظعون، عامر بن ربیعہ، سہیل بن بیضا، حاطب بن عمرو، ابو حذیفہ بن عتبہ شامل تھے۔ اور عورتوں میں آپ کی زوجہ رقیہ کے علاوہ ابوسلمہ کی بیوی ام سلمہ، عامر کی زوجہ لیلیٰ اور ابو حذیفہ

کی بیوی سہیلہ کے نام کتب تواریخ میں درج ہیں[1]۔ طبری کے یہاں ان پندرہ ناموں کے علاوہ ابوسبرہ بن ابی رہم کے نام کا اضافہ ملتا ہے۔

حضرت عثمان نے شعبان اور رمضان کا مہینہ حبشہ میں گزارا اور جب ان تک یہ افواہ پہنچی کہ کفار قریش مسلمان ہو گئے ہیں تو وہ ماہ شوال میں حبشہ سے واپس آ گئے۔ مگر مکہ کے قریب آکر جب ان پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کفار پہلے سے بھی زیادہ دشمنی پر آمادہ ہو گئے ہیں تو وہ دشمنوں سے بچنے کے لیے مخفی طور پر ایسی جگہ سکونت پذیر ہوئے جہاں انھیں پناہ مل سکتی تھی[2]۔

مواخاۃ

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور پانچ یا آٹھ ماہ کے بعد وہاں کے لوگ مسلمان ہوئے تو آپ نے انصار و مہاجرین کے درمیان رشتۂ اخوت قائم کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مہاجرین مکہ پر افسردگی طاری ہو گئی تھی وہ اس آب و ہوا کے عادی نہ تھے۔ بہت سے لوگ بیمار پڑ گئے اور بیماری، کمزوری اور ناتوانی میں انھیں اپنے آبائی وطن مکہ کی یاد ستانے لگی۔

چنانچہ آنحضرتؐ نے ان کے آرام و تسلی کا خیال کرتے ہوئے انصار و مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ (عقد مواخات) قائم کیا۔ اس مواخات

[1] ابوالفدا ج۱ ص ۱۸۸۔ ابن سحنہ جلد اول ص ۱۳۴، ثمرۃ الاوراق ج۱ ص ۱۰۸

[2] (دیکھیے) روضۃ الاحباب، تاریخ طبری اور تاریخ الخمیس

کے ذریعہ حضرت ابوبکر خارجہ بن زید کے، حضرت عمر عتبان بن مالک کے بھائی قرار پائے۔ اور جب تمام مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ قائم ہو چکا تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ میں تو یوں ہی رہ گیا، اس پر آنحضرت نے یہ فرمایا کہ اے علیؑ! تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی وصی اور جانشین ہو۔

واضح رہے کہ ہجرت سے قبل مکہ میں بھی ایک بار رسول اکرمؐ نے مواخات قائم کیا تھا اور اس مواخات میں ابوبکر و عمر، عثمان و عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہ و زبیر میں بھائی چارے کی داغ بیل پڑی تھی، اس وقت بھی آنحضرت نے حضرت علیؑ کے بارے میں یہی فرمایا تھا کہ یا علیؑ! میرے بھائی تم ہو۔

غزوات میں عثمانی حصہ

قتال و جہاد کے ذیل میں یہ تجزیہ ضروری ہے کہ "ثلاثہ کمیٹی" کے آخری رکن حضرت عثمان نے دورِ رسالت کے اسلامی غزوات میں کیا حصہ لیا؟ جب کہ جہاد کے بارے میں قرآنی ارشادات حسب ذیل ہیں:

"مسلمانو! خدا کی راہ میں جہاد کرو اور یہ جان لو کہ خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔" (بقرہ آیت ۲۴۴)

"کیوں قتال نہیں کرتے تم اس قوم سے جس نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور رسولؐ کو نکالنے کا تہیہ کر لیا۔ اور پھر اسی قوم کے لوگوں نے تم سے (پہلے پہل) چھیڑ کی۔ کیا تم لوگ ان سے ڈرتے ہو؟ بس اگر تم مومن ہو تو خدا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔"

(توبہ آیت ۱۳ و ۱۴)

"جب تمھیں حکم دیا جائے تو فوراً چل پڑو اور اپنی جانوں اور

اپنے مالوں سے خدا کی راہ میں جہاد کرو اگر تم کچھ جانتے ہو تو سمجھ لو کہ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔" (توبہ آیت ۴۱)

"ایمان والو! جب تم میدان میں کفار سے لڑو تو ان کی طرف ہرگز ہرگز پیٹھ نہ پھیرو ...... اور جو شخص بھی اس دن کفار کی طرف پیٹھ پھیرے گا تو وہ (سمجھ لے کہ) خدا کے غضب میں آگیا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے جو (یقیناً) برا ٹھکانہ ہے۔" (انفال آیت ۱۶)

ظاہر ہے کہ ان احکامات الٰہیہ کے خلاف عمل کرنے والا شخص اللہ، رسولؐ اور اسلام کی نظروں میں کافر قرار پائے گا لیکن اس کے باوجود تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان نہ صرف بعض اسلامی غزوات سے کنارہ کش رہے بلکہ فرار بھی اختیار کرتے رہے۔ حضرت عثمان تو ایک اہم معرکہ میں اپنے پیش رو صحابہ (ابوبکر و عمر) سے بھاگنے میں چار قدم آگے نکل گئے اور آتش کارزار سرد ہونے کے بعد تیسرے دن واپس پلٹے۔[1] اس کا اجمالی تذکرہ آگے ہوگا، فی الحال ابتداً ہم پہلی اسلامی جنگ سے کریں گے تاکہ ساری حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔

جنگِ بدر

یہ جنگ اسلام اور کفر کے درمیان پہلی جنگ ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اگر ایک طرف سے پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ تمام صحابہ موجود تھے تو دوسری طرف کفار کے لشکر میں تمام سردارانِ قریش شامل تھے۔

---

[1] شرح تجرید علامہ قوشجی ص ۳۸۷

یہ جنگ سنہ ۲ھ میں مدینہ سے ۸۰ میل کی دوری پر واقع بدر نامی ایک گاؤں کے قریب لڑی گئی اور اس جنگ میں معرکہ آرائی کے لیے لشکر اسلام کل ۳۱۳ مجاہدین پر مشتمل تھا جن کے پاس صرف دو عدد گھوڑے تھے۔ اس کے برعکس کفار کا لشکر ایک ہزار جنگ جو اور خونخوار سپاہیوں پر مبنی تھا جس میں قریش کے آزمودہ کار جرنیل بھی شامل تھے اور سو گھوڑوں کا ایک رسالہ بھی۔ ظاہر ہے کہ کفار کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھی لہٰذا ایسی صورت میں اسلام کے جانباز سپاہی اگر جذبۂ سرفروشی اور قوت ایمانی کا مظاہرہ نہ کرتے تو اس جنگ میں اسلام شکست سے بھی دوچار ہو سکتا تھا لیکن چونکہ تائیدِ الٰہی شامل تھی اس لیے مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور اس فتح کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مدینہ اور اس کے اطراف کے یہودیوں نیز قرب و جوار کے قبائل پر مسلمانوں کی دھاک جم گئی۔

یقیناً یہ غزوہ بڑی اہمیت کا حامل تھا اور اس میں جن صحابۂ کرام نے حصہ لیا تھا انھیں آج "بدری صحابہ" کے نام سے یاد کیا جاتا اور عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے لیکن حضرت عثمان اس شرف سے محروم ہیں۔ تاویلاً اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی رقیہ کی علالت اور بیماری کی وجہ سے رسولؐ اللہ کے حکم کے مطابق رُک گئے تھے۔ مگر میرے خیال سے یہ غلط ہے اور محض حضرت عثمان کی حمایت میں یہ روایت وضع کی گئی ہے۔ ورنہ حقیقت سے قریب تر اور قرینِ قیاس بات یہ ہو سکتی ہے کہ اس جنگ میں خاندانِ بنی امیہ کی کچھ ایسی سربرآوردہ اور سرکش شخصیتیں پیغمبرؐ اسلام کے مقابلہ میں صف آرا تھیں

جن سے حضرت عثمان کا خونی رشتہ بھی تھا اور نزدیکی قرابت داری بھی، لہٰذا عثمان کا ان شخصیتوں کے مقابلہ میں آمادۂ پیکار ہونا غیر ممکن تھا۔ اس لیے بہانہ تراش کر کنارہ کش ہو گئے ہوں گے۔

بہرحال تاریخی اعتبار سے یہ بات مسلم ہے کہ آپ اس جنگ میں شریک نہیں تھے۔ اب قرآنی احکامات کی رو سے حضرت عثمان خدا، رسولؐ اور اسلام کی نظر میں کیا ہیں؟ قارئین کرام خود فیصلہ کرلیں۔

جنگِ احد

یہ جنگ ماہ شوال ۳ھ میں واقع ہوئی۔ اپنے مقتولین کے انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے بدر کے شکست خوردہ قریش تین ہزار کی ایک جمعیت لے کر پوری توانائی، قوت اور غیظ و غضب کے ساتھ مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ ان سے مقابلہ کے لیے ایک سو زرہ پوشوں کے ہمراہ سات سو مسلمانوں کا دفاعی لشکر صف بستہ ہوا اور معرکۂ کارزار احد کے دامن میں گرم ہونے لگا اور رفتہ رفتہ گھمسان کی جنگ میں تبدیل ہو گیا۔

مورخین کا بیان ہے کہ حضرت حمزہ اور حضرت علی صفوں کو چیرتے ہوئے دشمنوں کے درمیان گھس جاتے اور لاشوں کے ڈھیر لگا دیتے یہاں تک کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور مسلمان مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ پیغمبرؐ اسلام نے احد کی پشت پر تیراندازوں کا ایک دستہ اس تاکید کے ساتھ تعینات کیا تھا کہ مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست لیکن یہ دستہ اپنی جگہ نہ چھوڑے مگر اس دستہ نے جب اپنے ساتھیوں کو مالِ غنیمت لوٹتے دیکھا تو اس نے بھی حکم رسولؐ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی اور وہ بھی

مالِ غنیمت کی طرف متوجہ ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موقع پا کر خالد بن ولید اسی سمت سے عبداللہ ابن جبیر اور اس کے چند ساتھیوں کو تہِ تیغ کرتا ہوا مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا اور ادھر سے مشرکین جن کے قدم کچھ دیر پہلے اکھڑ چکے تھے واپس آ گئے۔ نتیجتاً مسلمانوں کی فتح و کامرانی نامرادی و ناامیدی میں ڈھل گئی۔ یکایک یہ خبر بھی پھیلی کہ رسول اللہؐ شہید کر دیے گئے۔ پھر کیا تھا، میدان میں بھگدڑ پڑ گئی۔ بڑے بڑے نامی گرامی صحابہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر کے ساتھ عثمان بھی بھاگے اور اتنی دور نکل گئے کہ تین دن بعد پلٹ کر آئے۔ طبری نے تحریر کیا ہے کہ

"عثمان بن عفان اور انصار کے دو آدمی عقبہ و سعد بن عثمان نے فرار کیا تو جلعب[1] پہنچ گئے اور وہاں تین دن قیام کیا۔ جب واپس پلٹے تو ان کا بیان ہے کہ رسولؐ خدا نے کہا کہ تم لوگ تو بڑے لمبے گئے۔"

شاہ عبدالحق محدث دہلوی کا کہنا ہے کہ کچھ لوگوں نے شہر (مدینہ) جا کر قرار لیا اور عثمان بن عفان انھیں لوگوں میں تھے جو جنگ کا مرحلہ ختم ہونے اور آتش کارزار سرد ہونے کے بعد رسولؐ کی خدمت میں واپس آئے۔[2]

بہرحال تاریخوں سے یہ بات ثابت ہے کہ میدانِ جنگ سے

---

[1] جلعب مقام اعوص کے قریب مدینہ سے ملحق ایک پہاڑ ہے۔

[2] مدارج النبوۃ

اکابرین صحابہ کے ساتھ بھاگنے والوں میں حضرت عثمان بھی شامل تھے لیکن دو باتیں حضرت عثمان کو ابو بکر و عمر سے ممتاز بنا دیتی ہیں۔ اوّل یہ کہ آپ تیسرے دن واپس آئے اور دوسری بات جسے مورخین نے انتہائی شد و مد سے تحریر کیا ہے یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنے اس خطا کار صحابی کو معاف کر دیا ہے۔ معلوم نہیں تذکرہ نگاروں نے حضرت ابوبکر و عمر کے بارے میں معافی کا تذکرہ کیوں نہیں کیا جب کہ فرار کے سلسلے میں جرم سب کا برابر تھا بلکہ حضرت عثمان کا جرم ان دونوں خلفا کے مقابلہ میں زیادہ سنگین تھا کہ وہ تیسرے دن واپس پلٹے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمعِ قرآن کے وقت جب حضرت عثمان کے سامنے وہ آیتیں آئیں جن میں احد سے فرار اختیار کرنے والوں کی سرزنش کی گئی ہے تو حضرت عثمان نے فخریہ طور پر اپنے مصاحبین سے یہ کہا ہوگا کہ ان آیتوں کے ذریعہ خداوند عالم میرے جرم فرار کو معاف فرما رہا ہے بس یہیں سے حضرت عثمان سے عقیدت رکھنے والے مفسرین کو موقع ملا ہوگا اور انھوں نے معافی کا تذکرہ عثمان کی خواہش کے مطابق کر دیا ہوگا ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ معافی کے ذیل میں ابو بکر و عمر کا تذکرہ نہ ہوتا۔

دیگر غزوات

سنہ ۴ھ میں بنی اسد نے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا جسے رد کرنے کے لیے پیغمبر اسلامؐ نے ابو سلمہ کو بھیجا۔ انھوں نے دشمنوں کو مار بھگایا پھر سفیان بن خالد نے حملہ کا ارادہ کیا اسے عبداللہ بن انیس نے پسپا کر دیا۔ اسی سنہ میں غزوۂ بنی نضیر، غزوۂ ذات الرقاع اور غزوۂ بدر

ثانی پیش آیا مگر ان غزوات یا معرکوں میں حضرت عثمان کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

سنہ ۵ھ میں جنگ خندق واقع ہوئی، اسی سنہ میں غزوۂ بنی مصطلق، واقعۂ افک، غزوۂ بنی قریظہ اور غزوۂ بنی اعیان واقع ہوئے مگر ان غزوات میں حضرت عثمان غائب نظر آتے ہیں۔

سنہ ۶ھ میں حدیبیہ کے موقع پر آپ نظر آتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ہجرت کے برسوں بعد آپ کو اپنے وطن (مکہ) جانے کا موقع فراہم ہوا تھا۔ دوسری وجہ شاید یہ رہی ہو کہ پیغمبرؐ حج کے ارادے سے نکلے تھے جس میں تمام لوگوں کی جانیں محفوظ تھیں لہٰذا آپ کی جان کو بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔ تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ کے دل میں مکہ جا کر اپنے اہلِ خاندان (بنی امیہ) سے ملاقات کی تمنا بھی دل میں چٹکیاں لے رہی ہوگی۔ اسی لیے پیغمبرؐ نے جب حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا اور حالات سے آگاہی کے لیے حضرت عمر کو اپنا سفیر بنا کر مکہ بھیجنا چاہا اور انھوں نے جان کے خوف سے انکار کر دیا تو رسولؐ کے کہنے پر آپ فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئے اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت مکہ میں ابو سفیان کی سرداری تھی جو آپ کا عزیز خاص تھا۔

سنہ ۷ھ میں خیبر کا معرکہ پیش آیا۔ اس معرکہ میں بھی آپ کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ زندہ بھی تھے یا نہیں جب کہ ابو بکر و عمر اس جنگ میں موجود تھے اور علم لے کر مرحب وغیرہ کے مقابلے میں جاتے تھے لیکن جب کھدیڑے جاتے تھے تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ آتے تھے اس کے بعد فتح مکہ، محاصرۂ طائف اور جنگ حنین کے معرکے گزر

گئے لیکن تاریخ کسی معرکے میں آپ کی موجودگی ثابت نہیں کرتی۔ البتہ خان بہادر خیرات احمد مرحوم نے اپنی کتاب "نور ایمان" کے صفحہ ۶۲ پر اس امر کا انکشاف کیا کہ جنگ حنین میں جس وقت کہ دشمن ایک جھاڑی سے نکل کر حملہ آور ہوئے تو آپ جان کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے پھر پلٹ کر نہیں آئے۔

نہیں معلوم کہ آپ کا اسلام کیسا تھا اور آپ کی پیغمبرؐ اسلام سے کیسی محبت و وابستگی تھی۔ کہاں رہتے تھے، کیا کرتے تھے؟ یہ معمہ سمجھ سے باہر ہے۔

غزوۂ تبوک ۹ھ میں بھی آپ کی شرکت واضح نہیں ہے البتہ آپ کی طرف سے مالی اعانت کا تذکرہ ضرور ملتا ہے لیکن یہ خاص بات اس لیے نہیں ہے کہ دیگر صحابہ نے بھی بڑے بڑے نذرانے پیش کیے تھے۔

حضرت عثمان عہد رسالت میں

دورِ رسالت کے غزوات میں حضرت عثمان کا کوئی بھی جنگی یا غیر جنگی کارنامہ نہیں ملتا جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے اور نہ ہی آپ رسول اکرمؐ کو کسی قسم کا مفید یا غیر مفید مشورہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود متقدمین میں کچھ سیرت نگاروں نے نہ جانے کیوں آپ کو پیغمبرؐ اسلام کے مشیرِ خاص کے منصب پر فائز کر دیا اور یہ سلسلہ متاخرین تک چلا آیا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت عثمان حضور سرورِ کائنات صلعم کے

کیسے مشیر خاص تھے کہ تمام اسلامی معرکے گزر گئے اور کچھ نازک ترین منزلیں بھی آئیں مگر آپ کے مشوروں سے تاریخ کا دامن خالی ہے۔

پیغمبرؐ کی حیات طاہرہ کے آخری لمحات میں سب سے اہم مسئلہ خلافت کا تھا جسے تحریری شکل دینے اور اپنے بعد امت کو گمراہی سے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ صحابہ کی موجودگی میں آنحضرتؐ نے قلم، دوات اور کاغذ کی خواہش ظاہر کی لیکن عمر نے آپ کی اس خواہش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اس شخص پر مرض کا غلبہ ہے اور یہ ہذیان بک رہا ہے، ہمیں کسی نوشتہ کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے لیے بس قرآن کافی ہے۔

صحابہ میں کچھ رسول اللہؐ کے اس حکم پر عملدرآمد کرنا چاہتے تھے اور کچھ عمر کے ہمنوا تھے، آپس میں تکرار ہوئی اور جب شور زیادہ بڑھا تو آنحضرتؐ نے "قُومُوا عَنِّی" کہہ کر سب کو نکال باہر کیا۔ اس نازک وقت میں مشیر خاص کہیں نظر نہیں آتے حالانکہ یہ مشورے کا خاص وقت تھا۔

اسی طرح وقت آخر جیش اسامہ کی تشکیل و ترتیب کا مقصد بھی یہی تھا کہ جب آپؐ دنیا سے رخصت ہوں تو مدینہ مخالفین علیؑ سے خالی رہے۔ چنانچہ رسولؐ نے یہ حتمی اور تاکیدی حکم دے دیا تھا کہ اس لشکر میں تمام صحابہ ابوبکر، عمر اور عثمان وغیرہ بھی شامل ہوں اور یہ لشکر فوری طور پر مدینہ سے کوچ کر جائے۔ مگر یہ لوگ اس میں شامل نہیں ہوئے اسی بنا پر لشکر کی روانگی میں تاخیر ہوئی تو آپؐ سخت ناراض ہوئے اور تخلف کرنے والوں پر تین بار لعنت فرمائی۔

افسوس ہے کہ ان بے غیرتوں پر لعنت ملامت کا کوئی اثر نہیں ہوا

اور ہوتا بھی تو کیسے؟ جان تو خلافت میں اٹکی ہوئی تھی۔ یہ منتظر تھے کہ کب رسولؐ کی آنکھیں بند ہوں اور کب تختِ خلافت کی طرف جھپٹ پڑیں

اگر حضرت عثمان مشیر خاص تھے تو اسی موقع پر آنحضرتؐ کو اپنے مشوروں سے نوازتے لیکن مشورہ تو درکنار آپ نے آنحضرتؐ کے جنازہ میں شرکت تک گوارا نہیں کی اور شاید آپ کی غیرت، شرم اور حیا کا تقاضا بھی یہی تھا۔

حضرت عثمان عہدِ شیخین میں

یہ کہنا قطعی غلط نہ ہوگا کہ حضرت عثمان کو شیخین (ابو بکر و عمر) کے دور میں مشیر خاص کی حیثیت حاصل تھی۔ جیسا کہ طبقات ابن سعد حصہ سوم کی اس روایت سے ظاہر ہے۔

"ابو بکر جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے مستقبل کے خلیفہ کے بارے میں رائے مشورہ کے لیے عثمان کو طلب کیا اور ان سے فرمایا:

"عمر کے بارے میں تمھاری رائے کیا ہے؟ عثمان نے کہا آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ فرمایا، یہ تم درست کہتے ہو لیکن اس کے باوجود جو تمھاری رائے ہو اس کا اظہار کرو۔ عثمان نے کہا میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے اچھا ہے اور ان کا مثل ہم میں سے کوئی نہیں ہے۔

ابو بکر نے کہا خدا تم پر رحمت کرے اگر تمھاری رائے ان کے خلاف ہوتی تو میں تمھیں جانے نہ دیتا۔"

حضرت ابو بکر، عمر کے بارے میں عثمان کی زبان سے جو کہلوانا چاہتے تھے وہ کہلوا چکے اور مطمئن ہو گئے تو نامزدگی کے فرمان کی طرف متوجہ ہوئے اور اس فرمان کو عثمان ہی سے لکھوانا شروع کیا۔ ابھی عثمان لکھ ہی رہے تھے اور عمر کا نام لکھنا رہ گیا تھا کہ ابو بکر بے ہوش ہو گئے اور جب تھوڑی دیر بے ہوشی طاری رہی تو عثمان نے سمجھا کہ شاید آپ مر گئے لہٰذا انھوں نے اپنی طرف سے یہ لکھ دیا کہ میں نے عمر بن خطاب کو مسلمانوں پر خلیفہ مقرر کر دیا ہے۔ جب آپ کو ہوش آیا اور عثمان نے فرمان پڑھ کر سنایا تو بہت خوش ہوئے۔ عثمان کے اس طرزِ عمل سے آپس کی قربت کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت عثمان کا نام عمر کے مشیروں میں بھی سرِ فہرست ہے۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں ایوب بن ابی امامہ سے روایت کی ہے کہ عمر اپنے زمانۂ خلافت میں بیت المال سے کچھ نہیں کھاتے تھے یہاں تک کہ فاقہ کشی کی نوبت آ گئی تھی۔ انھوں نے اصحاب کو اکٹھا کر کے اس مسئلے کو ان کے سامنے رکھا اور کہا کہ میں نے اپنے آپ کو امورِ خلافت میں مشغول کر رکھا ہے مگر یہ میرے لیے کافی نہیں ہے میرے اخراجات کیسے چلیں گے؟ اس پر عثمان نے کہا کہ (خوب) کھائیے اور کھلائیے۔ عثمان کی تائید سعید بن زید نے بھی کی تو آپ نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ آپ کیا کہتے ہیں، فرمایا۔ صبح و شام کا کھانا کھائیے اور اسی پر اکتفا کیجیے[1]

---

[1] طبقات ابن سعد حصہ سوم اردو ص ۹۳

حضرت عثمان کے ان مشوروں سے آپ کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ غرض کہ بوبکر و عمر کے عہد حکومت میں عثمان کی زندگی کے تقریباً تیرہ برس ان دونوں کی حکومت مضبوط و مستحکم کرنے اور ان کے ہر اقدام کی تائید میں گزر گئے۔

عثمان کے بارے میں رسول اللہ صلعم کی پیشین گوئیاں

ابو ہریرہ سے یہ روایت ہے کہ میں نے سنا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بنی امیہ میں سے ایک جبار میرے تخت پر بیٹھے گا جس کی ناک سے خونِ رُعاف جاری ہوگا[1]

اس پیشین گوئی کے متعلق صاحب روضۃ الاحباب تحریر فرماتے ہیں کہ جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو تین ماہ تک ان کی نکسیر پھوٹتی رہی اور خون جاری ہوتا رہا۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی تاریخ الخلفا میں حضرت عثمان کی نکسیر پھوٹنے کا تذکرہ کیا ہے۔

صاحب خلفائے ثلاثہ حصہ سوم نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۸ پر علامہ ذہبی کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ:

"آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جب دجال خروج کرے گا تو اس کی پیروی وہی لوگ کریں گے جو عثمان کو دوست رکھتے ہوں گے۔"

کیا آنحضرت صلعم کا یہ ارشاد اہلِ بصیرت کے لیے مشعلِ ہدایت نہیں ہے؟

---

[1] تطہیر الجنان برحاشیہ صواعق محرقہ ص ۱۴۱ طبع مصر

شوریٰ پر تبصرہ

حضرت عمر اپنے دیرینہ منصوبہ کے تحت ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ خلافت کی باگ ڈور حضرت علی ابن ابی طالب کے ہاتھوں میں جائے لہٰذا اس کا رخ عثمان کی طرف موڑنے کے لیے انھوں نے انتہائی حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے ایک پراسرار مجلس شوریٰ تشکیل دی اور اس کی ہیئت ترکیبی میں کچھ ایسے رہنما اصول رکھے جس سے حضرت علی علیہ السلام کو خلافت ملنا ناممکن ہو جائے۔ اس کی تفصیل حالاتِ عمری کے پانچویں باب میں ہم مرقوم کر چکے ہیں۔

پاکستان کے مشہور مولف و مصنف جناب علی اکبر شاہ نے اپنی کتاب "نعثل کو قتل کر دو" میں تاریخ طبری سے شوریٰ کے تفصیلی واقعات نقل کر کے اس پر جو تبصرہ فرمایا ہے وہ انتہائی جامع، پرمغز اور فکر آمیز ہے۔ میرے خیال سے مناسب ہوگا کہ محترم قارئین کی خدمت میں اسے پیش کر دیا جائے۔ آپ فرماتے ہیں:

یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا کہ خلافت کو اس کے مرکز پر پہنچنے سے روکا گیا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ مصلحتوں اور مجبوریوں سے اسلام لانے والے کہ جنھیں کثرت اور طاقت حاصل تھی، بنی ہاشم کو مزید کوئی اعزاز دے دیتے۔ ان کے لیے یہ کوئی کم قیامت نہ تھی کہ انھیں اپنے آباء و اجداد کے ورثہ کو چھوڑ کر حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیادت کلی اختیار کرنا پڑی۔ اب کس دل سے وہ علیؑ کی خلافت قبول کر لیتے اور پھر علیؑ بن ابی طالب کے ہاتھ سے تو ان کے بڑے بڑے سورما

قتل ہو چکے تھے، تو یہ صدیوں انتقام کی آگ میں جلنے والی قوم کس طرح علی علیہ السلام کو معاف کر سکتی تھی، ان کے لیے ابوبکر و عمر کو قبول کر لینا آسان تھا کہ ان کی حقیقتوں سے سب واقف تھے چنانچہ انھیں ٹھنڈے پیٹوں قبول کر لیا گیا اور پھر جب تیسری خلافت کی نوبت آئی تو خلافت کے اصل امیدوار علیؑ اور عثمان تھے۔ عثمان بنی امیہ کے چشم و چراغ تھے یہ قبیلہ بنو ہاشم کا طاقت ور حریف تھا اور فتح مکہ تک یہی قبیلہ اسلام دشمنی پر کمر بستہ رہا اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی اسے صرف اپنے ذاتی مفادات سے دل چسپی تھی لہٰذا وہ اپنے ہی قبیلہ کے اس فرد کا حامی بنا کہ جو داد و دہش میں شہرت رکھتا تھا اور کفر و اسلام کی جنگوں میں اس کے ہاتھ سے کسی کافر کو خراش تک نہ آئی تھی اور دوسری طرف انھوں نے ایسے شخص کو چھوڑ دیا کہ جس کا تعلق ایک دشمن (بنو ہاشم) قبیلہ سے تھا اور جو کہ اسلام کا سب سے بڑا مخلص تھا اور جس نے کفر و اسلام کی جنگوں میں بنو امیہ کے بڑے بڑے سرداروں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ بنو امیہ کے علاوہ اور دوسرے مجبوری کے مسلمان بھی علیؑ کو چھوڑنے پر مجبور تھے۔ علیؑ کے چاہنے والوں کے پاس طاقت نہ تھی کہ وہ اہل بیتؑ کے ساتھ ہونے والی اس مسلسل زیادتی کا ازالہ کر سکتے۔ چنانچہ مشہور صحابی جناب مقدادؓ پکار اٹھے کہ "کاش میں علیؑ کے مددگار پاتا۔"

حضرت علی نے خلافت کے بارے میں وہ موقف اختیار کیا کہ جو آپ کے شایانِ شان تھا۔ آپ کا فرض صرف اتنا تھا کہ لوگوں پر حق واضح کر دیں اور یہی ان کے بھائی محمدؐ کا طرزِ عمل تھا کہ اپنی رسالت کا اعلان کرتے، خدا کا پیغام پہنچاتے کوئی مان لیتا تو خوش ہوتے، انکار کر دیتا تو

صبر کرتے۔

حضرت علی علیہ السلام نے پہلی خلافت چھیننے والوں کے سامنے بھرپور احتجاج کیا اور اپنے حق کے لیے دلیلیں دیں، اپنی فضیلتیں بیان کیں۔ ایسا نہ کرتے تو کہا جاتا کہ ہمیں کیا معلوم کہ حق کہاں ہے؟ دوسری خلافت پہلی کا لازمی نتیجہ تھی، لہٰذا عمر بن خطاب کی نامزدگی پر علیؑ کو کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ علیؑ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ابوبکر کی خلافت کے لیے عمر کی کوشش اس لیے تھی کہ حیات ابوبکر میں بھی در پردہ انھیں کی حکومت ہوگی اور جب ابوبکر دنیا سے رخصت ہونے لگیں گے تو خلافت کے لیے وہی نامزد کیے جائیں گے۔ غرض کہ حضرت علیؑ ابن ابی طالب نے دوسری مرتبہ بھی صبر کا گھونٹ پیا۔ تیسری خلافت کے موقع پر عمر بن خطاب نے عثمان کو براہِ راست نامزد نہیں کیا کہ اب اس کا موقع نہ تھا، لہٰذا خلیفہ کے انتخاب کے لیے ایسی شوریٰ تشکیل دی اور ایسے رہنما اصول دیے کہ نتیجہ سو فیصدی عثمان کے حق میں رہے۔ حضرت علیؑ بھی اس انجام سے واقف تھے، لیکن اس کے باوجود آپ نے شوریٰ میں شرکت کی اور آپ نے اپنے اس اقدام کی یہ توجیہ کی:

> "میں نے اس طویل مدت اور شدید مصیبت پر صبر کیا یہاں تک کہ دوسرا بھی اپنی راہ لگا اور خلافت کو ایک جماعت میں محدود کر دیا گیا اور مجھے بھی اس جماعت کا فرد خیال کیا۔ اے اللہ! مجھے اس شوریٰ سے کیا لگاؤ؟ ان میں کے سب سے پہلے کے مقابلہ ہی میں میرے استحقاق اور فضیلت میں کب شک تھا جو اب ان لوگوں میں شامل کر لیا گیا ہوں۔ مگر میں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ جب وہ

زمین کے نزدیک ہو کر پرواز کرنے لگیں میں بھی ایسا کرنے لگوں اور جب وہ اونچے ہو کر اڑنے لگیں تو میں اسی طرح پرواز کروں۔"

(نہج البلاغہ)

"حضرت علیؑ کو معلوم تھا کہ اس شوریٰ کا کیا انجام ہونے والا ہے، لیکن آپ نے اتمام حجت کے طور پر اہل شوریٰ کے سامنے اپنا استحقاق پیش کیا:

"اے عزیزو! تمھیں معلوم ہے کہ ہم اہلِ بیتؑ نبوت ہیں اور ہر ایک بلا و مصیبت سے امت کے بچاؤ کا ذریعہ ہیں۔ اگر تم ہمارا حق ہمیں پہنچاؤ گے تو حق اپنے مرکز پر پہنچ جائے گا اور اگر ہمارا حق ہمیں نہ دو گے تو ہم اونٹوں پر بیٹھ کر چلے جائیں گے اگرچہ کتنا ہی زمانہ گزرے ہمیں پروا نہیں جب ہمارا حق آ پہنچے گا تو چلے آئیں گے خدائے جلیل کی قسم! اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے عہد نہ لیتے اور ہم کو اس امر کی اطلاع نہ کر چکے ہوتے تو میں اپنا حق کبھی نہ چھوڑتا اور کسی کو اپنا حق نہ لینے دیتا۔۔۔۔۔"

حضرت علیؑ کی اس تقریر کا اثر اہلِ شوریٰ پر کچھ بھی نہیں ہوا کہ صورت حال کچھ اس طرح تھی۔

عبدالرحمٰن بن عوف کی بیوی ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط عثمان کی بہن تھی یعنی عثمان اور عبدالرحمٰن بن عوف میں سالے بہنوئی کا رشتہ تھا اور سعد بن ابی وقاص عبدالرحمٰن بن عوف کے قریبی رشتہ دار تھے اس کے علاوہ سعد بن ابی وقاص کی ماں اموی تھیں۔ میدانِ کربلا میں یزیدی فوج کا سپہ سالار عمر ابن سعد اسی سعد ابن ابی وقاص کا بیٹا

تھا لہٰذا اموی رجحان کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ طلحہ کو حضرت علیؑ سے پرانی دشمنی تھی اور ان کی والدہ ابو سفیان کی بیوی بھی رہ چکی تھیں۔ خود طلحہ کا تعلق ابو بکر کے قبیلہ بنو تیم سے تھا۔ اب صرف زبیر رہ گئے جو ابو بکر کے داماد بھی تھے اور ان کی والدہ صفیہ بنت عبدالمطلب تھیں۔ اس لحاظ سے وہ دونوں طرف تھے۔

ان رشتہ داریوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ سعد بن ابی وقاص۔ نے اپنا حق عبدالرحمٰن بن عوف کے حوالے کر دیا اور طلحہ نے اپنی رائے عثمان کے حق میں دے دی زبیر نے دیکھا تو جوش میں علیؑ کی طرف ہو گئے مگر جب عبدالرحمٰن عوف نے عثمان کے لیے کوشش کی تو یہ پھر ادھر ہو گئے۔"

(ماخوذ از نعثل کو قتل کردو)

شوریٰ کا انجام

حضرت عمر نے شوریٰ کا طریقۂ انتخاب پیش کر کے قریش کی اہم شخصیتوں اور ان کے قبائل و انصار میں ایک سیاسی طمع پیدا کر دیا جس کا وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ عمر نے شوریٰ کو جن چھ شخصیتوں میں منحصر کیا تھا ان میں سے ہر ایک خلافت کے لیے امیدوار تھا۔ لوگ حضرت علیؑ بن ابی طالب علیہ السلام کی طرف مائل تھے کیونکہ بنی امیہ کی سلطنت سے خوفزدہ تھے۔ دوسری طرف مہاجرین حضرت علیؑ اور ان کے استقامت سے خائف تھے شاید ان میں سے اکثر کو بیت المال، اجتماعیت اور حکومت کے بارے میں حضرت علیؑ کے نظریات کا علم بھی تھا۔ انصار کی اکثریت علیؑ کے ساتھ اور اقلیت عثمان کے ساتھ

تھی ایسا اس لیے تھا کہ وہ قریش کی حکومت سے خوفزدہ تھے اور مسجد نبوی میں جو گفتگو ہوئی تھی اس میں بنی امیہ پر سقیفہ کا قبائلی تعصب چھایا ہوا تھا۔ یہ گفتگو حضرت عثمان کی بیعت سے پہلے ہوئی تھی۔

لہٰذا حضرت علیؑ مسلمانوں کی اکثریت کی طرف سے اور عثمان قریشی ارسٹوکریسی کی جانب سے امیدوار تھے۔

شوریٰ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اموی حکومت پر قابض ہو گئے اور حضرت عمر نے جن لوگوں کو شوریٰ میں نامزد کیا تھا ان میں حضرت علی کے علاوہ سب کے سروں پر اقتدار کا بھوت سوار ہو گیا اور یہی بھوت شوریٰ سے باہر قریش کی دوسری شخصیتوں پر بھی سوار تھا کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ حضرت عمر نے قریش میں سے جن لوگوں کو امیدوار بنایا ہے وہ ان سے کسی چیز میں افضل نہ تھے۔ شوریٰ نے انصار کے ذہنوں پر بھی برا اثر چھوڑا کیونکہ سقیفہ میں ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ وہ حکومت میں شریک ہوں گے لیکن وہ محروم کر دیے گئے تھے اور اس پر یہ ستم تھا کہ ان کے قدیم حریف یعنی مکہ کے وہ مشرک جو ان کے ساتھ برسرپیکار رہے برسراقتدار آگئے تھے۔

خلافت کی طمع رکھنے والے پس پردہ انصار کو اپنے گرد جمع کرتے اور اپنی دولت اور قبیلہ کی طاقت سے بھی استفادہ کرتے تھے اور دوسرے قبائل سے رشتے بناتے تھے چنانچہ حضرت عثمان کی خلافت کے آخری دنوں میں یہ لوگ (قریش) اپنے مقصد کے لیے علی الاعلان سامنے آگئے۔

یہ سب شوریٰ کا نتیجہ تھا کہ مختلف شخصیتوں کو پسند کرنے والے یہ احزاب عالم وجود میں آگئے۔ یہ شخصیتیں اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اقتدار پر قبضہ جمانے کے لیے عثمان کے خلاف کی جانے والی عوامی شکایتوں سے بھی فائدہ اٹھاتی تھیں۔ ابن عبداللہ نے معاویہ کا ایک اعتراض نقل کیا ہے جس میں وہ کہتا ہے:

"عمر نے چھ آدمیوں میں شوریٰ قائم کر کے مسلمانوں میں تفرقہ اور ان کے خیالات میں اختلاف پیدا کیا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک خلافت کی طمع رکھنے لگا تھا اور اس کی قوم بھی اس کے ساتھ اس طمع میں شریک تھے۔"[1]

یہی وہ حوادث تھے جن سے مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑا اور انھیں حادثات میں سے ہر حادثہ نے دوسرے حادثے پر اثر ڈالا اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت کو چلانے، تقسیم اموال اور اجتماعی امور میں عثمان کے غلط اسلوب کار نے بھی اثر کیا جس کی وجہ سے لوگ اسلامی اصولوں سے منحرف ہو گئے، یہاں تک کہ یہ حادثات اس انتہا پر پہنچے کہ عثمان کے خلاف عوامی غم و غصہ کا سیلاب اٹھ کھڑا ہوا اور آپ کے قتل کی شکل میں شوریٰ کا انجام سامنے آگیا۔ حضرت عمر کی حکمت عملی نے شوریٰ کے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک عثمان کو لقمۂ اجل بنایا اور دوسرے بنی امیہ کو اقتدار و استحکام عطا کر کے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو شہید کرا دیا

[1] عقد الفرید ج ۵ ص ۳۱ و ۳۲

خاموش انتقام

سقیفہ بنی ساعدہ میں صحابیت، انصاریت اور قرابت کو تزویری چالوں سے شکست ہوئی اور "دُم کٹے"[عہ] اجماع کے ذریعہ خلیفۂ اول کا انتخاب ہوگیا۔ یہ اجماع حجت قرار پایا اور دنیائے اسلام نے اس کو سنتِ شیخین تصور کیا۔ لیکن یہ سنت باقی نہ رہی کیوں کہ عمر نے سقیفائی کوششوں کا ثمر فرمان نامزدگی کی شکل میں ابوبکر سے پالیا۔ اب خلیفۂ اوّل کی اس روش اور اس طرزِ عمل کو سنت کہیے یا سیرت۔

بہرحال یہ سلسلہ بھی ختم ہوا کیونکہ عمر نے ان دونوں راستوں سے ہٹ کر ایک تیسرا راستہ اختیار کیا جس پر گامزن ہو کر موصوف نے اجماع، وصیت، سنت اور نص کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ شوریٰ مقرر ہوا اور اس میں عمداً ان ہستیوں کو رکھا گیا کہ لامحالہ خلافت بنی ہاشم سے نکل کر بنی امیہ تک پہنچے اور جب بنی امیہ تک پہنچے گی تو بنی امیہ و بنی ہاشم کی خاندانی عداوت بنی ہاشم کو سرسبز نہ ہونے دے گی۔ کیوں کہ ریاست و حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں ہوگی اور ہمیشہ کے لیے خاندانِ رسالت اس سے محروم رہے گا۔ یہ وہ خاموش انتقام تھا جو رسولؐ سے ان کے قتل کا ارادہ کرنے والے اور ان کی بزمِ ادب آموز میں بیٹھنے والے نے لیا۔

عہ دم کٹا اجماع اس لیے تھا کہ انصار اور بنی ہاشم اس میں شریک نہیں تھے۔

خلافت عثمانیہ کی ابتدا

حضرت عائشہ و حفصہ کی وساطت نے جس طرح حضرت ابوبکر و عمر کو سرسبز کیا اسی طرح عبدالرحمٰن بن عوف سے ازاربندی رشتہ نے حضرت عثمان بن عفان کو تختِ خلافت تک پہنچایا لیکن یہ نہیں معلوم کہ آپ نے کس تاریخ کو کاروبارِ حکومت سنبھالا؟ شاید اسی لیے "علمبردار ثلاثہ" مولوی عبدالشکور پاٹانالوی نے بھی اپنی کتاب خلفائے راشدین میں بھی تاریخ کا انکشاف نہیں کیا۔ بعض مورخین یکم محرم الحرام سنہ ۲۴ھ تحریر کیا ہے اور یہی تاریخ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ غرض کہ تاریخ کچھ بھی مگر یہ حقیقتِ کلیہ ہے کہ آپ نے حصولِ خلافت کے وقت کیے گئے کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل کے وعدہ کو یکسر فراموش کر دیا تھا اور خلیفہ بنتے ہی اس کی خلاف ورزیاں شروع کر دی تھیں۔ صرف آپ کی توجہ اس بات پر مرکوز ہو گئی تھی کہ کس طرح سیرتِ شیخین پر عمل پیرا ہو کر ابوبکر و عمر کی اسلام دشمن سرگرمیوں کو جاری رکھا جائے اور کس ترکیب سے ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ قیامت تک اسلام کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے۔ غالباً آپ کے اسی رجحان کو محسوس کرتے ہوئے عرب کے مانے ہوئے فتنہ پرداز ابوسفیان نے کہا تھا: "بنی تیم و بنی عدی کے بعد اب خلافت تمہارے ہاتھ آئی ہے، اسے گیند کی طرح گھماؤ پھراؤ اور نچاؤ اور بنی امیہ کو اس کی میخیں بنا کر اسے ہمیشہ کے لیے مستحکم کرلو۔ یہ صرف دنیاوی حکومت ہے، دین سے اس کا کیا تعلق؟ میرے نزدیک جنت و دوزخ اور سزا و جزا کچھ نہیں ہے[1]۔"

---

[1] استیعاب ج ۲ ص ۹۰۷ و ۱۰۷ مطبوعہ مصر

(ساتواں باب)

عثمانی نظامِ حکومت

اقتدار پرست سقیفائی خلافت ابتدا ہی سے ملوکیت کی طرف مائل رہی اور اس کا اصل مقصد تعلیماتِ اسلامی، سنتِ پیغمبری، احکامِ شریعت، حقوق بشریت اور انسانی قدروں کو بالائے طاق رکھ کر اقتدار کی تمنا، ملک گیری کی ہوس اور تخت و تاج کی خواہش کے تحت ایک ایسا شہنشاہی نظام قائم کرنا تھا جس میں خواہشاتِ نفس کی تکمیل دینی فریضہ کی ادائیگی قرار پائے۔

اور چونکہ اصحابِ ثلاثہ نے تزکیہ نفس یا اللہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور صرف جہاں بانی ان کا مطمح نظر تھا اس لیے وہ نظامِ الٰہی و نظامِ اسلامی کو خالص شہنشاہی نظام میں ضم کرنے کی جد و جہد میں مصروف رہے۔ وہ ایک ایسے نظام کی کوششوں میں سرگرداں رہے جس میں حصولِ منفعت کی ہر امکانی کوشش مستحسن سمجھی جائے خواہ وہ منفعت دوسروں پر جبر و تشدد اور مظالم کے ذریعہ ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

یہ سلسلہ خلافت اولیٰ سے دورِ عثمانی تک برابر جاری و ساری رہا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ حق گو مورخین نے عہدِ ثلاثہ کے نظامِ حکومت کو

دینی و الٰہی نظام تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے جیسا کہ مصر کے مشہور مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا کہنا ہے:

"جو لوگ اس نظام (خلفائے ثلاثہ کے نظامِ حکومت) کو الٰہی نظام تصور کرتے ہیں وہ حقیقت میں ان الفاظ و کلمات سے دھوکا کھاتے ہیں جو خلفاء کے خطبات میں پڑھتے ہیں نیز ان روایات سے جو خلفاء کے بارے میں عام طور سے مشہور ہیں اور جن میں اللہ کا ذکر، اللہ کا حکم اور اس کی سلطانی اور اطاعت کا تذکرہ ہے۔ یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ الفاظ اور یہ روایات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کا نظامِ حکومت آسمانی تھا حالانکہ ان میں صرف ایک بات کی طرف اشارہ ہے جو بالکل عام لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ "خلافت" خلفاء اور عام مسلمانوں کے مابین ایک معاہدہ ہے[1]۔"

اسی کتاب کے صفحہ ۴۴ پر رقم طراز ہیں کہ:

"اکثر لوگ خیال کرتے ہیں کہ اس عہد کا نظام ایک الٰہی نظام ہے جو آسمان سے اترا ہے حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے اصل بات خلیفہ اور رعایا کے دلوں کا متاثر ہونا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خلفائے ثلاثہ کا رائج کردہ نظام نہ تو اسلامی تھا نہ الٰہی تھا اور نہ سنتِ رسولؐ کے مطابق تھا بلکہ اس نظام کا مقصد یہ تھا کہ عام مسلمان ان کے نظامِ حکومت کو اللہ کا رائج کردہ نظام

۱؎ "عثمان" ترجمہ الفتنۃ الکبریٰ عبدالحمید نعمانی ص ۴۳

سمجھ کر ان کے ہر جائز و ناجائز افعال کو قبول کرتے رہیں اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ خلفائے ثلاثہ کے ذہن میں نظامِ اسلامی، نظامِ الٰہی یا نظامِ آسمانی کا کوئی تصور نہیں تھا اور وہ صرف ایک دنیاوی حکمراں کی حیثیت رکھتے تھے۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان یا صحابہ جو ہمہ وقت جمال و کمالِ رسالتؐ کا مشاہدہ کیا کرتے تھے اور جنھوں نے سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا تھا یا جو سیرت رسولؐ سے متاثر تھے اور جن کے دلوں میں ایمان کا چراغ روشن تھا اور جو اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ رسولؐ دنیا پر حکومت کرنے نہیں آئے بلکہ دنیا کو امن، اخوت، سلامتی کا درس دینے آئے ہیں اور جو یہ بھی جانتے تھے کہ رسولؐ کے دل میں فتوحات اور مالِ غنیمت کی تمنا نہیں تھی بلکہ وہ خلقِ عظیم بن کر انسانی قدروں کو بلند کرنے، اخلاق بشری کو سنوارنے، توحید کا درس دینے اور مرحلۂ آخرت کو آسان بنانے کے لیے آئے ہیں۔ وہ لوگ عقل و بصیرت کیوں کھو بیٹھے کہ انھوں نے خلفائے ثلاثہ کے ان خطرناک ارادوں اور منصوبوں کو نہ سمجھا اور ان کے غیر اسلامی رنگ ڈھنگ اور رویے کو محسوس کرتے ہوئے بھی انھیں خلیفۂ رسولؐ کی حیثیت دے دی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تلوار، طاقت، دولت اور خصوصاً ذہنی کی نیم پختگی نے حقائق و عقائد پر گہرے پردے ڈال دیے تھے جس کی وجہ سے یہ لوگ خلفاء کی ہر بات کو حقیقت سمجھ کر مجاز میں گم ہو گئے۔

ملک گیری کی تمنا نے دور اول میں فتوحات کا بازار گرم کر کے مالِ غنیمت کی شکل میں جو سرمایہ حاصل کیا اس کا بیشتر حصہ بغاوت کو

فرو کرنے، حکومت کے استحکام اور افواج کی تنظیم کاری پر خرچ ہوا، جو بچ گیا وہ مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے بعد خلیفہ کے گھر یا بیت المال میں جمع ہو گیا۔[1] رفتہ رفتہ فتوحات کا یہ سلسلہ دوسرے دور میں داخل ہو کر منزلِ کمال پر پہنچ گیا اور دنیا کی دولت سمٹ کر ڈھیر ہو گئی لیکن حضرت عمر کی جمع خوری نے اسے وقتِ آخر حضرت عثمان کے حوالے کر دیا اور عثمان عمری مفتوحہ ممالک اور ان کے خزانوں کے مالک و مختار بن گئے۔

عہد عثمانی میں افراطِ زر کا یہ حال تھا کہ ایک لاکھ درہم میں ایک گھوڑا خریدا جاتا تھا[2] اور ایک بیگہ زمین پر لگے ہوئے باغ کی معمولی قیمت چار لاکھ درہم تھی۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے عثمانی عہد میں مفتوحہ ممالک سے مالِ غنیمت کے طور پر حاصل ہونے والی دولت کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

> "سنہ ۳۰ھ میں خراسان کے اکثر شہر، نیشاپور، طوس، سرخس، مرو اور بیہق فتح ہوئے۔ ان وسیع شہروں کی فتوحات کے بعد دولت و مالِ غنیمت کے انبار لگ گئے تو حضرت عثمان نے (باضابطہ) خزانہ بنوایا اور تمام لوگوں کو وظیفہ و یومیہ تقسیم کیا۔ دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہوا کہ ہر شخص کو ایک ایک لاکھ بدرے و ہمانیاں (یعنی سولہ ارب روپیہ) دیئے۔"[3]

---

[1] تاریخ اسلام ذاکر حسین حصہ دوم ص ۵۷ [2] تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۰۸
[3] تاریخ الخلفاء ص ۱۶۰

دولت کی اس ریل پیل میں حضرت عثمان نے تقسیم اموال کا جو غیر مساوی طریقہ اختیار کیا وہ مسلمانوں کے لیے قطعاً نامانوس اور تکلیف دہ تھا۔ آپ شوریٰ کے اراکین، قریش کے بڑے لوگوں اور اپنے رشتہ داروں کو خصوصی طور پر بہت زیادہ مال دیتے تھے۔

اگر یہ سارا مال ان کی اپنی ذاتی کمائی کا ہوتا تو کسی کے لیے اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی لیکن یہ مال بیت المال سے دیا جاتا تھا جس میں تمام مسلمان شریک تھے۔ مستزاد یہ کہ مختلف شہروں میں عثمان کے نمائندے بھی ان کی پیروی کرتے اور وہ بھی اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو ترجیحاً مال دیا کرتے[1]۔

حضرت عثمان نے دولت مند طبقہ کی دولت کو مزید بڑھاوا دینے کے لیے یہ طریقہ بھی رائج کیا کہ وہ مالِ غنیمت میں حاصل کی ہوئی اپنی زمینوں کو وہاں منتقل کر سکتے ہیں جہاں وہ مقیم ہیں۔ یعنی کسی شخص کی زمین اگر شام میں ہے تو وہ اس کے عوض اس شخص سے اپنی زمین کا تبادلہ کر سکتا ہے جس کی آراضی حجاز یا دوسرے عرب ممالک میں ہے۔

اس طریقۂ کار سے دولت مند طبقہ نے بھی فائدہ اٹھایا اور اپنی بے پناہ دولت سے مفتوحہ علاقہ میں آراضیات کی خریداری شروع کر دی اور اپنے غلاموں و مزدوروں کو ان کی کاشت پر لگایا۔ نتیجے میں یہ زمینیں سونا اگلنے لگیں جس سے ان کی دولت دن دونی رات چوگنی کے تناسب سے بڑھنے لگی۔ جس کا خلاصہ مسعودی کے قلم کی زبان سے سنیے:

---

[1] مروج الذہب ج ۲ ص ۱۴ و انساب الاشراف ج ۵ ص ۲۵، ۵۲

"زبیر کی دولت بصرہ، کوفہ، مصر اور اسکندریہ میں پچاس ہزار دینار، ایک ہزار گھوڑے، ایک ہزار غلام اور جاگیر تک پہنچ گئی تھی۔ اور طلحہ بن عبید اللہ کو عراق کے غلہ سے ایک ہزار یومیہ کی آمدنی تھی۔ عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس ایک سو گھوڑے، ایک ہزار گائیں اور دس ہزار بھیڑیں تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے انتقال کے وقت اس کی دولت کے آٹھویں حصہ کا ایک چوتھائی اٹھاسی ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ جب زید بن ثابت کا انتقال ہوا تو اس کا سونا اور چاندی کلہاڑوں سے توڑا گیا۔ اس کے علاوہ جو رقم نقد اس نے چھوڑی وہ ایک لاکھ دینار پر مشتمل تھی۔ یعلیٰ بن منیتہ مرا تو اس نے تین لاکھ کی جاگیر کے علاوہ پانچ لاکھ دینار نقد چھوڑے۔ خود عثمان نے مرتے وقت ایک لاکھ پچاس ہزار دینار، دس لاکھ درہم (مدینہ میں) نقد اس کے علاوہ وادی القریٰ، حنین اور دوسرے مقامات پر ایک لاکھ دینار کی جائداد، ہزاروں کی تعداد میں اونٹ و گھوڑے اور متعدد محل چھوڑے[1]۔"

اس دولت مند طبقہ کے برعکس غربت اور افلاس کا مارا ہوا ایک مفلس و نادار طبقہ بھی تھا جس کے پاس نہ زمینیں تھیں نہ مال و دولت، اس طبقہ میں محاذ جنگ پر لڑنے والے جانباز اور ان کے اہل و عیال شامل تھے جن کے لیے عثمان کا کہنا تھا کہ لڑنے والے مسلمانوں کو صرف معمولی اجرت کا حق ہے باقی مالِ غنیمت اللہ کے لیے ہے[2]۔

---

[1] مروج الذہب ج ۲ ص ۳۴۱ تا ۳۴۳ [2] تاریخ اسلام حسن ابراہیم ج ۱ ص ۲۵۸

جب مالِ غنیمت اللہ کے لیے تھا تو کیا حضرت عثمان خدا تھے؟ یا خدا کے بیٹے اور وارث وجانشیں تھے؟ جو اس کی ملکیت کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اس کے مال پر اپنا دست تصرف دراز کیے ہوئے تھے۔

بہرحال حضرت عثمان نے اپنی اس غلط حکمت عملی سے ان دونو طبقوں کے درمیان عدم مساوات کی ایک خلیج پیدا کر دی چنانچہ ایک طرف دولت مند طبقہ کی دولت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا اور دوسری طرف غریب و مفلس طبقہ کی غربت اور بڑھتی رہی۔ آخر کار اس غیر منصفانہ نظام نے مسلمانوں کو بہت جلد یہ احساس دلا دیا کہ انھوں نے اقتدار اسلامیہ کو غلط اور سفاک ہاتھوں کے حوالے کر دیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عثمان نے اپنے عہد میں جو بدعنوانیاں کیں ان پر کسی درد مند انسان کا دل دکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ تو گمنامیوں کے گوشوں میں پڑے ہوں، افلاس ان کا مقدر بن چکا ہو، غربت انھیں گھیرے ہوئے ہو اور بیت المال پر تسلط ہو تو بنی امیہ کا۔ تمام چراگاہوں میں چوپائے چریں تو ان کے، محلات تعمیر ہوں تو ان کے، حکومت کے مرکزی عہدوں پر فائز ہوں تو انھیں کے نوخیز و ناتجربہ کار افراد — اور اگر کوئی درد مند ان تمام بدعنوانیوں و بے اعتدالیوں کے خلاف زبان کھولنے کی کوشش کرے تو اس کی پسلیاں توڑ دی جائیں اور کوئی اس سرمایہ داری کے خلاف آوازِ احتجاج بلند کرے تو اسے شہر بدر کر دیا جائے۔

زکواۃ و صدقات جو فقراء و مساکین کا حق تھا اور بیت المال جو تمام مسلمانوں کا سرمایہ تھا، اس کا مصرف کیا قرار دیا گیا تھا؟ ذیل کے

چند نمونوں سے واضح ہے:

۱۔ حکم بن العاص کو (جسے رسولؐ نے مدینہ سے نکلوا دیا تھا) نہ صرف سنت رسولؐ بلکہ سیرتِ شیخین کی بھی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے پھر مدینہ میں واپس بلا لیا اور بیت المال سے ایک لاکھ درہم عطا فرمائے۔[1]

۲۔ ولید بن عقبہ کو (جسے قرآن نے فاسق قرار دیا ہے) ایک لاکھ درہم دے دیے۔[2]

۳۔ مروان بن حکم سے اپنی بیٹی ابان کی شادی کی تو اسے ایک لاکھ درہم بیت المال سے دیے۔[3]

۴۔ حارث بن حکم سے اپنی بیٹی عائشہ کا عقد کیا تو اسے بھی بیت المال سے ایک لاکھ درہم عطا کیے۔[4]

۵۔ ابوسفیان بن حرب کو دو لاکھ درہم سے نوازا۔[5]

۶۔ عبداللہ بن خالد کو چار لاکھ درہم عنایت کیے۔[6]

۷۔ مروان کو افریقہ کا خمس (پانچ لاکھ درہم) نذر کر دیا۔[7]

۸۔ مدینہ میں بہزور ایک جگہ تھی جسے رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کے لیے وقف عام قرار دیا تھا حارث بن حکم کے حوالے کر دی۔[8]

۹۔ فدک مروان کو عطائے خسروانہ کے طور پر دے دیا۔[9]

---

[1] معارف ابن قتیبہ ص ۸۴ [2] عقد الفرید ج ۳ ص ۹۴ [3] شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۳۹ [4] شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۳۹ [5] شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۳۹ [6] معارف ص ۸۴ [7]، [8] و [9] معارف ص ۸۴

۱۰۔ مدینہ اور اس کے نواح میں جتنی چراگاہیں تھیں ان میں بنی امیہ کے اونٹوں کے علاوہ دیگر افراد کے جانوروں کو چرنے کی اجازت نہیں تھی[1]۔

ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عثمان نے خلافت حاصل کرتے وقت عبدالرحمٰن بن عوف سے کتاب خدا، سنت رسولؐ اور سیرت شیخین پر عمل کا جو وعدہ ارکان شوریٰ کے سامنے کیا تھا اس سے مکر ہی نہیں گئے بلکہ خلافت ملنے کے بعد اسے ہوا میں اڑا دیا۔

مسٹر ذاکر حسین نے اپنی کتاب تاریخ اسلام میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عثمان کسی طرح بھی حکومت کے قابل نہ تھے[2]۔ اور اسی ناقص عثمانی نظام حکومت نے بنی امیہ اور بنی ہاشم کے درمیان عداوت کی دبی ہوئی آگ کو ہوا دے کر پھر مشتعل کر دیا جو تقریباً سو سال تک بھڑکتی رہی۔

مختصر تعارف

حکم بن العاص

حکم بن عاص؛ حضرت عثمان کے باپ عفان کا حقیقی بھتیجا اور عثمان کا سگا چچیرا بھائی تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہو گیا تھا مگر اس کے طور طریقے ایسے تھے کہ پیغمبرؐ نے اس پر اور اس کی اولاد پر لعنت کی[3] اور اسے مدینہ سے وادی وج (طائف میں ایک جگہ ہے) کی طرف جلاوطن

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۳۹ [2] تاریخ اسلام ذاکر حسین باب چہارم ص ۱۲
[3] نہج البلاغہ ص ۲۱۹ بحوالہ اسد الغابہ

کر دیا۔ اس کا بیٹا مروان بھی اس کے ساتھ جلاوطن ہوا۔ پھر آنحضرتؐ نے عمر بھر ان دونوں کو مدینہ واپس نہ آنے دیا۔ حضرت ابوبکر و عمر نے بھی ایسا ہی کیا لیکن حضرت عثمان نے خلیفہ ہوتے ہی ان دونوں کو واپس بلوا لیا اور مروان کو وہ عروج بخشا کہ خلافت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھوں میں تھما دی کہ وہ جو چاہے کرے اور پھر اس کے حق میں حالات کو یوں سازگار بنایا کہ وہ معاویہ ابن یزید کے مرنے کے بعد خلیفۃ المسلمین بن بیٹھا لیکن ابھی نو مہینہ اٹھارہ دن ہی تخت حکومت پر گزرے تھے کہ تیسری رمضان ۶۵ھ میں اسے قضا نے اس طرح دبوچا کہ اس کی بیوی اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر بیٹھ گئی اور اس وقت تک الگ نہ ہوئی جب تک اس نے دم نہیں توڑ دیا۔

حکم بن عاص کو پیغمبر اسلامؐ سے جو عداوت تھی یا اس نے آنحضرتؐ کو جو اذیتیں پہنچائیں اس کا حال تاریخ کی زبان سے سنیے، بلاذری کا کہنا ہے:

"حکم آنحضرتؐ کا سخت و شدید دشمن تھا۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد اسلام لایا مگر یہ مسلمان ہونے کے باوجود آنحضرتؐ کا مضحکہ اڑایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ آنحضرتؐ اپنی کسی زوجہ (غالباً عائشہ) کے حجرہ میں خلوت نشیں تھے تو یہ باہر سے (کسی سوراخ کے ذریعہ) جھانک رہا تھا۔ آنحضرتؐ نے باہر نکل کر ڈانٹا اور فرمایا کہ کاش کوئی مجھے اس ملعون سے نجات دلا دے۔ پھر فرمایا جہاں میں ہوں وہاں یہ نہیں رہ سکتا چنانچہ آپ نے اسے طائف کی طرف جلاوطن کر دیا اور عثمان کی سفارشوں اور کوششوں کے باوجود اسے مدینہ میں

پھر داخل نہ ہونے دیا۔ حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے دور میں بھی اس کی جلاوطنی برقرار رہی مگر عثمان نے خلیفہ ہوتے ہی اسے بلا لیا۔[1]"

لطف تو یہ ہے کہ حضرت عثمان کے اس مذموم فعل کو علمائے اہل سنت میں بیشتر حضرات مستحسن نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ حضرت عثمان نے اس سلسلہ میں پوشیدہ طور پر رسول اکرمؐ سے اجازت حاصل کرلی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکم بن عاص کی جلاوطنی کے بارے میں رسولؐ اللہ اور عثمان کے درمیان گویا خفیہ معاہدہ تھا۔ اگر اسی طرح کی تاویلیں ہم کریں کہ اصحاب نبیؐ نے قتل عثمان کے لیے آنحضرتؐ سے پوشیدہ طور پر اجازت حاصل کرلی تھی تو اس کا کیا جواب ہے؟ بہرحال ابن ہشام کا کہنا ہے کہ:

"حکم مکہ میں آنحضرتؐ کے پڑوس میں رہتا تھا اور یہ آنحضرتؐ کا جانی دشمن تھا اور ہر وقت طرح طرح کی تکلیفیں اور سخت سے سخت ایذائیں پہنچایا کرتا تھا۔[2]"

اصابہ وغیرہ میں مالک بن دینار سے مروی ہے:

"ایک مرتبہ آنحضرتؐ ایک راستہ سے گذر رہے تھے، حکم آپ کے پیچھے پیچھے کچھ مضحکہ خیز اشارے کرتا ہوا چل رہا تھا آنحضرتؐ نے دیکھ لیا تو (اس کے حق میں) بد دعا کی چنانچہ وہ ویسا ہی ہوگیا اور مرتے دم تک ویسا ہی رہا۔[3]"

---

[1] خلاصہ کتاب الانساب بلاذری ج ۵ ص ۲۷ [2] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۵
[3] اصابہ ج ۱ ص ۲۲۵، سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۳۳۷، فائق زمخشری ج ۲ ص ۲۰۵

یہی وہ حکم تھا جسے مدینہ بلوانے کے بعد حضرت عثمان نے بیت المال سے ایک لاکھ درہم عطا کیے تھے۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان نے حکم کو بنی قضاعہ سے زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور کیا تھا اور جب وہ تین لاکھ درہم وصول کرکے لایا تو سب اسی کو بخش دیا۔

یعقوبی نے اپنی تاریخ میں عجیب حیرت انگیز واقعہ تحریر فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"بازار مدینہ کی آمدنی وصول کرنے پر جو شخص معین تھا اس کے پاس ایک دن عثمان تشریف لے گئے اور فرمایا کہ آج کی جتنی آمدنی ہے وہ حکم کو دے دو۔ حضرت عثمان کا یہ قاعدہ تھا کہ جب وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو کچھ دینا چاہتے تھے تو اپنے پاس سے نہیں دیتے تھے بلکہ بیت المال سے خزانچی کے ذریعہ دلوا دیتے تھے. خزانچی نے کہا یہ رقم میں نہیں دوں گا۔ عثمان نے کہا تم میرے خزانچی ہو اس لیے تمھیں عذر نہیں ہونا چاہیے۔ خزانچی نے کہا تم جھوٹے ہو، میں تمھارا خزانچی نہیں ہوں بلکہ تمام مسلمانوں کا خزانچی ہوں اور بیت المال میں مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ چنانچہ اس تکرار کے بعد وہ خزانچی جمعہ کے دن جب کہ عثمان نماز کے بعد خطبہ دے رہے تھے آیا اور مسلمانوں کو مخاطب کرکے بولا کہ لوگو! عثمان کہتے ہیں کہ تم میرے خزانچی ہو حالانکہ میں مسلمانوں کا خزانچی ہوں ایسی صورت میں میرا ان کا نباہ مشکل ہے لہٰذا بیت المال کی کنجیاں میں واپس کرتا ہوں۔ اس کے بعد عثمان نے اسے معزول کرکے زید بن ثابت کو خزانچی بنا دیا۔"

ایسی صورت میں اولادِ امیہ یا دیگر مالی فائدہ حاصل کرنے والے لوگ اگر عثمان کو "عثمان غنی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں تو کیا یہ تعجب خیز نہیں ہے؟

مروان بن حکم

یہ حضرت عثمان کا بھتیجا اور داماد تھا، ہم تحریر کر چکے ہیں کہ یہ بھی اپنے باپ حَکَم کے ساتھ جلاوطن کر دیا گیا تھا مگر حضرت عثمان نے آنحضرتؐ کے حکم کی خلاف ورزی کر کے اسے بھی حَکَم کے ساتھ واپس بلالیا اور اس پر عنایتوں کی وہ بارش کی کہ وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سپرد کرنے کے ساتھ ہی اپنی بیٹی بھی اسے سپرد کر دی اور کثیر مال و زر کے علاوہ فدک کا علاقہ جو رسولؐ اللہ کی اکلوتی بیٹی جناب فاطمہ زہراؑ سے ابوبکر و عمر نے چھین لیا تھا، اس کو عطا کر دیا۔ غرض کہ مروان سے عثمان کے تعلقات کچھ ایسے پیچیدہ تھے کہ وہ برائے نام خلیفہ رہ گئے تھے اور خلافت و حکومت کا سارا کام مروان ہی انجام دیتا تھا۔

مروان نگاہِ رسالت میں کیا تھا؟ حضرت عائشہ بنت ابوبکر کی زبان سے سنیے:

"عائشہ کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ نے مروان کے باپ حَکَم پر اس وقت لعنت کی تھی جب مروان حکم کی صلب میں تھا، اس لیے وہ بھی لعنتِ رسولؐ کا ایک ٹکڑا ہے[1]۔"

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۲۲۵، تفسیر زمخشری ج ۴ ص ۹۹، تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۳ اور تفسیر رازی ج ۷ ص ۴۹۱

ایک روایت اور:

"جبیر ابن مطعم سے روایت ہے کہ ہم لوگ پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ادھر سے حکم گزرا، اسے دیکھ کر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس کے صلب میں جو بچہ ہے اس سے میری امت عذاب و پریشانی میں مبتلا ہوگی[1]۔"

عبدالرحمن بن عوف سے مروی ہے:

"مدینہ میں جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں لایا جاتا تھا چنانچہ پیدا ہونے کے بعد مروان بھی لایا گیا، اسے آنحضرتؐ نے دیکھ کر فرمایا کہ یہ ملعون ابن ملعون ہے[2]۔"

جبیر ابن مطعم کی روایت کے مطابق پیغمبر اسلامؐ نے مروان کی اسلام دشمنی سے متعلق اس وقت پیشین گوئی فرما دی تھی جب وہ اپنے باپ کی صلب میں تھا۔ کاش حضرت عثمان کو آنحضرتؐ کی اس پیشین گوئی پر بھی اتنا ہی اعتماد ہوتا جتنا کاہنوں اور نجومیوں پر تھا تو شاید مروان کے ساتھ وہ یہ سلوک روا نہ رکھتے، مگر اعتماد کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اسلام اور رسولِ اسلام پر ان کا عقیدہ مستحکم ہوتا اور وہ نیک نیتی سے مسلمان ہوئے ہوتے۔

حارث بن الحکم

حارث بن حکم بن عاص حضرت عثمان کا دوسرا داماد اور آپ کی

---

[1] اصابہ ج ۱ ص ۳۴۴، اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۴ [2] صواعق محرقہ ص ۱۰۸، حیواۃ الحیوان ج ۲ ص ۳۹۲، سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۲۲۷ و مستدرک حاکم ج ۴ ص ۴۷۵۔

صاحبزادی عائشہ کا شوہر تھا، اسے بھی آپ نے بیت المال سے مالا مال کر دیا محض اس لیے کہ یہ حضرت علیؑ اور آلِ رسولؐ کا جانی دشمن تھا اور آپ کی دامادی سے مشرف تھا۔

کتاب الانساب بلاذری میں ہے کہ آپ (عثمان) نے حارث کو بیت المال سے تین لاکھ درہم دیئے[1] اور مدینہ کے بازار کی وہ آمدنی جو رسولؐ نے مسلمانوں کے لیے وقف کی تھی، بطور جاگیر اسے بخش دی۔[2]

سیرتِ حلبیہ میں ہے کہ مدینہ کے بازار میں جو مال فروخت ہوتا تھا اس کا دسواں حصہ حضرت عثمان نے حارث کے لیے وقف کر رکھا تھا۔[3] زکوٰۃ میں وصول ہونے والے کچھ اونٹ حضرت عثمان کے پاس لائے گئے وہ سب انھوں نے حارث کے حوالے کر دیے۔[4] غرض کہ حضرت عثمان نے خیرات، زکوٰۃ سب اپنے دامادوں اور بیٹیوں کے لیے روا رکھا تھا۔

سعید بن العاص

سعید اس عاص کا بیٹا تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایذا رسانی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا اور چونکہ وہ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہوا تھا اس لیے سعید کو حضرت علیؑ سے خاص طور پر دشمنی و عداوت تھی۔

یہ شخص حد سے زیادہ اوباش، آوارہ مزاج، بدکردار اور عیاش

[1] کتاب الانساب ج۵ ص ۸۵ [2] عقد الفرید ج۶ ص ۲۶۱ و معارف ص ۸۸،
[3] سیرت حلبیہ ج۲ ص ۲۷، [4] کتاب الانساب ج۵ ص ۸۵

قسم کا انسان تھا۔ چنانچہ اس کا مشہور قول ہے کہ:

"عراق کی سرزمین ہمارے چھوکروں کے لیے باغات ہیں۔"

حضرت عثمان کی خصوصی نگاہِ التفات سعید پر کیوں تھی؟ یہ وہ جانیں۔ تاریخ میں صرف اتنا ہے کہ عثمانی لطف و کرم پر جب بعض صحابہ نے احتجاج کیا تو حضرت عثمان نے انھیں یہ جواب دیا کہ:

"میں نے سعید کو مالا مال کر کے حق قرابت ادا کیا ہے، تم سے مطلب؟"

ولید بن عقبہ بن ابی معیط

حضرت عثمان بن عفان کی طرح ولید بن عقبہ بھی اروی بنت کریز کے بطن سے تھا۔ ماں ایک اور باپ مختلف ہونے کی وجہ سے عثمان اور ولید آپس میں سوتیلے بھائی تھے۔

ولید ایک مانا ہوا فاسق تھا اور اس کے فسق کی گواہی قرآن نے دی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے اسے جہنمی قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت عثمان نے اسے کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔

تاریخِ احمدی مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ کے صفحہ ۱۴۲ پر مسعودی کی تاریخ مروج الذہب کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عثمان نے جو عمال مقرر کیے تھے ان میں آپ کا اخیافی بھائی ولید بن عقبہ بھی تھا جس کے جہنمی ہونے کی خبر رسولِ خدا نے دی تھی۔ ولید تمام رات

[1] کتاب الانساب بلاذری ج۵ ص ۲۸

اپنے مصاحبین اور اربابِ نشاط کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول رہتا تھا اور جب موذن نماز کے لیے اسے خبردار کرتا تو وہ اسی طرح مخمور (نشہ کی حالت میں) مسجد میں جاکر (نمازیوں کو) صبح کی نماز پڑھاتا تھا اور دو کے بجائے چار رکعت پڑھا کے کہتا تھا کہ اگر تم لوگ کہو تو رکعتوں کو اور زیادہ کردوں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ولید جب سجدے میں جاتا تو دیر تک پڑا رہتا تھا اور کہتا رہتا تھا کہ "(پروردگار) تو بھی اور مجھے بھی پلا" چنانچہ ایک بار جو لوگ اس کے پیچھے پہلی صف میں تھے ان میں سے کسی نے کہا کہ ہم تجھ پر تعجب نہیں کرتے بلکہ حیرت اور تعجب اس پر ہے کہ جس نے ہم پر تجھے امیر اور والی مقرر کیا ہے۔

جب ولید کے فسق اور شراب نوشی کی خبر مسلمانوں میں عام ہوئی تو مسلمانوں کے ایک گروہ نے جس میں ابوذر اور ابوزینب وغیرہ شامل تھے، مسجد سے آکر ولید پر ہجوم کیا، اس وقت وہ شراب کے نشے میں بے ہوش پڑا تھا، ان لوگوں نے اسے ہوشیار کرنا چاہا مگر جب وہ کسی طرح ہوش میں نہیں آیا تو اس کی انگشتری جس پر مہر کندہ تھی، اس کے ہاتھ سے اتار لی گئی اور لوگوں نے فوراً مدینہ آکر عثمان سے ولید کے شراب نوشی کا حال بیان کیا۔ حضرت عثمان نے پوچھا کہ تم نے کیونکر جانا کہ ولید نے شراب پی۔ ان لوگوں نے ولید کی شراب نوشی کے ثبوت میں اس کی انگشتری پیش کرکے کہا کہ وہ وہی شراب پیتا ہے جو ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں پیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان نے شکایت کنندگان کے سینہ پر دو لتی رسید کرتے ہوئے انھیں دھکا دیا اور ڈانٹ پھٹکار کر بھگا دیا۔

ملا علی بن برہان الدین حلبی شافعی کا بیان ہے کہ:

"ولید شاعر، ظریف اور بے حد شرابی تھا۔ صبح سے لے کر شام تک برابر شراب پیتا رہتا تھا اور نشے میں چور رہتا تھا۔ اس نے اہل کوفہ کو صبح کی نماز دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھائی اور رکوع و سجود میں کہتا تھا "اشرب واسقنی"۔ نماز کے وقت ایک دن اس نے مصلّٰی پر محرابِ مسجد میں قے کر دی۔[1]"

علامہ بلاذری کا بیان ہے کہ:

"جب ولید حاکم کوفہ ہوکر آیا تو اس وقت بیت المال کے نگراں عبداللہ بن مسعود تھے۔ ولید نے عبداللہ سے ایک کثیر رقم بطور قرض مانگی اور وعدہ کیا کہ وظیفہ ملنے پر ادا کردوں گا۔ لیکن جب ولید نے وہ رقم ادا نہیں کی تو کچھ عرصہ بعد عبداللہ نے مطالبہ کیا۔ اس پر ولید نے عثمان سے عبداللہ کی شکایت کی۔ حضرت عثمان نے ابن مسعود کو لکھا کہ تم میرے خزانچی ہو، ولید نے جو قرض لیا ہے اس کا تقاضا نہ کرو۔ عبداللہ بن مسعود نے کنجیاں پھینک دیں اور کہا کہ مجھے ایسی ملازمت منظور نہیں ہے۔[2]"

اس واقعہ کے بعد بلاذری نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن مسعود عثمان کی غیر اسلامی روش اور غیر دینی سرگرمیوں پر بر سرِ عام نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔

کردارِ عثمانی کا یہ تضاد فکر انگیز ہے کہ وہ شریعت محمدی اور دینِ الٰہی کو تباہ کرنے والوں پر انتہائی مہربان تھے اور اپنی ذات کے خلاف آواز

---

۱ ابو الفداء ص ۲۰۴ ۲ کتاب الانساب بلاذری ج ۵ ص ۳۰

اٹھانے والوں کے لیے سخت اور شقی القلب۔

عبداللہ بن سعد بن سرح

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح حضرت عثمان کا رضاعی بھائی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معتوب تھا۔ آنحضرتؐ نے فتح مکہ کے دن اس کا خون مباح کر دیا تھا۔ یہ شخص پیغمبرؐ اسلام کا مذاق اڑاتا اور آپ کو طرح طرح کی اذیتیں دیا کرتا تھا۔ یہ قرآن کا مضحکہ اڑاتا اور کہتا کہ قرآن میرے ہاتھ میں ہے جیسا چاہوں لکھ سکتا ہوں۔ اور خود قرآن نے اس کے کفر کو بیان کیا ہے۔

سرورِ کائنات یقیناً اس شخص کو بھی مکہ سے نکلوا دیتے مگر حضرت عثمان اس کی سفارش کی تو خلق عظیم نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

اسی عبداللہ کو حضرت عثمان نے اپنے دور میں پہلے افریقہ فتح کرنے کے لیے مسلمانوں کی فوج کا سپہ سالار بنایا۔ پھر عمرو بن العاص کو معزول کر کے مصر کا گورنر بنا دیا۔

عبداللہ بن خالد

یہ عبداللہ ابن خالد حضرت عثمان کے تیسرے داماد تھے۔ اسلام دشمنی میں ان کا درجہ بھی بہت بلند تھا۔ ان کے لیے بھی مراعات و عنایاتِ عثمانی عروج پر تھیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

"حضرت عثمان نے اپنے تیسرے داماد عبداللہ بن خالد بن اوسید بن ابوالعاص بن ابی امیہ کو چار لاکھ درہم بیت المال سے

عطا کیے۔ عبداللہ بن مسعود نے اعتراض کیا تو عثمان نے اتنا مارا کہ ان کی پسلیاں ٹوٹ گئیں[1]۔"

بلاذری کا بیان ہے:

"عثمان کے زمانہ میں عبداللہ بن ارقم صحابیٔ رسولؐ خزانچی تھے۔ عثمان نے بیت المال سے ایک لاکھ درہم قرض لیے، عبداللہ بن ارقم نے اس قرض سے متعلق ایک تحریر لکھوائی اور حضرت علیؑ، طلحہ، زبیر، سعد وقاص اور عبداللہ بن عمر اس کے گواہ ہوئے کیونکہ یہ مسلمانوں کا مال تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد عبداللہ بن خالد بن اوسید آئے اور ان کے ساتھ ان کے چند دوست تھے۔ حضرت عثمان نے عبداللہ کو تین لاکھ درہم اور اس کے ساتھیوں کو ایک ایک لاکھ درہم بیت المال سے دلوانے کے لیے خزانچی کے نام ایک تحریر لکھ دی کہ یہ رقم انھیں بیت المال سے دے دی جائے۔ ابنِ ارقم کے نزدیک یہ رقم بہت زیادہ تھی، بیت المال برداشت نہیں کر سکتا تھا، انہوں نے عثمان کا حکم نامہ واپس کر دیا۔ اس کا انجام عبداللہ بن ارقم کی معزولی پر تمام ہوا[2]۔"

یعقوبی کا بیان ہے:

"حضرت عثمان نے عبداللہ بن خالد سے اپنی لڑکی بیاہ دی اور اس کو چھ لاکھ درہم عطا کیے جانے کا حکم عبداللہ بن عامر کو دیا کہ بصرہ کے بیت المال سے یہ رقم دے دی جائے[3]۔"

---

[1] عقد الفرید ج ۲ ص ۲۶۱، معارف ص ۸۴ [2] کتاب الانساب ج ۵ ص ۵۸ [3] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۲۵

"تعارف" کے عنوان سے تحریر کیے گئے ان چند نمونوں سے حضرت عثمان غنی کی "عنایت" اور اقربا پروری کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ اندازہ بھی آسان ہو جاتا ہے کہ بیت المال کی لوٹ کھسوٹ میں عام مسلمانوں کی زبوں حالی اور سنت پیغمبری کی کسمپرسی کا کیا عالم رہا ہوگا؟

عاملوں کی معزولی اور تقرری

(**کوفہ**) حضرت عثمان جب خلیفہ ہوئے تو اس وقت کوفہ کا گورنر مغیرہ بن شعبہ تھا، انھوں نے اسے معزول کر کے سعد بن ابی وقاص کو گورنر مقرر کیا، لیکن ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ سعد بھی معزول ہو گئے اور ان کی جگہ ولید بن عقبہ بن ابی معیط گورنر ہو گیا۔

سعد کی معزولی کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کا عبداللہ بن مسعود (خزانچی بیت المال) سے قرض کے لین دین کے معاملہ میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ کیونکہ سعد بن ابی وقاص نے بیت المال سے جو رقم قرض لی تھی اسے انھوں نے مقررہ مدت میں ادا نہیں کیا تھا لیکن ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی نظر میں یہ وجہ معقول نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"ان (سعد بن ابی وقاص) کا عبداللہ بن مسعود سے قرضہ کے معاملہ پر جھگڑا کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا کہ ان جیسے صحابی کو معزول کر دیا جاتا جب کہ وہ قرض سے منکر نہ تھے محض اس کی ادائیگی کے لیے تھوڑی سی مہلت چاہتے تھے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ حضرت سعد کی معزولی کا اصل سبب یہ ہے کہ بنی امیہ اور آلِ ابی معیط نے ولایت

حاصل کرنے کے لیے جلد بازی، تقاضے اور مختلف حیلے اختیار کرنا شروع کر دیے۔ انھوں نے حضرت عثمان پر دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ ان کے لیے حکومت تک پہنچنے کی راہ صاف کریں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت عثمان نے سعد کو کوفہ سے معزول کیا تو ان کی جگہ صحابۂ کبار یا مہاجر و انصار میں سے کسی کو متعین نہیں کیا نہ حضرت طلحہ کو بھیجا نہ زبیر کو نہ عبدالرحمٰن کو نہ محمد بن مسلمہ کو اور نہ ابو طلحہ کو، انھوں نے بھیجا تو ولید بن عقبہ کو، حالانکہ مسلمانوں کو ولید پر کوئی اعتماد نہ تھا۔[1]"

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا یہ خیال قرینِ قیاس ہے اس لیے کہ ولید بن عقبہ حضرت عثمان کا سوتیلا بھائی تھا اور عثمان و ولید کی ماں ایک تھیں۔

(**بصرہ**) بصرہ کے گورنر ابو موسیٰ اشعری تھے لہٰذا عثمان کے رشتہ داروں کی نظر میں یہ کھٹک رہے تھے۔ آخر کار حضرت عثمان نے انھیں بھی نکال باہر کیا اور ان کی جگہ اپنے ماموں زاد بھائی عبدالرحمٰن بن عامر بن کریز کو گورنر کے عہدہ پر مامور کر دیا۔

(**مصر**) مصر میں عمرو بن العاص والی تھے۔ حضرت عثمان نے عمر کی وصیت کے مطابق کچھ عرصہ تک انھیں برقرار رکھا اور اپنی حکمتِ عملی سے رفتہ رفتہ اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح (جس کا حال ہم اوپر تحریر کر چکے ہیں) کے لیے راستہ ہموار کرنا شروع کر دیا۔ پہلے افریقہ کی فتح کے لیے اسے سپہ سالار بنا کر بھیجا اور پھر افریقہ

---

[1] الفتنۃ الکبریٰ

کی فتح کے بعد اسے مصر کا والیٔ خراج بنا دیا اور عمرو بن العاص کی خدمات کو جنگی امور تک محدود کر دیا‘ اس طرح ایک صوبہ کے دو حاکم ہو گئے۔ اب تنازعات کا پیدا ہونا لازمی تھا اور جب تنازعات ظہور پذیر ہوئے تو حضرت عثمان نے عمرو بن العاص کو معزول کر کے عبداللہ بن سعد کو مکمل طور پر وہاں کا گورنر بنا دیا۔

(شام) شام میں عمر بن خطاب کے زمانے سے معاویہ بن سفیان گورنر تھا۔ اس کا شمار طلقاء میں ہوتا تھا اور اس کا اسلام بھی مہمل اور نام نہاد تھا۔ لیکن چونکہ یہ اموی تھا اس لیے قوم پرستی کے فطری تقاضوں کے تحت حضرت عثمان کی تمام مہربانیاں اس کے شامل حال رہیں معاویہ کے لیے عثمان نے اس صوبہ میں وسعت پیدا کی اور فلسطین و حمص کے صوبے بھی اس میں شامل کر دیے جب کہ عمر کے زمانہ میں یہاں الگ الگ عامل ہوا کرتے تھے۔

اگر حضرت عثمان کی دینی غیرت‘ ان کے قبائلی عصبیت پر غالب ہوتی تو وہ معاویہ کی طاقت کو مزید نہ بڑھاتے۔ معاویہ اور اس کی اولاد نے آلِ رسول پر جو مظالم ڈھائے ان سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں اور ساری دنیا واقف ہے۔ کیا حضرت عثمان اس ذمہ داری سے بچ سکتے ہیں۔

دورِ عثمانیہ کے اہم واقعات

قتل ہرمزان

فیروز (ابولولو) کے خنجر سے جناب عمر جس دن زخمی ہوئے اس کے

دوسرے دن عبدالرحمٰن بن ابوبکر نے عبیداللہ بن عمر سے بتایا کہ کل میں نے ابولولو، ہرمزان[۱] اور جفینہ[۲] ایک جگہ بیٹھ کر آپس میں کچھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا‘ یہ لوگ مجھے دیکھ کر منتشر ہونے لگے تو ایک دودھاری خنجر ان میں سے ایک کے پاس سے گرا تھا۔ عبدالرحمٰن بن ابوبکر نے خنجر کی شناخت بتائی تو عبیداللہ نے جو خنجر ابولولو سے عمر کے زخمی ہونے کے بعد چھینا تھا اس کو ویسا ہی پایا۔ اسے گمان ہوا کہ یہ تینوں افراد قتل عمر میں شریک تھے۔ اسی گمان اور شک و شبہ کی بنا پر عبیداللہ جنونی کیفیت کے ساتھ ہرمزان کے گھر گیا اور جاتے ہی اس کا کام تمام کر دیا، پھر جفینہ کے گھر پہنچا اور اسے قتل کر دیا اس کے بعد ابولولو کے گھر میں گھس کر اس کی یتیم لڑکی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جب انصار و مہاجرین کی بزرگ ہستیوں کو اس تہرے قتل کی اطلاع ملی تو وہ لوگ عبیداللہ کے پاس آئے اور بہت کچھ تہدید و تخویف کی۔ عبیداللہ نے جواب دیا کہ میں عجمیوں میں کسی کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اور اس کے ساتھ ہی بہت سے مہاجروں کو بھی قتل کروں گا۔ اس پر عبیداللہ

---

[۱] ہرمزان اہواز کا ایرانی صوبہ دار تھا جو حضرت عمر کے زمانہ میں فتح اہواز کے بعد اسیر ہو کر آیا تھا اور جناب عباس عم رسول اکرمؐ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا۔ بیت المال سے دو ہزار درہم اس کا سالانہ وظیفہ مقرر تھا اور جناب عباسؓ و دیگر بنی ہاشم کی پناہ میں رہتا تھا۔

[۲] عربی تاریخوں میں جفینہ اور فارسی تاریخوں میں جہینہ مرقوم ہے۔ یہ نصرانی تھا اور سعد بن ابی وقاص کا ہمنوا حامی تھا۔

اور سعد بن ابی وقاص میں سخت تو تو میں میں، گالم گلوچ، گتھم گتھا اور ہاتھا پائی ہوئی یہاں تک کہ سعد نے اس کی تلوار چھین لی، بال پکڑ کر دے مارا اور گھسیٹتا ہوا اپنے گھر لایا اور کمرے میں بند کر دیا۔ اور جب تک حضرت عثمان کی خلافت کے لیے شوریٰ ہوتا رہا صہیب نے اسے نظر بند رکھا۔ بیعت کے دوسرے دن عثمان کے سامنے اس تہرے قتل کا پہلا مقدمہ پیش ہوا۔

حضرت عثمان نے مہاجرین وانصار کو مجتمع کیا اور ان سے پوچھا کہ عبیداللہ بن عمر کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے جس نے ہرمزان جو مسلمان اور عبادت گزار تھا، جفینہ جو اللہ کے ذمہ اور سید ابرار کی پناہ میں تھا اور فیروز (ابولولو) کی یتیم و نابالغ لڑکی کو بے جرم و خطا صرف گمان پر بغیر دلیل و برہان کے قتل کیا اور دینِ محمدی میں فتنہ برپا کیا؟

تمام بنی ہاشم نے خون کے بدلے خون اور قتل کے بدلے قتل کا مطالبہ کیا۔ کچھ مہاجرین اور خاص کر حضرت علی علیہ السلام بھی قصاص میں عبیداللہ کو قتل کیے جانے کے حق میں تھے۔ اس کے برعکس عمرو بن العاص کے ساتھ ایک گروہ کثیر عبیداللہ بن عمر کا طرفدار بھی تھا۔ چنانچہ عمرو عاص نے کہا کہ لوگ چاہتے ہیں کہ کل باپ (عمر) مارا گیا اور آج بیٹا مارا جائے۔ اس پر دربار عثمانی میں بہت کچھ بحث و مباحثہ اور ہنگامہ ہوا تو عمرو عاص نے عثمان سے کہا کہ یہ واقعہ آپ کے خلیفہ ہونے سے پہلے کا ہے لہٰذا آپ کے لیے درگذر مناسب ہے۔ عثمان نے کہا ٹھیک ہے میں اس کی دیت بیت المال سے ادا کیے دیتا ہوں۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ تمھیں یہ مجاز نہیں ہے کہ دیت بیت المال سے

ادا کرو، اس پر عثمان نے کہا، اچھا میں دیت کی رقم اپنی جیب خاص سے ادا کیے دیتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے ادا کر دیا اور عبیداللہ بن عمر کو چھوڑ دیا۔

مندرجہ بالا اقتباسات تاریخ طبری، ابن اثیر، روضۃ الاحباب اور حبیب السیر سے ہم نے نقل کیے ہیں۔ اور طبقات ابن سعد میں ہے کہ:

جب عثمان خلیفہ بنا دیے گئے تو انھوں نے مہاجرین و انصار کو بلایا اور کہا کہ مجھے اس شخص (عبیداللہ ابن عمر) کے بارے میں مشورہ دو جس نے دین میں رخنہ پیدا کیا، مہاجرین نے اتفاق کر کے عثمان کو مقتولین کا والی بنا دیا۔ لوگوں کی اکثریت عبیداللہ کے ساتھ تھی جو جفینہ اور ہرمزان کے لیے کہتے تھے کہ وہ تو قتل ہوئے اب تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ عمر کے بعد ان کے بیٹے کو قتل کر دو۔

اس معاملے میں شوروغل اور اختلاف بہت ہو گیا۔ عمرو عاص نے عثمان سے کہا یہ واقعہ آپ کی خلافت کے آغاز سے پہلے کا ہے لہٰذا اسے درگذر کیجیے۔ عمرو کی تقریر سے لوگ منتشر ہو گئے، عثمان بھی باز آ گئے اور دونوں آدمیوں اور لڑکی کا خون بہا دے دیا گیا۔

ابی وجزہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ میں نے عبیداللہ بن عمر کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ عثمان سے ہاتھا پائی کر رہے تھے، عثمان کہہ رہے تھے کہ خدا تجھے غارت کرے، تو نے ایسے شخص کو قتل کیا جو نماز پڑھتا تھا اور چھوٹی بچی کو، ایک دوسرے شخص کو جو رسول اللہ کے ذمہ تھا، تیرا چھوڑنا حق نہیں ہے۔ پھر تعجب ہے کہ جس وقت وہ والی ہوئے انھوں نے اسے کیوں کر چھوڑ دیا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ عمرو عاص نے اس میں دخل اندازی کی اور انھوں نے ان کے کہنے پر

چھوڑ دیا۔

خلیفہ بننے سے پہلے عثمان کا یہ خیال تھا کہ اس تہرے قتل کے مجرم عبید اللہ کو چھوڑنا مناسب نہیں ہے مگر خلیفہ بننے کے بعد آپ نے عبید اللہ کو نہ صرف چھوڑا بلکہ خون بہا کی رقم بھی اپنے پاس سے ادا کرنے کو تیار ہو گئے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو یہ احساس ہوا ہو کہ یہ خلافت تو اسی کے باپ کی مرہون منت ہے اس لیے احسان مند اور حیادار خلیفہ کو تین معصوم جانوں کا قصاص لیتے ہوئے شرم آئی، کیوں کہ مقتولین غیر عرب تھے اور ان کا کوئی والی و وارث نہ تھا۔

حضرت ابوذر غفاری کی جلاوطنی

ابوذر غفاری مدینہ سے مشرق کی جانب واقع ایک چھوٹے سے گاؤں ربذہ کے رہنے والے تھے۔ آپ کا نام جندب ابن جنادہ تھا جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا حال سنا تو مکہ آئے اور پیغمبر کی خدمت میں باریاب ہو کر اسلام قبول کیا جس پر کفار قریش نے انھیں طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں مگر آپ کے ثبات قدم میں لغزش نہ آئی۔ اسلام قبول کرنے والوں میں آپ پانچویں نمبر پر ہیں۔ اس سبقتِ اسلامی کے ساتھ آپ کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ابوذر زہد و ورع میں عیسیٰؑ ابن مریم کی مثال ہیں۔

آپ حضرت عمر کے زمانۂ خلافت میں شام چلے گئے اور حضرت عثمان کے عہد خلافت میں وہیں مقیم تھے اور شب و روز ہدایت و تبلیغ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ امیر شام معاویہ کو آپ کی یہ

روش پسند نہ آئی چنانچہ وہ ان کے کھلم کھلا لے دے کرنے اور عثمان کی سرمایہ پرستی، اقربا پروری اور بے راہ روی کے تذکروں سے انتہائی بیزار تھا مگر کچھ بنائے نہ بنتی تھی۔ آخر کار اس نے عثمان کو لکھا کہ اگر ابوذر کچھ دنوں اور یہاں مقیم رہے تو اطراف کے تمام لوگوں کو آپ سے برگشتہ کر دیں گے لہٰذا اس کا انسداد ہونا چاہیے۔ اس کے جواب میں عثمان نے معاویہ کو لکھا کہ ابوذر کو کسی بے کجاوہ اور تیز رفتار اونٹ پر سوار کر کے کسی درشت مزاج، تندخو اور بے رحم و سنگدل رہبر کے ساتھ مدینہ کی طرف بھیج دو۔ چنانچہ حضرت ابوذر جب مدینہ پہنچے تو اذیت ناک سواری کی وجہ سے آپ کی رانوں کا گوشت جدا ہو چکا تھا اور صرف ہڈیوں کی سفیدی ظاہر ہو رہی تھی۔ لیکن مدینہ پہنچ کر بھی آپ کی زبانِ صداقت خاموش نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کو رسولؐ کا زمانہ یاد دلاتے۔ نظامِ حکومت پر طنز کرتے، سرمایہ داری کی مخالفت کرتے اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ کی بر سرِ عام مذمت کرتے۔

حضرت عثمان کے لیے جناب ابوذر کا یہ طرز عمل ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ آپ نے انھیں ایک دن بلایا اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تم کہتے ہو کہ جب بنی امیہ کی تعداد تیس ۳۰ تک پہنچ جائے گی تو اللہ کے شہروں کو اپنی جاگیر، اس کے بندوں کو اپنا غلام اور اس کے دین کو فریب کاری کا ذریعہ قرار دے لیں گے؟

ابوذر نے کہا کہ بے شک میں نے پیغمبرؐ اسلام سے یہ حدیث سنی ہے۔ عثمان نے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ پھر اپنے مصاحبین کو مخاطب کر کے پوچھا کہ کیا تم میں سے کسی نے پیغمبرؐ کی زبان سے یہ حدیث سنی ہے؟

سب نے جواب نفی میں دیا جس پر ابوذر نے فرمایا کہ اس حدیث کے بارے میں امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام سے پوچھا جائے وہی اس کی حقیقت بتائیں گے۔ چنانچہ حضرت علیؑ کو بلا کر دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ابوذر سچ کہتے ہیں۔ عثمان نے کہا کہ آپ کس بنا پر اس حدیث کی صحت کی گواہی دے رہے ہیں تو حضرت نے فرمایا کہ میں نے پیغمبرؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

"زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے ابوذر سے زیادہ سچ بولنے والا کوئی نہیں ہے"

اب عثمان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اگر جھٹلاتے تو پیغمبرؐ کی تکذیب لازم آتی لہٰذا پیچ و تاب کھا کر رہ گئے اور کوئی تردید نہ کر سکے۔ اب سرمایہ پرستی کے خلاف ابوذر کی صدائے احتجاج اور بلند ہونے لگی اور جب عثمان کو دیکھتے تو اس قرآنی آیت کی تلاوت فرماتے:

(ترجمہ) "جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے انھیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو کہ جس دن ان کا جمع کیا ہوا سونا اور چاندی دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیاں داغی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جسے تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا تھا تو اب ذخیرہ اندوزی کا مزہ چکھو"

حضرت عثمان نے اپنی طینت، فطرت اور عادت کے مطابق ابوذر کو بھی مال و زر کا لالچ دیا مگر اس طائر آزاد کو سنہری جال میں نہ جکڑ سکے۔ تشدد اور سختی سے بھی کام لیا مگر زبان بند نہ کر سکے۔ آخر کار عثمان

کی ظالمانہ روش نے اس حق پرست کو مدینہ چھوڑ دینے اور ربذہ کی طرف چلے جانے پر اپنے شاہی فرمان کے ذریعہ مجبور کر دیا۔ اور مروان کو اس امر پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ انھیں مدینہ سے باہر نکال دے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ قہرمانی فرمان بھی جاری ہوا کہ کوئی شخص ابوذر سے کلام نہ کرے اور نہ کوئی شخص الوداع کہے۔ مگر امیر المومنین حضرت علیؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ، عقیل، عبداللہ بن جعفر اور عمار یاسر نے اس قہرمانی فرمان کی کوئی پروا نہ کی اور اشک بار آنکھوں کے ساتھ رخصت کے لیے دور تک ابوذر کے ہمراہ آئے۔

جلاوطنی کے بعد ربذہ میں ابوذر کی زندگی انتہائی مصائب و آلام میں کٹی۔ آپ کے فرزند ذر اور اہلیہ نے یہیں انتقال کیا جو بھیڑ بکریاں گزارے کے لیے پال رکھی تھیں وہ بھی ہلاک ہو گئیں، صرف ایک بیٹی رہ گئی جو باپ کے ساتھ دکھوں اور فاقوں میں برابر کی شریک تھی۔ جب سر و سامان زندگی ناپید ہو گئے اور مسلسل فاقے پر فاقے ہونے لگے تو اس نے ابوذر سے کہا، بابا! یہ زندگی کے دن کیسے کٹیں گے کہیں آنا جانا چاہیے اور رزق کا سامان فراہم کرنا چاہیے۔ بیٹی کی اس تجویز پر ابوذر اسے ہمراہ لے کر صحرا کی طرف نکل کھڑے ہوئے مگر گھاس پھوس اور درختوں کے پتے بھی میسر نہ آسکے۔ آخر کار تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ صحرا کی ریت اکٹھا کی اور اس پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ اسی عالم میں سانسیں اکھڑ گئیں اور نزاعی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب ابوذر کی دختر نے یہ حال دیکھا تو سراسیمہ و مضطرب ہو کر کہنے لگی کہ باباجان! اگر آپ نے اس لق و دق صحرا میں انتقال فرمایا تو میں اکیلی کیوں کر کفن دفن کا انتظام کروں گی۔ آپ نے

فرمایا کہ بیٹی گھبراؤ نہیں، رسولؐ اللہ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اے ابوذر! تم عالمِ غربت میں انتقال کروگے اور کچھ عراقی تمھاری تجہیز و تکفین کریں گے لہٰذا بیٹی اگر میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو ایک چادر میرے اوپر ڈال دینا اور سرِراہ جاکے بیٹھ جانا، جب ادھر سے کوئی قافلہ گزرے تو کہنا کہ رسولؐ کے صحابی ابوذر نے انتقال کیا ہے۔

چنانچہ ابوذر کی رحلت کے بعد ان کی بیٹی سرِراہ جاکر بیٹھ گئی، کچھ دیر بعد ایک قافلہ گزرا جس میں ہلال بن مالک مزنی، احنف بن قیس تمیمی، اصعصعہ بن صوحان ابدی، اسود بن قیس تمیمی اور مالک بن حارث اشتر تھے۔ جب انھوں نے حضرت ابوذر کے انتقال کی خبر سنی تو اس بے کسی کی موت پر تڑپ اٹھے۔ سواریاں روک لی گئیں اور ان کی تجہیز و تکفین کے لیے سفر ملتوی کر دیا گیا۔ مالک اشتر نے جو کفن دیا اس کی قیمت چار ہزار درہم تھی۔ یہ لوگ تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دینے کے بعد رخصت ہوئے اور ابوذر کی بیٹی کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ یہ واقعہ ۸/ ذی الحجہ ۳۲ھ کا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ مالک اشتر اور ان کے ساتھیوں نے دفن کرنے کے بعد ابوذر کے لیے دعائے مغفرت کی اور عثمان کے اس ظلم کے خلاف اللہ سے فریاد اور ان کے حق میں بددعا کی۔

(طبری، خلافت فاروقی و عثمانی)

حضرت عمار بن یاسر پر عثمانی تشدد

آپ کا نام عمار اور والد کا نام یاسر تھا جو نسلاً یمنی تھے۔ آپ کی

والدہ سمیہ قبیلۂ مخزوم سے تھیں۔ آپ نے ابتدا ہی میں اپنے والدین کے ساتھ قبولیت اسلام کا شرف حاصل کیا اور اس کی پاداش میں کفار قریش کے ہاتھوں بڑے بڑے مصائب و آلام برداشت کیے۔ اہل قریش اپنے معبودوں (بتوں) کی تعریف و توصیف اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برا بھلا کہنے کے لیے آپ کو چلچلاتی دھوپ اور آگ اگلتی ہوئی گرم ریت پر دن دن بھر لٹائے رکھتے اور کہتے کہ ہم تمھیں اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک تم محمدؐ کی برائی اور ہمارے معبودوں کی توصیف و تعریف نہ کروگے مگر عمار کی پیشانی پر بل نہ آتا اور آپ کی زبان حمدِ الٰہی اور توصیفِ محمدی میں رطب اللسان رہتی۔ یہ حال دیکھ کر پیغمبرؐ کو صدمہ ہوتا اور وہ آپ اور آپ کے والدین کے لیے خدا سے رحمت کے طلبگار ہوتے۔ قرآن نے بھی آپ کے اسلامی ثبات اور سرمدی ایمان کے تذکرے کیے ہیں۔

حضرت عمار یاسر کو "ذوالہجرتین" کا خطاب دیا جائے تو غلط نہ ہوگا اس لیے کہ آپ نے دو ہجرتیں کی ہیں۔ پہلے حبشہ کی طرف اور پھر مدینہ کی طرف۔

دیگر صحابہ کی بہ نسبت مسجد نبوی کی تعمیر میں آپ کا حصہ زیادہ ہے، اس لیے کہ دیگر صحابہ اگر ایک اینٹ یا پتھر لاتے تو آپ دو لاتے تھے۔ جنگ خندق کے موقع پر خندق کی کھدائی اور تیاری میں بھی عام مسلمانوں سے زیادہ حصہ لیا اور ہر اسلامی جنگ میں پیغمبرِ اسلام کے دوش بدوش رہے، دیگر صحابہ کی طرح کسی جنگ کے میدان سے راہِ فرار نہیں اختیار کی۔

عمر بن خطاب نے اپنے دورِ خلافت میں آپ کو کوفہ کا گورنر مقرر فرمایا اور پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد معزول کر دیا اور پوچھا کہ اس معزولی سے آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟ عمار نے جواب دیا کہ جس وقت آپ نے مجھے گورنر بنایا تھا اس وقت بھی میں خوش نہیں تھا اور اب معزول ہو گیا ہوں تب بھی خوش نہیں ہوں۔ یہ تھی عمار کی صاف گوئی اور شانِ بے نیازی۔

حضرت ابوذر غفاری کے بعد عمار دوسرے صحابی تھے جنھوں نے حضرت عثمان کی بد عنوانیوں اور بے اعتدالیوں کے خلاف آوازِ احتجاج بلند کی اور اس کے بدلے مصائب و آلام میں مبتلا ہوئے۔

ایک دن حضرت عثمان نے بیت المال سے ایک انتہائی بیش قیمت ہیرا نکلوا کر اپنی کسی بیٹی یا بیوی کے زیور میں جڑوا دیا۔ لوگوں کو اس کا پتہ چلا تو انھوں نے عثمان پر لعنت ملامت کی اور غم و غصہ کا اظہار کیا۔ اس پر عثمان بھی طیش میں آ گئے اور انھوں نے بر سرِ عام یہ اعلان کیا کہ سارا مالِ غنیمت ہمارا ہے، ہم جو مناسب سمجھتے ہیں کرتے ہیں، کسی کا اس میں کیا اجارہ؟ اس پر حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تمھیں روک دیا جائے گا اور تمھارے اور بیت المال کے درمیان آڑ کر دی جائے گی۔

حضرت عمار یاسر بھی اس موقع پر موجود تھے، آپ نے فرمایا کہ میں اپنے خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اس معاملہ کی مخالفت کرنے والوں میں میرا نام سرِ فہرست ۔ ۔ م کر لیا جائے۔ بس اس جملے پر عثمان نے عمار کو گرفتار کرا لیا اور اپنے ہاتھوں سے اتنا مارا کہ آپ

بے ہوش ہو گئے۔

یہ پیغمبرؐ کا بے باک صحابی پھر بھی اپنی حق بیانی اور حق پرستی پر قائم رہا اور اس کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ ایک موقع پر کچھ صحابہ نے عثمان کو ایک خط لکھا اور اس میں انھیں ان کے طرزِ عمل پر ملامت و نصیحت کی۔ حضرت عمار یاسر یہ خط لے کر عثمان کے پاس آئے اور اس کا ابتدائی حصہ انھیں پڑھ کر سنایا۔ عثمان نے انھیں سخت و سست کہا، گالیاں دیں اور لاتوں اور گھونسوں سے بری طرح مارا پیٹا۔ اس وقت عثمان کے پیروں میں چرمی موزے تھے، یہاں تک کہ ایک ایسی لات حضرت عمار کے پیٹ پر پڑی کہ شکم کا پردہ پھٹ گیا جس سے اس بوڑھے صحابی کو فتق کی بیماری ہو گئی۔

مورخ اعثم کوفی کا بیان ہے کہ:

"حضرت ابوذر غفاری کے انتقال کی خبر جس وقت عثمان کو ملی، اس وقت عمار یاسر بھی عثمانی بزم میں موجود تھے، آپ نے "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن" کا کلمہ زبان پر جاری کیا اور فرمایا کہ ابوذر پر اللہ کی رحمت ہو، اے خدا! میں یہ دعا اس کیلیے دل و جان سے مانگتا ہوں کہ اسے بخش دیجیو۔ اس پر خلیفہ عثمان نے غصہ ہو کر کہا، اے نالائق! تیرا بھی یہی حال ہو گا۔ میں ابوذر کو مدینہ سے نکال دینے پر پشیمان نہیں ہوں..... عمار نے کہا، خدا کی قسم میرا یہ حال نہ ہو گا۔ عثمان نے کہا اسے دھکے دو اور شہر سے نکال دو اور اسی جگہ پہنچا دو جہاں ابوذر کو پہنچایا تھا..... عمار نے کہا، خدا کی قسم مجھے کتے اور بھیڑیوں کی ہمسائیگی تیرے پاس رہنے سے زیادہ پسند ہے۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت عثمان نے جناب یاسر کو بھی جلا وطن کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ خبر جب عام ہوئی تو قبیلۂ بنی مخزوم کے وہ لوگ جو حضرت عمار کے قریبی رشتہ دار تھے، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فریاد کی:

"آج ہم عثمان کی اس ناشائستہ گفتگو اور بے ہودہ فیصلہ کے سلسلہ میں آپ کے پاس آئے ہیں جو اس نے عمار کے بارے میں کیا ہے۔ اگر وہ عمار کو شہر سے باہر نکال دے گا تو ہمارے ہاتھوں بھی وہ حادثہ ظہور میں آجائے گا جس سے وہ تمام عمر پچھتائے گا۔"

حضرت علی علیہ السلام نے قبیلۂ بنی مخزوم کے اس وفد کے تیوروں کو محسوس کیا اور عثمان کے پاس آکر کہا:

تم نے اس سے پہلے ابوذر کو جو انتہائی نیک، پرہیزگار، متقی، سچا مسلمان اور حضرت رسولِ خدا کا بہترین صحابی تھا، مدینہ سے نکال دیا اور وہ بے چارہ بے کسی کی حالت میں پردیس (ربذہ) میں ہی چل بسا۔ تمھارے اس تشدد نے مسلمانوں کو برگشتہ کیا ۔۔۔ اب تم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ عمار کو بھی مدینہ سے نکال باہر کرو ۔۔۔ اللہ سے خوف کھاؤ اور اصحابِ پیغمبرؐ کو اذیتیں دینے سے باز آؤ۔ عثمان کو حضرت علیؑ کی یہ باتیں ناگوار گذریں۔ چنانچہ مورخ اعثم کوفی نے تحریر کیا ہے کہ عثمان نے غصہ سے بے قابو ہو کر حضرت علی سے بدکلامی کی اور آپ کو بھی مدینہ سے نکال دینے کی دھمکی دی۔ اس پر علیؑ نے عثمان کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے فرمایا کہ اگر تیرے دل میں یہ حسرت ہے، تو آزما کے دیکھ ۔۔۔ خدا کی قسم تمام فسادات تیری ذات سے ہیں اور

میں دیکھتا ہوں کہ تجھ سے ایسے امور سرزد ہو رہے ہیں جو حدودِ شریعت سے باہر ہیں۔ یہ کہہ کر آپ عثمان کے پاس سے چلے آئے اور پھر عثمان نے عمار کی جلاوطنی کا فیصلہ ترک کر دیا۔

عبداللہ بن مسعود

عبداللہ بن مسعود کا تعلق قبیلۂ بنی زہرہ سے تھا۔ آپ سابقین مسلمین میں سے تھے۔ آپ ہی نے سب سے پہلے بلند آواز سے قرآن مجید کی تلاوت کی، اس سے پہلے کسی کی یہ ہمت نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ کفار قریش نے آپ کو اس فعل پر اتنا مارا تھا کہ آپ لہولہان ہو گئے تھے۔ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد سے آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت و فرمانبرداری کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ آپ پیغمبر اسلامؐ کے کفش بردار بھی تھے۔ آپؐ کی نعلین پیروں میں پہناتے اور آپ کے ساتھ آگے آگے چلتے۔ آپ نے دو ہجرتیں کیں، پہلی حبشہ کی طرف اور دوسری ہجرت مدینہ کی طرف۔ جنگ بدر سے لے کر اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ رفتار و گفتار اور طور و طریق میں رسولؐ کے مشابہ تھے[1]

حضرت عمر نے انھیں امورِ دین کی تعلیم دینے کے لیے اور جناب عمار کو حاکم بنا کر کوفہ بھیجا تھا اور کوفے والوں کو تحریراً یہ تاکید کی تھی کہ تم

---

[1] مسند احمد ج ۵ ص ۳۸۹، بخاری مناقب ابن مسعود، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۱۵ و ۳۲۰، کنز العمال ج ۷، ص ۵۵

لوگ ان دونوں حضرات کی پیروی کرنا اور ان کی باتوں پر عمل کرنا۔[1]

ابن مسعود اہل کوفہ کو قرآن اور دین کی تعلیم دیتے رہے، یہاں تک کہ جب ولید کوفہ کا گورنر مقرر ہو کر آیا تو آپ اس وقت بیت المال کے خزانچی بھی تھے۔

ولید نے بیت المال سے کچھ قرض لیا اور جب ایک مدت تک اس نے وہ قرض کی رقم ادا نہیں کی تو آپ نے اس سے واپسی کا تقاضہ کیا۔ ولید نے اس کی شکایت عثمان سے کی چنانچہ عثمان نے ابن مسعود کو لکھا:

"تم صرف ہمارے خزانچی ہو۔ ولید نے بیت المال سے جو رقم لی ہے اس کا تقاضہ نہ کرو۔"

یہ شاہی حکم جب موصول ہوا تو خوددار عبداللہ بن مسعود نے بیت المال کی کنجیاں ولید کے سامنے پھینک دیں اور کہا کہ میں اپنے آپ کو تمام مسلمانوں کا خزانچی تصور کرتا تھا، تمہارا خزانچی ہونا مجھے منظور نہیں ہے۔ چنانچہ کنجیاں پھینکنے کے بعد آپ کوفہ ہی میں مقیم رہے۔[2]

علامہ بلاذری رقم طراز ہیں:

ولید کے سامنے عبداللہ بن مسعود نے جب بیت المال کی کنجیاں پھینکیں تو یہ جملہ بھی کہا:

"جو شخص شریعت میں الٹ پھیر کرے گا اسے خدا بھی الٹ دے گا

---

[1] استیعاب ج۱ ص ۴، ۴، ج۲ ص ۳۶۴، اصابہ ج ۲ ص ۳۶۹، اسد الغابہ ج۳ ص ۲۸۵ [2] انساب الاشراف ج ۵ ص ۳۶

اور جو تبدیلی کا مرتکب ہوگا وہ اللہ کے قہر وغضب میں آئے گا۔ تمہارے "صاحب" (عثمان نے الٹ پھیر بھی کیا ہے اور تبدیلی کے مرتکب بھی ہوئے ہیں۔ ورنہ کیا رسولؐ کے صحابی سعد بن ابی وقاص اس قابل تھے کہ انھیں معزول کیا جاتا؟ اور کیا تم اس قابل تھے کہ تمھیں مسلمانوں پر حاکم مقرر کیا جاتا؟

آپ اکثر یہ بھی کہا کرتے:

"سب سے زیادہ صحیح قول اللہ کی کتاب ہے اور سب سے عمدہ ہدایت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت ہے اور بدترین امور (شریعت میں) نئی باتیں ہیں اور ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور گمراہی کا ٹھکانا جہنم ہے۔"

ولید بن عقبہ نے ان تمام باتوں کے بارے میں عثمان کو لکھا کہ ابن مسعود آپ پر الزام عائد کرتے ہیں اور اہل کوفہ کے درمیان برا بھلا کہتے ہیں۔ عثمان نے ولید کو یہ پیغام بھیجا کہ عبداللہ بن مسعود کو کسی سرکش اور درشت خو رہبر کے ساتھ میرے پاس روانہ کر دو۔ چنانچہ ابن مسعود جب وارد مدینہ ہوئے اور عثمان سے ملنے کی غرض سے مسجد میں آئے تو اس وقت عثمان منبر پر خطبہ فرما رہے تھے۔ ابن مسعود پر نگاہ پڑی تو گویا ہوئے:

"لوگو! تمہارے درمیان وہ جانور آیا ہے جو اپنی خوراک کو پیروں تلے روندتا ہے اور اس پر لید کرتا ہے۔"

حضرت عائشہ نے اپنے حجرے سے پکار کر کہا:

"عثمان! خدا کا خوف کر۔ صحابیٔ رسولؐ کی شان میں ایسی

گستاخی کرتا ہے"۔

لیکن عثمان نے عائشہ کی ایک نہ سنی اور ابن مسعود کو گرا کر پیروں تلے روند ڈالا جس سے آپ کی پسلیاں شکستہ ہوگئیں۔ اکثر نے یہ کہا ہے کہ عثمان کے اشارے پر عبداللہ بن زمعہ نے ابن مسعود کو پٹک دیا۔ بعض کا یہ کہنا ہے کہ عثمان کے غلام محموم نے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر زمین پر دے مارا جس سے آپ کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

اس ظلم کے بعد بھی عثمان کو چین نہ آیا چنانچہ آپ نے ابن مسعود پر مزید ستم یہ کیا کہ وظیفہ بند کر دیا اور مدینہ سے باہر جانے پر مکمل پابندی عائد کر دی۔

بلاذری کا کہنا ہے کہ جب ابن مسعود مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو عثمان ان کی عیادت کو آئے اور دونوں میں باہم اس طرح گفتگو ہوئی:

عثمان: —— آپ کو کیا تکلیف ہے؟

ابن مسعود: —— اپنے گناہوں کا خوف ہے۔

عثمان: —— آپ کیا چاہتے ہیں؟

ابن مسعود: —— اپنے پروردگار کی رحمت۔

عثمان: —— آپ کا وظیفہ پھر جاری کر دوں؟

ابن مسعود: —— جب ضرورت تھی تو بند کر دیا، اب ضرورت نہیں تو جاری کرنے پر آمادہ ہیں۔

عثمان: —— آپ کے بچوں کے کام آئے گا۔

ابن مسعود: —— میرے بچوں کا کفیل خدا ہے۔

عثمان: —— میری بخشش کے لیے خدا سے دعا کیجیے۔

ابن مسعود: —— میں خدا سے دعا کروں گا کہ وہ آپ سے میرا انتقام لے۔

تاریخ ابن کثیر میں ہے کہ جب عثمان نے یہ کہا کہ وظیفہ آپ کے بچوں کے کام آئے گا تو ابن مسعود نے فرمایا کہ آپ میرے بچوں کی ناداری کا اندیشہ نہ کریں، میں نے انھیں تاکید کر دی ہے کہ وہ ہر رات سورۂ واقعہ کی تلاوت کرے گا وہ کبھی فقر و فاقہ میں مبتلا نہیں ہوگا۔[1]

عثمان جب چلے گئے تو ابن مسعود نے وصیت کی کہ وہ میری نمازِ جنازہ نہ پڑھائیں۔ چنانچہ جب آپ نے انتقال کیا تو کسی نے عثمان کو خبر تک نہ دی۔ عمار یاسر نے نماز جنازہ پڑھی اور یہ برگزیدہ صحابی ۳۲ھ میں دنیا سے رخصت ہو کر آنحضرتؐ سے جا ملا۔

عثمانی فتوحات

حضرت عمر کے استبدادی دور میں حکومت کے نمک خوار سپہ سالاروں، جرنیلوں اور فوجی کمانڈروں نے عرب کے ننگے اور بھوکے قبائل کے ساتھ مل کر ملک گیری اور مالِ غنیمت کے نام پر غیر اسلامی فتوحات کا جو لامتناہی سلسلہ قائم کیا تھا، اس کا تسلسل حضرت عثمان کے دور میں بھی برقرار رہا۔ چنانچہ ۲۵ھ میں عثمان نے والیٔ مصر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے نام یہ شاہی فرمان جاری کیا کہ وہ افریقہ کی طرف پیش قدمی کرے اور اس کے تمام علاقوں کو اپنے مفتوحہ علاقوں میں شامل کرلے۔

---

[1] ابن کثیر ج ۷، ص ۱۶۳

اس فرمان کے بموجب عبداللہ بن سعد ایک کثیر فوج لے کر تیونس کی طرف روانہ ہوا مگر وہ اس مہم میں ناکام رہا۔ سنہ ۲۷ھ میں عثمان نے ایک لشکر جس میں صحابہ کی ایک بڑی تعداد شامل تھی، عبداللہ کی مدد کو بھیجا تاکہ وہ تیونس پر دوبارہ حملہ کر کے اس پر فتح حاصل کرے، چنانچہ تیونس فتح ہوا۔ اس کے بعد اسپین فتح ہوا۔ اسی سال معاویہ نے بحری راستے سے قبرص پر چڑھائی کر کے اسے فتح کیا جب کہ حضرت عمر کے دور میں معاویہ کی نگاہیں قبرص پر تھیں لیکن چونکہ عمر بحری جنگ سے ڈرتے تھے اس لیے انھوں نے اجازت نہیں دی تھی۔ اسی سنہ میں ارجان وغیرہ فتح ہوئے۔ سنہ ۲۹ھ میں اصطخر اور قساو وغیرہ فتح ہوئے۔ سنہ ۳۰ھ میں خراسان اور اس کے بیشتر شہر نیشاپور، طوس، سرخس، مرو اور بیہق وغیرہ مفتوحہ ممالک میں شامل ہوئے۔ آذربائیجان کا علاقہ جو حضرت عمر کے دور میں فتح ہو چکا تھا، پھر باغی ہو گیا۔ اس بغاوت کو ولید بن عقبہ نے سختی سے کچل دیا اور وہاں کے لوگوں سے آٹھ لاکھ درہم سالانہ خراج پر صلح ہوئی۔

بہرحال، عثمانی فتوحات کا تذکرہ اس کروفر سے کیا جاتا ہے جیسے یہ تمام فتوحات انھیں کی تدبیر اور فراست کا نتیجہ ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ فتوحات ورثہ ہیں اس جنگی معاشرے کا جو حضرت عمر کے دور میں پوری طرح تشکیل پا چکا تھا، فوجی چھاونیاں قائم ہو چکی تھیں جن میں لاتعداد ملازم پیشہ فوج رہتی تھی جسے مصروف رکھنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ عثمان کی فتوحات، عمر بن خطاب کے عہد کی جنگوں کا تسلسل تھیں اور ان فتوحات اور کامرانی کا سہرا صوبائی

گورنروں، سپہ سالاروں اور جرنیلوں کے سر ہے نہ کہ عثمان کے۔ البتہ ایک نئی جارحیت عثمانی دور میں شروع ہوئی اور وہ تھی بحری جنگوں کی جس میں سیرتِ شیخین کا کوئی دخل نہ تھا اور نہ آپ کی حوصلہ مندی ہی کارفرما تھی۔ یہ مہم تو صرف بنی امیہ کے سفاک اور غاصب گورنر معاویہ بن ابوسفیان کی جاہ پسندی کا نتیجہ تھی۔

مسجد نبوی کی توسیع

علامہ جلال الدین سیوطی کا کہنا ہے:

"سنہ ۲۹ھ میں حضرت عثمان نے مسجد نبوی کی توسیع کی اور تراشیدہ پتھروں سے اس کی تعمیر عمل میں لائی گئی۔ ستون بھی پتھروں کے بنوائے گئے اور چھت میں ساگوان کی لکڑی استعمال کی گئی اور مسجد کا طول ۱۶۰ ہاتھ اور عرض ۱۵۰ ہاتھ رکھا گیا۔" (تاریخ الخلفاء)

مسجد الحرام کی توسیع

حضرت عثمان نے سنہ ۲۶ھ میں حرم کعبہ کی تجدید اور توسیع کا حکم دیا۔ پہلے تو انھوں نے آس پاس کے لوگوں سے ان کے مکانات اور زمینوں کو خریدنے کا قصد کیا مگر جب کچھ لوگوں نے انکار کیا تو ان کے گھروں کو زبردستی مسمار کرا دیا اور انھوں نے فریاد کے ذریعہ جب انصاف کا مطالبہ کیا تو آپ نے انھیں قید خانوں میں ڈال دیا۔ بعد میں عبداللہ بن خالد کی سفارش پر بمشکل تمام انھیں رہا کیا۔ (طبری)

خلیفہ کی حیثیت سے مسجد نبوی اور مسجد الحرام کی تجدید و توسیع

عثمان کا فرض تھا، لیکن اللہ کے بندوں کے گھروں کو مسمار و تاراج کر کے اللہ کے گھر کی تعمیر و توسیع کہاں تک جائز اور درست ہے؟ کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے؟

جمعِ قرآن

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت کے ایک سال کچھ ماہ بعد جنگ یمامہ شروع ہوئی جس میں ستر حفاظ قرآن قتل کر دیے گئے۔ اس سانحۂ عظیم کے بعد حضرت ابوبکر سے عمر نے فرمایا کہ اگر تنہا حفاظ پر قرآن کے تحفظ کا انحصار کیا گیا اور جنگِ یمامہ کی طرح دیگر جنگوں میں حفاظ قتل ہوتے رہے تو پھر قرآن کی بقا کا مسئلہ پیچیدہ ہو جائے گا اور قرآن میں کمی واقع ہو جانے کا احتمال رہے گا، مناسب ہے کہ قرآن لکھوا کر جمع کرا دینا چاہیے۔ تمام صحابہ نے بھی حضرت عمر کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ زید بن ثابت کو اس کام کی تکمیل کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ انھوں نے تمام حفاظ کو جمع کیا اور جن جن کے پاس قرآنی آیتیں لکھی ہوئی تھیں ان کو بعد تحقیق ایک جلد میں نقل کر کے جمع کیا۔ وہ نسخہ حضرت ابوبکر کے پاس رہا، ان کے بعد حضرت عمر کے پاس رہا اور عمر کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی حفصہ کے قبضہ میں آیا۔

چونکہ عہدِ خلفائے ثلاثہ میں مسلسل فتوحات نے اسلام کو دور دراز ممالک اور علاقوں میں پہنچا دیا تھا، اس لیے زبان کے لحاظ سے علاقائی فرق کا قرآن کی تلاوت و قرات پر اثر انداز ہونا ایک لازمی امر تھا جسے

جنگی مہمات کے دوران عثمانی عاملوں نے بھی محسوس کیا اور حذیفہ یمانی نے عثمان کو یہ مشورہ دیا کہ حفصہ کے پاس جو نسخہ ہے اس کی نقلیں کرا کے انھیں تشہیر کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ اس کام کے لیے حضرت عثمان نے ایک چار رکنی کمیٹی تشکیل دی اور اس میں زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبداللہ بن حارث بن ہشام کو نامزد کر کے زید بن ثابت کو اس کا انچارج بنایا اور انھیں حکم دیا کہ ایک ایسا معیاری نسخہ تیار کیا جائے جس کی بنیاد قریش کی قرات پر ہو۔

اس کمیٹی نے حفصہ کے پاس جو نسخہ تھا اس سے نیز دیگر حفاظ کی حفظ کی ہوئی آیتوں سے تقابل کر کے تحقیق و جستجو کے بعد سات نسخے تیار کیے اور انھیں عراق، شام، مصر اور دیگر بلاد اسلامیہ بھجوا دیے اور اصل نسخہ حفصہ کو واپس کر دیا۔

اب یہاں حسب ذیل باتیں غور طلب ہیں:

۱۔ یہ کہ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام جو بقول رسولِ خداؐ امت میں سب سے بڑے عالم اور "باب شہر علم" تھے، ان کے جمع کیے ہوئے قرآن کو ابوبکر، عمر اور عثمان نے قبول کیوں نہیں کیا؟

۲۔ جب حضرت علیؑ نے اپنا جمع کیا ہوا قرآن حضرت عثمان کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اسے مسترد کیوں کر دیا؟

۳۔ حضرت عثمان نے جمعِ قرآن کا کام ایسے لوگوں کے ذمہ کیوں کیا جو اس کے اہل نہ تھے۔

ان تمام باتوں کے ذیل میں ہم سب سے پہلے اراکینِ قرآن کمیٹی

کے حالات کا جائزہ لیں گے

زید بن ثابت : زید میں قرآن جمع کرنے کی صلاحیت، اہلیت اور قابلیت قطعی نہیں تھی وہ اس کام کو پہاڑ سرکانے سے بھی زیادہ مشکل سمجھتے تھے۔ سنہ ۱ھ میں ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ جمع قرآن کا کام سنہ ۱۱ھ میں جنگِ یمامہ کے بعد ہوا، اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال کی تھی۔

ابو وائل بن شفیق بن مسلم سے اعمش نے روایت کی ہے کہ جب حضرت عثمان نے زید بن ثابت کو قرآن کی تدوین کا حکم دیا تو عبداللہ بن مسعود نے ایک خطبہ مسلمانوں کے سامنے دیا جس میں انھوں نے کہا کہ عثمان مجھے حکم دیتے ہیں کہ میں قرآن کو زید بن ثابت کے مطابق پڑھوں۔ خدا کی قسم جب میں نے رسولِ خداؐ سے ستر سورتیں اخذ کیں تو اس وقت زید بن ثابت بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا۔[۲]

ایک دن عمر بن خطاب، زید بن ثابت کے پاس آئے۔ زید اس وقت اپنی کنیز سے اپنے سر میں کنگھی کرا رہے تھے، عمر کو دیکھا تو سر کھینچ لیا اور کہا کہ آپ نے کیوں زحمت کی، مجھے بلوا لیتے میں خود حاضر ہو جاتا۔ اس پر عمر نے کہا کہ یہ وحی نہیں ہے کہ تم اس میں زیادتی یا کمی کرو بلکہ یہ ایک رائے مشورہ کی بات ہے اگر موافقت کرو تو بہتر ہے ورنہ کچھ نہیں۔ زید نے انکار کیا تو عمر خفا ہو کر چلے گئے۔[۳]

---

[۱] استیعاب ترجمہ زید بن ثابت ص ۱۱۹۴ [۲] استیعاب جز اوّل ترجمہ عبداللہ بن مسعود ص ۳۷۳ [۳] ازحد السارق ص ۴۴۴

آخر الذکر روایت سے پتہ چلتا ہے کہ زید بن ثابت "وحی" کے معاملہ میں کمی اور زیادتی کرتے تھے۔

عبداللہ بن زبیر: آپ حضرت ابوبکر کے نواسے تھے۔ سنہ ۲ھ میں پیدا ہوئے۔ جمع قرآن کے وقت ان کی عمر ۲۳ سال کی تھی۔

سعد بن عاص: سعد بن عاص کا تعارف گذشتہ صفحات میں مرقوم ہو چکا ہے۔ یہ بنی امیہ میں سے تھے۔ سنہ ۱ھ میں پیدا ہوئے جمع قرآن کے وقت ان کی عمر ۲۳ یا ۲۴ سال کی تھی۔[۱]

عبداللہ بن مسعود کے قول نیز دیگر روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ جمعِ قرآن کمیٹی کے اراکین زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر اور سعد بن العاص کی عمریں ۲۲ اور ۲۴ سال کے درمیان تھیں۔ عبداللہ بن مسعود جنھوں نے براہ براہِ راست رسول اکرمؐ سے ستر سورتیں اخذ کی تھیں، ان کی موجودگی میں نوخیز، نوعمر اور نااہل لونڈوں کو قرآن جمع کرنے کا اہم اور محتاط کام سپرد کرنا انتہائی حیرت انگیز و تعجب خیز بات نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

حضرت علی علیہ السلام کے جمع کردہ قرآن کو مسترد کر دینے کی تہہ میں اہل بیت رسولؐ بالخصوص حضرت علیؑ سے بغض و عناد کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اگر آپ کا جمع کردہ قرآن قبول کر لیا جاتا اور نافذ کر دیا جاتا تو اسلام کی تباہی و بربادی کا منصوبہ ابتدائی مراحل میں ہی ختم ہو جاتا۔ اصل مقصد تو اسلام میں تفریق و انتشا

---

[۱] استیعاب فی معرفۃ الصحابہ جزء الثانی ص ۵۵۵

پیدا کرنا تھا اور رسول اکرمؐ اپنی حیات میں ہی فرما چکے تھے کہ میرے بعد اسلام میں تہتّر فرقے ہو جائیں گے۔ آپؐ کی رحلت کے بعد آپ کے اہل بیتؑ پر حکومت وقت کی مقتدر ہستیوں نے جو انسانیت سوز مظالم ڈھائے ان سے تاریخ کے اوراق پُر ہیں۔ اگر حضرت علیؑ کا قرآن قبول کر لیا جاتا تو مزید تفسیر کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوتی اور نہ مدنی آیتیں مکی آیتوں میں نہ مکی آیتیں مدنی آیتوں میں خلط ملط ہوتیں۔ اس کے علاوہ ناسخ و منسوخ آیتوں کی تمیز میں بھی دشواری نہ ہوتی۔ کم سن اور نا اہل لونڈوں کے ذمہ یہ اہم کام سپرد کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلحاظ ترتیب نزول آیتوں کو مرتب نہ کیا جا سکا۔ حضرت علیؑ نے رسولؐ اللہ کی زبانِ مبارک سے ہر آیت کی تفسیر جس طرح سنی تھی اسی طرح آپ نے اپنے جمع کردہ قرآن کے حاشیہ پر تحریر فرما دیا تھا، اس کو ترک کر دینے سے ہر کس و ناکس کو یہ موقع ملا کہ وہ اپنے قیاس پر تفسیر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مفسر کی تفسیر دوسرے مفسر کی تفسیر سے نہیں ملتی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ عقیدے بدلے اور تہتّر فرقے عالم وجود میں آ گئے۔ کیا اسلام میں اس تخریبی عمل کی ذمہ داری ان خلفاء پر عائد نہیں ہوتی جو حضرت علیؑ کے قرآن کو مسترد کرنے کے ذمہ دار ہیں؟

حضرت عثمان کے اس کارِ خیر کا سب سے بڑا تاریک پہلو یہ ہے کہ آپ نے باقی تمام قرآنی نسخے چاروں طرف سے اکٹھا کرا کے ان میں آگ لگوا دی اور جل کر خاک ہو گئے [1] عبداللہ بن مسعود نے اپنا

[1] تاریخ تذکرۃ الکرام ص ۲۳۔

صحیفہ عثمان کے حوالے کرنے سے انکار کیا تو انھیں بری طرح مارا پیٹا گیا اور ان سے زبردستی وہ نسخہ چھین کر نذر آتش کر دیا گیا۔[1]

منیٰ میں عثمانی نماز

کتابِ خدا، سنتِ رسولؐ اور روایاتِ متواترہ سے ثابت ہے کہ سفر کے دوران نماز قصر ہو جاتی ہے خواہ وہ خوف و دہشت کا عالم ہو یا سکون و اطمینان کا۔ چنانچہ رسولِ اکرمؐ نے اپنی حیات میں "قصر" کے اس عمل کو جاری رکھا اور آپ کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکر و عمر بھی اسی سنت رسولؐ پر عمل پیرا رہے۔ تاریخوں سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ حضرت عثمان بھی اپنی خلافت کے ابتدائی ایام میں اسی سنت رسولؐ اور سیرتِ شیخین پر کاربند رہے لیکن بعد میں نہ جانے کون سی دماغی رگ پھڑک گئی کہ آپ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور قرآن و سنت کے مقابلہ میں اپنے جاہلانہ اجتہاد سے کام لیتے ہوئے اسے ترک کر دیا۔ چنانچہ مسلم نے اپنی صحیح میں ابن عمر سے روایت کی ہے:

> "ابن عمر کہتے ہیں کہ منیٰ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے قصر نمازیں پڑھیں لیکن حضرت عثمان نے اتمام کیا۔"

> "حارث بن وہب سے مروی ہے کہ ہم نے رسولؐ اللہ کے ساتھ منیٰ میں انتہائی سکون کے عالم میں نماز قصر پڑھی ہے۔" (بخاری، مسلم)

[1] تاریخ تذکرۃ الکرام ص ۲۳۔

"عبدالرحمن بن یزید سے مروی ہے کہ حضرت عثمان نے منیٰ میں نماز تمام پڑھی تو اس کی اطلاع ابن مسعود کو کی گئی انھوں نے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھ کر فرمایا کہ یہ خلافِ سنتِ رسولؐ و سیرتِ شیخین ہے۔" (بخاری و مسلم)

مسلم کی دیگر روایات:

"حضرت انس سے روایت ہے کہ میں نے رسولِؐ خدا کے ساتھ مدینہ میں تمام اور ذوالحلیفہ میں قصر نماز پڑھی۔"

"حضرت انس سے یہ روایت بھی ہے کہ میں مدینہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ تک آنحضرت کے ساتھ رہا اور آپ برابر قصر پڑھتے رہے۔"

"حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے مکہ میں ۱۹ دن تک قصر نمازیں پڑھیں۔"

"ابن ابی شیبہ سے روایت ہے کہ آنحضرت نے نیک کردار افراد کی نشانیوں میں قصر کو بھی ذکر فرمایا ہے۔"

"یعلیٰ بن امیہ نے حضرت عمر سے پوچھا کہ ہم لوگ امن کی حالت میں اپنی نمازیں کیوں قصر کریں، انھوں نے کہا کہ میں خود اسی الجھن میں تھا لیکن آنحضرتؐ سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ قصر صدقۂ خدائی ہے اسے قبول کرو۔"

مسلم میں یہ روایت بھی ہے:

"زہری کہتے ہیں کہ میں نے عروہ سے پوچھا کہ عائشہ کو یہ کیا ہوگیا ہے کہ وہ سفر میں پوری نماز پڑھتی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ عائشہ نے عمر کی طرح تاویل کر لی ہے۔"

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب و سنت اور سیرتِ شیخین کی حضرت عثمان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی، نیز حضرت عائشہ بھی اس عثمانی فعل میں شریک تھیں۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان نماز کے اجزا میں بھی تخفیف کر لیا کرتے تھے اور سجدہ میں جاتے وقت یا بلند ہوتے وقت تکبیر کو ترک کر دیا کرتے تھے جیسا کہ امام احمد بن حنبل نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے:

"انھوں (عمران بن حصین) نے کہا، میں نے علیؑ کی امامت میں نماز ادا کی تو میں نے کہا کہ آپ نے مجھے رسولؐ اور دونوں خلفاءؓ کی نماز یاد دلادی۔ میں حضرت کے پیچھے پہلی صف میں تھا جب آپ رکوع میں جاتے اور بلند ہوتے تو تکبیریں کہتے مگر عثمان نے انھیں اس وقت ترک کر دیا تھا جب وہ بوڑھے ہو گئے تھے اور ان کی آواز نحیف ہو گئی تھی۔" (مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۴۴۰)

اسی طرح سنت نبیؐ برباد ہوئی اور اس کی جگہ سنت خلفاء اور سنت صحابہ نے لے لی اور یہ اسلام میں ایک بدعت ہے اور ہر بدعت ضلالت ہے اور ہر ضلالت کا نتیجہ جہنم ہے۔

MOWLANA NASIR DEVJANI
MAHUVA, GUJARAT, INDIA
PHONE : 0091 2844 28711

(آٹھواں باب)

سیرتِ شیخین

گذشتہ صفحات میں ہم یہ تحریر کر چکے ہیں کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں صحابیت، انصاریت اور قرابت کو تزویری چالوں سے شکست ہوئی اور "دم کٹے اجماع" کی بدولت ابوبکر خلیفہ بن گئے۔

اس اجماع کو نافہم مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے سیرتِ شیخین سے تعبیر کرتے ہوئے حجت قرار دیا، مگر جب حضرت ابوبکر نے وقتِ آخر حضرت عمر کو ان کی تزویری کوششوں کا ثمر انھیں وصیت نامہ کی شکل میں دے کر اپنے بعد کا خلیفہ بنایا تو یہ اجماع ختم ہوگیا اور سیرت کے "ٹکڑے مصلحت کی ہوائیں اڑ گئے۔ اب اس دوسری روش کو مسلمان کیا کہیں؟ سیرت یا سنت؟ لیکن یہ بھی اس وقت فنا کے گھاٹ اتر گئی جب حضرت ابولولو کے خنجر نے عمر کی زندگی پر موت کا سایہ ڈالا۔ اب نہ اجماع رہا نہ نص اور نہ وصیت، بلکہ شوریٰ کا طریقہ رائج ہوا اور اس میں جان بوجھ کر ایسی شخصیتوں کو نامزد کیا گیا جن کے توسل سے خلافت بنی ہاشم کے بجائے حتمی طور پر بنی امیہ تک پہنچے اور جب ایسا ہوگا تو بنی امیہ کی دیرینہ دشمنی بنی ہاشم کو چین نہ لینے دے گی کیونکہ دولت، طاقت اور اقتدار سب کچھ بنی امیہ کے ہاتھوں

میں ہوگا اور بنی ہاشم اس سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوں گے۔

یہ وہ خاموش اور سیاسی انتقام تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ان کے قتل کا ارادہ کرنے والے اور ان کی بزم میں بیٹھنے والے نے لیا۔ چنانچہ اسی انتقامی کارروائی کی بنیاد پر حضرت عثمان بن عفان مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ بن بیٹھے محض اس ظاہری و زبانی اقرار پر کہ وہ سیرتِ شیخین پر عمل کریں گے۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے شاید واقف تھے کہ "سیرتِ شیخین" صرف آلِ رسولؐ سے دشمنی اور عداوت کا نام ہے۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ حضرتِ عثمان نے سیرتِ شیخین کے ساتھ ساتھ سنت رسولؐ کو بھی پامال کر دیا اور جن ملعونوں کو آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں جلاوطن کر دیا تھا انھیں پھر عزت و احترام کے ساتھ مدینہ واپس بلا لیا جب کہ ابوبکر و عمر نے یہ جسارت نہیں کی۔

اگر ہم حضرتِ عثمان کے اس غلط اقدام کو سیرتِ شیخین سے تعبیر کریں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیخین کی سیرت یہ تھی کہ حضرت عثمان رسولؐ اللہ کی مخالفت کرتے، ورنہ حکم بن عاص اور مروان بن حکم کو، جن پر پیغمبرؐ نے لعنت کی تھی اور یہ کہہ کر انھیں مدینہ سے نکالا تھا کہ ان کے ہاتھوں میری امت تباہی و بربادی میں مبتلا ہوگی، واپس کیوں بلاتے؟

بعض مورخین کا خیال ہے کہ پیغمبرِ اسلام نے حکم اور اس کے بیٹے مروان کو طائف کی طرف جلاوطن کیا تھا اور بعض کا کہنا ہے کہ انھیں آنحضرت نے جلاوطن کر کے ربذہ روانہ کیا تھا۔ چنانچہ تاریخ خمیس

میں ابن خلکان کے حوالے سے یہ روایت ہے:

"جب عثمان کی بیعت ہو چکی تو انھوں نے حضرت ابوذر غفاری رحمۃ اللہ علیہ کو ربذہ میں پھنکوا دیا صرف اس خطا پر کہ وہ لوگوں کو ترک دنیا کا درس دیا کرتے تھے اور حکم بن عاص کو جسے رسولؐ نے ربذہ میں پھنکوایا تھا، مدینہ واپس بلا لیا حالانکہ یہ کام نہ حضرت ابوبکر نے کیا اور نہ حضرت عمر نے۔"[1]

اس روایت سے ظاہر ہے کہ حضرت عثمان نے حضرتِ ابوذر غفاری کو اسی مقام پر جلاوطن کیا جس مقام پر رسولؐ اکرم نے حکم بن عاص اور اس کے بیٹے مروان کو پھنکوایا تھا۔ کیا حضرت عثمان کا یہ فعل رسولؐ اللہ سے صریحی انتقام نہ تھا؟ کیا اس عثمانی طرزِ عمل کو دنیا کے مسلمان سیرتِ شیخین کا نام دے سکتے ہیں؟

دوسرے یہ کہ حضرت عثمان کے تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی بنی امیہ کی بن آئی۔ بیت المال کا دروازہ ان کے لیے کھول دیا گیا اور کنبہ پروری وصلہ رحمی کے پہرے میں اسلامی خزانہ لوٹا جانے لگا۔ دولت کے فرش پر کیف و سرور، عیش و نشاط اور شراب و کباب کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ ذلیل و پست گھرانوں کے نوخیز، نوعمر اور بدکردار "لونڈوں" کو اصحاب رسولؐ پر مقدم کیا جانے لگا۔ صحابہ معزول کیے گئے۔ ابوموسیٰ اشعری کو بصرہ سے ہٹا کر عثمان نے ان کی جگہ عبداللہ بن عامر کو مقرر کیا، مصر سے عمرو عاص کو ہٹایا تو اس کی جگہ اپنے رضاعی بھائی عبداللہ

---

[1] تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۸۸

بن سعد بن ابی سرح کا تقرر کیا، حالانکہ اس کے مرتد ہونے کی وجہ سے پیغمبرؐ اسلام نے اس کا خون مسلمانوں کے لیے مباح اور جائز کر دیا تھا۔ کوفہ سے عمار کو ہٹایا، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی اہم تبدیلیاں کیں جس میں انھوں نے ہر لحاظ سے اپنے قرابت داروں کو ملحوظ خاطر رکھا۔ مسلمان سوچیں، سمجھیں اور فیصلہ کریں کہ کیا یہ سیرتِ شیخین تھی؟ لطف کی بات تو یہ ہے کہ عثمان نے سیرتِ شیخین اور سنتِ رسولؐ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جب حکم بن عاص کو مدینہ میں بلایا تو اسے بیت المال سے ایک لاکھ درہم بھی مرحمت کیے۔ کیا یہ مسلمان تھا؟ اسی طرح حارث بن حکم کو بازارِ مدینہ کی آمدنی کا ایک حصہ اور مروان بن حکم کو افریقہ کا خمس اور فدک ہبہ کر دیا، کیونکہ یہ دونوں آپ کے داماد تھے۔ عبداللہ بن خالد جب ملنے آیا تو اسے چار لاکھ درہم عطا کیے۔ ولید بن عقبہ (جسے قرآن نے فاسق کہا ہے) کو ایک لاکھ درہم اور ابوسفیان بن حرب کو دو لاکھ درہم سے سرفراز کیا۔

صحابیٔ رسولؐ ابوموسیٰ کا بیان ہے کہ عمر کے دورِ خلافت میں جب سونا، چاندی یا زیورات وغیرہ باہر سے آتے تھے تو وہ انھیں مسلمانوں میں تقسیم کرتے تھے لیکن ایک مرتبہ جب میں اس قسم کی چیزوں کو لے کر عثمان کے پاس پہنچا تو انھوں نے سارا مال اپنی بیویوں اور لڑکیوں کے حوالے کر دیا۔ اس طرزِ عمل پر مجھے بے حد صدمہ ہوا اور میں نے ان سے کہا آپ سے پہلے تو یہ نہیں ہوتا تھا کہ مسلمانوں کا مال خلیفہ کی بیویوں اور بیٹیوں کی ملکیت بن جائے۔ اس پر انھوں نے جواب دیا کہ عمر اپنی رائے سے کام کرتے تھے اور میں اپنی رائے پر چلتا ہوں۔

کیا یہ سیرتِ شیخین تھی؟

حضرت عثمان کے دور میں زید بن ثابت بیت المال کے انچارج تھے۔ انھوں نے ایک دن عثمان سے اس رقم کا تذکرہ کیا جو سالانہ اخراجات کے بعد بیت المال کی تحویل میں باقی تھی۔ عثمان نے زید بن ثابت سے فرمایا کہ وہ تم لے لو۔ جب کہ اس رقم کی تعداد ایک کرور درہم سے زیادہ تھی۔ کیا انھیں بدعنوانیوں اور بے ایمانیوں کا نام سیرتِ شیخین ہے؟

اس کے علاوہ حضرت عثمان نے سنتِ رسولؐ اور سیرتِ شیخین کے خلاف جو اقدام کیے ان کی مختصر فہرست میں ام المومنین حضرت عائشہ کے وظیفے میں تخفیف، عبداللہ بن مسعود اور ابوذر غفاری کے وظائف کا بند کیا جانا، اشتر صحابئ رسولؐ کو مع بیس آدمیوں کے مدینہ سے باہر نکلوانا اور انھیں قید کرنا۔ رسولؐ کے برگزیدہ صحابیوں کو جلاوطن کرنا، ابن مسعود کو پٹوانا اور قرآن کا جلوانا، عمار یاسر کو بری طرح زدوکوب کرانا، عبداللہ بن عمر پر باوجود اس کے کہ وہ ہرمزان، جفینہ اور ابولولو کی دو کم سن و یتیم بچیوں کے قاتل تھے، شرعی حد نہ جاری کرنا اور منیٰ میں قصر کے بجائے پوری نماز ادا کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے علاوہ بھی دیگر عثمانی لغزشوں اور خطاؤں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ یہی وہ سیرتِ شیخین تھی جسے ٹھکرا کر امیر المومنین حضرت علی بن طالب علیہ السلام نے شوریٰ میں خلافت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

مسلمانوں میں ہیجان

تشدد، مظالم، جبر، استبداد، تذلیل صحابہ، کنبہ پروری اور نفس پرستی کے ساتھ ساتھ عام رعایا کے جائز امور میں غفلت، لاپروائی، سستی اور کاہلی نے عثمان کے خلاف مسلمانوں میں اضطراب و بے چینی کی لہر پیدا کر کے انھیں ایک ہیجانی صورت حال سے دوچار کر دیا تھا۔ ہر شخص پیچ و تاب کھا رہا تھا اور ان کی بے راہ روی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ ابوذر غفاری کی توہین و تذلیل اور ان کی جلاوطنی کے سبب سے بنی غفار اور ان کے حلیف قبائل، عبداللہ بن مسعود کی پسلیاں تڑوانے اور ان کا قرآن جلوانے کی وجہ سے بنی ہذیل اور ان کے حلیف بنی زہرہ، عمار یاسر کو بے دردی سے پٹوانے کے باعث بنی مخزوم اور ان کے حلیف قبیلے اور محمد بن ابوبکر کے قتل کا سروسامان کرنے کی وجہ سے بنی تیم کے دلوں میں غم و غصہ کا ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ دوسرے صوبوں کے مسلمان بھی عثمانی عمّال کے ہاتھوں نالاں اور پریشان تھے۔ یہ لوگ دولت کی سرشاریوں اور بادۂ عشرت کی سرمستیوں کی بنا پر جو چاہتے تھے کر گزرتے تھے۔ نہ ان کے دلوں میں خوفِ خدا تھا نہ مرکز کی طرف سے عتاب کا ڈر تھا اور نہ کسی بازپرس کا اندیشہ۔ لوگ ان کے پنجۂ استبداد سے نکلنے کے لیے پھڑپھڑاتے تھے مگر کوئی ان کے کرب و اذیت کی صدائیں سننے کے لیے آمادہ نہ ہوتا تھا۔ نفرت کے جذبات ابھر رہے تھے مگر انھیں دبانے کی کوئی فکر نہ کی جاتی تھی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین ان عثمانی عمّال کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"یہ عمّال ایسی حکومت کے اہل نہ تھے جس کا نظام اسلامی اصولوں یعنی عدل و انصاف، مساوات اور پابندیٔ عہد پر قائم ہو، جس کا وعدہ عثمان نے قوم سے کیا تھا کہ وہ قرآن و سنت اور سیرتِ ابوبکر و عمر پر قائم رہیں گے اور اس سے کسی قسم کا انحراف نہیں کریں گے۔ بلکہ یہ اہل تھے اس حکومت کے کہ جس کا نظام قوت، شوکت، دبدبہ، غرور اور جبر و استبداد پر قائم ہو۔"

(الفتنۃ الکبرٰی)

صحابہ بھی بددل تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ امن عالم تباہ، نظم و نسق تہ و بالا اور اسلامی خدوخال مسخ کیے جا رہے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی خاموش نہ رہ سکے اور جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو انھوں نے حضرت عائشہ کی سربراہی میں عثمان کو کافر قرار دے دیا اور ان کے قتل کی زمین ہموار کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

حضرت عثمان سے حضرت عائشہ کا اختلاف

خلیفۂ ثانی کے عہدِ خلافت میں حضرت عائشہ کی ذات عمر کی خصوصی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ انھوں نے ان کے ساتھ امتیازی اور ترجیحی سلوک روا رکھے۔ وظائف و عطایا میں یہ تمام ازواجِ رسولؐ پر مقدم تھیں۔ عمر نے شرعی احکام اور فقہی مسائل میں بھی انھیں اقتدار کا مالک بنایا اور رفتہ رفتہ وہ قوت و طاقت دے دی کہ یہ

محترمہ بعد میں آنے والے ہر حاکم سے ٹکرائیں اور اس کے لیے دردِ سر بن گئیں۔ چنانچہ آپ نے نہ صرف عثمان کا تختہ الٹا بلکہ حضرت علیؑ سے بھی برسرِ پیکار ہوئیں۔

تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ خلافت عثمانیہ کے ابتدائی دور میں چند برسوں تک آپ کی زبان بند رہی اور عہدِ شیخین کی طرح حکومت کی تائید و حمایت کا سلسلہ بھی آپ کی طرف سے جاری رہا۔ چنانچہ آپ کی بیان کردہ وہ حدیثیں جن میں حضرت عثمان کی توصیف و ثنا ہے اور قتل کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، اسی ابتدائی دور کی معلوم ہوتی ہیں۔ ممکن ہے ذیل کی حدیث بھی اسی دور سے متعلق ہو جس میں آپ فرماتی ہیں:

"رسولؐ اللہ میرے ساتھ..... ایک چادر میں لیٹے ہوئے تھے کہ میرے والد (ابوبکر) نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ پیغمبرؐ نے انھیں اجازت دے دی، وہ آئے اور باتیں کر کے چلے گئے رسولؐ اللہ میرے ساتھ اسی طرح چادر میں لیٹے رہے۔ پھر عمر نے اجازت طلب کی، وہ بھی آئے اور چلے گئے اور ہم دونوں اسی چادر میں بدستور لیٹے رہے۔ پھر عثمان آئے اور انھوں نے اذنِ حضوری چاہی تو آپ کپڑے درست کرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ عثمان کے چلے جانے کے بعد میں نے رسولؐ اللہ سے پوچھا کہ ابوبکر جب آئے تو آپ اسی طرح لیٹے رہے، عمر آئے بھی اور گئے بھی مگر آپ اسی طرح محوِ استراحت رہے۔ مگر جب عثمان آئے تو آپ نے کپڑے درست کیے اور اٹھ بیٹھے؟ فرمایا عثمان ایک

حیادار شخص ہیں اگر میں اسی حالت میں لیٹا رہتا تو وہ اپنی بات نہ کہہ پاتے[۱]۔

مسلم کی روایت میں ہے کہ:

"پیغمبرؐ نے عثمان کے آنے پر عائشہ سے فرمایا کہ تم اپنے کپڑے درست کر لو[۲]"

اس حدیث کی صحت یا عدم صحت پر میں کوئی گفتگو یا کسی قسم کا تبصرہ مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ پیغمبرؐ کے بارے میں عائشہ کی زبان سے بہت سی تعجب خیز و حیرت انگیز اور غیر شائستہ حدیثیں بیان ہوئی ہیں جن کی بدولت "رنگیلا رسولؐ" جیسی کتابیں عالم وجود میں آگئیں۔ بظاہر یہ حدیث عثمان کو حیادار بنانے کے لیے ان کی فضیلت میں بیان ہوئی ہے لیکن اس میں سب سے بڑا اشکال یہ ہے کہ ابوبکر کی موجودگی میں حضرت عائشہ کی غیرت نے یہ کیونکر گوارا کیا کہ وہ شوہر کے ساتھ زیر چادر پڑی رہیں جب کہ ابوبکر عائشہ کے باپ بھی تھے اور باپ و بیٹی کے رشتہ کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ اپنے والد کا پاس و لحاظ اور ادب و احترام کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے آنحضرت کے پہلو سے الگ ہو جاتیں۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ آنحضرت نے عثمان کے آنے پر کپڑے بھی درست کیے اور اٹھ کر بیٹھ بھی گئے مگر ابوبکر یا عمر کے سامنے نہ شرم محسوس کی نہ ندامت اور نہ بستر سے اٹھنے کی ضرورت۔ آخر اس بے تکلفی

---

[۱] مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۱۶۷، کنز العمال ج ۵ ص ۳

[۲] صحیح مسلم ج ۷، ص ۱۷ باب فضائل عثمان

کی کیا وجہ تھی؟ آنحضرتؐ کی نظروں میں اگر عثمان حیادار تھے تو کیا اس موقع پر سرکارِ دو عالم ابوبکر و عمر کو بے حیا تصور فرما رہے تھے؟

بہر حال گمان یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت عثمان کے ابتدائی دورِ خلافت کی ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں خلفائے ثلاثہ کا ذکر بھی اسی ترتیب سے ہے جس ترتیب سے وہ تختِ خلافت پر متمکن ہوئے۔

غرض کہ حضرت عثمان کی خلافت کے ابتدائی دور میں حضرت عائشہ ان کی سرگرم حمایتی رہیں، ان کی اطاعت کرتی رہیں اور ان کی مخالفت کا خیال بھی ان محترمہ کے دل میں نہیں تھا، یہاں تک کہ جب عائشہ اور دیگر ازواج نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا تو حضرت عائشہ نے ضروری سمجھا کہ پہلے عثمان سے اجازت حاصل کر لیں۔ چنانچہ خود آپ کا بیان ہے کہ:

"جب عمر مر گئے اور عثمان خلیفہ ہوئے تو ام سلمہ، میمونہ، ام حبیبہ اور میں نے عثمان سے حج کی اجازت مانگی، عثمان نے کہا کہ عمر کی طرح میں بھی تمھارے ساتھ حج کرنا چاہتا ہوں، جو بھی میرے ساتھ چلنا چاہے چلے۔ پھر عثمان نے ہم سب کے ساتھ حج کیا"[۱]

وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت عثمان اور حضرت عائشہ کے درمیان اختلاف کی ابتدا کب سے ہوئی۔ عام طور پر مورخین کا خیال ہے کہ حضرت عمر نے اپنے زمانے میں تمام ازواج رسولؐ کے دس دس ہزار کی رقم بطور وظیفہ مقرر فرمائی تھی اور ترجیحی بنیاد پر حضرت

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۲۰۹

عائشہ کے بارہ ہزار مقرر کیے تھے، جب عثمان کا زمانہ آیا تو انھوں نے عائشہ کے وظیفے میں دو ہزار کی تخفیف کر کے اسے بھی دس ہزار کر دیا تاکہ معاملہ مساوی رہے۔ یہ فعل عائشہ کو ناگوار گزرا اور وہ عثمان پر سخت برہم ہوئیں۔ یہیں سے دونوں کے درمیان اختلاف کی ابتدا ہوئی اور رفتہ رفتہ اسی اختلاف نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔

حضرت عائشہ ہی وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے عثمان کے قتل پر لوگوں کو ابھارنے اور متحد کرنے میں نبیؐ کی زوجیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور یہ کہہ کر کہ "اس نعثل کو قتل کر دو کیونکہ یہ کافر ہو گیا ہے"[1] دنیائے اسلام میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ بلاذری کا کہنا ہے:

"حضرت، عائشہ کی پہلی وہ ذات ہے جس نے ان (عثمان) کی مخالفت میں آواز بلند کی، ان کے مخالفین کی جائے پناہ بنی اور ان سے آمادہ پیکار لوگوں کی قیادت کی۔ اس وقت پورے مملکت اسلامیہ میں حضرت ابوبکر کے خاندان (بنی تیم) سے بڑھ کر حضرت عثمان کا کوئی دشمن نہ تھا۔"[2]

حضرت عائشہ کے اختلاف کا سبب وظیفہ میں تخفیف کے علاوہ حضرت عثمان کی وہ زیادتیاں، وہ مظالم اور وہ تشدد بھی ہو سکتا ہے جس سے تمام اصحاب اور مسلمان نالاں تھے۔ طلحہ و زبیر کی وہ ملی بھگت بھی ہو سکتی ہے جس کے ذریعہ وہ امارت کے خواہاں تھے اور جس کی تصویر جنگ جمل کے موقع پر عثمان کے قتل کے بعد ابھر کر سامنے آ چکی تھی۔

---

[1] تاریخ کامل ج ۳ ص ۸۰ [2] انساب الاشراف ج ۵ ص ۶۸

بہرحال جو کچھ بھی ہو، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کی ذات وہ خاموش چنگاری تھی جس نے خلافت ثالثہ کی پوری عمارت کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا۔ پھر الگ کی الگ رہیں، مگر تاریخ ان واقعات پر خاموش نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ مورخین نے سب کچھ لکھ مارا۔

اختلاف کی اس آگ کو جن واقعات نے اپنے دامن کی ہوا دے کر بھڑکایا اور شعلوں میں تبدیل کیا ان میں سب سے پہلا واقعہ ولید بن عقبہ کا ہے۔

حضرت عثمان نے اپنے دور خلافت میں سعد بن ابی وقاص کو معزول کر کے ولید بن عقبہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ ولید بن عقبہ عثمان کا سوتیلا بھائی تھا۔ یہ مانا ہوا فاسق تھا، اور اس کے فسق کی گواہی قرآن نے دی ہے، جب کہ سعد بن ابی وقاص وہ شخص تھے جنھوں نے حضرت عمر کے حکم سے کوفہ کی بنیاد ڈالی تھی اور وہاں اسلامی فوجوں کو آباد کیا تھا۔ ایران کی جنگ میں بھی سعد، ان افواج کے سپہ سالار تھے اور انھیں کے زیرِ قیادت ایران فتح ہوا تھا جس کی وجہ سے اسلامی لشکر میں ان کی محبوبیت و مقبولیت بہت زیادہ تھی، لوگ احترام کرتے تھے اور انھیں عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب ولید گورنر ہو کر آیا تو سعد نے اس سے کہا:

"ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارے بعد تم عقلمند ہو گئے یا ہم احمق۔"

اس پر ولید نے جواب دیا

آپ گھبرائیے نہیں، یہ بادشاہت ہے۔ یہاں ایک قوم صبح کا ناشتہ کرتی ہے تو دوسری شام کا کھانا کھاتی ہے۔

سعد نے کہا، قسم ہے خدا کی کہ تم لوگ خلافت کو بادشاہت بنا کر ہی دم لوگے[1]

اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ عثمان نے ایسے شخص کو مسلمانوں پر گورنر کی حیثیت سے مسلط کیا تھا جو خلافت کو بادشاہت کے دائرے میں محدود سمجھتا تھا۔

سعد کی معزولی اور ولید کی تقرری تمام مسلمانوں کو ناگوار گزری۔ لوگوں نے کہا:

"عثمان نے بہت بڑی تبدیلی کی ہے کہ ابو اسحاق (سعد) جو نرم مزاج، مہربان، عالم، صالح اور صحابیٔ رسولؐ تھے، کو معزول کر کے اپنے فاسق و فاجر اور احمق بھائی کو ہم مسلمانوں پر حاکم مقرر کیا ہے۔"

ولید بن عقبہ نے کوفہ کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے عبداللہ بن مسعود کو اپنے پیکانِ استبداد کا نشانہ بنایا جیسا کہ ہم تحریر کر چکے ہیں کہ ولید کی شکایتوں پر حضرت عثمان نے ابن مسعود کو اتنا پٹوایا کہ ان کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ اس صحابیٔ رسولؐ کی داستانِ مصائب کو سن کر مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر کا پیدا ہونا ایک فطری عمل تھا۔

ولید کے جرائم کی طولانی فہرست میں مساجد کی بے حرمتی بھی شامل ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ابوالفرج اصفہانی کا بیان ہے:

"حضرت عثمان نے جب ولید کو کوفہ کا گورنر بنا کر بھیجا تو

[1] طبقات حالات ولید، استیعاب، اسد الغابہ، کنز العمال وغیرہ

(نصرانی شاعر) "ابو زبید" بھی اس کے پاس آیا۔ ولید نے اسے مسجد سے ملحق عقیل بن ابی طالب کے گھر میں اسے ٹھہرایا۔ ولید نے عقیل سے کہا، "یہ گھر مجھے دے دیجیے۔" انھوں نے وہ گھر اس کے نام کر دیا اور ابو زبید اسی میں رہنے لگا۔ کوفہ والوں کے نزدیک ولید کی یہ پہلی قابل اعتراض حرکت تھی، کیونکہ ابو زبید اپنے گھر سے نکل کر (جوتا پہنے ہوئے) مسجد کے درمیان سے چلتا ہوا ولید کے پاس پہنچتا، اس کے ساتھ شراب پیتا، گپ شپ کرتا اور پھر پلٹتا تو نشہ کی حالت میں جھومتا ہوا مسجد کے درمیان ہی سے گزرتا اور اپنے گھر میں چلا جاتا۔ کوفہ والوں نے ولید کو جب اس کی طرف متوجہ کیا تو بجائے کچھ کہنے کے اس نے ابو زبید کو شام اور حیرہ کی بہت بڑی جائداد دے دی۔[1]

بلاذری کا کہنا ہے:

"ولید نے ابو زبید کے لیے سور کے گوشت اور شراب کا کوٹہ بھی مقرر کر دیا تھا جو اسے برابر ملتا تھا۔"[2]

دوسرا واقعہ ایک یہودی ساحر کا ہے جسے مسعودی نے لکھا ہے:

"ولید نے کوفہ کے نواح میں رہنے والے ایک یہودی شعبدہ باز اور جادوگر کے بارے میں جب سنا تو اسے بلوایا اور مسجد کوفہ میں اس کی شعبدہ بازی اور جادوگری کے مظاہرے کا اہتمام کیا۔ اس نے ولید کو کچھ شعبدے دکھلائے وہ یہ کہ اس نے ایک بہت

[1] آغانی ج ۴ ص ۱۵۳ [2] کتاب الانساب ج ۵ ص ۲۹۔۳۱

بڑا ہاتھی دکھلایا جو صحن مسجد میں گھوڑے کی پیٹھ پر تھا۔ پھر وہ اونٹ بن گیا جو پہاڑ پر چل رہا تھا، پھر اس نے ایک گدھے کی صورت اختیار کی اور جس کے منہ میں داخل ہوا پاخانے کے مقام سے باہر نکل گیا۔ پھر اس نے ایک شخص کی گردن ماری، جسم و سر علیحدہ علیحدہ کر دیے۔ پھر تلوار پھیری تو وہ آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔[1]

تماشے کے وقت کچھ اہلِ کوفہ بھی وہاں کھڑے ہوئے یہ جادو دیکھ رہے تھے ان میں جندب بن کعب ازدی بھی موجود تھے وہ لاحول پڑھنے لگے، ولید پر لعنت کی اور تلوار نکال کر اس جادوگر یہودی کا سر تن سے جدا کر دیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے کو پھر سے زندہ کر لو۔ محفل درہم برہم ہو گئی اور تماشائیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ولید نے جندب کو قتل کرنا چاہا مگر قبیلۂ ازد مانع ہوا۔ غرض کہ جندب قید کر دیے گئے۔ قید خانے کے داروغہ نے جب جندب کو رات بھر عبادت میں مصروف دیکھا تو کہا، قید خانے سے نکل بھاگو ورنہ ولید صبح ہوتے ہی تمھیں قتل کر دے گا۔ جب صبح ہوئی تو ولید نے جندب کو قید خانے سے بلوایا مگر وہ غائب تھے داروغہ سے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ نکل بھاگے۔ ولید نے داروغہ کو قتل کر دیا۔[2]

مساجد کی بے ادبی و بے حرمتی میں ولید کا شراب پی کر نشہ کی حالت میں صبح کی دو رکعت کے بجائے چار رکعت نماز پڑھانے اور مصلّٰی پر قے کرنے کا واقعہ بھی شامل ہے جس کے بارے میں مسعودی کا کہنا

[1] و [2] مروج الذہب ج۱ ص ۴۳۷

ہے کہ ولید کی اس حرکت پر نمازیوں نے اس پر پتھراؤ کر دیا اور وہ کراہتا ہوا دارالامارہ میں داخل ہو گیا۔[1]

ولید کی انھیں تمام باتوں اور بے راہ روی کی شکایتیں لے کر ابو زینب، جندب، ابن زبیر اور ابو حبیبہ غفاری وغیرہ عثمان کے پاس پہنچے اور انھیں تمام حالات سے آگاہ کیا۔ عثمان نے جندب سے پوچھا کہ تم نے اپنی آنکھوں سے میرے بھائی کو شراب پیتے دیکھا ہے؟ جندب نے کہا، میں صرف اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ نشہ میں چور تھا اور اس نے مصلّٰی پر شراب کی قے کی۔ میں نے بدمستی کی حالت میں اس کی انگلی سے انگوٹھی اتاری اور اسے پتہ بھی نہ چلا۔ اس واقعہ کی صداقت کے ثبوت میں وہ انگوٹھی عثمان کے سامنے پیش کی گئی لیکن انھوں نے کوئی توجہ نہ کی اور الٹے شکایت کنندگان کو ڈانٹا، پھٹکارا اور ان کے سینوں پر ہاتھ مار کر کہا کہ دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ یہ لوگ مایوس ہو کر حضرت عائشہ کی خدمت میں آئے اور ان سے سارا ماجرا بیان کیا اور کہا، ہم ولید کی شکایت لے کر عثمان کے پاس آئے تھے لیکن اُلٹے پھٹکارے گئے۔[2]

زہری سے منقول ہے:

"کوفہ کے کچھ لوگ ولید کی شکایت لے کر عثمان کے پاس آئے تو انھوں نے کہا کہ تم لوگ جب اپنے حاکم سے ناراض ہوتے ہو تو اس پر جھوٹی تہمتیں اور غلط الزام عائد کرتے ہو۔ صبح ہونے دو،

[1] مروج الذہب ج ۵ ص ۴۳۵ [2] انساب الاشراف ج ۵ ص ۲۳

تم لوگوں کو سخت سزائیں دوں گا۔ ان لوگوں نے حضرت عائشہ کی پناہ لی۔ صبح ہوئی تو عثمان نے عائشہ کے گھر سے آوازیں سنیں اور کہا کہ عراق کے فاسقوں اور خارجیوں کے لیے عائشہ کے گھر کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ عثمان کی یہ بات عائشہ کے کانوں میں بھی پہنچی، انھوں نے پیغمبرؐ کی نعلین اٹھا کر عثمان کو مخاطب کیا اور کہا، تم نے اس نعلین پہننے والے کی روش چھوڑ دی ہے۔ باہم تکرار شروع ہوئی یہاں تک کہ آوازیں سن کر لوگ اکٹھا ہوگئے، بعض کہتے تھے کہ عائشہ سچ کہتی ہیں اور بعض کا کہنا تھا کہ عورتوں کو اس سے کیا مطلب؟ مردوں کے ساتھ ان کی ڈھیلے بازی اور جوتی بیزار کیسی[1]؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عائشہ اور عثمان کے درمیان اس معاملے کو لے کر بڑی "توتو، میں میں" ہوئی۔ آپس میں ایک دوسرے پر جوتے پھینکے گئے اور خوب دھینگا مشتی ہوئی[2]۔ پیغمبرؐ کے بعد مسلمانوں کے درمیان یہ پہلا جھگڑا اور فساد تھا۔

ان واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اکابرین صحابہ اور حق پرست مسلمان حضرت عثمان کے طرزِ عمل سے نالاں تھے اور حضرت عائشہ ان کی قائد تھیں۔ انھیں کی طاقت و قوت تھی کہ انھوں نے عوام کو عثمان کے خلاف متحد و منظم کر دیا تھا ایسے وقت میں جبکہ

---

[1] آغانی ج ۴ ص ۱۷۸ [2] انساب الاشراف ج ۵ ص ۳۳، تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۲۰۳، الاستیعاب حالات ولید

دنیا کی نگاہیں رسول اللہؐ کے تبرکات دیکھنے کو ترس رہی تھیں آپ نے پیغمبرؐ کی نعلین مبارک نکال کر لوگوں میں ہیجان برپا کر دیا اور ایسی آگ لگا دی جو عثمان کے خون سے بجھی۔

مسلمانوں میں دو گروہ ہو گئے، ڈھیلے بازی ہوئی، جوتے چلے اور آخر کار حضرت عائشہ عثمان پر غالب آکر رہیں، انھیں رائے عامہ کے سامنے سر جھکانا پڑا اور ولید معزول کر کے سزا دینے کے لیے مدینہ بلا لیا گیا۔

یہ سیاسی واقعات میں سے ایک واقعہ تھا جس میں ام المومنین حضرت عائشہ کو عثمان کے خلاف قدم اٹھانا پڑا۔ دوسرا اہم واقعہ جس میں انھوں نے پوری طرح حصہ لیا، عمار یاسر کا تھا۔ حضرت عمار کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

"عمار یمن کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد یاسر مکہ میں آئے۔ حذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سمیہ سے ان کی شادی کر دی، عمار اسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین اشخاص اسلام لا چکے تھے۔ قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ یہ بیہوش ہو جاتے۔ ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا۔ حضرت عمار کی والدہ سمیہ کو اسلام لانے کے جرم میں ابوجہل نے برچھی ماری جس سے وہ ہلاک ہو گئیں، یاسر عمار کے والد تھے یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہو گئے"[1]

---

[1] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۶۸

حضرت عمار یاسر کی مختصر سرگذشت تحریر ہوچکی ہے۔ حضرت عثمان نے پیغمبرؐ کے اس بوڑھے صحابی پر متعدد بار مظالم کے پہاڑ توڑے۔ پہلا موقع وہ تھا جب عمار حضرت ابوذر غفاری کے دل گداز واقعہ پر اندوہ گیں ہوئے۔ چنانچہ یعقوبی کا کہنا ہے کہ:

"جب عمار کو ابوذر کے انتقال کی خبر ملی تو وہ اس وقت عثمان کی بزم میں تھے، آپ بے حد ملول ہوئے اور فرمایا، خدا ہم سب کی طرف سے ابوذرؒ پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ اس پر عثمان نے عمار کو گندی گندی گالیاں دیں اور کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ابوذر کی جلاوطنی یا ان کے انتقال پر شرمندہ ہوں[1]؟"

پھر خلیفہ کا قہری حکم ہوا اور حضرت عمار یاسر گدی میں ہاتھ دے کر باہر نکال دیے گئے۔ عثمان نے ان کو بھی ربذہ میں جلاوطن کرنے کا تہیہ کیا، لیکن قبیلۂ بنی مخزوم اور حضرت علیؑ کی دخل اندازی نے انھیں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا، دوسرا موقع وہ تھا جب عمار یاسر، صحابۂ کرام کا شکایت نامہ لے کر عثمان کے پاس گئے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ:

"طلحہ، زبیر اور مقداد بن عمر بن عمر نے بہت سے صحابۂ کرام کے مشورے سے عثمان کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کی تمام قابلِ اعتراض حرکتیں تحریر کی گئیں اور یہ تنبیہ کی گئی کہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے تو ہم بھی کسی اقدام کے لیے مجبور ہوں گے[2]۔"

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۵۰ [2] کتاب الانساب ج ۵ ص ۴۹

حضرت عمارؓ یہ نوشتہ لے کر قاصد کی حیثیت سے عثمان کے پاس گئے اور اس کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا۔ بس پھر کیا تھا، عثمان آگ بگولا اور غیظ و غضب میں آپے سے باہر ہوگئے۔ غلاموں کو حکم دیا، عمار جکڑ لیے گئے۔ عثمان نے عمار کے آلۂ تناسل پر اتنی ٹھوکریں ماریں کہ وہ بے ہوش ہوگئے اور انھیں عارضۂ فتق ہوگیا۔

تیسرا واقعہ وہ ہے جب عثمان نے بیت المال کے خزانے سے ایک انتہائی بیش قیمت موتی نکال کر اپنی بیوی کو دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل بلاذری کے قلم کی زبان سے سنیے:

"بیت المال میں ایک صندوقچہ تھا جس میں زیور اور ایک انتہائی بیش قیمت موتی تھا۔ عثمان نے بیت المال سے وہ صندوقچہ نکال کر زیور اور موتی اپنی کسی بیوی کو دے دیا۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا اور عثمان کو سخت سست کہا تو وہ غصہ کی حالت میں منبر پر گئے اور تقریر کی جس میں کہا کہ ہم بیت المال سے اپنی ضرورت کے مطابق لے کر رہیں گے۔ حضرت علی نے فرمایا، ایسی صورت میں آپ روک دیے جائیں گے اور آپ کے اور بیت المال کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے گی۔ عمار یاسر نے کہا، میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں وہ پہلا شخص ہوں جسے یہ تصرف ناگوار گذرا ہے۔ عثمان نے کہا، اسے گرفتار کر لو، عمار گرفتار کر لیے گئے پھر عثمان نے عمار کو گھر میں بند کر کے اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہوگئے۔ عمار وہاں سے اٹھا کر زوجۂ رسولؐ ام سلمہ کے گھر میں لائے گئے۔ بے ہوشی اتنی بڑھی کہ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں

قضا ہو گئیں ..... عمار بنی مخزوم کے حلیف ابی تعلق کی بنا پر ہشام بن ولید مخزومی بگڑ گیا، اس نے عثمان سے کہا، علیؑ سے تو ڈر گئے اور ہم پر ہاتھ اٹھا لیا اور ہمارے بھائی کو مار مار کر لب گور کر دیا۔ خدا کی قسم اگر عمار مر گئے تو بنی امیہ کی کسی بڑی شخصیت کو قتل کر کے رہوں گا۔ عثمان نے گالیاں دے کر ولید کے بیٹے ہشام کو نکلوا دیا۔ وہ ام المومنین ام سلمہ کے گھر پہنچا، وہ خود عمار کی حالت دیکھ کر بے حد غضبناک تھیں۔ حضرت عائشہ کو خبر ہوئی تو وہ بے حد برہم ہوئیں اور حضرت سرورِ کائنات کا ایک موئے مبارک، ایک کپڑا اور ایک جوتی نکال کر کہنے لگیں۔ کتنی جلدی تم لوگ اپنے پیغمبرؐ کے طور طریقوں کو چھوڑ بیٹھے ہو، ابھی تک آنحضرتؐ کے تبرکات میلے نہیں ہوئے اور تم لوگوں نے قیامت برپا کر دی۔ عثمان کے بنائے کچھ نہ بن پڑی اور وہ غصہ میں آپے سے باہر ہو گئے ..... جناب ام سلمہ کے پاس کہلوایا کہ یہ ہجوم آپ کے گھر پر کیوں اکٹھا ہو رہا ہے۔ ام سلمہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ تم اپنی خبر لو، ایسا نہ ہو کہ لوگ وہ کر بیٹھیں جو وہ نہیں کرنا چاہتے عمار کے ساتھ عثمان کے اس برتاؤ پر سب نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ خبر آگ کی طرح پھیلی اور تمام مسلمانوں میں نفرت و ناراضگی کی لہر دوڑ گئی"[1]

حضرت عمار یاسر سے عثمان کی برہمی کا ایک واقعہ اور تاریخ کی

[1] کتاب الانساب ج ۵ ص ۴۸

کتابوں میں ملتا ہے۔ جب جناب عمار نے ابن مسعود کی وصیت کے مطابق ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور عثمان کو ابن مسعود کے انتقال کی اطلاع نہیں دی گئی۔ اسی طرح جب کچھ عرصہ بعد حضرت مقداد کا انتقال ہوا تو ان کی وصیت بھی یہی تھی کہ عثمان ان کے جنازے پر نہ آئیں چنانچہ ان کی نمازِ جنازہ بھی عمار یاسر نے پڑھائی، اس پر بھی عثمان بے حد غضبناک ہوئے اور کہا کہ عمار کا "ناس" ہو میں انھیں پہلے ہی سے جانتا تھا[1]

ان واقعات میں سب سے زیادہ قابلِ غور عثمان کی فحش اور شرمناک گالیاں ہیں، حالانکہ اِنھیں عثمان کے متعلق صحاحِ ستہ میں ام المومنین عائشہ کی یہ حدیث بڑے شدّ و مد سے بیان کی جاتی ہے کہ عثمان بڑے حیادار تھے، ان سے ملائکہ بھی شرماتے تھے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع پر عثمان کے خلاف لوگوں کو صف بستہ کرنے میں ام المومنین حضرت عائشہ نے انتہائی اہم کردار ادا کیا اور عثمان کی وہ حیثیت و اہمیت خاک میں ملا دی جس کی وجہ سے وہ اسلامی معاشرے میں بہت سر بلند تھے۔ ان کی ساری عزت و توقیر ختم ہو گئی اور مسلمان کھل کر انھیں برا بھلا کہنے لگے۔

غرض کہ ام المومنین حضرت عائشہ اور حضرت عثمان کے درمیانی تعلقات دن بہ دن بد سے بد تر ہوتے گئے۔ کہاں وہ ان کی سب سے بڑی حمایتی تھیں اور کہاں یہ نوبت آ گئی کہ ان سے بڑھ کے عثمان کا

[1] یعقوبی ج ۲ ص ۱۴۷

کوئی مخالفت نہ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اسی اختلاف کی بنا پر عثمان نے حضرت عائشہ کے وظیفہ کے دو ہزار کم کر دیے ہوں۔ بلاذری کا کہنا ہے :

"اس معرکہ میں حضرت عائشہ کے خاندان والے بھی شریک ہو گئے تھے، یہاں تک کہ لوگ یہ کہنے لگے تھے کہ محمد بن ابو بکر نے بنی تیم کو ان کے خلاف صف بستہ کیا اور طلحہ بن عبید اللہ نے ان کی اس معاملہ میں پوری پوری مدد کی"[1]

ان واقعات کے پیش نظر حضرت عثمان کے قتل کو وقتی جوش اور ہنگامی جذبہ کا نتیجہ قرار دے کر چند بلوائیوں کے سر تھوپ دینا حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے جب کہ ان کی مخالفت کے تمام عناصر مدینہ ہی میں موجود تھے۔ باہر سے آنے والے تو ان کی آواز پر اپنے دکھ درد کی چارہ جوئی کے لیے جمع ہوئے تھے جن کا مقصد صرف اصلاح تھا نہ کہ قتل و خوں ریزی۔ اگر ان کی فریاد سن لی جاتی تو خون خرابے کی نوبت ہی نہ آتی۔

حضرت عثمان پر پتھراؤ

مصر کے گورنر اور حضرت عثمان کے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے مظالم اور جبر و استبداد سے جب اہلِ مصر تنگ و پریشان آچکے اور تشدد کا پانی ان کے سروں سے اونچا ہو گیا تو وہ لوگ فریاد کی غرض سے مدینہ کی طرف بڑھے اور شہر کے قریب پہنچ کر

---

[1] انساب الاشراف ج ۵ ص ۶۸

وادیٔ ذی خشب میں خیمہ زن ہو گئے۔ وہاں سے ان لوگوں نے ایک شخص کے ہاتھ حضرت عثمان کے پاس تحریری عرض داشت بھیجی، جس میں یہ مطالبہ کیا کہ ابن سرح کے مظالم، تشدد اور بے راہ روی کا سلسلہ بند کیا جائے، موجودہ روش کو بدلا جائے اور آئندہ کے لیے متبادل اور معقول انتظام کیا جائے۔

حضرت عثمان نے اس عرض داشت پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ان کے قاصد کو ڈانٹا پھٹکارا اور دھکے دے کر گھر سے باہر کر دیا۔ اس غرور و طغیان اور ناروا سلوک پر مصری وفد کے لوگ بپھر گئے اور مخالفانہ نعرے بلند کرتے ہوئے شہر میں داخل ہو گئے اور اہلِ مدینہ سے حکومت کی ستم رانیوں اور عثمان کے اس غیر اصولی برتاؤ کا شکوہ کیا۔ ادھر بصرہ اور کوفہ سے بھی اپنی اپنی شکایتیں لے کر سینکڑوں لوگ آئے ہوئے تھے وہ بھی اہلِ مصر کے ہمنوا ہو گئے اور مدینہ والوں کی پشت پناہی پر ان لوگوں نے حضرت عثمان کو گھیر کر پابند مسکن بنا دیا، مگر مسجد میں آمد و رفت پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ چنانچہ اس سلگتے ہوئے ماحول میں حضرت عثمان نے پہلے جمعہ میں جو خطبہ دیا اس میں مصر، کوفہ اور بصرہ والوں کو برا بھلا کہا اور انھیں ملعون قرار دیا۔ بس پھر کیا تھا خلیفہ کی شامت آگئی، تمام لوگ مشتعل ہو گئے اور حضرت عثمان پر چاروں طرف سے پتھر برسنے لگے یہاں تک کہ یہ بے ہوش ہو کر منبر سے نیچے گر پڑے۔

حضرت علیؑ سے فریاد

حضرت عثمان کو جب ہوش آیا اور انھیں یہ احساس ہوا کہ

حالات بگڑ چکے ہیں تو "مشکل کشائی" کے لیے حضرت علیؑ کا سہارا لیا اور ان سے گڑگڑا کر فریاد کی اس آئی ہوئی بلا کو کسی طرح ٹال دیجیے۔ امیرالمومنین نے فرمایا کہ میں کس بنیاد پر انھیں واپس جانے کے لیے کہوں جب کہ ان کے مطالبات حق بجانب ہیں۔ عثمان نے کہا، آپ ان لوگوں سے جو بھی معاہدہ کریں گے میں اس کا پابند رہوں گا۔ چنانچہ حضرت علیؑ مصری وفد کے لوگوں سے ملے اور ان سے گفتگو کی۔ وہ لوگ اس شرط پر واپس جانے کے لیے آمادہ ہو گئے کہ تمام مظالم ختم کیے جائیں اور مصر کے گورنر ابن ابی سرح کو معزول کر کے اس کی جگہ محمد بن ابو بکر کا تقرر کیا جائے۔ حضرت علیؑ نے پلٹ کر عثمان کے سامنے ان کے مطالبات رکھے جسے بے چون وچرا انھوں نے منظور کر لیا۔ حضرت علیؑ نے اہل مصر کو ان کے مطالبات پورے کیے جانے کی یقین دہانی کرادی اور وہ لوگ منتشر ہو گئے۔

مروان کا فریب اور عثمان کا جھوٹ

جب اہل مصر چلے گئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا تو دوسرے دن مروان بن حکم نے عثمان سے کہا کہ مصر سے آئی ہوئی بلا تو ٹل گئی۔ اب آپ دوسرے شہروں کے لوگوں کی روک تھام کے لیے کوئی ایسا بیان دیں جس سے آئندہ لوگ ادھر کا رخ نہ کریں۔ عثمان نے کہا، کیا بیان دوں؟ کہا، آپ یہ بیان دیں کہ مصر کے کچھ لوگ افواہیں سن کر غلط فہمی کی بنیاد پر مدینہ میں جمع ہو گئے تھے اور جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ جو وہ سنتے تھے وہ غلط تھا تو سب لوگ مطمئن ہو کر واپس

چلے گئے۔ حضرت عثمان اس مروانی دامِ فریب میں گرفتار ہو گئے، چنانچہ انھوں نے مسجد نبوی میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"اہل مصر کو اپنے خلیفہ کے متعلق کچھ بے بنیاد خبریں ملی تھیں اور جب انھیں یقین ہو گیا کہ وہ سب غلط ہیں تو وہ اپنے شہر کی طرف پلٹ گئے۔"[1]

حضرت عثمان کے منہ سے اس جھوٹ کا نکلنا تھا کہ مسجد میں ایک ہلڑ مچ گیا اور لوگوں نے پکار پکار کر کہنا شروع کیا کہ خدا کے لیے عثمان اس جھوٹ سے توبہ کرو اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ ہنگامہ اتنا بڑھا کہ عثمان سٹپٹا کر رہ گئے اور انھیں توبہ کرتے ہی بنی۔ چنانچہ قبلہ کی طرف رخ کر کے خدا کی بارگاہ میں گڑگڑائے اور پھر گھر پلٹ آئے۔

نائلہ اور مروان کی مبتذل گفتگو

مسجد نبوی سے پلٹ کر حضرت عثمان جب بوجھل قدموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے تو مروان نے ان سے کچھ کہنا چاہا، مگر حضرت عثمان کی بیوی نائلہ بپھر گئیں اور مروان سے کہا تم چپ رہو۔ کسی وقت تمھاری باتیں ان کے لیے موت کا پیش خیمہ بن جائیں گی۔ مروان نے بگڑتے ہوئے کہا، تمھیں ان معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، تم اسی کی تو بیٹی ہو جسے مرتے دم تک وضو کرنا بھی نہیں آیا۔ نائلہ نے جھلا کر کہا، تو غلط کہتا ہے اور بہتان رکھتا ہے، میرے باپ کو کچھ کہنے

---

[1] طبری ج ٣ ص ٣٩٥

سے پہلے اپنے باپ کی حقیقت پر نگاہ ڈال۔ اگر ان "بڑے میاں" (عثمان) کا خیال نہ ہوتا تو ایسی کھری کھری سناتی کہ لوگ کانوں پر ہاتھ دھر لیتے۔ عثمان نے جب بات بڑھتے دیکھی تو دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کیا اور کہا، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟

حضرت عثمان پر مروان کی چڑھائی اور اس کا انجام

مروان نے عثمان سے کہا، مسجد میں آپ توبہ کر کے کیوں آئے؟ میرے نزدیک تو گناہ پر اڑے رہنا اس توبہ سے کہیں زیادہ بہتر تھا، کیونکہ گناہ خواہ کس حد تک بڑھ جائیں، توبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے اور مارے باندھے کی توبہ، توبہ نہیں ہوتی۔ اس توبہ کا نتیجہ دیکھ لیجیے، دروازے پر ہجوم اکٹھا ہے۔ حضرت عثمان نے کہا جو مجھے کرنا تھا وہ کر آیا۔ اب اس ہجوم سے تم نپٹ لو، میرے بس کا یہ روگ نہیں ہے۔ چنانچہ آپ کے ایماء پر مروان باہر آیا اور مجمع سے مخاطب ہو کر اس نے کہا، تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟ کیا لوٹ مار کا ارادہ ہے یا دھاوا بولنا چاہتے ہو؟ یاد رکھو کہ تم آسانی کے ساتھ اقتدار ہم سے نہیں چھین سکتے۔ یہاں سے منہ کالا کرو اور بھاگ جاؤ، خدا تمھیں ذلیل و رسوا کرے۔

لوگوں نے جب یہ بدلا ہوا نقشہ دیکھا تو غیظ و غضب میں بھرے ہوئے وہاں سے چل پڑے اور سیدھے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں ساری روداد سے آگاہ کیا۔ حضرت کو بھی غصہ آیا، چنانچہ وہ اسی وقت عثمان کے یہاں گئے اور ان سے کہا، تم نے مسلمانوں کی کیا درگت بنائی ہے، ایک بے دین و بدکردار

کی خاطر دین سے بھی ہاتھ اٹھا لیا ہے اور عقل کو بھی چھوڑ بیٹھے ہو۔ تمھیں اپنے وعدوں کا کچھ پاس و لحاظ تو ہونا چاہیے۔ یاد رکھو! مروان تمھیں ایسے اندھے کنوئیں میں پھینکے گا جس سے نکلنا تمھارے لیے ممکن نہ ہو گا۔ تم مروان کی سواری بن چکے ہو جس طرح چاہے وہ تم پر چڑھے اور جس غلط راہ پر چاہے تمھیں ڈال دے۔ آئندہ میں تمھارے کسی معاملے میں دخل نہیں دوں گا، جو تمھارے جی میں آئے کرو، اب تم جانو اور تمھارا کام۔ یہ کہہ کر جب حضرت علیؑ چلے آئے تو نائلہ نے عثمان سے کہا:

"مروان سے پیچھا چھڑائیے ورنہ وہ ایسا کلنک کا ٹیکہ لگائے گا کہ مٹائے نہ مٹے گا۔ آپ ایسے شخص کے کہنے پر عمل کرتے ہیں جو بے آبرو اور لوگوں کی نظروں میں گرا ہوا ہے۔ علیؑ بن ابی طالب کو منائیے ورنہ یاد رکھیے کہ بگڑے ہوئے حالات پر قابو پانا نہ آپ کے بس میں ہے اور نہ مروان کے اختیار میں۔" (طبری)

نائلہ کی اس تجویز سے عثمان متفق ہوئے اور امیرالمومنین حضرت علیؑ کے پیچھے آدمی بھیجا مگر آپ نے ملنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عثمان کے لیے شرم و حیا اور ندامت مانع تھی، کون سا منہ لے کر دن کے اجالے میں نکلتے لہٰذا رات کے پردے میں چھپ کر امیرالمومنین کے یہاں پہنچے اور اپنی بے بسی و لاچاری کا رونا رویا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اب تمھاری ذات پر اعتماد بہ ذات خود اپنے کو فریب میں مبتلا کرنا ہے، لہٰذا میں تمھاری کوئی ذمہ داری اپنے سر لینے کو تیار نہیں ہوں، جو راستہ مناسب سمجھو اختیار کرو۔ یہ جواب سن کر حضرت عثمان پلٹ

آئے اور حضرت علیؑ پر الٹے یہ الزام عائد کرنا شروع کیا کہ ان ہنگاموں کے پیچھے علیؑ بن ابی طالب کا ہاتھ ہے۔

محمد بن ابوبکر کے ساتھ عثمانی فریب کاری

محمد بن ابوبکر کا قصہ مصر سے شروع ہوتا ہے، جب انھوں نے ابن حذیفہ کے ساتھ مل کر مصری گورنر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے خلاف محاذ قائم کیا۔ بلاذری نے سعید بن مسیب سے روایت کی ہے:

"حضرت عثمان نے بارہ سال حکومت کی اور اس عرصہ میں انھوں نے ایسے لوگوں کو عامل مقرر کیا جنھیں پیغمبرؐ کی صحبت کا شرف حاصل نہ تھا۔ یہ لوگ ایسے مظالم اور ایسی حرکتیں کرتے جو اصحابِ رسولؐ کے لیے ناقابل برداشت ہوتیں۔ ان کی شکایتیں حضرت عثمان سے کی جاتیں لیکن وہ کوئی توجہ نہ دیتے نہ انھیں معزول کرتے۔ آخری زمانۂ خلافت میں انھوں نے اپنے خاندان والوں کو بہت سر چڑھا لیا اور انھیں ہر جگہ حاکم مقرر کیا۔ انھیں حاکموں میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح بھی تھا، یہ عبداللہ بن مسعود، ابوذر غفاری اور عمار یاسر کے ساتھ طرح طرح کے مظالم اور بدسلوکیاں کر چکا تھا جس کی وجہ سے قبائل ہذیل، بنی زہرہ، بنی غفار اور بنی مخزوم کے لوگ برہم تھے۔ چند برس یہ حاکم رہا ہوگا کہ مصر والے اس کی شکایتیں لے کر عثمان کے پاس پہنچے۔ وقتی طور پر عثمان نے اس کی تنبیہہ کی اور خفگی بھرے خطوط لکھے لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی بلکہ اس کی جسارتیں اور زیادہ بڑھ گئیں۔ جو لوگ شکایتیں

لے کر عثمان کے پاس گئے تھے انھیں مارا پیٹا اور ان میں سے ایک شخص کو قتل بھی کر ڈالا۔ عاجز ہو کر مصر کے لوگ سات سو کی تعداد میں مدینہ روانہ ہوئے۔ نمازوں کے وقت اصحاب پیغمبرؐ سے ملاقاتیں کیں اور ان سے ابن ابی سرح کی زیادتیوں کے بارے میں سب کچھ بتایا، طلحہ نے عثمان سے اس معاملہ میں سخت لب و لہجہ میں گفتگو کی۔ حضرت عائشہ نے بھی کہلا بھیجا کہ مصر والوں کے معاملے میں انصاف کیا جائے۔ حضرت علیؑ بھی مصر والوں کے ترجمان بن کر عثمان کے پاس گئے اور فرمایا کہ یہ لوگ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ابن ابی سرح کو ہٹا کر دوسرے کو حاکم مقرر کر دیجیے اور ان کے ساتھ انصاف کیجیے۔ عثمان نے کہا جسے یہ لوگ کہیں حاکم مقرر کر دوں۔ ان لوگوں نے محمد بن ابوبکر کے لیے کہا، حضرت عثمان نے محمد بن ابوبکر کو بلا کر مصر کی حکومت کا پروانہ لکھ دیا اور ان کے ساتھ مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کر دی کہ وہ مصر جائیں اور ابن ابی سرح کی زیادتیوں کی تحقیقات کریں۔"[1]

اب اس تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیں:

ابھی محمد بن ابوبکر اور ان کے ساتھی حجاز کی سرحدیں پار کر کے دریائے قلزم کے کنارے آباد ایک مقام "ایلہ" تک پہنچے تھے کہ ان لوگوں کو ایک حبشی ناقہ سوار نظر آیا جو اپنی سواری کو اس طرح بگٹٹ دوڑائے چلا جا رہا تھا جیسے وہ کسی کا پیچھا کر رہا ہو یا کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ محمد بن

---

[1] انساب الاشراف بلاذری ج ۵ ص ۶۷-۶۸

ابوبکر کے رفقا کو اس پر شبہ ہوا۔ انھوں نے اسے روکا اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا میں حضرت عثمان کا غلام ہوں۔ پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے کہا مصر کا۔ پوچھا کس کے پاس جا رہے ہو؟ کہا والیِ مصر کے پاس۔ لوگوں نے کہا والیِ مصر تو ہمارے ساتھ ہیں، تم کس کے پاس جا رہے ہو؟؟ اس نے کہا ابن ابی سرح کے پاس۔ لوگوں نے پوچھا تمھارے پاس کوئی خط ہے؟ پوچھا پھر کس مقصد سے جا رہے ہو؟ اس نے کہا نہیں معلوم۔ لوگوں نے کہا اس کی تلاشی لی جائے۔

چنانچہ تلاشی لی گئی لیکن اس کے پاس سے کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ کنانہ بن بشر نے کہا کہ اس کا مشکیزہ دیکھو۔ اور جب مشکیزہ کھول کر دیکھا گیا تو اس میں سیسے کی ایک نلکی تھی جس میں خط رکھا ہوا تھا جو سیل بند لفافے میں تھا۔ یہ خط فرمانِ خلافت تھا۔ سیل توڑی گئی، خط پڑھا گیا، اس میں تحریر تھا:

"جب محمد بن ابوبکر اور ان کے ساتھی تمھارے پاس پہنچیں تو انھیں کسی طرح قتل کر دو اور جو پروانۂ تقرری محمد کے پاس ہے اسے منسوخ سمجھو، اپنے منصب پر قائم رہو اور جو شخص مخالفت کرے اسے جیل میں بند کر دو......"[1]

خط کا مضمون پڑھنے کے بعد سب پر سناٹا چھا گیا اور حضرت عثمان کی اس فریب کاری پر لوگ حیرت سے ایک دوسرے کا منھ

[1] عقد الفرید ج ۲ ص ۱۸۶، انساب الاشراف ج ۵ ص ۶۸، طبری ج ۵، کامل ابن اثیر ج ۳، ابن ابی الحدید ج ۲ وغیرہ

تکنے لگے اور ان کے درمیان سراسیمگی اور غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب آگے بڑھنا موت کو دعوت دینا تھا۔ چنانچہ محمد بن ابوبکر نے اس خط کو تمام لوگوں کے سامنے سربمہر کیا اور اس حبشی غلام کو ساتھ لے کر سب لوگ مدینہ کی طرف پلٹ پڑے۔ مدینہ پہنچ کر ان لوگوں نے حضرت علیؑ، طلحہ، زبیر، سعد اور دوسرے اصحابِ پیغمبر کو جمع کیا اور وہ خط صحابہ کے مجمع کے سامنے رکھا گیا۔ سب انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو حضرت عثمان کو برا نہ کہہ رہا ہو۔ جو لوگ ابوذرؓ، ابن مسعودؓ اور عمارؓ کی وجہ سے پہلے ہی سے برہم تھے، ان کے غیظ و غضب کا ٹھکانا نہیں تھا۔ طلحہ، زبیر، سعد، عمار وغیرہ محمد بن ابوبکر کے ہمراہ عثمان کے گھر پہنچے اور وہ خط ان کے سامنے رکھ کر پوچھا کہ اس پر مہر کس کی ہے؟ عثمان نے کہا میری، پوچھا تحریر کس کی ہے؟ کہا میرے کاتب کی۔ پوچھا یہ غلام کس کا ہے؟ کہا میرا۔ پوچھا یہ سواری کس کی ہے؟ کہا حکومت کی۔ پوچھا بھیجا کس نے ہے؟ کہا مجھے اس کا علم نہیں۔

لوگوں نے کہا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کا غلام آپ ہی کی سواری پر بیٹھ کر جائے اور اس کے پاس ایسا فرمان ہو جس پر آپ ہی کی مہر لگی ہو اور آپ کو پتہ تک نہ ہو۔ جب آپ کی بے بسی کا یہ حال ہے تو خلافت سے دست بردار ہو جائیے تاکہ کوئی ایسا شخص آئے جو مسلمانوں کے امور کی دیکھ بھال کر سکے۔

حضرت عثمان نے کہا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ میں اس پیراہن کو اتار دوں جو اللہ نے مجھے پہنایا ہے، البتہ توبہ کیے لیتا ہوں۔ لوگوں نے

کہا، توبہ کی مٹی تو اسی دن خراب ہو گئی تھی جب مروان آپ کے دروازے پر آپ کی ترجمانی کر رہا تھا، رہی سہی کسر اس خط نے پوری کر دی، اب ہم آپ کے فریب میں آنے والے نہیں۔ اگر یہ کارنامہ مروان کا ہے تو آپ اسے ہمارے حوالے کیجیے تاکہ ہم باز پرس کر سکیں، ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ یہ خط آپ ہی کے حکم سے لکھا گیا ہے۔

مروان اس وقت عثمان کے گھر میں موجود تھا لیکن اسے انھوں نے صحابہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور وہ لوگ حضرت عثمان کو کوستے ہوئے واپس پلٹ آئے۔

قتل عثمان کا فتویٰ اور اس پر عملدرآمد

مورخ اعثم کوفی کا بیان ہے:

"جب ام المومنین (عائشہ) نے دیکھا کہ تمام لوگوں نے عثمان کے خلاف ایکا کر لیا ہے تو انھوں نے عثمان سے کہا تم نے مسلمانوں کے بیت المال کو اپنی ذات کے لیے مخصوص کر لیا..... بنی امیہ کو آزادی دے دی کہ جس طرح وہ چاہیں (مسلمانوں کا مال) لوٹیں، انھیں ہر شہر کا حاکم بنا دیا اور امتِ پیغمبرؐ کو تنگی و عسرت میں مبتلا کر دیا۔ خداوند عالم تم سے آسمانی برکتوں کو روک لے اور زمین کی بھلائیوں سے محروم کر دے۔ اگر تم نماز نہ پڑھتے ہوتے تو اونٹ کی طرح تمھیں نحر کر دیا جاتا۔"[1]

---

[1] اعثم کوفی ص ۱۵۵

اس کے جواب میں عثمان نے قرآن کی آیت پڑھی جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

"خداوند عالم نے کافروں کی مثال زوجۂ نوح اور زوجۂ لوط سے دی ہے کہ یہ دونوں ہمارے بندوں کے تصرف میں تھیں، دونوں نے اپنے شوہروں سے دغا کی مگر کچھ بگاڑ نہ سکیں اور ان سے کہا گیا کہ جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی داخل ہو جاؤ۔"

(سورہ تحریم آیت ۱۰)

اول اس خط نے جسے مصر جاتے وقت محمد بن ابوبکر نے حضرت عثمان کے غلام سے برآمد کیا تھا اور جس میں محمد اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنے کا حکم تھا، دوسرے عثمان کے ان سخت فقروں نے حضرت عائشہ کو جن کے مزاج میں پہلے ہی سے حدت بھری ہوئی تھی اور جو غیظ و غضب کے عالم میں اپنے آپے میں نہیں رہتی تھیں، ایک دم سے مشتعل کر کے اس امر پر مجبور کیا کہ وہ حضرت عثمان کے کفر اور ان کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ جاری کر دیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

"اُقْتُلُوْا نَعْثَلًا فَقَدْ کَفَرَ" (اس نعثل کو قتل کر دو کہ یہ کافر ہو گیا ہے)

ام المومنین کی زبان سے اس فتوے کا صادر ہونا تھا کہ یہ خبر اس طرح پھیلی جیسے آگ سوکھے پتوں میں پھیل جاتی ہے۔ مخالفین آپس میں متحد ہونے لگے۔ طلحہ، زبیر، حفصہ، عمرو بن عاص، عبدالرحمن بن عوف، معاویہ بن ابوسفیان، ابوموسیٰ اشعری، ابن مسعود، عمار یاسر، مالک اشتر، عبداللہ بن عمر، عامر بن قیس تمیمی، جندب بن کعب ازدی، ابوزینب،

حجاج بن عدی اور ثابت بن قیس ہمدانی وغیرہ نے ہمنوائی کی۔ قبیلۂ بنی ہذیل، بنی زہرہ، بنی غفار، بنی مخزوم، بنی ساعدہ، بنی خزاعہ، بنی تیم اور بنی سعد وغیرہ نے حضرت عائشہ کے اس فتوے کو سراہا۔ اہل مدینہ، اہلِ مصر، اہلِ بصرہ اور اہلِ کوفہ نے لبیک کہی۔

ادھر حضرت عائشہ نے اپنے اس فتوے کی ہمہ گیری کا جائزہ لیا اور جب انھیں یقین ہوگیا کہ عثمان کے قتل کے لیے ایک جوہر دار اصل تلوار تیار ہوچکی ہے تو وہ حج کے بہانے سے مدینہ چھوڑ کے مکہ کی طرف روانہ ہوگئیں تاکہ ان کی عدم موجودگی میں جو ہونا ہے وہ ہوجائے۔

جب تک حضرت عائشہ نے یہ فتویٰ نہیں دیا تھا حضرت علیؑ اور دوسرے صحابہ کی جدوجہد سے یہ امید قائم تھی کہ شاید عثمان اور مسلمانوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہوجائے مگر اس فتوے کے بعد حضرت عثمان کی زندگی پر موت کی مہر لگ گئی۔

اس فتوے کا اثر اس وجہ سے اور بڑھ گیا کہ انھوں نے ایسے موقع پر یہ فتویٰ دیا جب پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا، مسلمانوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی، مسلم معاشرہ دو گروہوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔ ایک طرف حاکموں کا گھرانہ یعنی بنی امیہ تھے جن کی ہر شہر پر حکومت تھی اور دوسری طرف وہ مسلمان تھے جو نادار، مفلوک الحال، فاقہ کش اور پریشان حال تھے۔ حضرت عائشہ کے اس فتوے پر صحابۂ کرام کے اجماع و اتفاق کے بعد حضرت عثمان کے لیے صرف دو راستے تھے۔ یا تو وہ خلافت سے شرافت کے ساتھ دست بردار ہوجاتے یا عام مسلمانوں سے جنگ کرتے۔ بالکل یہی صورت دیگر مسلمانوں کے لیے بھی تھی کہ وہ گوشہ نشین

ہوجائیں یا پھر وہ حضرت عثمان یا ان کے مخالفین کے ساتھ شامل ہوکر میدان میں اتر آئیں۔ چنانچہ اراکین شوریٰ میں حضرت علیؑ اور سعد بن ابی وقاص نے گوشہ نشینی کو پسند کیا اور طلحہ و زبیر وغیرہ نے عام مسلمانوں میں شامل ہوکر عثمان کے قتل کو ترجیح دی۔

"اقتلوا نعثلاً" کا اثر یہ بھی ہوا کہ لوگ حضرت عثمان کی زندگی کے آخری ایام میں انھیں "نعثل" کے نام سے پکارنے اور ان سے بدکلامیاں کرنے لگے۔ چنانچہ سب سے پہلے جس نے عثمان کو "نعثل" کہہ کر مخاطب کیا، وہ جبلہ بن عمر ساعدی تھے۔ طبری نے روایت کی ہے کہ عثمان جبلہ بن ساعدی کی طرف سے گزرے تو وہ اپنے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا:

"اے نعثل خدا کی قسم میں تجھے ضرور قتل کروں گا اور اونٹ کی پیٹھ پر بٹھا کر پہاڑوں کی طرف نکال باہر کروں گا۔"[1]

دوسرے بزرگ صحابی جنھوں نے حضرت عثمان کے منھ پر انھیں نعثل کہا وہ حضرت جہجاہ غفاری ہیں۔ طبری و بلاذری نے بسلسلۂ اسناد حاطب سے روایت کی ہے کہ جہجاہ نے عثمان کو نعثل کہا اور ان کا عصا چھین کر اپنے گھٹنے سے توڑ ڈالا۔ دیگر کتابوں میں ابوجیبہ سے روایت ہے جہجاہ غفاری عثمان کے لیے ایک اونٹ، چادر اور ہتھکڑی و بیڑی لے کر آئے اور کہا: "اے نعثل اچل تجھے اوڑھا پہنا کر اونٹ پر بٹھائیں اور دخان پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ آئیں۔"[2]

---

[1] طبری ج ۵ ص ۱۱۴، کامل ج ۳ ص ۷۰، ابن کثیر ج ۷ ص ۱۷۶ [2] استیعاب، حالات جہجاہ، کامل، اصابہ ج ۱ ص ۱۵۳، خمیس ج ۲ ص ۲۶۰۔

ان روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہ کے فتوے کے بعد حضرت عثمان تمام مسلمانوں کی نظر سے بالکل ہی گر گئے تھے۔ ساری عزت و توقیر خاک میں مل چکی تھی، اگر زندہ بھی رہتے تو بے کار تھا لہٰذا اس ذلت و رسوائی کی زندگی سے ان کے لیے موت ہی بہتر تھی۔

حضرت عثمان کا محاصرہ اور قتل

تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہ نے نہ صرف قتل عثمان کا فتویٰ صادر فرمایا تھا بلکہ مختلف شہروں میں خطوط بھیج کر مسلمانوں کو ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب بھی دی تھی۔[1]

ابن عباس سے بھی آپ نے فرمایا:

"اللہ نے آپ کو فصاحت و بلاغت اور قوت گویائی سے نوازا ہے۔ عثمان کے سارے معاملات روشنی میں آچکے ہیں آپ کو چاہیے کہ اپنی تقریروں سے مسلمانوں کو عثمان کی طرف سے برگشتہ کر دیں۔"[2]

مگر ابن عباس آپ کے چکمہ میں نہیں آئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت عائشہ عثمان کو کافر قرار دے کر ان کے قتل کا فتویٰ دے چکی ہیں اور اگر عثمان قتل ہو گئے تو یہ مظلمہ کس کی گردن پر جائے گا؟

بہر حال حضرت عائشہ نے اپنے فتوے کی ہمہ گیری اور قوت، ذاتی اثرات و رسوخ اور لامحدود وسائل کی بدولت عثمان کے خلاف

[1] انساب الاشراف ج ۵ ص ۱۰۳ [2] طبری ج ۵ ص ۱۴۰

اپنے مشن میں زبردست کامیابی حاصل کی، یہاں تک کہ مصر، کوفہ اور بصرہ کے مسلمانوں کا سیلاب آپ کی اس آواز پر امنڈ کر مدینہ کی گلیوں اور کوچوں میں پھیل گیا اور حضرت عثمان کو ان کے گھر ہی میں محصور کر دیا گیا۔ بلاذری رقم طراز ہیں کہ:

"لوگوں نے حضرت عثمان کا محاصرہ کر لیا اس وجہ سے کہ انھوں نے لوگوں کے مطالبات منظور نہیں کیے، نیز اس وجہ سے کہ ام المومنین عائشہ نے ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا تھا اور مختلف شہروں میں خطوط بھیج کر مسلمانوں کو ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دی تھی۔"[1]

محاصرہ چالیس[2] دن تک جاری رہا جس کی قیادت طلحہ کے ہاتھ میں تھی۔[3] ابتدا میں محاصرہ کی روش زیادہ سخت نہ تھی۔ عثمان مسجد نبوی میں نماز کی غرض سے آتے جاتے تھے۔ پھر طلحہ نے اس آنے جانے پر بھی پابندی عائد کر دی اور نماز خود پڑھانے لگے، نیز انھوں نے بیت المال پر بھی قبضہ کر لیا۔ چنانچہ حالات کی سنگینی کے تحت حضرت عثمان نے اپنی مدد کے لیے اپنے پُراعتماد عاملوں کو آواز دی اور انھیں خطوط لکھے۔ آپ نے شام کے حاکم معاویہ کو لکھا:

"واضح ہو کہ اہل مدینہ کافر ہو گئے ہیں، انھوں نے بیعت توڑ دی ہے اور اطاعت سے منہ پھیر لیا ہے لہٰذا تم شام کی فوجوں کو تیز و تند سواریوں کے ذریعہ میری طرف بھیجو۔"[4]

[1] انساب الاشراف ج ۵ ص ۱۰۳ [2] انساب الاشراف ج ۵ ص ۸۱ [3] طبری ج ۳ ص ۴۰۲

معاویہ کو یہ خط ملا تو اس نے توقف سے کام لیا اور اصحابِ رسولؐ سے مخالفت نیز ان سے بر سرِ پیکار ہونے کو خلافِ مصلحت جانا کیونکہ وہ ایک کہنہ مشق سیاست داں تھا اور اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ تمام صحابہ عثمان کی مخالفت پر یک جہتی سے متفق ہیں۔

بصرہ کے گورنر عبداللہؓ بن عامر کو لکھا:

"کچھ سرکش، باغی اور ظالم لوگوں نے جو مدینہ کے رہنے والے ہیں۔ بصرہ، کوفہ اور مصر کے باشندوں کے ساتھ مجھ سے برگشتہ ہو کر میرے گھر کا محاصرہ کر لیا ہے۔ لیکن میں ابھی ان کے دسترس سے باہر ہوں۔ ہر چند انھیں نصیحت کرتا ہوں اور ان کی رضامندی کو مدنظر رکھنے اور کتابِ خدا و سنتِ رسولؐ پر چلنے کا وعدہ کرتا ہوں مگر وہ ذرا بھی کان نہیں دھرتے۔ میرے قتل یا مجھے خلافت سے علیحدہ کرنے پر مصر ہیں اور میں ان کی خواہش پوری کرنے یعنی خلافت سے علیحدہ ہو جانے کی نسبت موت کو زیادہ سہل اور آسان سمجھتا ہوں۔ میں نے تمھیں صورتِ حال سے مطلع کر دیا ہے۔ لازم ہے کہ تم میری مدد کرو اور مضبوط و بہادر لوگوں کی جمعیت کو میرے پاس روانہ کرو۔" (اعثم کوفی)

ان خطوط کے جواب میں کوئی مدد تو نہیں آئی مگر یہ ضرور ہوا کہ عثمان کے مخالفین کو اس بات کا علم ہو گیا کہ خلیفہ نے اپنے عاملوں سے فوجوں کی مدد مانگی ہے تاکہ وہ ہم سے جنگ کر سکیں۔

ظاہر ہے کہ اس خیال نے مخالفین کے ذہنوں میں قتلِ عثمان کے سلسلے میں "عجلت" کے تصور کو جنم دیا ہو گا اور شاید یہی وجہ تھی

کہ محاصرے کا دائرہ یک بارگی حضرت عثمان پر تنگ کر دیا گیا۔ رسد و اشیائے خوردنی کے تمام ذرائع منقطع کر دیے گئے یہاں تک کہ آپ پر پانی بھی بند کر دیا گیا۔

اب حالات قابو سے باہر تھے، لہٰذا عثمان نے سوچا ہو گا کہ جان بچانے کی یہی صورت ممکن ہے کہ حضرت عائشہ کے قدموں پر سر رکھ دیا جائے، اس طرح ایک آخری کوشش اور کر لی جائے۔ چنانچہ انھوں نے مروان بن حکم اور عبدالرحمن بن عتاب کو حضرت عائشہ کے پاس بھیجا، وہ مدینہ سے فرار ہونے کے لیے رختِ سفر باندھ چکی تھیں۔ حضرت عثمان کے نمائندوں نے آکر ان سے فریاد کی اور کہا کہ خلیفہ پر محاصرے کا دائرہ مزید تنگ کر دیا گیا ہے۔ مناسب ہو گا کہ آپ سفر ملتوی کر دیں کیونکہ آپ کی موجودگی ان کے بچاؤ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ حضرت عائشہ نے سخت لہجے میں انکار کرتے ہوئے فرمایا:

"خدا کی قسم میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ وہ (عثمان) میرے ان تھیلوں میں سے کسی ایک تھیلے میں بند ہوتے اور میں خود انھیں لے جا کر کسی سمندر میں غرق کر دیتی۔"[1]

حضرت عائشہ کی زبان سے یہ خشک اور "دوٹوک" جواب سن کر حضرت عثمان کے نمائندے بے نیلِ مرام واپس آگئے، اور رہی سہی یہ امید بھی ختم ہو گئی

محاصرے کی شدت، خوردنی اشیاء کی عدم فراہمی اور بندشِ آب

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۵

نے حضرت عثمان کو مضطرب و پریشان اور نیم جان کر دیا تھا۔ خصوصاً پیاس نے جب مجبور کیا تو آپ کاشانۂ خلافت کی چھت پر چڑھ گئے اور وہاں سے محاصرین کو مخاطب کر کے پوچھا کہ کیا تم میں علیؑ بھی ہیں؟ لوگوں نے کہا نہیں۔ پوچھا سعد ہیں؟ لوگوں نے کہا نہیں۔ پھر کہا، کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو مجھ پر رحم کرے اور میرا یہ پیغام علیؑ تک پہنچا دے کہ وہ میرے لیے پانی کی کچھ سبیل کر دیں؟ جب یہ خبر حضرت علیؑ کو ملی تو وہ طلحہ کے پاس آئے اور کہا کہ یہ مناسب نہیں کہ تم عثمان پر پانی کو بند رکھو۔ میں پانی کی جو مشکیں بھیج رہا ہوں، انھیں عثمان کے پاس جانے دو۔ بات صاحب ذوالفقار کی تھی، طلحہ کی کیا مجال تھی کہ وہ اس سے انحراف کرتے۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے تین مشکیں پانی کی عثمان کے پاس روانہ کیں جو ان تک پہنچیں۔[1]

نیار بن عیاض صحابیٔ رسولؐ کا المناک واقعہ بھی قتلِ عثمان میں عجلت کا سبب بنا۔ وہ یہ کہ نیار بن عیاض حضرت عثمان کو نصیحت کرنے کا جذبہ لے کر ان کے گھر پہنچے اور محاصرین کی صفوں میں شامل ہو کر عثمان کو آواز دی۔ جب انھوں نے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو نیار نے کہا، اے عثمان! خدا کے لیے خلافت سے دست بردار ہو جاؤ اور مسلمانو کو خون خرابے سے بچاؤ۔ ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ عثمان کے آدمیوں میں سے کسی نے انھیں تیر کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا۔ اس حادثے نے مسلمانو کو مشتعل کر کے آپے سے باہر کر دیا۔ پہلے تو لوگوں نے عثمان سے نیار

[1] انساب الاشراف ج ۵ ص ۶۸-۶۹

کے قاتل کو طلب کیا۔ مگر عثمان نے یہ کہہ کر ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے ایک مددگار کو تمھارے سپرد کر دوں۔

عثمان کی اس سینہ زوری نے بھڑکی ہوئی آگ کو اور ہوا دے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے جوش میں آ کر ان کے دروازے میں آگ لگا دی کچھ لوگ اندر گھسنے کے لیے آگے بڑھے تھے کہ مروان بن حکم، سعد بن عاص اور مغیرہ بن اخنس اپنے اپنے جتھوں کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑے اور دروازے پر ہی کشت و خون شروع ہو گیا۔ لوگ گھر کے اندر گھسنا چاہتے تھے مگر انھیں باہر دھکیل دیا جاتا تھا۔ اتنے میں عمرو بن انصاری نے جن کا مکان عثمان کے مکان سے متصل تھا، اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا اور للکار کر کہا، آؤ ادھر سے آگے بڑھو چنانچہ محاصرین اس مکان کے ذریعہ کاشانۂ خلافت کی چھت پر پہنچے اور وہاں سے صحن میں اتر کر تلواریں سونت لیں۔

جناب اشتر جب عثمان کو قتل کرنے کے ارادے سے آگے بڑھے تو انھوں نے دیکھا کہ وہ تنہا ہیں اور کوئی مدافعت کرنے والا نہیں ہے تو انھوں نے اس حالت میں قتل کو بزدلی پر محمول کیا اور پلٹ آئے۔ مسلم بن کثیر کوفی نے کہا، معلوم ہوتا ہے تم عثمان سے ڈر گئے۔ اشتر نے کہا میں ڈرا نہیں، چونکہ عثمان نہتے، تنہا اور بے بس ہیں، کوئی ان کی مدافعت کرنے والا نہیں ہے، اس لیے میری غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ میں ایسے شخص پر ہاتھ اٹھاتا۔ اتنے میں محمد بن ابوبکر آگے بڑھے اور انھوں نے جھپٹ کر عثمان کی داڑھی پکڑ لی۔ عثمان نے کہا، اے بھتیجے! میری داڑھی چھوڑ دے، اگر تیرا باپ (ابوبکر) زندہ ہوتا تو وہ

بھی میری داڑھی نہ پکڑ! ۔ محمد نے کہا اگر میرا باپ زندہ ہوتا تو وہ تجھے ہرگز ان فعلوں کی اجازت نہ دیتا جن کی وجہ سے تو کافر ہوگیا۔ یہ کہہ کر محمد نے وہ بیچہ جو ان کے ہاتھ میں تھا عثمان کی گردن پر رسید کیا جس سے کاری زخم آیا۔ اتنے میں کنانہ بن بشر نے عثمان کے سر پر گرز کا وار کیا۔ سودان بن حمران نے تلوار ماری اور عثمان بری طرح زخمی ہوکر زمین پر گر پڑے۔ غافقی نے ایک ضرب لگائی اور ایک مصری نے چاہا کہ عثمان کی ناک کاٹ لے مگر نائلہ (عثمان کی بیوی) نے (جو بڑی قوی ہیکل تھیں) اس کی تلوار پکڑ لی جس سے ان کا انگوٹھا کٹ گیا (ایک روایت میں ہے کہ انگلیاں کٹ گئیں)، اتنے میں خلیفہ کے ایک غلام نے اس مصری شخص پر جو عثمان کی ناک کاٹنا چاہتا تھا، تلوار کا وار کر کے سر تن سے جدا کر دیا۔ یہ دیکھ کر قنبرہ بن وہب نے غلام کے دو ٹکڑے کر دیے پھر ایک اور غلام نے قنبرہ کو مار ڈالا۔ اسی اثنا میں عمرو بن حمق جست لگا کر عثمان کے سینہ پر سوار ہو گیا۔ اس نے نو زخم لگائے اور کہا تین زخم خدا کی راہ میں لگائے ہیں اور چھ اس کینہ کی طرف سے جو اس کی طرف سے میرے دل میں تھا۔ عمر بن صابی آگے بڑھا اور اس نے عثمان کی دو پسلیاں توڑ دیں۔ لوگوں نے چاہا کہ عثمان کا سر کاٹ لیں مگر عورتیں رونے پیٹنے لگیں لہٰذا وہ اس ارادے سے باز رہے۔ پھر عثمان کا گھر لوٹا گیا، جس میں دو بوریاں درہموں سے بھری ہوئی برآمد ہوئیں۔

جن لوگوں نے عثمان کی محصوری کے واقعات قلمبند کیے ہیں ان میں سے اکثر نے لکھا ہے کہ جس دن عثمان قتل ہوئے اس دن طلحہ اپنے چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے

اور عثمان پر چھپ چھپ کے تیر چلا رہے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ جب محاصرہ کرنے والوں کو عثمان کے گھر میں داخل ہونے کا راستہ نہ ملا تو طلحہ ہی نے کسی انصاری کی طرف سے انھیں عثمان کے گھر میں داخل کیا۔[1] طبری نے روایت کی ہے کہ وہ لوگ عمرو بن حزم انصاری کے گھر میں گھسے، ان کا گھر حضرت عثمان کے گھر کے پہلو میں تھا۔ کچھ دیر جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہا، اس کے بعد سودان بن حمران باہر نکلا اور اس نے پکار کر کہا، طلحہ کہاں ہیں؟ ہم نے عثمان کو قتل کر دیا۔[2] یہ واقعہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو جمعہ کے دن بعد نماز عصر ظہور پذیر ہوا۔ اس وقت حضرت عثمان کی عمر ۸۲ سال کی تھی۔ مدت محاصرہ چالیس دن اور بعض روایتوں کے مطابق انچاس[3] دن بتائی جاتی ہے۔

مدفن

مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت عثمان کی لاش تین دن تک مزبلہ یعنی کوڑے پر پڑی رہی اور بلوائیوں نے اسے دفن نہ ہونے دیا، یہاں تک کہ (بروایت اعثم کوفی) آپ کی ایک ٹانگ کتے اٹھا لے گئے۔

دفن کے بارے میں ایک مصری بزرگ عبداللہ بن سواد کا کہنا تھا کہ میں انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دوں گا کیوں کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ اس گفتگو کے ذیل میں اس کے پاس یہ دلیل تھی:

"جب عثمان خلیفہ ہوئے اور ابو سفیان نے کہا کہ اب خلافت

---

[1] اقتباسات تاریخ اعثم کوفی [2] ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۴۰۴، طبری ج ۵ ص ۱۲۲

تمھارے ہاتھ آئی ہے اسے گیند کی طرح نچاؤ، کھیلو اور ہمیشہ کے لیے بنی امیہ میں منحصر کردو۔ میرے نزدیک حساب کتاب، عذاب و ثواب حشر و نشر اور جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں ہے، تو آپ نے اس کفر پر شرعی حد کیوں نہیں جاری کی اور ابو سفیان کو مسلمانوں کے بیت المال سے دو لاکھ درہم کیوں دیے ؟"

ممکن ہے کہ عبداللہ بن سواد کی گفتگو میں حضرت عائشہ کا وہ فتویٰ بھی کار فرما رہا ہو جس کے تحت انھوں نے عثمان کو کافر کہہ کر واجب القتل قرار دیا تھا۔ بہرحال وجہ کچھ سہی، حضرت عثمان تین دن تک پڑے رہے اور انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کرنے دیا گیا۔ آخرکار جبیر بن مطعم اور حکیم بن حزام امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور ان سے منت سماجت کی کہ وہ کسی تدبیر سے عثمان کو دفن کرا دیں۔ حضرت علیؑ نے بلوائیوں سے رابطہ قائم کر کے انھیں سمجھایا کہ وہ عثمان کی میت کو دفن ہو جانے دیں۔ غرض کہ وہ لوگ مان تو گئے مگر اس کے باوجود ان میں سے کچھ پتھر لے کر راہ میں بیٹھ گئے اور جب عثمان کا جنازہ ادھر سے گزرا تو ان لوگوں نے پتھراؤ کر دیا۔ بڑی مشکلوں سے آپ یہودیوں کے قبرستان "حش کوکب" میں ایک دیوار کے نیچے دفن کیے جا سکے۔

طبری نے ابی کرب (جو عثمان کی طرف سے بیت المال کا نگراں تھا) سے روایت کی ہے کہ حضرت عثمان بعد مغرب دفن ہوئے۔ ان کی میت میں مروان بن حکم، تین غلام اور ان کی ایک بیٹی شریک تھی جو چلا چلا کر رونے لگی تو لوگوں نے نعثل نعثل کہہ کر پتھر پھینکنا شروع کر دیا۔ قریب

تھا کہ میت سنگسار ہو جاتی۔ آخرکار "حش کوکب" میں ایک دیوار تلے انھیں دفن کر دیا گیا۔[1]

ابن قتیبہ کا کہنا ہے کہ بلوائیوں کے خوف سے میت تین دن تک پڑی رہی، آخرکار عائشہ دختر عثمان اور بارہ دیگر اشخاص نے مغرب و عشاء کے درمیان مکان کے پشت کا ایک دروازہ توڑ کر میت کو اسی پر لٹایا اور قبرستان کی طرف لے گئے۔ اس دروازے کا تختہ جس پر میت کو رکھا گیا تھا چوڑائی میں اس قدر کم تھا کہ آپ کی ایک بچی ہوئی ٹانگ نیچے لٹک رہی تھی اور جلدی جلدی چلنے کی وجہ سے ان کا سر اس تختے پر "کھٹا کھٹ" کرتا جاتا تھا، اسی آواز پر بلوائیوں نے پتھراؤ کیا۔ بروایت ابن خلدون و ابن قتیبہ وغیرہ حضرت عثمان کا غسل و کفن یا نماز جنازہ نہیں ہوئی۔

معاویہ نے وہ دیوار جس کے زیر سایہ عثمان کی قبر تھی، اپنے دور حکومت میں گروا دی اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے مردوں کو عثمان کی قبر کے آس پاس دفن کریں تاکہ اس کا سلسلہ مسلمانوں کے قبرستان (بقیع) سے مل جائے۔ اسی وقت سے حضرت عثمان والا قبرستان بنی امیہ کا قبرستان کہا جانے لگا۔

مدتِ اقتدار

حضرت عثمان گیارہ سال، گیارہ ماہ اور چودہ دن تخت اقتدار پر

---

[1] طبری ج ۵ ص ۱۴۳۔ نیز دیکھیے: کامل ج ۳ ص ۷۶، ریاض النضرہ ج ۲ ص ۱۳۱-۱۳۲

جلوہ افروز رہے اور اس مدت میں آپ نے اسلام، اسلامی شریعت، قرآن، سنتِ رسول اور سیرتِ شیخین کا ایسا "ستیاناس" کیا کہ حضرت عائشہ کے حکم پر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

ازواج

حضرت عثمان کی آٹھ بیویاں تھیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) رقیہ (۲) ام کلثوم (۳) فاختہ بنت غزوان (۴) ام عمر بنت جندب بن عمرو (۵) فاطمہ بنت ولید بن مغیرہ مخزومی (۶) ملیکہ بنت عتیبہ (۷) رملہ بنت شیبہ بن ربیعہ (۸) نائلہ بنت فرافصہ کلبیہ نصرانیہ۔

حضرت عثمان کی ان بیویوں کی فہرست میں "رقیہ" اور "ام کلثوم" کو مسلمانوں کا ایک فرقہ رسول اکرمؐ کی صلبی بیٹیاں قرار دے کر عثمان کی اس فضیلت کا قصیدہ پڑھتا ہے کہ وہ ذوالنورین تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں پیغمبرؐ کی صلبی بیٹیاں نہیں تھیں بلکہ حضرت خدیجہ کی بہن ہالہ کی بیٹیاں تھیں جنھیں پیغمبرؐ نے خدیجۃ الکبریٰ سے عقد کے بعد پالا تھا اور وہ انھیں سے منسوب ہو گئی تھیں۔ جیسا کہ ابوالقاسم الکوفی المتوفیٰ ۳۵۲ھ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خدیجہ سے عقد کیا تو اس کے تھوڑے عرصہ بعد ہالہ کا انتقال ہوا اس نے تین لڑکیاں رقیہ اور زینب اور ام کلثوم چھوڑیں جو پیغمبرؐ اور خدیجہ کی گود میں پلیں اور اسلام سے قبل یہ دستور تھا کہ اگر کوئی بچہ کسی کی گود میں پرورش پاتا تھا تو وہ اسی سے منسوب کیا جاتا تھا۔" (کتاب الاستغاثہ ص ۶۹)

اولاد

حضرت عثمان کی سترہ اولادیں تھیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

ام کلثوم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ رقیہ سے عبداللہ پیدا ہوئے، چھ برس کی عمر میں مرغ نے ان کی آنکھ میں چونچ ماری اور وہ بیمار ہو کر مر گئے۔ پھر فاختہ نے ایک لڑکے کو جنم دیا اس کا نام بھی عبداللہ رکھا گیا۔ ام عمرو بنت جندب سے عمرو پیدا ہوئے۔ ان کے بعد ابان پیدا ہوئے جن کی کنیت ابوسعید تھی۔ پھر خالد پھر عمر پیدا ہوئے۔ ان پانچ لڑکوں کے بعد مریم پیدا ہوئیں جن کا نکاح سعید بن عاص سے ہوا۔ فاطمہ بنت ولید بن مغیرہ مخزومی سے ولید اور سعید دو لڑکے اور ایک لڑکی ام سعید ہوئی جو عبداللہ بن عمر کو بیاہی گئی۔ ملیکہ (ام البنین) سے عبدالملک پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں مر گئے۔ رملہ بنت شیبہ سے دو لڑکیاں عائشہ اور ام ابان ہوئیں جو حارث بن حکم اور مروان بن حکم سے بیاہی گئیں۔ اور نائلہ بنت فرافصہ سے مریم، (ام خالد) اروی اور امِ ابانِ صغریٰ تین لڑکیاں ہوئیں جن میں سے مریم، عمر بن ولید بن عقبہ بن ابی معیط سے بیاہی گئی۔

فہرست قاتلینِ عثمان

(ازواج و اصحابِ رسولؐ)

(۱) ام المومنین حضرت عائشہ (۲) طلحہ بن عبداللہ (۳) زبیر بن عوام (۴) ام المومنین حفصہ (۵) عمرو بن عاص (۶) عبدالرحمن بن عوف

(۷) معاویہ بن ابی سفیان (۸) مروان بن حکم (۹) محمد بن ابوبکر (۱۰) محمد بن ابی حذیفہ (۱۱) عمار یاسر (۱۲) مالک اشتر (۱۳) عبدالرحمٰن بن عدیس بلوی (۱۴) زید بن صوحان عبدی (۱۵) صعصعہ بن صوحان (۱۶) عبداللہ بن عمر بن خطاب (۱۷) حکیم بن جبلہ عبدی (۱۸) عبداللہ بن الاصم عامری (۱۹) جبلہ بن عمرو ساعدی (۲۰) جہجاہ غفاری (۲۱) عمرو بن الحمق (۲۲) عمرو بن حزم انصاری (۲۳) ینار بن عیاض (۲۴) عمیر بن صابی (۲۵) کمیل بن زیاد نخعی (۲۶) ابو عمرو بن بدیل بن ورقاء خزاعی (۲۷) سودان بن ریان (۲۸) ذرع بن یشکر نافعی (۲۹) ابن عیسیٰ (۳۰) ابن ابوشمر بن ابرہہ (۳۱) عبداللہ بن سودا (۳۲) خالد بن ملجم (۳۳) ذریح بن عباد (۳۴) سودان بن حمران (۳۵) کنانہ بن بشر (۳۶) غافقی بن حرب تمی (۳۷) بشر بن شریح قیسی (۳۸) ابن المحترش (۳۹) حرقوص بن زہیر سعدی (۴۰) عروہ بن بیاع (۴۱) قیس بن سعد (۴۲) عروہ بن سلیم لیثی (۴۳) کدر بن حمام (۴۴) سدوس بن عنبس (۴۵) سیار بن عیاض (۴۶) یسار بن الیاس (۴۷) رومان بن سرحان (۴۸) جبلہ بن ایہم (۴۹) یزید بن قیس ارحبی (۵۰) عامر بن قیس تمیمی (۵۱) عبدالرحمٰن بن اسود (۵۲) کنانہ بن عتاب (۵۳) ابوموسیٰ اشعری (۵۴) حذیفہ (۵۵) ابن مسعود (۵۶) قعقاع بن عمرو (۵۷) احنف بن قیس (۵۸) عبید بن رفاء (۵۹) حجاج بن عدی (۶۰) ثابت بن قیس نخعی (۶۱) جندب بن زہیر (۶۲) ابوزینب (۶۳) عبداللہ بن فدیک (۶۴) علقمہ بن عثمان (۶۵) علقمہ بن قیس نخعی (۶۶) حبیب بن زہیر (۶۷) حبیب بن کعب ازدی (۶۸) ابن کوار (۶۹) قتیرہ بن وہب (۷۰) عروہ

بن جعد (۷۱) ابوثور (۷۲) کعب بن سور (۷۳) عدی بن حاتم۔

قاتلین عثمان کی فہرست بہت طویل ہے، اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے صرف تہتر ۷۳ ناموں پر ہی اکتفا کی ہے۔ اس کے علاوہ قبائل عرب میں قبیلہ بنی ساعدہ، بنی ہذیل، بنی زہرہ، بنی غفار، بنی مخزوم، بنی خزاعہ، قبیلہ سعد بن بکر، قبیلۂ جہینہ، قبیلۂ مزنیہ، قبیلۂ انباط یثرب، قبیلۂ تیم، بنی سعد اور دیگر قبائل اور ان کے حلیف سب کے سب عثمان کے قتل میں شریک ہو گئے تھے۔ ان قبائل کے علاوہ اہل مدینہ، اہل مصر، اہل کوفہ اور اہل بصرہ بھی شریک تھے۔ گویا پوری دنیا عثمان کے قتل پر آمادہ نظر آرہی تھی۔

(ماخوذ از قاتلان عثمان حصہ اول)

حضرت عائشہ کے قاتل ہونے پر صحابۂ کرام کی گواہیاں

(تاریخ کی روشنی میں)

مغیرہ بن شعبہ

"مغیرہ بن شعبہ (ایک دن) عائشہ کے پاس آیا تو عائشہ نے اس سے کہا کہ اے ابوعبداللہ! کاش تم مجھے جنگ جمل میں دیکھتے کہ تیر کس طرح میرے ہودج کو توڑ کر نکل رہے تھے، یہاں تک بعض تیر میرے جسم تک پہنچ جاتے۔ مغیرہ نے کہا، کاش ان تیروں میں کوئی تیر آپ کا خاتمہ کر دیتا۔ عائشہ نے کہا آخر یہ کیوں؟ مغیرہ نے کہا، تمھارے قتل کے بعد اس سعیٔ

قتل کا کفارہ ہو جاتا جو عثمان کے لیے آپ نے کی ہے"۔[۱]

ابن ابی وقاص

"راوی کہتا ہے کہ میں نے سعد بن ابی وقاص سے پوچھا کہ عثمان کو کس نے قتل کیا ہے تو انھوں نے کہا، اس تلوار نے جو عائشہ نے کھینچی تھی"۔[۲]

مروان بن حکم

"عائشہ نے کہا تم لوگ عثمان پر چڑھ بیٹھے اور انھیں قتل کر ڈالا۔ اس پر مروان نے کہا، یہ کام تو تمھارا ہے کہ تم نے خطوط لکھ کر لوگوں کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ عثمان پر خروج کریں"۔[۳]

ابن کلاب

"حصار عثمان کے وقت عائشہ مکہ چلی گئیں، پھر مکہ سے مدینہ کا ارادہ کر کے پلٹیں۔ مقام سرف میں ابن کلاب سے ملاقات ہوئی، پوچھا کیا خبر ہے؟ کہا، عثمان قتل کر دیے گئے۔ یہ سن کر عائشہ مکہ کی طرف پھر پلٹیں اور یہ کہتی جاتی تھیں کہ ہائے عثمان مظلوم قتل ہوئے۔ ابن کلاب نے کہا کہ آپ ہی نے عثمان کا قتل چاہا، آپ ہی وہ ہیں جس نے یہ فتویٰ دیا کہ نعثل کو قتل کر ڈالو کیونکہ یہ کافر ہو گیا ہے"۔[۴]

---

[۱] عقد الفرید ج ۲ ص ۱۹۰ [۲] الامامت والسیاست ص ۴۹، عقد الفرید ج ۳ ص ۱۸۸ [۳] عقد الفرید ج ۳ ص ۱۸۷ [۴] تاریخ کامل ج ۳ ص ۸۰

عمار بن یاسر

"عثمان کے قتل ہونے پر عائشہ نے شور مچایا کہ عثمان بے گناہ قتل ہوئے۔ اس پر عمار نے کہا کہ کل تم ان کے قتل کے لیے لوگوں کو بھڑکاتی تھیں اور آج شور مچاتی ہو"۔[۱]

ابن عباس

"عائشہ نے ابن عباس سے فرمایا اگر تم نے دیکھا کہ طلحہ نے بیت المال اور خزائن پر قبضہ کر لیا تھا، اگر وہ خلیفہ ہوتے تو اپنے ابن عم ابوبکر کی سیرت پر چلتے"۔[۲]

اس روایت میں حضرت عائشہ کی خواہش کا اظہار ہے۔

حضرت عائشہ کا اقرار

"جب امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بیعت کی خبر عائشہ کو ملی تو وہ مدینہ میں نہیں تھیں۔ ان سے کہا گیا کہ عثمان قتل ہو گئے اور علیؑ کی بیعت ہو گئی۔ یہ سن کر عائشہ نے کہا مجھے پروا نہیں اگر آسمان زمین پھٹ پڑے، خدا کی قسم عثمان مظلوم قتل ہوئے اور میں ان کے خون کا انتقام لوں گی۔ عبید نے کہا کہ اے ام المومنین سب سے پہلے جس نے عثمان پر طعن کی اور لوگوں کو ان کے قتل پر ابھارا وہ آپ تھیں اور آپ ہی نے کہا، اس نعثل کو قتل کر ڈالو کیونکہ یہ کافر ہو گیا ہے عائشہ

---

[۱] الامامت والسیاست ص ۴۹ [۲] طبری ج ۳ ص ۱۴۰

نے کہا ہاں! خدا کی قسم میں نے یہ ضرور کہا اور کیا۔ مگر میرا دوسرا قول پہلے قول سے بہتر ہے ..... عبید نے کہا اے ام المومنین! ہمارے نزدیک قاتل وہ ہے جس نے قتل کا حکم دیا۔"[1]

عمرو عاص

"ابن قتیبہ نے اپنی کتاب الامامت والسیاست میں تحریر کیا ہے کہ جس وقت عثمان قتل ہوئے، عمرو عاص فلسطین میں تھا اسے خبر معلوم ہوئی تو اس نے سعد بن ابی وقاص سے خط لکھ کر پوچھا کہ عثمان کو کس نے قتل کیا تو جواب میں اس نے لکھا:۔ اس تلوار نے جسے عائشہ نے تیار کی تھی اور طلحہ نے اس پر صیقل کی تھی۔"

یہ وہ تاریخی شواہد ہیں جو اس سربستہ راز پر پڑے ہوئے پردے کو چاک کر دیتے ہیں کہ حضرت عثمان کا اصل قاتل کون تھا؟ اب سوال یہ ہے کہ اگر حضرت عائشہ نے عثمان کے قتل کا حکم دیا اور اس حکم کے عملدرآمد پر مسلمانوں کو ہموار کیا تو پھر عثمان کے قتل ہو جانے کے بعد انھوں نے خونِ عثمان کے قصاص کا نعرہ کیوں بلند کیا جس کے نتیجہ میں "جنگ جمل" کے نام سے ایک ہولناک حادثہ رونما ہو گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر سے عائشہ کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو پھر فریب میں مبتلا کر کے اپنے دامن سے عثمان کے خون کے دھبوں کو صاف کر لیں۔ دوسرے

۱؎ کامل ج ۳ ص ۸۰، طبری ج ۳ ص ۱۷۳، الامامت والسیاست ص ۵۴

یہ کہ وہ دیرینہ دشمنی اور عداوت جو حضرت علیؑ کی طرف سے آپ کے دل میں تھی، اس کے انتقام کے لیے بھی ضروری تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میدانِ کارزار گرم کر دیں۔ اگر جنگ میں یہ کامیاب ہو جاتیں تو ان کی ساری دلی مرادیں پوری ہو جاتیں۔ یعنی حضرت علیؑ بھی قتل ہو جاتے اور حکومت و اقتدار کی باگ ڈور بھی ان کے ہاتھ میں آجاتی۔ کیونکہ عائشہ، طلحہ، زبیر اور معاویہ، ان چاروں میں ہر ایک چاہتا تھا کہ وہ اقتدار کا مالک بنے۔ حضرت عائشہ کے دل میں یہ خواہش بھی جاگزیں تھی کہ اگر میں اس منصب پر فائز نہ ہو سکوں تو میری بہن اسماء کا لڑکا عبداللہ بن زبیر فائز ہو اور یہی وجہ تھی کہ عثمان کے قتل میں ان لوگوں نے اپنا پورا سیاسی زور صرف کر دیا۔ تاریخ کی نظروں سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ ان لوگوں میں باہم مشورے ہو چکے تھے اور جب اس اہم نکتے پر نظر ٹھہرتی ہے کہ طلحہ ام المومنین عائشہ سے عقد کرنا چاہتے تھے[1] تو اس وقت صورتِ حال اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ معاملہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ نبوت کے لیے مسیلمہ کذاب اور سجاح کے درمیان طے پایا تھا۔ (تمام شد)

خاک پائے اہل بیتؑ

فروغ کاظمی

۳۰ر دسمبر ۱۹۹۴ء

۱؎ سیرت حلبیہ ج ۳ ص ۳۲۵

تاثرات

عالی جناب فروغ کاظمی صاحب دام اقبالہٗ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

آپ نے مولانا ابوالحسن ندوی کی کتاب "المرتضیٰ" کا مسکت جواب الخلفاء حصہ اول تصنیف فرماکر ملتِ اسلامیہ پر وہ احسان عظیم کیا ہے جس کا اجر سوائے ائمہ طاہرین علیہم السلام کے اور کوئی نہیں دے سکتا۔ خدا آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور عمر میں برکت عطا فرمائے۔ آپ نے تاریخ کی روشنی میں وہ وہ حقائق پیش کیے ہیں جس پر صدیوں سے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے اور یہ صرف دشمنانِ اہلِ بیتِ طاہرین علیہم السلام نے ڈال رکھے تھے۔ اُن دبیز پردوں کو آپ نے نوچ کر تار تار کر دیا اور اُن خبیث، منحوس، مکروہ اور روسیاہ چہروں کو بے نقاب کر دیا جو وقت کی نزاکت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بظاہر کلمہ پڑھ کر داخلِ اسلام ہو گئے تھے۔

بہر حال آپ کی تصنیف کردہ کتاب الخلفاء پڑھ کر روح تازہ ہو گئی، دل باغ باغ ہو گیا۔ حصہ دوم کا بے چینی سے انتظار ہے بلکہ مولانا ابوالحسن ندوی صاحب کو بھی دوسرے طمانچۂ حق کا انتظار ہے جس کے پڑتے ہی چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ حصہ اول میں تو آپ ندوی

صاحب کو ایسا آئینہ دکھلا چکے ہیں جن کی مدح سرائی مولانا ندوی صاحب نے کی ہے ان کی سوانح حیات کے خدوخال کے نقوش صاف نظر آ گئے ہوں گے۔

میں آپ کو محبانِ اہل بیت و شیعانِ علی علیہ السلام کی طرف سے نیز اپنے اہل و عیال کی طرف سے مبارک باد دیتا ہوں۔ یہ کتاب الخلفاء آپ کے قلم مبارک سے ایسی تصنیف ہے جو ہماری قوم کی نئی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ بس میں تو یوں کہوں، یہ تائید مولائے کائنات حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام تھی۔

فقط خاک پائے اہل بیت علیہم السلام

سید محمد مختار رضوی

۱۲۔اے، یشپ وہار، سیکٹر ۵، ساکیت، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۰

جناب شاعر آل محمدؐ سید فروغ کاظمی صاحب

السلام علیکم

آپ کی کتاب الخلفاء پہلی جلد پڑھ کر دل شاد ہو گیا۔ خوب جواب دیا ہے۔ واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر بالکل نئی کتاب ہے۔ دشمن اہل بیتؑ اب بھی اس دنیا میں یزیدی شکل میں نمایاں نظر آتا ہے اس کا جواب تفسیر کربلا پڑھ کر آپ نے حسینؑ اور اسلام کو زندہ کر دیا۔ پوری تاریخ کربلا کو ایک کوزے میں بھر دیا ہے۔ ابوسفیان و معاویہ کی تاریخ بیان کیا ہے جو اکثر لوگ خاندان بنی امیہ سے واقف نہیں تھے۔ آپ کے معلومات کی کیا تعریف کریں۔ اس کی تعریف اللہ پاک یا رسولؐ اللہ یا

ائمہ کی روحِ پاک شاد ہوگی۔ جناب سیدہؑ بنت رسولؐ خدا خوش ہوں گی
جنت کے فرشتے خوش ہوں گے خاص کر حضرت جبرئیل امین شاگرد مولا
علیؑ خوش ہوں گے۔

حکیم سید محمد سردار علی رضوی
سکریٹری شیعہ رویت ہلال کمیٹی، گلزار باغ، پٹنہ

محترم شاعرِ ملت حضرت فروغ کاظمی

سلام مسنون

"تفسیر کربلا" کا مطالعہ کر رہا ہوں، اس سے قبل الخلفاء جلد
اول کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ سبحان اللہ
مبارک باد کے مستحق ہیں آپ کہ آپ اس دور میں حقیقی اسلام اور
اس کے معصوم محافظین پر مخالفین کے ناپاک حملوں کا دنداں شکن
جواب دے رہے ہیں۔

آپ واقعی اپنے اس شعر کے مصداق ہیں
میں کہاں لے جاؤں اپنے میثمی کردار کو

فقط والسلام
گدائے در اہل بیت علیہم السلام
واصف عابدی
محلہ انصاریان، چھوٹا امام باڑہ سہارن پور
(یوپی)

محترم محبی، مشفقی، کرم فرمائے بندہ، محقق و مورخ دوراں،
شاعر اہلِ بیتؑ جناب فروغ صاحب

تسلیم نیازمندانہ

امید ہے کہ جناب عالی بفضل ایزدی و بہ تصدق محمدؐ و آل محمدؐ
مع متعلقین بخیریت ہوں گے۔ آپ کی تحریری گراں بہا کاوش الخلفاء
حصہ دوم کی Deelopment بھی معلوم خدا کرے آپ کی یہ محنت
بارآور ہو اور ایک ایسا تاریخی کارنامہ بن جائے جو تاریخ فضائل محمدؐ
وآل محمدؐ ورد وہابیت میں سنگ میل ثابت ہو اور جسے پڑھنے کے
بعد کسی بھی دشمنِ اہلِ بیتؑ کو فضائل اہل بیتؑ گھٹا کر پیش کرنے کی
ہمت نہ ہو سکے نیز آنے والی نسلیں اس سے فیض اکتساب کر سکیں۔

فقط خیر اندیش
ریاض الحسن

اظہارِ تشکّر

جناب خورشید آغا صاحب، ایڈوکیٹ

اوسط قد، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، پُرکشش آنکھیں، گداز جسم کے پیکر کا نام خورشید آغا ایڈوکیٹ ہے۔

آپ کے والد محترم جناب منور آغا صاحب مجنوںؔ لکھنوی کا شمار ہندوستان کے عظیم ترین اور مشہور ہزل گو شعراء میں تھا۔

آپ پیشہ کے اعتبار سے لکھنؤ کے معروف وکلاء میں شمار کیے جاتے ہیں اور کھلے ذہن کے ساتھ مولائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کربلائے معلّیٰ، نجف اشرف، خراسان، سامرہ اور ایران کے مقدس مقامات کی متعدد زیارتوں سے مشرف ہو چکے ہیں۔ اور ہندوستان کے اہم مقدس مقامات مثلاً حسین ٹیکری، نجف ہند جوگی پورہ اور بگھرہ وغیرہ کی زیارتوں سے برابر مشرف ہوتے رہتے ہیں۔

اس کتاب کے آپ خصوصی معاون رہے ہیں اور از ابتدا تا انتہا اس کی تالیف میں آپ نے میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ خدا ان کے اس جذبہ کو برقرار رکھے۔

فروغ کاظمی

کتابیات

قرآن مجید
نہج البلاغہ
الملل والنحل
الامامت والسیاست
ارجح المطالب
الاتقان
الغدیر
الفتنۃ الکبریٰ
اصابہ
احیاء العلوم
ازالۃ الخفاء
استیعاب
البدایہ والنہایہ
الفاروق
انوار اللغۃ
المامون
انساب الاشراف
آغانی

تاریخ ابو الفدا
تاریخ طبری
تاریخ الخلفاء
تاریخ کامل
تاریخ ابن خلدون
تاریخ خمیس
تاریخ اسلام ذاکر حسین
تاریخ اسلام حسن ابراہیم
تطہیر الجنان
تفسیر غرائب القرآن
تذکرۃ الکلام
تفسیر ابن کثیر
تہذیب التہذیب
تفسیر بیضاوی
تفسیر حقانی
تفسیر معالم التنزیل
تفسیر در منثور
تفسیر الاتقان

تفسیر نیشاپوری
تذکرۃ خواص الامہ
تفسیر کبیر (فخر الدین رازی)
تفسیر کشاف زمخشری
ثمرۃ الاوراق
حیواۃ الحیوان
خلفائے راشدین (اعظم گڑھ)
خصائص نسائی
خلفائے ثلاثہ
دیوانِ حسان
روض الانف سہیلی
روضۃ الاحباب
روضۃ الصفار
ریاض النضرہ
صحیح بخاری
صحیح مسلم
قرۃ العینین
فتح البیان

سیرۃ النبی ابن ہشام	موطا (مالک)	سیرتِ حلبیہ
فتح الباری	میزان الاعتدال	شرح ابن ابی الحدید
نہج الوصول	کنز العمال	طریق الحکمت
نص و اجتہاد	سوانح عمری حضرت عمر	فاروق اعظم
صواعق محرقہ	طبقات ابن سعد	مستطرف
کوکب دری	سر العالمین	سیرت خلفائے راشدین (عبدالشکور)
مشکوٰۃ المصابیح	شرح بخاری عسقلانی	عثمان ترجمۃ الفتنۃ الکبریٰ
شرح مشکوٰۃ	مقتل حسین خوارزمی	شرح تجرید
محاضرات راغب	سیرۃ النبی شبلی	معارف
مسند احمد بن حنبل	عقد الفرید	فائق زمخشری
مدارج النبوۃ	شرح مسلم نووی	

تفسیر کربلا

بہ جواب

واقعۂ کربلا اور اس کا پس منظر (ایک نئے مطالعہ کی روشنی میں)

مولف

محقق بصیر حضرت فروغ کاظمی

ہدیہ مجلد ۶۵ روپئے

منازلِ آخرۃ

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

کیا مردہ حرف ادا کرتا ہے، روحیں کیسے قبض ہوتی ہیں؟ وہ اعمال جن کی وجہ سے سکرات میں آسانی ہوتی ہے، وہ اعمال جو مرنے والے کے لیے راحت کا سبب ہیں۔ آسانیٔ موت کے اعمال۔ وہ چیزیں جو وحشتِ قبر کے لیے مفید ہیں۔

فشارِ قبر کیوں ہوتا ہے؟ منکر نکیر کا قبر میں سوال و جواب، برزخ کی لذت فانی نہیں ہے۔ بدن جسمانی میں روح کی تاثیر اور قبر کے ساتھ تعلق۔ برزخ والوں کے لیے مفید اعمال۔ قیامت کی سختی سے محفوظ رکھنے والے اعمال۔

دوبارہ زندگی، قبروں سے نکلنا، کیفیت حشر و نشر، موقف حساب، حساب کون لے گا؟ حساب کن لوگوں کا ہوگا؟ شفاعت کن لوگوں کی ہوگی؟ حوض کوثر، پل صراط سے گذرنے میں آسانی پیدا کرنے والے اعمال، دوزخ اور اہلِ دوزخ کی کیفیت۔ جنت اور لذاتِ جنت وغیرہ کے سلسلے میں معلومات فراہم کرنے والی بہترین معتبر اور مستند کتاب قرآن و حدیث کی روشنی میں۔

مصنفہ: شیخ عباس القمی النجفی علیہ الرحمہ

ملنے کا پتہ:

عباس بک ایجنسی درگاہ حضرت عباسؑ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ

اسلام کے حقیقی نظریات اور معارف کے ادراک اور آپ کے علمی، دینی اور روحانی ذوق کی تسکین کیلئے

عالم اسلام کے جید عالموں اور دانشوروں کی تحقیقی کاوشوں پر مبنی اور اپنے مواد کی صحت، دیدہ زیب کتابت عمدہ کاغذ اور خوبصورت طباعت سے مزین ہونے کی بنا پر مندرجہ ذیل مطبوعات کتابوں کی دنیا میں یقیناً گراں بہا اضافہ ہیں

توبہ — دستغیب شیرازی — ۱۵/=
تربیت اولاد — مولانا جان علی شاہ کاظمی — ۲۵/=
اولین مؤذن اسلام حضرت بلال — سید حسن آبادی — ۴/=
جناب فضہؑ — راحت حسین ناصری — ۷/=
مجالس عظیم — مولانا سید کلب عابد صاحب — ۲۵/=
سیرت امیر المومنینؑ جلد (۱) — مولانا مفتی جعفر حسین صاحب — ۱۲۰/=
سیرت امیر المومنینؑ جلد (۲) — " " " — ۷۵/=
الخلفاء (حصہ اول) — فروغ کاظمی — ۳۰/=
تفسیر کربلا — " " — ۴۰/=
درگاہ حضرت عباسؑ تاریخ کی روشنی میں (مرتبہ حسن لکھنوی) — ۲۵/=
آل محمد کا دیوانہ بہلول دانا — زجس عابدہ — ۲۰/=
عرفان امامت، حالات امام زمانہؑ — ظفر عباس کشمیری — ۷/=
البیان تفسیر سورہ الحمد — سید ابوالقاسم الخوئی — ۳۰/=
اہل ذکر — ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی — ۷/=
انتقام خونیں یا خروج مختار — سید محمد علی انجمانی — ۸/=
اسلام اور جنسیات — ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی — ۳۰/=
کائنات روش مراثی — باقر علی خاں روش لکھنوی — ۲۰/=

تعقیبات نماز (پاکٹ سائز) — ۵/=
اسلام اور عزاداری (مجموعہ مجالس کراچی) طاہر جروی صاحب — ۲۵/=
علوم القرآن — مولانا سید محمد ہارون صاحب — ۳۰/=
صرف ایک راستہ — عبدالکریم مشتاق (پاکستان) — ۷۰/=
قرآن اور جدید سائنس — موریس بوکائی — ۳۰/=
الخلفاء (حصہ دوم) — فروغ کاظمی — ۵۰/-
حضرت عائشہ کی تاریخی حیثیت — فروغ کاظمی — ۴۰/-
قرآن اور سائنس — مولانا سید کلب صادق صاحب — زیر طبع
منازل آخرہ (مرنے کے بعد کیا ہوگا؟) شیخ عباس قمی علیہ الرحمۃ — ۳۰/
حقائق القرآن — الحاج سید امتیاز حیدر — ۴۰/
مولیٰ علیؑ — تقاریر مولانا کوثر نیازی (پاکستان) و مولانا سید کلب صادق صاحب — ۳۶
وظائف القرآن — سورۂ قرآنی بمع حروف رنگین — [illegible]
امامیہ نماز — مجیبی باتصویر — [illegible]
قرآن مجید — مولانا سید فرمان علی صاحب، رنگین، مع ترجمہ
خطبات حضرت زینبؑ — مولانا ابن حسن نجفی — زیر طبع

ملنے کا پتہ
عباسؑ بک ایجنسی
درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ، ۳